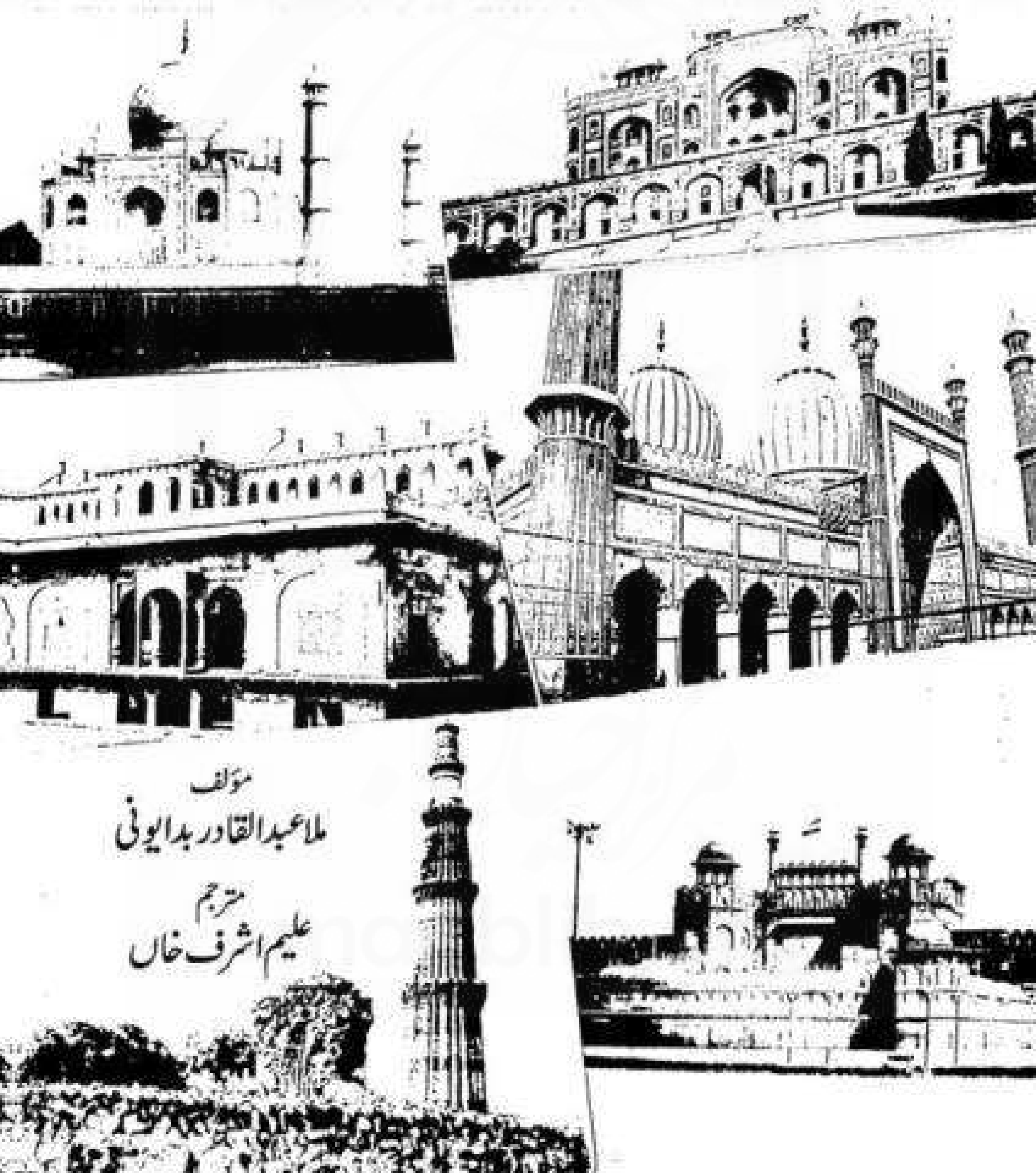
منتخب التواریخ

(جلد دوم وسوم)



مؤلف

ملا عبدالقادر بدایونی

مترجم

علیم اشرف خاں

منتخب التواریخ

(جلد دوم و سوم)

مولف

ملا ع[redacted]ایونی

مترجم

علیم اشرف خاں

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔ 110025

پہلی اشاعت : 2008

تیسری طباعت : 2017

تعداد : 550

قیمت : [redacted]

سلسلۂ مطبوعات : 1297

Muntakhabut Tawareekh Vol.2,3

By: Mulla Abdul Qadir Badayuni

ISBN :978-81-7587-759-7
978-81-7587-760-3(Set)

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی110025، فون نمبر: 49539000، فیکس:49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8 آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066
فون نمبر:26109746، فیکس:26108159 ای میل:ncpulsaleunit@gmail.com
ای میل:urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ:www.urducouncil.nic.in
طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد دہلی۔ 110 006

اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جا سکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل

برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تنقیدیں اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم وفنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کر دی جائے۔

پروفیسر سید علی کریم
(ارتضیٰ کریم)
ڈائریکٹر

منتخب التواریخ

جلد دوم

فہرست

عرض مترجم

مجھے بے حد خوشی ہے کہ ملا عبدالقادر بدایونی کا شاہکار منتخب التواریخ کا اردو ترجمہ مکمل ہوا۔ مترجم کو یہ بھی احساس ہے کہ ترجمہ ایک نہایت دشوار اور پیچیدہ کام ہے جس میں روح مطلب کا مفقود ہونا عام بات ہے۔ بہرحال یہ ترجمہ ہے نہ کہ اصل تالیف، مزید برآں یہ کوئی صحیفۂ آسمانی نہیں ہے جو سہو، اشتباہات اور کمیوں سے مبرا ہو۔

مؤلف منتخب التواریخ کا نام عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی ہے جو شاعر تھے اور قادری تخلص کرتے تھے نیز فن تاریخ گوئی میں بھی ان کا منفرد مقام ہے۔ خاص طور سے یہ بات بھی نہایت اہم ہے کہ ملا عبدالقادر بدایونی عہد وسطیٰ کے معروف مورخ ابوالفضل کے معاصر ہیں۔ جن میں ایک کو دربار اکبری میں نہایت معتبر رتبہ ملا ہوا تھا اور دوسرا اپنی تمام کوششوں کے باوجود اس درجۂ اعتبار اور قربت کو حاصل نہ کر سکا تھا۔

ملا عبدالقادر بدایونی کی ولادت 947ہجری/ 41-1540 عیسوی میں ہوئی جس کے لیے شاہد منتخب التواریخ میں یوں آیا ہے:

"مجھے خدا نے 60 سال کی عمر میں لڑکا عطا کیا جس کا نام محی الدین رکھا، جس کی ولادت پیساور میں ہوئی۔"

اسی طرح دوسری جگہ جلد اول میں عبدالقادر بدایونی رقم طراز ہیں:

''اس منتخب کا جامع 961 ہجری/ 54-1553 عیسوی میں 12 سال کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ تحصیل علم کے لیے سنبھل گیا تھا۔'' حالانکہ ان کی ولادت اور 12 سال کی عمر کے اعتبار سے سنین میں اختلاف موجود ہے۔

قرآن کی تعلیم سے متعلق یہ اطلاع بھی ملتی ہے کہ انھوں نے میر سید محمد مکی سے قرآن پڑھا تھا جو سات قرأتوں کے قاری تھے۔ عربی کی تعلیم اپنے نانا مخدوم اشرف سے حاصل کی۔ بقول ملا عبدالقادر ''961 ہجری قمری میں 12 سال کی عمر میں میاں حاتم سنبھلی سے ''قصیدۂ بردہ شریف' اور فقہ کی کتاب ''کنز'' کے بھی چند اسباق پڑھے تھے۔'' عبدالقادر بدایونی نے بہت سے علوم کے لیے ابوالفضل اور فیضی کے والد ملا مبارک ناگوری سے رجوع کیا اور باقاعدہ ان علوم کو اپنے استاد مبارک ناگوری سے حاصل کیا۔ میر غیاث الدین جو نقیب خاں کے نام سے پہچانے جاتے ہیں وہ ملا عبدالقادر بدایونی کے ہم سبق رہے تھے۔ اُن کی شادی 975 ہجری میں بدایوں میں ہوئی تھی۔ جلال خاں قورچی اور حکیم عین الملک کی سفارش پر ملا عبدالقادر بدایونی کو 981 ہجری میں بادشاہ وقت جلال الدین محمد اکبر کے دربار میں جگہ ملی اور بقول اکبر: ''یہ بدایونی عالم حاجی ابراہیم سرہندی کی خوب سرکوبی کرے گا۔'' کے مصداق دربار میں مامور ہوئے۔

قاضی علی کی سعی پیہم سے ملا عبدالقادر کو ہزار بیگھہ آراضی کی مدد معاش بھی دربار اکبری سے عطا ہوئی۔ دربار میں ملا عبدالقادر بدایونی کے ذمے ترجمہ، تصنیف اور تالیف کے علاوہ کتابوں کا انتخاب بھی تفویض ہوا۔ انھیں دربار سے ''اتھربن وید'' کے ترجمے کا کام ملا تھا مگر وہ اس کام میں کامیاب نہ ہوئے تو یہ کام بعد میں ابوالفیض فیضی کے سپرد کیا گیا۔ بدایونی کی دوسری کتاب ''الاحادیث'' ہے جس میں تیر اندازی اور جہاد کے سلسلے کی 60 حدیثیں جمع کی گئی ہیں۔ ایک کتاب ''تاریخ الفی'' کے لیے ایک ٹیم کا قیام کیا گیا جو سات افراد پر مشتمل تھی جس کے ایک رکن ملا عبدالقادر بدایونی بھی تھے۔ نقیب خاں اور بدایونی نے باہمی اشتراک سے ''مہابھارت'' کا ترجمہ ''رزم نامہ'' کے نام سے انجام دیا اور

''رامائن'' کو عبدالقادر نے 6 سال کی مدت میں انفرادی طور پر ترجمہ کیا تھا۔ ''جامع رشیدی'' کو ابوالفضل کے حکم اور مشورے سے ترجمہ کیا' بحر الاسمار' جو کشمیر کی تاریخ ہے اور اس کا ترجمہ سلطان زین العابدین نے کرایا تھا وہ بھی مکمل نہ ہو سکی تھی اس کی تکمیل بھی ملا عبدالقادر بدایونی نے کی۔ ''نجات الرشید'' کو بدایونی نے ذاتی طور سے اور ''انتخاب تاریخ کشمیر'' بھی بادشاہی حکم کے مطابق مکمل کیا۔ ''منتخب التواریخ'' ملا عبدالقادر بدایونی کی ضخیم اور 3 جلدوں پر مشتمل تاریخ ہے۔

ملا عبدالقادر بدایونی کو علوم معقول و منقول دونوں میں کامل دستگاہ تھی۔ عربی و فارسی ان کی گھٹی میں تھی اور وہ فارسی کے صاحب طرز ادیب اور انشا پرداز تھے۔ ملا کو نجوم، ریاضی اور ہندوستانی راگ اور راگنیوں سے بھی شغف تھا۔ تاریخ گوئی میں ان کا سکہ چلتا تھا اور انہیں عہد اکبری کے نابغۂ روزگار میں شمار کرنا حق شناسی کہی جائے گی۔ منتخب التواریخ میں ملا عبدالقادر بدایونی نے جلال الدین محمد اکبر کے 60 سالہ واقعات کو قلم بند کیا ہے۔ مزید اس کی سب سے عجیب خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی حیات تک اس تالیف کا راز افشا نہیں کیا۔ غالباً قوی امکان ہے کہ اس میں جگہ جگہ پر جو حقیقت بیانی کا عنصر ہے وہ ملا عبدالقادر کے نزدیک مصلحت اندیشی اور دور بینی کے نظریے سے پوشیدہ رکھنا ہی زیادہ مناسب رہا ہوگا۔ مگر جب عہد جہانگیری میں اس تاریخ کا شہرہ ہوا تو جہانگیر نے ملا عبدالقادر بدایونی کے بچوں کو بلا کر عتاب کیا اور باز پرس کی تو انھوں نے کہا کہ ہم تو چھوٹے اور نا سمجھ تھے۔ ہمیں اس کا کیا علم ہو سکتا ہے۔ مزید ان بچوں نے ایک مچلکہ لکھ کر جہانگیر کو دیا تھا کہ اگر یہ ہمارے پاس پائی گئی تو ہم سزا کے مستحق ہوں گے۔ منتخب التواریخ کا ماخذ مرزا نظام الدین احمد کی تاریخ ہے اور آخر کے دو سالوں کے حالات کو ملا عبدالقادر بدایونی نے خود جمع کیا ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی کو میر سید مہدی جونپوری کے داماد شیخ ابوالفتح گجراتی سے یک گونہ محبت و عقیدت کے باعث کچھ حضرات ملا عبدالقادر بدایونی پر مہدوی ہونے کا بھی الزام عائد کرتے ہیں۔

یہ امر بھی لائق توجہ ہے کہ عہد اکبری کے واقعات اور معاملات کو صحیح زاویہ نگاہ سے

سمجھنے اور کوئی رائے قائم کرنے کے لیے جہاں اکبر نامہ از حد ضروری ہے وہیں منتخب التواریخ کے اندراجات کو بھی "دیوانے کی بڑ" کہہ کر خارج نہیں کیا جا سکتا ہے۔

مترجم کوئی مورخ نہیں ہے جو منتخب التواریخ کی تاریخی اہمیت اور خصوصیات پر رائے زنی کرے، البتہ فارسی زبان و ادب کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے یہ کہہ سکتا ہے کہ جہاں تک اکبرنامے کا تعلق ہے تو ہمیں معلوم ہے کہ ابوالفضل کی تاریخ کو سرکاری اور درباری تاریخ کا درجہ ملا ہوا تھا۔ اس لیے اکبر بذات خود ابوالفضل کے اندراجات کو پڑھوا کر سنتا تھا اور حسب مرضی اس میں رد و بدل بھی کیا جاتا تھا اس لیے کسی حد تک اکبر نامہ کو ہم ایک ایسی تاریخ کہہ سکتے ہیں جس میں بادشاہ وقت کی رائے اور مرضی و مزاج کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ جب کہ ملا عبدالقادر بدایونی کی تاریخ غیر سرکاری اور شخصی و ذاتی نوعیت کی تاریخ ہے جس میں ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ کو دخل نہیں ہے۔ اسی لیے اس میں اگر بدایونی کو کسی بات سے اختلاف ہے تو شدید تنقید دیکھنے کو ملتی ہے جب کہ ابوالفضل کی تاریخ میں اس نوعیت کے اندراجات نہیں ہیں اور جو شاید ہو بھی نہیں سکتے تھے۔ اسی لیے ہمیں عہد اکبری کے معاملات کو معروضی طریقے سے درک و استفہام کے لیے جہاں اکبرنامہ کی ضرورت ہے وہیں منتخب التواریخ بھی اہم اور نہایت لازمی محسوس ہوتی ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے وہ باتیں جنھیں ملا عبدالقادر بدیونی برملا نہیں کہہ سکتے تھے اسے انھوں نے خاتمہ میں نہایت اچھے پیرائے میں یوں بیان کر دیا ہے جو منتخب التواریخ کی سبب تالیف بھی کہی جا سکتی ہے۔ ملا رقم طراز ہیں:

"میرے اس سودائی قلم نے دیوانہ وار ہر آشنا اور بیگانے کے دامن کو تھامنے کی کوشش کی ہے اور اپنے جنون کے ہر قطرے کو صفحۂ قرطاس پر ثبت کر دیا ہے نہ معلوم میرے بعد آنے والے اس نقش زاغ پا کو دیکھ کر کیا کہتے اور اسے پڑھ کر کیا رائے قائم کرتے ہیں؟ بہر حال مجھے ڈر ہے کہ میرے ساتھ بھی لوگ وہی سلوک کریں گے جو میں نے دوسروں کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن مجھے توقع ہے کہ نکتہ شناس اس بات کو نظر انداز نہیں کریں گے کہ میری یہ ساری آفرین اور نفرین شرع مبین کی حمایت اور دین متین کی

طرفداری میں ہے۔

ارباب تصنیف و تالیف کا یہ وطیرہ ہے کہ وہ اپنی اچھی بری کاوشوں کو قلم بند کر کے اہل زمانہ پر بڑا احسان جتا کر کسی نہ کسی کے نام اپنی تصنیف و تالیف کو منسوب کر کے اغراض و منافع کا راستہ نکال لیتے ہیں۔ میں اس روش کے خلاف کسی بھی طمع اور توقع کے بغیر اپنے پیچھے آنے والوں کے لیے ایک ہدیہ چھوڑنا چاہتا ہوں تا کہ وہ لوگ جو ہمارے زمانے کے حالات وحقائق کے طالب ہوں، اس سے استفادہ کر سکیں۔

اس انتخاب کی ترتیب کا اصلی سبب بھی یہی ہے کہ اس زمانہ میں احکام دین میں جس طرح تغیر وتبدل کیا جا رہا ہے اس کی گذشتہ ہزار سالوں میں کوئی مثال نہیں ملتی ہے۔ چنانچہ ہر وہ املاء و انشا کرنے والا جو دو کلمے جوڑ لینے کی صلاحیت رکھتا ہے صاحبان اقتدار کی خوشامد یا دین سے ناواقفیت یا اصل حالات سے لاعلمی کی بنیاد پر یا دوسرے فاسد اغراض کی خاطر حق پوشی سے کام لینے لگا ہے اور دین کو دنیا کے عوض فروخت کرنے، باطل کو حق بنا کر پیش کرنے اور کفریات اور حشویات کو خیرات وحسنات جتلانے میں بھی اسے ذرہ برابر خوف نہیں ہوتا۔ مجھے یقین ہے کہ مستقبل کے لوگ اگر ان باطل خرافات اور حشویات کو دیکھیں گے تو بڑے تذبذب اور تردد میں پڑ جائیں گے۔ اس لیے میں جو کہ اس گورکھ دھندے میں مبتلا رہا ہوں، ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنے مشاہدات اور روایات کو جو آنکھوں دیکھے حقائق ہیں، ظن وتخمین کا نتیجہ نہیں، مزید اہل اسلام پر میری اس خدمت کا حق ثابت ہو جائے۔"

ظاہر ہے یہ سب بیانات ملا عبدالقادر بدایونی کی مصلحت کوشی، دور بینی اور دور اندیشی کی طرف واضح اور مثبت اشارے ہیں اور یہی منتخب التواریخ کی سب سے اہم اور جداگانہ اہمیت بھی ہے۔

اس ترجمے میں مترجم نے یہ خیال رکھا ہے کہ ہر باب کے اختتام پر ہی حواشی ثبت کر دیے جائیں جس سے قارئین کو کتاب کے آخر میں رجوع کرنے کی زحمت سے بچایا جا سکے۔

مترجم اپنی بے بضاعتی اور کم مایگی سے بخوبی آشنا ہے۔ اس ترجمے میں کئی جگہ اشتباہات اور کمیاں ضرور رہ پا گئی ہوں گی۔ مزید برآں مترجم کی خواہش تھی کہ اس ترجمے کے ساتھ ساتھ اس ترجمے کے آخر میں اشاریہ کتب، اشخاص اور اماکن بھی درج ہو جاتا مگر چونکہ ترجمہ پہلے ہی خاصا وقت لے چکا ہے اس لیے عملی طور پر اس کی گنجائش نہیں۔ مگر اس سے کتاب کی اہمیت اور افادیت میں اضافہ ضرور ہوتا ہے۔ ممکن ہے دوسری اشاعت میں اس کام کو انجام دیا جا سکے۔ مزید اس کمی کو تفصیلی فہرست فراہم کر کے پر کرنے کی کوشش کی جاری ہے۔ بہر حال جو بھی ہو سکا وہ پیش خدمت ہے۔ مترجم کی دلی خواہش ہے کہ صاحب علم و نظر اس ترجمے میں واقع کمیوں اور اشتباہات سے مترجم کو آگاہ فرمائیں گے تاکہ بعد میں اگر ممکن ہو تو اس کی اصلاح کی جا سکے۔

آخر میں مترجم پر لازم ہے کہ وہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے ارباب حل و عقد کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرے۔ سب سے پہلے ادارہ ہذا کے ڈائریکٹر جناب ڈاکٹر علی جاوید صاحب میرے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں جن کی ڈائریکٹر شپ میں فارسی کی ایک اہم تاریخی کتاب کا اردو ترجمہ شائع ہو رہا ہے۔ نیز محترمہ مسرت جہاں صاحبہ ریسرچ اسسٹنٹ کا شکریہ ادا کرنا بھی اس لئے لازمی ہے کہ ان کی انتھک کوششوں سے یہ کتاب منظر عام پر آ رہی ہے۔

8/ستمبر 2007ء

علیم اشرف خاں
ریڈر، شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی
دہلی 110007

سبب تصنیف منتخب التواریخ

فن تاریخ کی اہمیت

حمد و نعت کے بعد اس بات کی توضیح ضروری معلوم ہوتی ہے کہ تاریخ ایک باوقعت علم اور لطیف فن کا نام ہے جو صاحبان علم و خبر کے لیے سرمایۂ عبرت اور وارثان خرد و ہوش کے لیے ایک دورس تجربے کا کام دیتا ہے۔ چنانچہ ارباب قلم نے ابتدائے آفرینش سے زمانۂ حال تک اس فن کے لیے زحمتیں برداشت کیں اور معتبر تصانیف اور مبسوط کتابیں وہ اپنی یادگار چھوڑ گئے۔ یہ علمی ذخیرہ فن تاریخ کی اہمیت اور فضیلت پر معقول دلائل فراہم کرتا ہے۔

مطالعۂ تاریخ کے سلسلے میں ہم ان لوگوں کو کوئی اہمیت نہیں دینا چاہتے جو عقیدے کے کمزور اور شکوک و اوہام کے شکار ہیں اور جن کے متعلق یہ اندیشہ رہتا ہے کہ وہ تاریخ کے مطالعے سے کتاب و سنت کی سیدھی راہ سے منحرف ہو جائیں گے۔ ایسے لوگ جو فطرتاً بے دینی کی طرف میلان رکھتے ہیں، تاریخ ہی کیا خود کلام الٰہی کا مطالعہ بھی ان کو ابدی شقاوت میں مبتلا کر دیتا ہے حالانکہ کلام پاک شفا اور رحمت ہے۔

"وانہ لم یھتدوا فیقولون ھذا افک قدیم"

ہمارا خطاب تو ان لوگوں سے ہے جو سلامتی طبع، حرمت ذہن اور شیوۂ انصاف سے مالا مال ہیں، جو لوگ منکر شرع ہیں، ہماری نگاہ میں وہ نہ تو قابل اعتبار ہیں نہ اہل بصیرت۔

امام بخاری اور قاضی بیضاوی سے لے کر اب تک کے اکثر علمائے حدیث و تفسیر اس علم کی تحریر و تدوین میں برابر دلچسپی رکھتے آئے ہیں اور انکے قول و عمل کو مشرق سے مغرب تک امت کے تمام گروہوں میں مستند تسلیم کیا گیا ہے، البتہ ایک مختصر سا گروہ ان بدعت پسند اشخاص کا ضرور رہا ہے جس نے اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے حقائق و واقعات میں تحریف و تخلیط سے کام لیا اور واقعات کی صحیح توجیہ اور تاویل کے بجائے ان کی نظر ہمیشہ صحابہ کرام کی معاصرانہ چشمک زنی پر رہی اور وہ صحابہ کے اس اختلاف کو بھی اپنے اختلافات پر محمول کر کے سادہ لوح اشخاص کے بہکانے اور اپنی دنیا بنانے کی فکر میں لگے رہے، یہ مشہور ہے:

اگر کوا کسی قوم کی رہبری کرنے لگے تو اس قوم کا ہلاک ہو جانا یقینی ہے" وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے نور یقین سے سرفراز کیا ہے اور توفیق الٰہی ان کے ہمراہ رہتی ہے، اب عالم کون و فساد میں رونما ہونے والے ہر سانحے اور حادثے کو صانع قدرت کی حکمت و قدرت کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اگر ہم نظر تحقیق سے کام لیں تو یہ بات چھپی نہیں رہتی کہ یہ دنیا بذات خود ایک قدیم صحیفہ ہے جس کا آغاز و انجام ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے لیکن اس کا ہر ورق افراد انسانی پر گزرنے والے احوال و حوادثات کا مرقع اور ان لوگوں کے کارناموں کا مجموعہ ہے جن کے ہاتھوں میں مخلوق خدا کی باگ ڈور رہی ہے۔

منتخب التواریخ کس طرح لکھی گئی؟

علم تاریخ کی اسی اہمیت کے پیش نظر راقم سطور، داعی اسلام عبد القادر بن ملوک شاہ بدایونی نے کشمیر کی تاریخ کے انتخاب سے فارغ ہونے کے بعد شاہان دہلی کا تذکرہ لکھنے کا ارادہ کیا۔ واضح رہے کہ کشمیر کی تاریخ کو اکبر بادشاہ کے حکم پر ہندوستان کے ایک فاضل شخص نے ہندی سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ ہندوستان کی تاریخ لکھنے کا مجھے ایک زمانے سے خیال تھا اور میں چاہتا تھا کہ ابتدائے اسلام سے اس زمانے تک کے حالات اختصار کے ساتھ ضبط تحریر میں آجائیں تاکہ ایک ایسا تاریخی مجموعہ بن جائے جس میں ہر بادشاہ کا اجمالاً تذکرہ ہو جو صاحبان علم کے لیے ایک "اشاریہ" کا کام دے سکے۔ میری آرزو تو بس

یہی ہے کہ اس کے مطالعہ سے پڑھنے والے عبرت حاصل کریں اور ان کی نگاہیں اس سرائے فانی کے آئینے میں عالم ملکوت کی جھلک کو دیکھنے کے قابل ہو جائیں۔

لیکن بد قسمتی سے میں اپنی مالی الجھنوں اور احباب و اقارب سے جدائی کے باعث ایسا پریشان رہا کہ یہ کام برابر التوا میں رہا یہاں تک کہ ایک مخیّر دولت مند نے جس کو میرے ساتھ تعلق خاص تھا اور مجھے بھی اس سے وابستگی تھی، تاریخ نظامی کی تصنیف میں جو ایک ضخیم کتاب ہے دلچسپی لی۔ افسوس کہ اس مخلص دوست کا جلدی ہی انتقال ہو گیا۔ اسی زمانے میں مجھے کچھ سکون و یکسوئی حاصل ہوئی اور مذکورہ ارادہ از سر نو تازہ ہو گیا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر اس اہم کام کو شروع کر دیا۔

مصنف کے ماخذ

پیش نظر تاریخ کی ترتیب و تدوین کے لیے میں نے شاہان ہند کے کچھ حالات تو تاریخ مبارک شاہی اور نظام التواریخ نظامی سے لیے ہیں اور کچھ اپنی معلومات کی بنا پر اضافے کیے ہیں۔ ان حالات کو لکھتے ہوئے میں (مؤلف منتخب التواریخ) نے نہایت اختصار سے کام لیا اور عبارتی تکلفات اور استعارہ بازی میں اپنے قلم کو الجھنے نہیں دیا۔ اس مجموعے کا نام منتخب التواریخ رکھا گیا ہے۔ امید ہے کہ یہ تالیف جو صرف شاہان اسلام کے بقائے نام اور دنیا میں اپنی ایک یادگار چھوڑ جانے کے خیال سے مرتب کی گئی ہے، مؤلف کی مغفرت کا ذریعہ ثابت ہوگی۔

میری تمام تحریر تو راست بیانی پر مرکوز ہے پھر بھی اگر مجھ سے کوئی سہو ہو گیا ہو تو میں اللہ تعالیٰ سے معافی کا امیدوار ہوں:

بہ بدگفتن زبان من مگردان
زبان من ریان من مگردان

جلال الدین محمد اکبر بادشاہ

تخت نشینی

جلال الدین محمد اکبر بادشاہ بیرم خان خانخاناں کے مشورے اور تائید سے ماہ ربیع الاول کی دوسری تاریخ[1] 963ھ/1555ء میں باغ کلانور میں تخت نشین ہوا اور سرحد کے امراء کو اس نے تسلی آمیز فرامین بھیجے۔ دہلی میں بھی اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ اکبر کی تاریخ جلوس "از ہمہ شہزادہا اشرف" سے نکلتی ہے ایک اور تاریخ ہے:

جلال الدین محمد اکبر آن شہزادۂ دوران   بتاریخ پدری گفت شاہنشاہ دورانم

"کام بخش" بھی اس کے جلوس کا مادۂ تاریخ ہے۔

تخت نشینی سے پہلے ہی بیرم خان نے پیر محمد خاں شروانی کو جو ایک لشکر لے کر سکندر کا تعاقب کرتا ہوا سوالک کی پہاڑی میں موضع دھمیری تک پہنچ گیا تھا، کسی نہ کسی طرح بہانے بنا کر واپس بلالیا۔ غرض یہ تھی کہ ہمایوں کے مرنے کی خبر مشہور نہ ہونے پائے۔

ابو المعالی کی سرکشی

تخت نشینی کے موقعے پر امرائے دربار نے ابو المعالی کو بھی شرکت کے لیے بلایا، اس نے کہلوادیا کہ مجھے اس وقت کچھ پریشانی ہے اس لیے میں حاضر نہیں ہوسکتا۔ دوبارہ کہلوایا گیا

کہ ایک خاص مشورہ درپیش ہے اور اس میں تمہاری رائے نہایت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اس مرتبہ بھی اس نے عذر معذرت کی اور کچھ ایسے مطالبات کیے جن کا پورا کرنا محال تھا۔ مصلحت وقت کے پیش نظر بیرم خان نے اس کے تمام مطالبے قبول کر لیے، لیکن جب وہ دربار میں آیا تو بیرم خان کے اشارے سے تولک خان قورچی نے جو ایک طاقتور پہلوان تھا اسے پیچھے سے جکڑ لیا۔ وہ اسے جان سے ہی مار ڈالتا لیکن اکبر نے یہ کہہ کر کہ "پہلے ہی دن کسی بے گناہ کا خون مناسب نہیں"۔ اس کی جان بچائی البتہ اسے قید کر کے لاہور بھیج دیا۔

بیرم خان کا قصیدہ

ابو المعالی کاشغر کا رہنے والا اور سیدزادہ تھا۔ نہایت بہادر اور خوب صورت شخص تھا۔ اس سے ہمایوں کو بڑی محبت تھی چنانچہ اسے وہ اپنا بیٹا کہا کرتا تھا۔ بیرم خان نے صنعت توشیح میں ایک قصیدہ کہا تھا جس کا قافیہ عظیم اور قدیم تھا۔ اس قصیدے میں چوبیس شعر تھے۔ خوبی یہ تھی کہ ہر شعر کے اول مصرعے کا ایک ایک حرف لیا جائے تو اس سے 'حضرت محمد ہمایوں بادشاہ' بن جاتا تھا اور اگر ہر شعر کے دوسرے مصرعے کا ایک ایک حرف لیں تو "شاہزادہ جلال الدین محمد اکبر" نکلتا تھا۔ ہر شعر کے اول مصرعے کا آخری حرف جمع کر لیں تو "میرزا شاہ ابو المعالی" کا نام بن جاتا ہے۔ اگر اس کے قافیے کے سارے "میم" جمع کر لیے جائیں تو 961ھ / 1553ء یعنی قصیدے کو نظم کرنے کی تاریخ نکل آتی ہے۔

ابو المعالی کی جان بخشی

ابو المعالی کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ جس زمانے میں ہمایوں دوسری مرتبہ قندھار آیا ہوا تھا، ابو المعالی نے نشے کی حالت میں ایک خطیب کو قتل کر دیا۔ مقتول کے وارثوں نے بادشاہ کے پاس دعویٰ کیا۔ ہمایوں نے ابو المعالی کو طلب کیا۔ ابو المعالی نے سیاہ مخمل کی پوشاک زیب تن کر رکھی تھی جس کا استر سرخ تھا اور وہ تلوار جس سے اس نے قتل کیا تھا دامن میں چھپا رکھی تھی۔ مستی میں جھومتا ہوا دربار میں حاضر ہوا اور اس جرم سے صاف انکار کر دیا۔ 3

بیرم خان نے اسی وقت یہ شعر پڑھا:

نشان شب روان دارد سر زلف پریشانش
دلیل روشن ایک چراغ زیر داما نش

ہمایوں کو یہ شعر بہت پسند آیا۔ جرم چونکہ بخوبی ثابت نہیں ہو سکا اس لیے ابو المعالی کی جان بچ گئی اور بیچارے مقتول کا خون رائیگاں گیا۔

ابو المعالی کا فرار

ابو المعالی لاہور کے قید خانے سے بھاگ کر کمال خان گھکر کے پاس چلا گیا۔ وہ علاقہ اس زمانے میں کمال خان کے چچا آدم گھکر کے قبضے میں تھا۔ اس نے ابو المعالی کی بڑی آؤ بھگت کی اور ایک بڑی فوج تیار کر کے کشمیر کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔

ابو المعالی یہ فوج لے کر گیا۔ 965ھ/1557ء میں کشمیر کے حاکم غازی خان چک سے اس کا مقابلہ ہوا جس میں ابو المعالی بھیس بدل کر دیپالپور چلا گیا اور وہاں بہادر خان کے ایک افسر تولک نامی کے پاس پناہ لی۔ تولک نے اسے اپنے گھر میں چھپایا اور دونوں مل کر بغاوت کی سازش کر رہے تھے۔ بہادر خان اسی وقت سوار ہو کر آیا، تولک کو قتل کر دیا اور ابو المعالی کو گرفتار کر کے بیرم خان کے پاس بھیج دیا۔ بیرم خان نے ابو المعالی کو ولی بیگ ترکمان کی تحویل میں بھکر روانہ کر دیا۔ ولی بیگ راستے میں اس کو ایذا دیتا رہا اور وہاں سے گجرات روانہ کر دیا وہ علی قلی خان کے پاس بھاگ کر چلا گیا۔ بیرم خان نے علی قلی خاں کو فرمان بھیجا کہ ابو المعالی آگرہ پہنچ گیا تو خود بیرم خاں کے بعض قضیے پیدا ہو گئے اور اکبر اس سے بدگمان ہو گیا۔ بیرم خان نے بادشاہ کی بدگمانی رفع کرنے کے لیے ابو المعالی کو چند روز بیانہ کے قلعے میں قید کر دیا اور جب خود حج کے ارادے سے روانہ ہوا تو اسے بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ مگر کچھ دن بعد ہی ابو المعالی اس کا ساتھ چھوڑ کر اکبر کے پاس لوٹ آیا لیکن غرور و تکبر کی وجہ سے اس نے گھوڑے پر بیٹھے ہی بیٹھے بادشاہ سے ملاقات کی۔ یہ بات اکبر کو بڑی ناگوار گزری اور اس نے ابو المعالی کو دوبارہ قید کر دیا۔

سکندر سے مقابلہ

تخت نشینی کے بعد جب حکومت کا نظام بخوبی ترتیب پا گیا تو اکبر نے سکندر کے مقابلے پر پہاڑوں پر ایک فوج روانہ کی۔ سکندر اس فوج سے تین ماہ تک برابر لڑتا رہا، آخر شکست کھا کر مغلوب ہوگیا۔ انھی دنوں نگر کوٹ سے راجہ رام چندر، بادشاہ کی ملازمت میں حاضر ہوا۔

اکبر نے برسات کا موسم گزارنے کے بعد جالندھر کی طرف کوچ کیا اور وہاں پانچ ماہ تک مقیم رہا۔ جس وقت دہلی کے حاکم تردی بیگ خان کو ہمایوں کی وفات اور اکبر کے جلوس کی خبر ملی تو اس نے کامران کے بیٹے میرزا ابوالقاسم کو شاہی اسباب و لوازمات اور بہترین ہاتھی دے کر خواجہ سلطان علی وزیر خان اور اشرف خان میر منشی کے ہمراہ بادشاہ کے حضور میں روانہ کر دیا تھا۔

اسی سال مرزا سلیمان نے ابراہیم مرزا کے ساتھ کابل کو فتح کرنے کا عزم کیا۔ قلعہ کابل میں منعم خان محصور ہوگیا۔ اس نے اس حملے کی اطلاع کے لیے اکبر کے پاس متعدد عرضیاں بھیجیں۔ اکبر نے محمد قلی خان برلاس، اتکہ خان اور خضر خان ہزارہ کو بادشاہ بیگم اور دوسری بیگمات کو لانے کے لیے کابل روانہ کیا۔ ابھی یہ لوگ وہاں پہنچے نہ تھے کہ مرزا سلیمان نے قاضی نظام بدخشی کو جو ایک بڑے عالم تھے اور بعد میں انھیں قاضی کا خطاب ملا تھا اپنا سفیر بنا کر منعم خان کے پاس بھیجا اور صلح کے لیے یہ شرط پیش کی کہ منعم خان صرف ایک بار خطبے میں اس کا نام پڑھے۔ منعم خان نے مصلحتاً اس شرط کو قبول کر لیا اور مرزا سلیمان بھی اتنی بات پر خوش ہو کر بدخشاں کو واپس چلا گیا۔

پٹھانوں سے مقابلہ

جلوس کے پہلے ہی سال علی قلی خان کو خان زمان کا خطاب عطا ہوا اور اس نے سنبھل پر فوج کشی کر کے عدلی کے ایک امیر شادی خان پٹھان سے مقابلہ کیا۔ دونوں کے درمیان رہب ندی کے کنارے سخت لڑائی ہوئی جس میں خان زمان کو شکست ہوئی۔ وہ از سرِ نو جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھا کہ دہلی اٹاوہ اور آگرے سے اس کے نام خطوط آئے کہ

عدلی کی طرف سے ہیمو بقال ایک بڑی فوج لے کر یلغار کر رہا ہے اور اکثر علاقے فتح کر کے وہ دہلی کے قریب پہنچ چکا ہے۔

ہیمو کے حملے کی خبر سنتے ہی آگرہ سے سکندر خان ازبک، اٹاوہ سے قیا خان گنگ، کالپی سے عبداللہ خان ازبک، بیانہ سے حیدر محمد خان اور بقیہ تمام امیر بھی اپنے اپنے علاقوں سے کوچ کر کے دہلی میں تردی بیگ خان کے پاس جمع ہو گئے۔ خان زمان کو جمنا کے دوسرے کنارے پر ہی ٹھہر جانا پڑا، اور وہ دہلی نہ پہنچ سکا۔

ہیمو بقال کا دہلی پر قبضہ

ہیمو سے مغل لشکر کا یہ مقابلہ تغلق آباد کے قریب ہوا۔ مغلوں کی کمان عبداللہ خان ازبک اور لعل خان بدخشی کے ہاتھ تھی۔ انھوں نے تیزی کے ساتھ ہیمو کی فوج پر حملہ کیا اسے پسپا کر کے ہوڈل اور پلول کے قصبوں تک اس کا تعاقب کیا اور کافی مال غنیمت اس سے چھین لیا۔

اس موقع پر ہیمو بہت سے ساتھیوں سمیت اپنے لشکر سے کٹ گیا تھا، اس نازک وقت میں اسے دور کی سوجھی اس نے مغلوں کو ستانے کے لیے یہ افواہ اڑائی کہ اس کی مدد کے لیے الور سے حاجی خان بڑی فوج لے کر آپہنچا ہے اور اسی وقت اچانک تردی بیگ خان پر حملہ کر دیا۔ اس وقت تردی بیگ خان کے پاس تھوڑی سی جمعیت تھی اس لیے ایک ہی حملہ میں ہیمو نے تردی بیگ خان کو شکست دے کر بھگا دیا۔ لیکن اس ڈر سے ان کا تعاقب نہیں کیا کہ کہیں مغل دھوکہ دے کر دوبارہ پلٹ نہ پڑیں۔ مغلوں کے وہ امیر جو ہیمو کے میمنہ کے تعاقب میں دور تک نکل گئے تھے جب شام کے وقت لوٹ کر آئے تو انھیں بڑی حیرت ہوئی کیونکہ ان کے چھوڑے ہوئے مورچوں پر ہیمو کی فوج قبضہ کیے ہوئے نظر آ رہی تھی۔ یہ رنگ دیکھ کر وہ آہستہ آہستہ دہلی سے نکل کر بھاگ گئے۔ خان زمان بھی میرٹھ کے راستے کوچ کر کے ان لوگوں سے سرہند میں آکر مل گیا۔

جب اکبر کو دہلی کی شکست کا حال معلوم ہوا تو اس نے سکندر کے مقابلے کے لیے خضر خان خواجہ کو مقرر کیا۔ اکبر کی پھوپھی گلبدن بیگم اسی خضر خان کے نکاح میں تھی اور خود

ہیمو کی سرکوبی کے لیے دہلی کی طرف کوچ کر دیا۔ جس وقت اس نے سرہند میں قیام کیا تو ہیمو سے شکست کھا کر آنے والے امیر شاہی لشکر سے آکر مل گئے۔

تردی بیگ کا قتل

خانخاناں بیرم خان کو تردی بیگ خان سے سابقہ رنجش تھی اور وہ اسے دکھاوے کے لیے ''طوقان'' (بڑا بھائی) کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ اسے موقع ملا تو اس نے اکبر کو یہ یاد دلایا کہ اس شکست کا ذمہ دار تردی بیگ ہے۔ تصدیق کے لیے خان زمان اور دوسرے امیروں سے شہادت بھی دلوادی اور بادشاہ کو مجبور کر کے اس کے قتل کی اجازت لے لی، پھر سیر کے بہانے تردی بیگ خان کے کیمپ میں جا کر اس کو اپنے خیمے میں بلا لایا۔ جب مغرب کا وقت ہوا تو طہارت کا بہانہ کر کے وہاں سے نکل گیا اور اپنے آدمیوں کو جنھیں اس نے اس غرض سے پہلے ہی تیار کر رکھا تھا، اشارہ کر دیا ان لوگوں نے خیمے میں داخل ہو کر تردی بیگ کو قتل کر دیا۔ قتل کے دوسرے دن خانخاناں دربار میں حاضر نہ ہوا۔ اس نے اسی الزام میں تردی بیگ کے داماد خنجر بیگ اور خواجہ سلطان علی میر منشی کو بھی گرفتار کر لیا تھا لیکن یہ لوگ کچھ دن بعد رہا ہو گئے تھے۔

پانی پت میں فوجوں کی آمد

اس عرصہ میں ہیمو نے دہلی میں بڑی قوت پیدا کر لی اور اپنا خطاب راجہ بکر ماجیت رکھ کر خود مختار حکمراں بن بیٹھا۔ اسلامی قوانین کو منسوخ کر دیا۔ جب اسے اکبر کے کوچ کی اطلاع ملی تو ایک ہزار پانچ سو جنگی ہاتھی کافی مال و دولت اور کثیر لشکر لے کر پانی پت پہنچ گیا۔ اس کا توپ خانہ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی میدان میں آچکا تھا۔ ادھر اکبر کے بھی چند امیر خان زمان، اسکندر خان وغیرہ بھی لشکر سے آگے نکل کر پانی پت پہنچ چکے تھے انھوں نے پہل کر کے ہیمو کے ہراول پر حملہ کر دیا اور تھوڑی سی لڑائی کے بعد اس کا توپ خانہ چھین لیا۔

ہیمو نے اپنے لشکر کے پٹھانوں کو جن کا سردار شادی خان میواتی تھا مناصب اور جاگیروں میں اضافے کا لالچ دے کر اور ان کو کافی روپیہ اور انعام واکرام دے کر اپنے ساتھ لگا رکھا تھا، لیکن یہ پٹھان ہیمو کی حرکتوں سے سخت بیزار ہو چکے تھے اور دل سے اس کی شکست اور بربادی کے خواہاں تھے۔ بہر حال ہیمو اپنی کثیر فوج کو لے کر ہوائی نامی ایک ہاتھی پر سوار ہوا اور راتوں رات کوچ کرتے ہوئے پانی پت پیچھے چھوڑ کر موضع کھرسندہ میں جا کر پڑاؤ ڈال دیا۔

پانی پت کی دوسری لڑائی

دس محرم 964ھ / 1556ء جمعہ کے دن صبح خان زمان اور سکندر خان ہراول کے امیروں سے اس کا مقابلہ ہوا۔ اکبر بھی شاہی لشکر کے ساتھ معرکہ گاہ سے تین کوس کے فاصلے پر پہنچ چکا تھا اور وہاں سے لشکر کے امراء کو مدد کر رہا تھا۔ ہیمو کے ساتھ جو امیر تھے وہ سب کے سب اس سے برہم اور بددل ہو چکے تھے۔ ان کے اس رویہ کی وجہ سے ہیمو صرف ہاتھیوں کی لڑائی پر بھروسہ کیے ہوا تھا، چنانچہ اس نے پہلے حملے ہی میں ہاتھیوں کا ایک بڑا غول لے کر اکبری فوج پر حملہ کر دیا یہ حملہ بڑا سخت اور ہولناک تھا شاہی لشکر میں افراتفری سی پھیل گئی، لیکن جلد ہی اکبر کے امیروں نے اپنی اپنی صفوں کو سنبھال کر منظم طریقے سے تیروں کی بوچھار کر دی اور ہیمو کے ہاتھی بوکھلا گئے۔ اسی حملے میں جب ہیمو فوری طور پر کامیاب نہ ہو سکا تو اس نے اپنا رخ بدل دیا اور ہاتھیوں کو دوسرے حملے پر جہاں خان زمان کمانددار تھا، بھیجا دیا۔ خان زمان نے بھی اس کی ہاتھی سوار فوج کو تیروں کی زد پر رکھ لیا۔ اس موقعے پر ہیمو باؤلے کتے کی طرح ادھر اُدھر دوڑ رہا تھا اور چلا رہا تھا کبھی کچھ منتر پڑھنے لگتا اور کبھی مارو مارو کا غل مچانے لگ جاتا تھا۔ اسی دوران ایک تیر ایسا آ کر لگا کہ وہ بیہوش ہو کر گر پڑا اور اس کی فوج بدحواس ہو کر منتشر ہو گئی۔ شادی خان میواتی بھی اس معرکہ میں مارا گیا۔

مغل فوج کی کامیابی

ھیمو کی فوج کے پسپا ہوتے ہی شاہ قلی خان محرم یلغار کرتا ہوا ہیمو کے ہاتھی پر حملہ آور ہوا۔ فیل بان نے کہا مجھے مار کر کیا کرو گے، تمہارا دشمن ہیمو اسی ہاتھی پر عماری میں پڑا ہوا ہے۔ اُسی بے ہوشی کی حالت میں ہیمو کو گرفتار کر کے اکبر کے پاس پیش کیا گیا۔ شیخ گدائی کنبوہ اور دوسرے امرا نے عرض کیا" چونکہ یہ حضور کا پہلا جہاد ہے اس لیے آپ بھی اس پر اپنی تلوار آزمائیں" اکبر نے ان کو جواب دیا" یہ مردہ پڑا ہوا ہے اگر اس میں کچھ جان ہوتی تو میں تلوار آزماتا"۔ آخر خانخاناں نے سب سے پہلے ہیمو پر تلوار چلائی۔ اس کے بعد شیخ گدائی نے پھر دوسروں نے بھی اس فرض کو ادا کیا اور اس بد بخت کی لاش کے چیتھڑے اڑ گئے۔

اکبری فوج کو پانی پت کی اس فتح کے نتیجے میں ایک ہزار پانچ سو ہاتھی اور بے شمار خزانہ اور کافی مال و اسباب غنیمت میں ملا۔ ہیمو نے شکست کھائی اور فوج کے تعاقب میں پیر محمد خان اور مہدی قاسم خان کا داماد حسین خان روانہ ہوئے ہیمو کی بیوی ایک بڑا خزانہ ہاتھیوں پر لدوا کر پہلے ہی نکل بھاگی تھی۔ پیچھا کرنے والے دستوں نے اس کو الور کے آگے جا کر گھیر لیا اور وہ خزانہ چھوڑ کر بجوارہ اور کوہ کی پہاڑی میں جان بچا کر بھاگ گئی۔ اس کا خزانہ کچھ تو جاٹوں نے لوٹ لیا اور کچھ مغل لشکریوں کے ہاتھ آیا۔ پھر بھی وہ اتنا تھا کہ سپاہیوں نے ڈھالوں میں بھر بھر کر اس کو بانٹ لیا۔ جس راستے سے ہیمو کی بیوی گزری تھی اس پر اشرفیاں اور سونے کی اینٹیں اتنی گری تھیں کہ ایک عرصے تک وہ راہ گیروں کو ملتی رہیں۔ یہ وہ خزانہ تھا جو شیر شاہ کے زمانے سے عدلی کے عہد تک جمع ہوتا رہا تھا زمانے کے ہاتھوں وہ اس طرح تباہ و تاراج ہوا۔

فتح کے دوسرے دن اکبر پانی پت پہنچا اور وہاں فتح کی خوشی میں پھولوں کا ایک مینار لگوایا۔ پھر وہاں سے کوچ کر کے بڑے جاہ و حشم کے ساتھ دہلی میں داخل ہوا منبر پر از سر نو اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ بادشاہ ایک مہینے تک دہلی میں مقیم رہا اور وہاں سے اس نے آگرہ اور سنبھل کی طرف امرا کو روانہ کیا۔ دہلی کے قیام ہی میں یہ خبر ملی کہ لاہور

سے بیس کوس پر موضع چھپاری میں اکبری امیر خضر خان کو سکندر نے حملہ کر کے شکست دے دی اور وہ بھاگ کر لاہور آ گیا ہے اس پر اکبر نے دوبارہ پنجاب کا رخ کیا، جب جالندھر پہنچا تو سکندر پھر کوہ سوالک کی طرف بھاگ گیا۔ اکبر نے دیسوڑہ اور دھمیری تک اس کا پیچھا کیا۔

یہ واقعات ابتدائے جلوس سے متعلق تھے۔

سکندر افغان کی اطاعت

سکندر برابر اکبر کی فوج سے برسر پیکار تھا اسی سال وہ قلعۂ مانکوٹ میں محصور ہو گیا۔ مغل لشکر روزانہ اس پر حملے کر رہا تھا۔ ان حملوں سے اس کی جان عذاب میں آ گئی تھی۔ اکبری فوج میں سے مہدی قاسم خان کے داماد محمد حسین خان نے ان معرکوں میں بڑی جاں نثاری اور بہادری کا ثبوت دیا۔ اس کا بھائی حسن بیگ بھی اسی لڑائی میں مارا گیا تھا۔ اکبر نے حسین خان کے دلیرانہ کارناموں کی بڑی قدر کی اس کو روز بروز اونچے درجوں پر ترقی ملتی رہی اور اچھی سے اچھی جاگیریں بھی اسے ملتی گئیں آخر میں لاہور کی حکومت پر اسے فائز کیا گیا۔

جب محاصرہ طویل ہو گیا اور قلعہ بند فوج غلے کی کمی کی وجہ سے بھوکوں مرنے لگی تو سکندر کے رفیق کھسکنے لگے، چنانچہ سید محمود بارہہ وغیرہ سکندر سے ٹوٹ کر اکبر سے آ کر مل گئے۔ یہ صورت حال دیکھ کر سکندر نے صلح کی سلسلہ جنبانی کی اور اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کو غازی خان سور کے ہمراہ اتکہ خان اور پیر محمد خان کو وسیلہ بنا کر بادشاہ کی خدمت میں بھیجا۔ یہ سفارت 27 رمضان 964ھ/1556ء کو بارگاہ شاہی میں باریاب ہوئی۔ اس نے بہت سے ہاتھی نذر گزارے اور قلعہ بھی سپرد کر دیا۔

اکبر نے شرائط صلح کے متعلق جو فرمان لکھوایا تھا اس کی رو سے جونپور عارضی طور پر سکندر کی جاگیر میں اس شرط پر دیا گیا تھا کہ جب وہ دوسرے اور علاقوں کو فتح کرے تو جونپور پر خان زمان اس کا قائم مقام ہو جائے گا۔ اس فرمان کے بدلے سکندر پہاڑوں کے راستے سے کوچ کرتے ہوئے جونپور پہنچ گیا۔ بعد میں جب خان زمان نے جونپور پر قبضہ کر لیا تو حسب

فرمان سکندر نے گوڑ پر لشکر کشی کی لیکن وہاں اسے ایسے حادثوں سے دوچار ہونا پڑا کہ گوڑ تو اس کے ہاتھ کیا آتا چند دن بھی نہ گزرے تھے کہ خود وہ گور کی آغوش میں چلا گیا۔ اکبر نے جس زمانے میں قلعہ مانکوٹ کا محاصرہ کر رکھا تھا محمد قلی خان اور دوسرے چند امرا کابل جا کر بادشاہ بیگم اور خانوادۂ شاہی کے دوسرے افراد و مستورات کو اپنے ساتھ لشکر میں لے آئے تھے۔

اکبر کی لاہور کو روانگی

بادشاہ نے دوسری شوال 964ھ/ 1556ء کو لاہور کا رخ کیا اسی سفر کے دوران خانخاناں اور اتکہ خان میں بدگمانی اور شکر رنجی پیدا ہوگئی۔ قصہ یہ ہوا کہ کسی منزل میں شاہی ہاتھی دوڑتے ہوئے خان خاناں کے سراپردہ پر سے گزر گیا خانخاناں کو شبہ ہوا کہ یہ حرکت اتکہ خان نے قصداً کی ہے۔ جب لشکر لاہور پہنچا تو اتکہ خان اپنے تمام بیٹوں کو لے کر خانخاناں کے پاس آیا اور کلام پاک کی قسم کھا کر اس نے اپنی بریت ظاہر کی اور خان خاناں کی بدگمانی رفع ہوگئی۔

اسی سال ملا عبداللہ سلطان پوری کے توسط سے سلطان آدم گھکڑ لاہور آ کر اکبر کے حضور میں باریاب ہوا۔ لاہور میں خانخاناں کے ساتھ اس کا بڑا یارانہ ہوگیا اور اکبر نے اس قضیے کا فیصلہ کر دیا جو سلطان آدم اور اس کے بھتیجے کمال خان کے مابین جاری تھا۔ اسی طرح سلطان آدم بڑی عزت و احترام کے ساتھ اپنے وطن کو لوٹ گیا۔

دہلی میں داخلہ

برسات کا موسم ختم ہونے پر اکبر نے دہلی کی طرف کوچ کیا۔ جالندھر میں جب قیام ہوا تو ہمایوں کی بھانجی اور میرزا نور الدین محمد کی لڑکی سلیمہ سلطان بیگم کا نکاح خان خانان بیرم خان کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے ہوا اور ایک بڑا جشن شادی کی تقریب میں منعقد کیا گیا۔ دونوں طرف سے دل کھول کر روپے لٹائے گئے۔

25 جمادی الثانی 965ھ/ 1557ء کو اکبر دہلی میں داخل ہوا۔ اس زمانہ میں خان

خانان ہر ہفتے دو مرتبہ دربار شاہی میں حاضر ہو کر دوسرے امراء کے تعاون سے مشورے اور انتظامی معاملات اور مقدمات کے فیصلے کیا کرتا تھا۔

خان زمان اور شاہم بیگ کا معاملہ

اس زمانہ میں جو واقعات پیش آئے ان میں شاہم بیگ کے ساتھ خان زمانہ کی عشق بازی کا قصہ نہایت دلچسپ ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ ہمایوں بادشاہ کے قورچیوں کے عملے میں دو خوبصورت اور خوش مزاج لڑکے شامل تھے ایک کا نام خوشحال بیگ اور دوسرے کا نام شاہم بیگ تھا۔ شاہم بیگ طہماسپ کے ساربان کا لڑکا تھا۔ یہ دونوں لڑکے نہ صرف خوش خلق و پسندیدہ اطوار تھے بلکہ دلیری اور بہادری میں بھی ہم چشموں میں امتیاز رکھتے تھے۔

اس زمانہ میں جب کہ خان زمان کا سنبھل پر تقرر نہیں ہوا تھا اسے شاہم بیگ سے بڑا تعلق خاطر پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا حال شاعر کے اس مفہوم سے مختلف نہ تھا:

نشان برتختۂ ہستی نبود از عالم و آدم
کہ جان در مکتب شوق از تمنائی تو میزد دم
کہ دارد این چنین عیشی کہ در عشق تو من دارم
شرابم خون کبابم دل ندیمم درد و فقلم غم

ہمایوں کے انتقال کے بعد جب خان زمان اکبر بادشاہ کی خدمت سے وابستہ ہوا تو اس نے شاہم بیگ سے اس بات کا قول و قرار لیا کہ وہ شاہی ملازمت ترک کر کے اس کے پاس آ جائے گا۔ چنانچہ اس نے لکھنؤ سے اپنے چند آدمی دہلی بھیجے کہ وہ شاہم بیگ کو بھگا کر لے آئیں۔

ماوراء النہر کے دوسرے عیاش امیروں کی طرح جو نوجوانوں کو شاہی مراتب کا لالچ دے کر بہار کا موسم عیش و نشاط میں گزارا کرتے ہیں۔ خان زمان بھی شاہم کی خاطر داری اور خوشامد میں لگا رہتا تھا اور اسے "بادشاہ" کہہ کر خطاب کرتا تھا۔ اس کے عشق میں اپنے آپ کو بھول گیا تھا اور اکثر اوقات اس کی رکاب پکڑ کر خدمت گاروں کی طرح اس کی

خدمت میں کھڑا رہتا تھا۔

میں (مؤلف منتخب التواریخ) نے ابو الغیث بخاری دہلوی کی زبان سے جن سے شاہم بیگ کو بڑی عقیدت تھی، یہ بھی سنا ہے کہ جس زمانہ میں شاہم بیگ لشکر شاہی سے جون پور گیا تھا، باجماعت نماز، درود خوانی اور تلاوت کلام پاک کا بڑا پابند تھا۔ ہمیشہ طہارت و پاکی کا خیال رکھتا تھا اور برائیوں کی طرف اس کا میلان نہ تھا، شاہم بیگ کی خاطر خان زمان بھی بڑا متقی اور پرہیز گار بن گیا۔ اپنے لشکر میں بھی اس نے غیر شرعی باتوں کی روک تھام کے لیے محتسبوں کا تقرر کردیا تھا اور شاہم بیگ کی تعلیم کے لیے میر سید محمد مکی کو جو سات قرأتوں کے قاری تھے، مقرر کیا تھا۔ راقم نے بھی سلیم شاہ کے عہد میں سنبھل میں مکی صاحب کے سامنے اپنی قرأت کی اصلاح کی تھی۔ غرض خان زمان اس خوبرو لڑکے کی ہر طرح خاطر داری کرتا رہتا تھا۔ لڑکوں کی پاک بازی کم سنی تک ہی رہتی ہے، شاہم بیگ کے چال چلن بھی بہت جلد بگڑ گئے۔

آرام جان

آرام جان نامی ایک حسین اور دلربا طوائف تھی۔ شاہم بیگ کا اس پر دل آگیا اور وہ بھی دل و جان سے اس نوجوان پر فریفتہ ہوگئی۔ یہ طوائف پہلے سے خان زمان کے نکاح میں تھی۔ اس نے شاہم بیگ کو جب اس کی طرف مائل پایا تو اس طوائف کو اس کے حوالے کردیا۔ شاہم بیگ نے چند دن اس کے ساتھ خوب رنگ رلیاں منائیں۔ جب جی بھر گیا تو اسے اپنے ایک جانی دوست عبدالرحمٰن بن مؤید بیگ کو بخش دیا۔

عشق بازی کے یہ قصے جب بادشاہ سلامت کے سننے میں آئے تو غیرت سلطانی جوش میں آگئی اور شاہم بیگ کی حاضری کے فرمان آگرے اور دہلی سے جونپور پہنچے۔ اس علاقہ کے جاگیرداروں کے نام بھی فرمان صادر ہوا کہ اگر خان زمان تعمیل حکم میں پس و پیش کرے تو سب مل کر اس کو سزا دیں۔

خان زمان نے اپنے ایک معتمد آدمی برج علی کو اپنے قصوروں کی تلافی کے خیال سے

دہلی روانہ کیا۔ برج علی سب سے پہلے خان خاناں کے نائب پیر محمد خان کے مکان پر گیا۔ برج علی پہنچا تو وہ ایک برج میں بیٹھا ہوا تھا۔ برج علی نے خان زمان کے پیغام سے مطلع کیا۔ غالباً باتوں باتوں میں کوئی ناگواری پیدا ہوگئی اور پیر محمد خان نے برج علی کی کسی سخت بات پر اسے اس برج سے اٹھا کر نیچے پھینک دیا۔ اس صدمہ سے وہ بے چارہ مٹی کا ڈھیر بن گیا اور اس ظالم نے سنگ دلی کے ساتھ قہقہہ لگا کر کہا "یہ کمینہ اب اسم با مسمٰی بنا ہے"

خان زمان کو جب اس حادثہ کی اطلاع ملی تو اس نے جدائی کا پتھر اپنے سینے پر رکھ کر شاہم بیگ کو سرہر پور کے پرگنے میں بھیج دیا، یہ پرگنہ جونپور سے اٹھارہ کوس پر اس کے دوست عبدالرحمٰن بیگ کی جاگیر میں تھا۔ مقصد یہ تھا کہ شاہم بیگ کچھ عرصہ تک وہاں سیر و شکار میں مصروف رہے، جب بادشاہ سلامت کا غصہ ٹھنڈا پڑے تو وہ لوٹ آئے۔

شاہم بیگ کا انجام

سرہر پور میں شاہم بیگ کی عبدالرحمٰن بیگ کے ساتھ بڑی اچھی گزر رہی تھی۔ آرام دہ و خوبصورت مکان تھا جس کے ساتھ سرسبز و شاداب باغ جو خوش منظر تالاب کے کنارے تھا۔ دونوں دوست عیش و نشاط کے جلسے مناتے رہتے تھے۔ ایک دن جب کہ شراب و کباب کی مجلس جمی ہوئی تھی:

سرود و عاشقی و می پرستی
سبب شد ہر سہ چیز بہر مستی

عالم مستی میں شاہم بیگ نے عبدالرحمٰن بیگ سے آرام جان کو بلانے کا مطالبہ کیا۔ اس نے نکاح کر لینے کا بہانہ کر کے اس کی فرمائش ٹال دی۔ اس بات سے شاہم بیگ کو بڑا رنج ہوا اور دونوں کی دوستی دیکھتے ہی دیکھتے دشمنی میں تبدیل ہوگئی اور شاہم بیگ نے غرور اور مستی کی وجہ سے آدمیوں کو حکم دیا کہ عبدالرحمٰن کو گرفتار کر لیں، پھر اس نے اس گھمنڈ میں کہ آرام جان پہلے اس کی تھی، عبدالرحمٰن کے مکان سے اپنے پاس بلوا لیا اور اس کے ساتھ خوش وقتی میں مشغول ہو گیا۔

عبد الرحمن کے چھوٹے بھائی مؤید بیگ کو اس کی اس حرکت پر بڑی غیرت آئی اور وہ ایک جمعیت لے کر اس بالاخانہ کی طرف گیا جس میں شاہم بیگ آرام جان کو ساتھ لیے ہوئے تھا۔ شاہم بیگ بھی مقابلہ کے لیے آیا۔ دونوں میں باقاعدہ جنگ چھڑ گئی شاہم بیگ کو اس نشہ کی حالت میں ایک تیر ایسا آکر لگا کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

خان زمان کی معرکہ آرائی

ان چند سالوں میں خان زمان نے باوجود مختصر جمعیت کے افغانوں کی ایک بھاری فوج سے دلیرانہ جنگ کر کے فتح حاصل کی۔ اس سلسلے کی اس نے جتنی لڑائیاں لڑیں وہ بلاشبہ اس کا ایک تاریخی کارنامہ ہے۔ انہی لڑائیوں میں سے لکھنؤ کی جنگ بھی ہے جس میں حسن خان بچگوتی بیس ہزار سپاہیوں کو لے کر حملہ آور ہوا تھا۔ خان زمان کے پاس تین چار ہزار سے زیادہ کی جمعیت نہیں تھی۔

جب غنیم نے کروتی ندی کو پار کر کے بہادر خان کی فوج پر حملہ کر دیا تو خان زمان کھانے کے لیے دسترخوان پر بیٹھ گیا۔ جب لوگوں نے آکر کہا کہ غنیم سر پر آ پہنچا ہے تو اس نے شطرنج لانے کا حکم دیا اور بڑے اطمینان سے شطرنج کھیلتا رہا۔ پھر لوگ دوڑتے ہوئے آئے اور کہا کہ دشمن نے آدمیوں کو پسپا کر دیا ہے تو اس نے ہتھیار منگائے۔ جس وقت دشمن کے سپاہی سراپردوں کو لوٹتے پھر رہے تھے اور اس کا سارا لشکر منتشر ہو چکا تھا خان زمان نے بہادر خان کو رخصت کر دیا اور خود تھوڑے سے آدمیوں کو ساتھ لے کر نقارہ بجاتے ہوئے دشمن کے مقابلے پر آیا اور ایسا دلیرانہ حملہ کیا کہ غنیم کے پیر اکھڑ گئے اور پٹھان بھاگ نکلے۔ خان زمان نے سات آٹھ کوس تک اس کا پیچھا کیا اور بہت سارے پٹھانوں کو تہ تیغ کر دیا۔

لکھنؤ کی جنگ کی طرح جونپور کی لڑائی بھی اس کی بہادری کا ایک کارنامہ ہے۔ بنگالہ میں کوریہ نے سلطان بہادر خطاب رکھ کر اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کر دیا تھا، پھر وہ بنگال سے تیس چالیس ہزار سوار لے کر جونپور پر حملہ آور ہوا۔ مقابلے میں خان زمان کا

سارا لشکر تباہ و برباد ہو گیا۔ جس وقت غنیم پہنچا ہے خان زمان دسترخوان سے اٹھ کر بس گیا ہی تھا۔ حملہ آوروں نے دسترخوان کو اسی طرح جما ہوا پایا تو بھوکوں کی طرح ٹوٹ پڑے اور سب کچھ لوٹ لیا۔ پھر خان زمان ایک مختصر سی جمعیت اکٹھی کر کے پٹھانوں پر بلائے ناگہانی کی طرح ٹوٹ پڑا اور انھیں شکست دے کر بھگا دیا۔ بہت سے پٹھان قتل اور بہت سے گرفتار ہوئے۔ اس قدر مال غنیمت مغل لشکریوں کے ہاتھ لگا کہ انھیں اور کسی چیز کی آرزو نہ رہی۔

سچ تو یہ ہے کہ بادشاہ کے اقبال سے اس نے اور اس کے بھائی نے اپنی فوج کے ساتھ مشرقی ہندوستان میں جیسی فتوحات حاصل کیں وہ کم ہی کسی کو نصیب ہوئی ہوں گی۔ اگر ان کا دامن معصیت سے داغدار نہ ہوتا تو کیا عجب کہ شاہی اعزاز سے نوازے جاتے۔ اپنی سرکشی کی وجہ سے انھوں نے اپنے سارے کارنامے خاک میں ملا دیے۔ ان کا باقی حال مناسب موقعے پر بیان کیا جائے گا۔

اسی سال خان خاناں نے خواجہ کلاں بیگ کے لڑکے مصاحب بیگ کو جو نہایت شر پسند اور ظالم تھا، قتل کرا دیا۔

اکبر کا آگرے میں داخلہ

17 محرم 965ھ/1557ء کو جلوس کے تیسرے سال، اکبر کی شاہانہ سواری آگرے میں داخل ہوئی۔ یہی وہ سال ہے جس میں پیر محمد خان کو عروج بھی نصیب ہوا اور سال بھر کے اندر زوال بھی آ گیا۔ پیر محمد خان پہلے صرف ملا تھا۔ ملا گیری سے وہ امارت کے اس درجہ پر پہنچا کہ تمام امور مملکت میں وہ خانخاناں کی نیابت کرنے لگا تمام امرا اس کے دروازے پر حاضر ہوا کرتے تھے اور بہت کم لوگوں کو باریابی کا موقع ملتا تھا۔

پیر محمد خان کا عروج و زوال

اس کے جاہ و حشم کا یہ حال تھا کہ جس وقت لشکر دہلی سے آگرہ جا رہا تھا تو اثنائے راہ میں

خان خاناں بیر محمد خان کے ساتھ شکار کے لیے نکل گیا۔ خان خاناں کو جب بھوک لگی تو اس نے اپنے رکاب داروں سے پوچھا کہ ہمارے ہمراہ کچھ کھانے کا سامان بھی ہے؟ بیر محمد خان نے عرض کیا: ''اگر آپ یہاں ٹھہر جائیں تو جو کچھ میرے ساتھ ہے خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ خانخاناں اپنی جمعیت کے ساتھ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ بیر محمد خان رکاب خانہ سے اسی وقت تین سو شربت کے پیالے اور سات سو کھانے کی رکابیاں دسترخوان پر چنی گئیں۔ اس کے اس ٹھاٹ باٹ کو دیکھ کر خان خاناں حیران رہ گیا۔ ظاہر تو کچھ نہ کہہ سکا لیکن دل ہی میں بہت پیچ و تاب کھاتا رہا، اسی وقت سے خان خاناں کا دل اس سے پھر گیا۔

آگرہ پہنچنے کے بعد بیر محمد خان کچھ دن تک بیماری میں مبتلا رہا۔ ایک دن خان خاناں اس کی عیادت کے لیے گیا تو اس کے ایک غلام نے اسے داخل ہونے سے روک دیا کیوں کہ بیر محمد خان نے امرا وغیرہ کے داخلے پر پابندی لگا رکھی تھی اور خان خاناں سے کہا جب تک اجازت آجائے آپ تشریف رکھیے۔ خان خاناں کے لیے یہ بات جلتے پر تیل سے کم نہ تھی۔ جب بیر محمد خان کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ مرض کی نقاہت کے باوجود دوڑا ہوا آیا اور خان خاناں سے معافی چاہی کہ ''دربان نے آپ کو پہچانا نہیں''۔ خان خاناں نے اس کے جواب میں صرف ایک معنی خیز جملہ کہا: ''اور تم نے بھی نہیں۔'' اس واقعہ کے باوجود بیر محمد خان کے دربانوں نے خان کے ملازموں میں سے کسی اور کو اندر نہ جانے دیا۔ صرف طاہر محمد سلطان، میر فراغت بڑی کوشش کے بعد اندر مجلس میں پہنچ سکے تھے خان خاناں کچھ دیر بیٹھ کر واپس چلا آیا اور بیر محمد خان کے ہوش درست کرنے کا ارادہ کر لیا۔

دو تین دن بعد خان خاناں نے خواجہ امینا جو بعد میں خواجہ جہان بنا اور میر عبداللہ بخشی کو خدمت گاروں کی ایک جماعت کے ساتھ بیر محمد خان کے پاس بھیجا اور یہ کہلوایا کہ ان دنوں کو تو بھول گیا ہے جب تو طالب علمی کے لباس میں نہایت خستہ حال قندھار پہنچا تھا۔ ہم نے اس وقت تجھ میں قابلیت اور خلوص کے جذبے کو دیکھ کر اور چند عمدہ خدمات

کے بجالانے کی وجہ سے زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہنچا دیا اور تجھے خلا گیری سے امارت کے اعزاز پر پہنچنا نصیب ہوا، پھر ہم نے ترقی دے کر تجھے امیرالامرائی کا عہدہ عطا کیا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیرا ظرف دولت و مرتبے کی سمائی کے لائق نہیں اور تیری طرف سے فتنہ و فساد کا اندیشہ ہو چلا ہے اس لیے ہم چند دن کے لیے وہ ساز و سامان تجھ سے چھین لیتے ہیں جو تیرے اس غرور کا باعث ہے تاکہ تیرا دماغ ٹھکانے آجائے، تیرے لیے یہی مناسب ہے کہ تو فوراً ہی علم و نقارہ اور ساز و سامان سرکاری آدمیوں کے حوالے کر دے"۔ پیر محمد خان نے خان خانان کے حکم کی تعمیل کی اور سارا ساز و سامان اس کے آدمیوں کے سپرد کر دیا۔ پھر وہ امیرالامراء کے درجے سے دوبارہ ملا پیر محمد بن گیا بلکہ اس کا حال اس سے بھی کہیں زیادہ برا ہو گیا۔

خان خانان نے چند دن بعد ہی اسے قلعہ بیانہ میں بھیج کر قید کر دیا۔ اسی قید کے زمانے میں اس "برہان تمانع" کی بحث پر جو "لو کان فیھما الھۃ الا اللہ لفسدتا" کی آیت پر مبنی ہے اور یہ متکلمین کے درمیان ایک مشہور بحث ہے پر چند رسالے لکھ کر خان خانان کے نام سے موسوم کیے تاکہ اس وسیلے سے اسے رہائی مل جائے، لیکن ایسی باتوں کا کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ چند دن بعد خان خانان کے حکم سے اسے مکہ معظمہ کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ تقدیر اچھی تھی، جب وہ گجرات پہنچا تو خان خانان خود سازشوں کا شکار ہو گیا۔ یہ خبر جب پیر محمد خان کو ملی تو وہ گجرات سے لوٹ آیا اور اکبر کے پاس باریاب ہوا۔ اکبر نے اسے ناصر الملک کا خطاب عطا کر کے خان خانان کے پیچھے روانہ کر دیا۔ ان وقعات کے بعد خان خانان کی نیابت کا عہدہ پیر محمد خان کے بجائے خان خانان کے ہی ایک ملازم حاجی محمد خان سیستانی کو دیا گیا تھا۔

شیخ گدائی کا اقتدار

ایک اور شخص شیخ گدائی کنبوہ تھا۔ یہ دہلی کے شاعر جمالی کنبوہ کا لڑکا تھا۔ جب ہندوستان دوبارہ فتح ہوا تو سفر کی حالت میں شیخ گدائی گجرات کے مقام پر خان خانان کی خدمت

میں حاضر ہوا تھا اور اس سے اس کی اچھی راہ و رسم ہوگئی تھی۔ انہی سابقہ روابط کی بنا پر خان خانان نے اس کی سرپرستی کی اور اسے صدرالصدور کا عہدہ دے کر تمام ہندوستانی اورخراسانی امیروں میں اس کا مرتبہ بڑھادیا۔ یہ شخص نہایت مکار اور ریاکار تھا۔ اس نے صوفیانہ وضع اختیار کر رکھی تھی اور اپنے گھر پر سماع کی محفلیں منعقد کیا کرتا تھا ان محفلوں میں خان خانان بلکہ خود بادشاہ بھی شریک ہوتے تھے۔ ہندوستان میں اسلام کا آغاز ہی تھا اس لیے ایسے مکار لوگ جو غلامانہ ذہنیت اور پست فطرت رکھتے تھے اور ان کے نفاق و ریاکارانہ زہد کی وجہ درویشی ان پر جچتی نہیں تھی، مکر و تزویر سے بہ آسانی اپنا رنگ جمالیتے تھے۔ شیخ گدائی بھی اسی قبیل کا آدمی تھا۔ لوگوں کوتو اس کے عالی نسب ہونے میں بھی شبہ تھا۔ غرض اس کے اس بڑھتے ہوئے اعزاز و مرتبے کی وجہ سے اہل علم اور امرا کی محفلوں میں ماتم برپا ہوگیا:

در تنگنائی حیرتم از نخوت رقیب
یا رب مبادآنکہ گدا معتبر شود

شیخ گدائی نے قدیم امیرزادوں اور پیرزادوں کی جاگیریں ضبط کرادیں۔ وہ صرف انہی کو جاگیر عطا کرتا تھا جو اس کے دربار میں جانے کی ذلت گوارا کرلیتے تھے۔ ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جو ایک گز زمین جاگیر میں حاصل کرنے کے لیے اس کی خوشامد نہ کرتے ہوں ان میں ولایت (ایران) سے آنے والے معزز لوگ بھی شامل تھے۔

میرعبداللطیف قزوینی

انہی دنوں عراق سے میر عبداللطیف[2] جو قزوین کے معزز خاندان سادات سیفی کے سربرآوردہ آدمی تھے۔963ھ/1555ء میں ہندوستان تشریف لائے تھے۔ بادشاہ نے لسان الغیب حافظ شیرازی کا دیوان ان سے سبقاً سبقاً پڑھنا شروع کیا۔

ان کے لڑکے کا نام غیاث الدین تھا جس کو نقیب خان کا لقب دیا گیا تھا۔ یہ شخص نہایت ذہین اور جامع العلوم ہے چنانچہ علم سیرت، تاریخ اور اسماء الرجال اور دوسرے تمام

مروجہ علوم میں اس کی نظر بڑی گہری تھی وہ بلا شبہ اس دور میں باعث برکت، بلکہ صحیح معنوں میں "ثانی لوح محفوظ" تھے۔ راقم الحروف کو بھی اس کے ساتھ ہم جماعتی، ہم عصری اور دینی اخوت کا شرف حاصل ہے۔ وہ ان دنوں بادشاہ سلامت کی خدمت میں تاریخ نظم ونثر اور دوسرے علوم کی کتابوں کے پڑھنے پر مامور ہے۔

گوالیار کے قلعہ پر قبضہ

966ھ/1558ء میں گوالیار کا قلع فتح ہوا۔ گوالیار کے قلعے میں عدلی کا ایک غلام بھبل خان نامی قبضہ جمائے ہوئے تھا۔ اس نے امان حاصل کر کے قلعے کی کنجی شاہی کارندوں کے حوالے کر دی۔

رنتھمبور کا قضیہ

اسی سال عدلی کے ایک اور غلام سنگرام خان نے رنتھمبور کا قلعہ رائے سرجن ہاڑا کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس واقعے کی تفصیل یہ ہے کہ اکبر بادشاہ نے آگرہ میں آنے سے پہلے امیروں کی ایک جماعت کو جس میں ہندو بیگ اور دوسرے مغل امیر شامل تھے، قلعہ رنتھمبور کی تسخیر کے لیے مقرر کیا تھا۔ ان امیروں نے سنگرام خان پر حملہ کر کے قلعے کے مضافات کو بری طرح لوٹا، لیکن ان سے قلعہ فتح نہ ہو سکا۔ جب بیانہ کی جاگیر خان خانان کے ایک غلام حبیب خان کو دی گئی اور پیاور وتودہ ترک علی جو تودہ بھون کے نام سے مشہور ہے چغتائی خان کے حوالے ہوا تو حبیب خان کو میر لشکر بنا کر رنتھمبور کی مہم پر مقرر کیا گیا۔ اس نے قلعے کو ایک سال تک محاصرے میں رکھا۔ اس طویل محاصرے سے قلعے والے تنگ آ گئے اور صلح کی بات چیت کرنے پر مجبور ہو گئے سنگرام خان نے حبیب خان کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ اپنا ایک قاصد ہمارے پاس روانہ کریں تاکہ ہم اپنی شرائط اسے بتا دیں۔

مغل سرداروں نے میرے والد (صاحب تصنیف) کو حاجی بھیکن پیاوری کے ساتھ اس سفارت کے لیے منتخب کر کے روانہ کیا۔ بڑی رد و کد کے بعد سنگرام خان چند شرطوں پر

قلعہ سپرد کرنے کے لیے آمادہ ہوگیا۔ ایک شرط یہ تھی کہ اسے نقد روپیہ اور مال و اسباب دیا جائے، دوسری یہ کہ شاہی ملازمت میں اس کے معاش کی بھی کوئی سبیل نکالی جائے۔ امیروں نے اس کے ان مطالبوں کی پابجائی میں تال مٹول سے کام لیا۔ ان کے پاس روپیہ بھی نہیں تھا جو اسے دیتے، اس لیے وہ قلعے پر زبردستی ہی قبضہ کر لینے کی فکر کرنے لگے تھے۔ امراء کے اس رویہ کو دیکھ کر اس نے رنتھمبور کا قلعہ رائے سرجن کے ہاتھ فروخت کردیا۔ شاہی لشکر نے قلعہ پر قبضہ کر لینے کی ہر طرح کوشش کر لی لیکن ان کو کسی قسم کی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

قلعے کو حوالے کر دینے کے بعد جھجھار خان تو حاجی خان الوری کے ساتھ گجرات کی طرف نکل گیا اور رائے سرجن نے قلعہ میں کافی رسد اور سامان جنگ پہنچا کر اسے اچھی طرح مستحکم کر لیا اور رسد و محصول کی وصولیابی کے بہانے قلعے سے متعلقہ بعض پرگنوں پر بھی قابض ہوگیا۔ غنیم کے اس تسلط کے بعد رجب علی خان اور دوسرے امیر کافی نقصان اٹھا کر اپنی اپنی جاگیروں کو لوٹ گئے۔

چنار کے قلعے پر قبضہ

اسی سال عدلی کے ایک غلام جمال خان نے جو چنار پر قابض تھا ایک قاصد دربار میں بھیجا اور درخواست کی کہ اگر بادشاہ کسی تجربے کار لائق آدمی کو روانہ کریں تو میں قلعہ اس کے حوالے کردوں گا۔ اس کے عریضہ پر خان خانان نے مہر علی بیگ سلاحدوز کو جس نے بعد میں خانی کا اعزاز پایا تھا اور قلعہ چتوڑ کا حاکم مقرر ہوا تھا، جمال خان کے قاصد کے ساتھ روانہ کیا اور جمال خان کے نام ایک تسلی آمیز فرمان بھی بھیج دیا۔

اس زمانے میں، میں (صاحب تصنیف) پڑھنے کے ارادے سے وطن سے بساور اور وہاں سے آگرہ پہنچا تھا اور مہر علی بیگ سے تعارف ہو جانے کی وجہ سے اسی کے گھر پر رہا کرتا تھا۔ مہر علی بیگ نے اس سفر میں مجھے بھی اپنے ہمراہ لے جانے کے لیے بڑا اصرار کیا، اور میرے استاد مرحوم شیخ مبارک ناگوری اور والد مرحوم شیخ ملوک شاہ سے بھی سفارش کرائی،

یہاں تک مجبور کیا کہ اگر وہ میرے ساتھ نہ چلے گا تو میں اس سفر کا ارادہ ہی ترک کر دوں گا۔ دونوں بزرگوں نے معرفت و آشنائی کی وجہ سے مجھے اس سفر کی اجازت دے دی۔ میں بھی مجبوراً تعلیم ترک کر کے عین برسات میں اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

ہم لوگ قنوج، لکھنؤ، جونپور اور بنارس کی سیر کرتے، جگہ جگہ کے عجائبات دیکھتے اور ہر شہر کے علماء و مشائخ کی صحبتوں سے استفادہ کرتے ہوئے ماہ ذی قعدہ 966ھ/1558ء میں گنگا کے کنارے آئے اور دریا پار کر کے چنار پہنچے۔

جمال خان نے اپنے آدمیوں کو ہمارے استقبال کے لیے بھیجا۔ یہ لوگ مہر علی کو قلعے کے اندر لے گئے اور وہاں اسے شیر شاہی اور سلیم شاہی دور کی عمارتیں دکھائیں اور قلعے کے ساز و سامان کا معائنہ کرایا۔ قلعے والوں نے ہماری مہمانی اور ضیافت بڑی کشادہ دلی کے ساتھ کی جس وقت جمال خان کو شاہی فرمان پڑھ کر سنایا گیا جس میں قلعہ چنار کے عوض جونپور کے پانچ پرگنے دیے جانے کا وعدہ تھا تو جمال خان نے جسے اس سے زیادہ کی توقعات تھیں یہ چاہا کہ مہر علی کو اس وقت تک قلعے میں روک لے جب تک کہ دربار سے اس کے عریضے کا جواب آ جائے۔

اس اثنا میں اس نے خان زمان سے علیحدہ بات چیت شروع کر دی اور تیسری طرف فتح خان افغان پنی سے بھی جو اپنی جمعیت کے ساتھ رہتاس کے قلعے پر قابض تھا، قلعہ سپرد کر دینے کا وعدہ کر لیا۔ جب مہر علی کو اس کے اس مکر و فریب کا علم ہوا تو اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں فتح خان اور جمال خان مل کر اسے کسی آفت میں نہ ڈال دیں اس ڈر کے مارے وہ ہمیں (صاحب تصنیف اور دیگر افراد جو ہمراہ تھے) اسی جگہ چھوڑ کر سیر کے بہانے قلعہ سے نکلا اور گنگا پار کر کے تنہا چلا گیا۔ اس کے تمام ساتھی قلعے میں رہ گئے۔

اس صورت حال کو دیکھ کر میں نے جمال خان سے چاپلوسی کی باتیں کیں اور اسے یہ یقین دلایا کہ میں کسی طرح مہر علی کو واپس لاتا ہوں تاکہ مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے اس نے مجھے جانے کی اجازت دے دی چنانچہ میں شام کے وقت ایک کشتی میں بیٹھ کر گنگا پار کرنے لگا۔ اتفاق سے کشتی پہاڑ کے دامن میں ایک خوفناک بھنور میں پھنس گئی۔ یہ بھنور

قلعے کی دیوار کے قریب ہی تھا اسی وقت ہوا کا ایک تیز سناٹا آیا اور کشتی ڈانوا ڈول ہونے لگی۔ اگر اس وقت اللہ کی مہربانی شامل حال نہ ہوتی تو بلا شبہ کشتی اس بھنور میں چکراتی ہوئی پہاڑ سے ٹکراتی اور اس کے پرخچے اڑ جاتے:

رسیدم من بہ دریائی کہ موجش آدمی خوار است

نہ کشتی اندران دریا نہ ملاحی عجب کار است

غرض بڑی مشکلوں سے کشتی ساحل سے جا لگی اور ہم اس جنگل میں جو کوہ چنار کے دامن میں ہے شیخ محمد غوث کے ٹھکانے پر پہنچے۔ یہ ہندوستان کے ممتاز شیخ اور صاحب دعوت بزرگ تھے اور اس ویرانے میں بارہ سال سے مقیم تھے۔ ان کی گزر بسر جنگل کے پھول اور درختوں کے پتوں پر تھی۔ دعوت دین کی برکت کی وجہ سے ان کو یہ مرتبہ حاصل ہوا کہ عالی مرتبت بادشاہ خلوص و عقیدت کے ساتھ ان کے آستانے پر سر جھکاتے تھے۔

شیخ محمد غوث گوالیاریؒ

جب مہر علی آگرہ پہنچ گیا تو چنار کے قلعہ پر عدلی کے غلام فتو نے قبضہ کرلیا۔ 966ھ 1558ء میں شیخ موصوف اپنے مریدوں اور معتقدوں کے ہمراہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ گجرات سے آگرہ پہنچے۔ اکبر بادشاہ نے بھی نہایت عقیدت مندی کے ساتھ ان کی زیارت کی۔ شیخ گدائی کو حسد اور نفاق کی وجہ سے آگرہ میں ان کا قیام نہایت ناگوار گزرا کیونکہ شیخ محمد غوث کی وجہ سے اس کی مشیخت کی دکان پھیکی پڑ رہی تھی:

بہ نزد خرد این سخن روشن است

کہ ہم پیشہ ہم پیشہ را دشمن است

خان خانان کے مزاج میں شیخ گدائی کا بڑا دخل تھا اس لیے خان خانان بھی شیخ محمد غوث سے کھل کر نہیں ملا بلکہ اس نے کئی ایک مجلسیں منعقد کیں وہ ان مجلسوں میں شیخ کا ایک رسالہ پڑھ کر سناتا تھا جس میں شیخ نے اپنی معراج کا حال لکھا ہے کہ حالت بیداری میں مجھ سے خدا نے گفتگو کی اور حضور اکرم ﷺ پر مجھے ترجیح دی۔ ان مجلسوں میں یہ اور ایسی

دوسری خرافات کا تذکرہ کر کے شیخ کی ذات پر کیچڑ اچھالا جاتا تھا۔ ان باتوں کی وجہ سے شیخ محمد غوث ناراض ہو کر گوالیار چلے گئے اور وہاں ہدایت و رشد کی مہم میں مشغول رہے۔ ایک کروڑ کی جاگیر جو انھیں بادشاہ کی طرف سے ملی تھی صبر کر لی۔

اسی سال خان زمان کا بھائی بہادر خان سزاول خان کے لڑکے باز بہادر کے مقابلہ پر گجرات کی طرف مامور کیا گیا۔ وہ سیری کے قصبہ تک پہنچا تھا کہ خان خانان کے فتنے اٹھ کھڑے ہوئے چنانچہ وہ دربار میں واپس آ گیا۔

اسی سال اندری سے حسین خان آگرہ اور چندتر سے باہر گئے امراء کو اپنے ساتھ لے کر تھنبور کی طرف گیا اور سوپر پہنچ کر اس نے بڑے نمایاں کارنامے انجام دیے اور پھر وہاں سے اس نے قلعہ رتھنبور پر حملہ کیا اور رائے سرجن کو شکست دے کر اسے اپنے ساتھ قلعہ میں لے کر گیا اور اس نے قلعہ داری کا جائزہ لے لیا، لیکن وہ بھی خان خانان کے جھگڑے کی وجہ سے اس مہم کو ادھورا چھوڑ کر گوالیار آ گیا اور وہاں سے مالوہ جانے کا ارادہ کیا تھا کہ خان خانان نے اسے آگرہ میں طلب کر لیا۔

اکبر دہلی میں

967ھ/1559ء میں اکبر نے شکار کے ارادے سے جمنا کو پار کیا۔ اس موقع پر مطلب پرستوں نے جن میں ادہم خان جو ماہم انکہ کی فرزندی کی وجہ سے سب سے زیادہ مقرب تھا اور صادق محمد خان پیش پیش تھے، خان خانان کے خلاف بادشاہ کے کان بھرنے لگے کیونکہ ان تمام امیروں کو خان خانان سے اس کی مستقل وکالت کی وجہ سے بڑا حسد تھا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ خان خانان سلطنت پر اس طرح قابض تھا کہ بادشاہ بھی اس کے ہاتھوں تنگ آ چکا تھا۔ اس کی بادشاہت تو بس برائے نام تھی، سب کچھ خان خانان کے ہاتھ میں تھا۔ بعض وقت تو ضروری اخراجات کے لیے بھی بادشاہ کو خود بڑی تنگی ہو جاتی تھی۔ خزانہ بالکل ہی خالی تھا۔ بادشاہ کے عملہ کے جتنے لوگ تھے وہ سخت پریشانی میں مبتلا رہتے تھے۔ انھیں جاگیریں بھی بڑی خراب دی گئی تھیں۔ اس کے برعکس خان خانان کے

جتنے ملازم تھے وہ بڑے خوشحال رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بادشاہی امرا خان خانان کے زوال کے آرزومند رہتے تھے۔

بیرم خان کے خلاف سازشیں

جب شہنشاہ کی سواری دہلی سے نصف مسافت پر سکندرہ راؤ میں پہنچی تو وہاں ماہم انکہ نے اطلاع دی کہ دہلی میں بیگم بادشاہ سخت بیمار ہیں اور بادشاہ سلامت کو بار بار یاد کرتی ہیں۔ یہ سن کر اکبر نے دہلی کا ارادہ کیا۔ جب شاہی لشکر دہلی پہنچا تو دہلی کے حاکم شہاب الدین احمد خان نے استقبال کیا۔ دہلی میں تمام امیروں نے مل کر خان خانان کے خلاف بڑی لگائی بجھائی کی اور رائی کا پہاڑ بنا کر بادشاہ کو اس کے خلاف بھڑکا دیا:

خال و خط و زلف و ابرویت یک جا شدند
از برائی کشتن مسعود محضری شود

ان لوگوں نے خان خانان کے مقابلہ میں اپنی بے بسی اور مظلومی دکھلانے کے لیے ایسا ڈھونگ رچایا کہ کہنے لگے حضور کی دہلی میں تشریف آوری پر خان خانان یہی سمجھے گا کہ ہم لوگ ہی آپ کو یہاں لے کر آئے ہیں اور وہ یقیناً ہمارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جائے گا۔ ہم چونکہ اس سے مقابلہ نہیں کر سکتے اس لیے مناسب یہی ہے کہ حضور ہمیں مکہ معظمہ چلے جانے کی اجازت دیں۔

اکبر کو ماہم انکہ کی جدائی گوارا نہیں تھی اس لیے اس نے تمام امیروں کی دلدہی کی اور خان خانان کو پیغام بھیجا کہ ”ہم تمہاری اجازت بغیر دہلی چلے آئے اور اب ہمارے تمام ملازم تمہاری طرف سے خوفزدہ ہیں، تمہیں چاہیے کہ تم ان سب کو تسلی دو تا کہ یہ سب مطمئن ہو جائیں۔

خان خانان نے خواجہ امینا، حاجی محمد خان سیستانی اور ترسون محمد خان کو شہنشاہ کے دربار میں بھیج کر اپنی طرف سے بڑی عذر خواہی کی اور اپنی خیر خواہی اور خلوص کو جتلانا چاہا لیکن اکبر نے ان باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی اور ان لوگوں کو بھی واپسی سے روک دیا اور

تمام امور سلطنت شہاب الدین احمد خان اور ماہم اتکہ کے ذریعے انجام پانے لگے۔ ان لوگوں نے اس بات کی خوب افواہ پھیلائی کہ: "بادشاہ سلامت خان خاناں سے ناراض ہو چکے ہیں" آگرہ میں جتنے امیر تھے سب ایک ایک کر کے دہلی پہنچنے لگے۔ سب سے پہلے قیام خان گنگ آگرہ چھوڑ کر آیا۔ وہاں سے جو امیر بھی آتا تھا شہاب الدین احمد خان وغیرہ اس کی جاگیر اور منصب میں اضافہ کر دیتے تھے۔ ان امیروں نے دور اندیشی سے کام لیا اور قلعہ کی مضبوطی کا بخوبی انتظام کر لیا۔

بیرم خان کی مکہ کے لیے روانگی

خان خاناں نے جب بساط[3] الٹی ہوئی دیکھی تو اپنے مصاحبوں وغیرہ کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ شیخ گدائی وغیرہ نے رائے دی کہ ایک منٹ ضائع کیے بغیر دہلی جا کر بادشاہ کو اپنے قبضہ میں کر لیا جائے، لیکن خان خاناں نے یہ تجویز پسند نہ کی اور کہا کہ اکبر کا مزاج میری طرف سے پھر گیا ہے، اس لیے اب میرا اور اس کا نبھاؤ ہونا مشکل ہے اس سے قطع نظر میری ساری عمر خیر خواہی میں گزری ہے اب بڑھاپے میں نمک حرامی کا داغ لگا کر میں بدنامی مول لینا نہیں چاہتا۔

خان خاناں نے ہر طرف سے مایوس ہو کر حج کا اردہ کیا اور بیانہ کی طرف کوچ کر دیا۔ آگرہ کے تمام سرداروں اور امراء کو اپنے اس اردہ سے مطلع کر کے دہلی رخصت کر دیا۔ مالوہ سے بہادر خان کو بھی بلا کر ان لوگوں کے ہمراہ روانہ کر دیا۔ بیانہ کے قید خانہ سے محمد امین دیوانہ کو بھی رہا کر دیا۔

دہلی میں امراء نے اکبر کو سمجھایا کہ خان خاناں پنجاب کا عزم کیے ہوئے ہے اور اس کی نیت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی، چنانچہ اکبر نے میر عبد اللطیف قزوینی کے ذریعے خان خاناں کو پیغام بھیجا کہ اب ہم نے سلطنت کا سارا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں رکھ لیا ہے تم عرصہ سے حج پر جانے کا ارادہ رکھتے تھے، اس لیے تم کوئی علاقہ اپنی جاگیر کے لیے تجویز کر لو، تمہارا نمائندہ اس کی آمدنی مکہ میں تمہارے پاس بھیجتا رہے گا۔

خان خاناں پہلے ہی سے یہ عزم کیے ہوئے تھا، یہ فرمان قبول کر کے وہ میوات سے ناگور کی طرف چلا گیا۔ سرداروں میں سب نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔البتہ ولی بیگ ذوالقدر، حسن قلی خان جو بعد میں خان جہان بنا، اسماعیل قلی خان اور اس کے بھائی شاہ قلی خان اور حسین خان خویش اور مہدی قاسم خان اس کے ہمراہ ناگور تک آئے۔ ناگور پہنچ کر خان خاناں نے سارا سامان، جلوس، نقارہ اور علم وغیرہ حسن قلی خان کے ہاتھ دربار میں بھیج دیا۔ جب وہ بیکانیر کی حد میں پہنچا تو شیخ گدائی بھی اس کا ساتھ چھوڑ کر نکل گیا۔

ابوالمعالی کی گرفتاری

اکبر نے دہلی سے پنجاب جانے کا ارادہ کیا۔ جس دن اس نے قصبۂ جھجھر میں قیام کیا حسن قلی خان مع سازو سامان کے حاضر ہوا۔ اسی قیام میں شاہ ابوالمعالی بھی خدمت شاہی میں حاضر ہوا لیکن اس نے یہ گستاخی کی کہ سواری کی حالت میں بادشاہ کو تسلیمات ادا کی۔ اکبر کو اس کی یہ حرکت سخت ناگوار گزری اور اسے گرفتار کر کے شہاب الدین احمد خان کے سپرد کر دیا۔

بیرم خان کا تعاقب

اسی قیام میں پیر محمد خان شیروانی بھی، جو خان خاناں کا حال سن کر گجرات سے لوٹ آیا تھا، باریاب ہوا۔ اکبر نے اسے ناصر الملک کا خطاب اور سرداری کا سامان دے کر خان خاناں کے پیچھے روانہ کیا تاکہ وہ جا کر خان خاناں کو جلد از جلد مکہ روانہ کر دے اور ہندوستان میں ٹھہرنے کی مہلت نہ دے۔ پیر محمد خان فوراً ہی شاہی لشکر گاہ سے رخصت ہو گیا اور ناگور کے قریب پہنچ کر قیام کیا اور ایک دو منزل کی مسافت پر یہ شعر ایک رقعہ میں لکھ کر خان خاناں کے پاس بھیج دیا:

آیدم در دل اساس عشق محکم ہم چناں
با غمت جان بلا فرسودہ ہمدم ہم چناں

خان خاناں نے اس کے جواب میں لکھ بھیجا:

''آمدن مردانہ، اما نزدیک رسیدہ توقف کردن نا مردانہ''

(تم آئے یہ تمہاری بہادری تھی لیکن قریب آکر ٹھٹک گئے یہ تمہاری نامردی ہے۔)

خان خانان کو پیر محمد خان[4] کے تعاقب سے بہت رنج ہوا اور وہ ناگور سے کوچ کرگیا۔ چونکہ جودھپور کے راجہ مالدیو نے بڑی جمعیت کے ساتھ گجرات کا راستہ روک رکھا تھا اسی لیے وہ بیکانیر کی طرف چلا گیا۔ یہاں بعض لوگوں نے اسے بہکایا اور اُس نے گجرات کے بجائے پنجاب کا رخ کیا۔ اپنے تمام اہل وعیال کو اپنے تین سال کے لڑکے مرزا عبد الرحیم سمیت جو اس وقت خان خانی اور سپہ سالاری کے عہدہ پر فائز ہیں شیر محمد خان دیوانہ کی جاگیر میں تبر ہندہ کو روانہ کردیا۔ خانخاناں نے شیر محمد خان کو اپنا فرزند بنا لیا تھا اسی بھروسے پر اس نے اس کی پناہ میں اپنے خاندان کو بھیج دیا، لیکن شیر محمد خان نے اس کی سابقہ مہربانیوں کا کوئی لحاظ نہ کیا اور اس کا سارا مال و اسباب لوٹ لیا اور اس کے خاندان کی ہر طرح سے توہین کی۔ خان خانان دیپالپور پہنچا تھا کہ اسے یہ حال معلوم ہوا، اس نے شیر محمد خان کی فہمائش کے لیے خواجہ مظفر علی دیوانہ اور درویش محمد اوزبک کو روانہ کیا تاکہ یہ لوگ اس کو ان حرکتوں سے باز رکھیں۔ شیر محمد خان نے ان کی کچھ نہ سنی بلکہ اس نے خواجہ مظفر علی کو قید کرکے بادشاہ کے پاس بھیج دیا۔ خان خانان کو سب سے زیادہ صدمہ شیر محمد خان کی اس طوطا چشمی سے ہوا۔

بیرم خان کی شکست

خان خانان نے اب جالندھر کا رخ کیا۔ یہاں اکبر کے اشارہ سے پنجاب کے امیروں شمس الدین خان اتکہ، اس کے بیٹے یوسف محمد خان اور شہاب خان کے داماد حسین خان وغیرہ نے اس کا راستہ روک دیا، موضع کنور پھلور پرگنہ دکھدار میں سخت مقابلہ ہوا[5] خانخاناں کی طرف سے مہدی قاسم خان کے داماد حسین خان نے بڑی مردانگی دکھائی، لیکن زخمی ہوکر گرفتار ہوگیا۔ اسے ولی بیگ اور اس کے بیٹے اسماعیل قلی خان کے ہمراہ بادشاہ کے حضور بھیج دیا گیا۔ خان خانان یہاں سے شکست کھا کر بھاگ گیا۔ اس لڑائی میں اس کا

جو کچھ مال واسباب تھا سب کا سب لٹ گیا۔ لوٹ کے اس مال میں ایک مرصع علم بھی تھا جس پر موتی اور جواہرات جڑے ہوئے تھے، اسے خان خانان نے ایک کروڑ کے خرچ سے حضرت امام علی بن موسیٰ رضا کے مزار پر چڑھاوے کے لیے مشہد مقدس روانہ کرنے کے لیے تیار کرایا تھا۔ اتکہ خان نے مال غنیمت کے ساتھ یہ علم بھی بادشاہ کے پاس بھجوایا۔

اکبر نے پنجاب سے دہلی واپس ہونے کے بعد کابل سے منعم خان کو وکالت کا عہدہ دینے کے لیے بلوایا تھا۔

بیرم خان کی فیاضی

اسی سال خان خانان نے ہاشمی قندھاری کی ایک غزل اپنے نام سے مشہور کردی تھی اور اسکے عوض اس نے شاعر کے پاس ساٹھ ہزار تنکہ روانہ کر کے اس سے پوچھا تھا: "یہ رقم کم تو نہیں''؟ شاعر نے بطور لطیفہ لکھا کہ کم ہے اور ساٹھ بہت کم ہے۔ خان نے چالیس ہزار تنکہ مزید روانہ کر کے ایک لاکھ پورے کردیے، وہ غزل یہ ہے:

من کیستم عنان دل از دست دادۂ
وزدست دل بہ راہ غم از پا فتادۂ
دیوانہ وار در کمر کوہ گشتۂ
بی اختیار سر بہ بیابان نہادۂ

خان خانان نے اسی طرح باوجود خزانہ خالی ہونے کہ رام داس لکھنوی کو ایک مجلس میں ایک لاکھ تنکہ نقد وجنس کی صورت میں بطور انعام دیا تھا۔ رام داس سلیم شاہ کے گویوں میں سے تھا، موسیقی میں اسے تان سین ثانی کہا جا سکتا ہے، یہ گویا خلوت وجلوت میں خان خانان کا ہمدم تھا اور وہ اس کی خوبصورتی سے اپنی آنکھیں سینکا کرتا تھا۔

اسی طرح مجاز خان بدایونی کو خان خانان کے نام پر ایک قصیدہ لکھنے کے صلہ میں ایک لاکھ تنکہ نقد خان خانان کے خزانہ سے دیے گئے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ اسے سرہند کی پوری سرکار کا امین بنا دیا گیا تھا۔ مجاز خان کو علم اور نقارہ کا امیرانہ اعزاز تھا اور وہ پہلے

افغانی امرا کے زمرے میں شامل تھا۔ آخر عمر میں اس نے سپاہ گری ترک کر کے معمولی معاش پر صبر کرلیا اور زہد و عبادت کی روش اختیار کرلی تھی جس قصیدہ پر خان خانان نے اسے یہ گراں بہا صلہ دیا تھا اس کا مطلع یہ ہے:

چون مہرۂ نگین سما شد فرو بہ آب
پرکار خامش بہ زمین داد لعل ناب

یہاں خواجہ کلاں بیگ کی یہ بات پوری صادق آتی ہے کہ عالم بالا کی شعر شناسی کا حال بھی کھل گیا۔ بہر حال خان کی ہمت بلند کے سامنے ایک لاکھ بس ایک کے برابر تھے۔

اسی سال ماہ ذی قعدہ میں پنجاب پر اتکہ خان کے تقرر کے بعد دربار شاہی سے خواجہ عبد المجید ہروی کو آصف خان کا خطاب ملا اور وہ دہلی کی حکومت پر فائز ہوا۔ حسین قلی خان کو اس بنا پر کہ اس کا باپ ولی بیگ اور اس کا بھائی اسماعیل قلی خان خان خانان کے ہمراہ تھے، آصف خان کے سپرد کر دیا گیا اور بادشاہ کی سواری پنجاب کی طرف روانہ ہوئی۔

منعم خان کی وزارت

اسی سفر کے دوران حسب الحکم منعم خان کابل سے تردی بیگ خان کے بھانجے مقیم خان کے ساتھ جس کو بعد میں شجاعت خان کا خطاب ملا تھا، آ کر لدھیانہ کے سفر میں حاضر ہوا۔ اسے خان خانان کا خطاب اور قلم دان وزارت سے سرفراز کیا گیا تھا۔

اتکہ خان کے فتح پانے اور خان خانان کے سوالک کی پہاڑی کی طرف فرار ہونے کی خبر بھی اسی سفر میں موصول ہوئی تھی اور بادشاہ نے اسیران جنگ کا معائنہ کر کے ان کو قید خانہ میں بھجوا دیا، ولی بیگ جو بری طرح زخمی ہو گیا تھا قید خانہ ہی میں دنیا سے کوچ کر گیا اور اس کا سر کاٹ کر دہلی بھیج دیا گیا، حسین خان کو اس کے سالے ملک محمد خان ولد ملال قاسم خان کے حوالے کر دیا گیا، آخر میں بادشاہ کی نظر عنایت اس پر ہوئی اور اسے پٹیالی کا قصبہ بطور جاگیر عنایت ہوا۔ پٹیالی دریائے گنگا کے کنارے ہے اور امیر خسرو کی جائے پیدائش ہے۔(6)

بیرم خان کی اطاعت

شکست کے بعد خان خانان بیرم خان تلوارہ میں جا کر قلعہ بند ہو گیا۔ تلوارہ شمالی پہاڑی کے دامن میں ایک بلند اور مستحکم مقام ہے اور راجہ گوبند چند کی عمل داری میں ہے۔ شاہی فوج نے بھی تلوارہ پر حملہ کر کے جنگ چھیڑ دی۔ بادشاہی لشکر میں سے سلطان حسین جلائیر جو نہایت خوش قامت اور بہادر نوجوان تھا ہلاک ہو گیا۔ لوگ جب مبارکباد دیتے ہوئے اس کا سر خانخانان کے پاس لے گئے تو اس نے اس کی آنکھوں کو چوم لیا اور اس کی حسن خدمت کو یاد کر کے ہائے ہائے کر کے رونے لگا اور کہا " میری زندگی پر ہزار لعنت کہ میرے نفس کی خاطر ایسے ایسے جوانوں کی زندگی خاک میں مل رہی ہے"۔ اس علاقہ کے ہندوؤں نے خان خانان کو بڑا حوصلہ دلایا، لیکن مسلمانوں کا غم اس کے دل میں ایسا لگا تھا کہ سارے ارادے ترک کر کے اپنی عاقبت کے ڈر سے اپنے قصوروں کا معافی نامہ ایک غلام جمال خان نامی کے ہاتھ بادشاہ کے حضور میں بھیج دیا اور خدمت شاہی میں حاضر ہونے کی اجازت طلب کی، ملا عبد اللہ سلطان پوری مخدوم الملک کو اس کو لانے اور دلاسہ دینے کے لیے روانہ کیا گیا۔ دونوں طرف سے قاصد آ جا رہے تھے اور ساتھ ہی حملہ کا بازار بھی گرم تھا۔ منعم خان چند آدمیوں کو ساتھ لے کر دلیرانہ خان خانان کے مقام پر جا پہنچا اور اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ جب خان خانان کی آمد کی اطلاع ہوئی تو بادشاہ کے حکم سے تمام امیر اس کے استقبال کے لیے روانہ ہوئے۔ حسب سابق کورنش بجالا کر اس کی تعظیم کی گئی۔ شہنشاہ نے اس کے قصور (7) معاف کر دیے اور خاص خلعت اور گھوڑا عطا ہوا۔ منعم خان اسے اپنے ٹھکانہ پر لے گیا اور اس کے لیے تمام ساز و سامان کے ساتھ سراپردہ وغیرہ کا انتظام کر دیا۔ شایان شان سفر خرچ اسے دے کر مکہ معظمہ کو رخصت کر دیا گیا۔ چھوٹے بڑے تمام امیروں اور مصاحبوں نے اس کی مدد کے لیے نقد اور جنس کا چندہ کر کے جسے ترک " چندوغ " کہتے ہیں اس کی خدمت میں پیش کیا۔ حاجی محمد خان سیستانی کو اس کی رہبری کے لیے نامزد کر کے دہلی کی طرف روانہ کیا گیا اور بادشاہ سلامت وہاں سے سیر و شکار کے ارادہ سے حصار فیروزہ کی طرف روانہ ہوئے۔ چار ربیع الاول 968ھ

1560ء کو شاہانہ سواری دہلی پہنچی، وہاں سے بذریعہ کشتی 2 ربیع الثانی کو دارالخلافہ آگرہ میں یہ قافلہ اترا۔

خار مغیلان

کہتے ہیں خان خانان اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ناگور کے راستے سے گجرات کی طرف جارہا تھا ایک جنگل میں ببولوں کے جھنڈ میں سے گزرنا پڑا، وہاں اس کی دستار کانٹوں میں الجھ کر گر پڑی۔ یہ ایک برا شگون تھا اس لیے خان خانان کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

بیرم خان کی شہادت

جس وقت خان خانان پٹن سے گجرات پہنچا تو پٹن کے حاکم موسیٰ خان فولاد اور حاجی خان الوری نے اس کی تعظیم و تکریم کی اور اس کی ضیافت کا اہتمام کیا۔ قیام کے دوران ایک دن خانخاناں سہنس لنگ نامی ایک تالاب کی سیر کے لیے گیا۔ مغرب کی نماز کے لیے جب وہ کشتی سے اترا تو ایک پٹھان مبارک خان نامی کہ خان خانان نے ہندوستان کی فتح کے زمانے میں اس کے باپ کے قتل کا حکم دیا تھا اوباشوں کی ایک جماعت کو ساتھ لے کر آیا، بہانہ ملاقات کا تھا اور نیت قتل کی، چنانچہ اس نے اچانک خنجر سے بھرپور وار کیا اور بوڑھا خان اسی جگہ شہید ہو گیا۔ اس کی تاریخ شہادت ہے:

بیرم بہ طواف کعبہ چون بست احرام
در راہ شہید گشت تا یافتہ کام
تاریخ شہادتش زدل پرسیدم
گفتا کہ شہید شد محمد بیرام

خان خانان بڑا رقیق القلب انسان تھا۔ بزرگوں اور مشائخوں کا نہایت احترام کرتا تھا۔ اس کی مجلس میں ہمیشہ اللہ رسول کا ذکر رہتا تھا۔ ایک دن سیکری میں وہ ایک گوشہ نشین درویش کی ملاقات کے لیے گیا اور ان سے آیت "وتعز من تشاء و تذل من تشاء" کا مطلب پوچھا، چونکہ اس درویش نے تفسیر نہیں پڑھی تھی اس لیے اس کا جواب نہ دیا۔

خان خانان نے خود آیت کی وضاحت کی۔ "تو عزت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے قناعت کے ذریعے اور جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے سوال کے ذریعہ"

بیرم خان[8] بڑا پابند اوقات تھا، کبھی جماعت اور جمعہ کی نماز قضا نہ ہوئی، لیکن عقائد میں تفضیل کی طرف میلان رکھتا تھا۔ حافظ محمد امین خطیب سے کہا کرتا تھا دوسرے صحابہ کی نسبت حضرت امیر علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں تعظیم کے چند کلموں کا اضافہ ہونا چاہیے۔

مالوہ کی فتح

اسی سال 12 رجب کو حاکم مالوہ باز بہادر ولد سزاول خان بڑا لاؤ لشکر اور ہاتھی لے کر ادہم خان اور پیر محمد خان کے مقابلہ پر سارنگ پور سے سات کوس کے فاصلہ پر آیا، یہاں فریقین میں سخت لڑائی ہوئی جس میں باز بہادر کو شکست ہوئی۔ اس کا سارا ساز وسامان غنیمت میں آیا اور اس کے حرم کی عورتیں بھی گرفتار ہو گئیں۔

جس دن یہ فتح ہوئی مذکورہ دونوں سردار اپنے خیموں میں بیٹھے ہوئے تھے اور قیدیوں کو ان کے سامنے پیش کر کے قتل کر دیا جاتا تھا، اس وقت پیر محمد خان طنز سے فقرے چست کر رہا تھا۔ "اس مقتول کی گردن کتنی موٹی تھی"۔ "اوہ اس لاش میں سے تو ڈھیروں خون نکلا"۔ انسان اشرف المخلوقات ہے اور خلقت الٰہی کی اساس ہے، اس سنگ دل کی نظر میں اس دن انسان کھیرے ککڑی نظر آ رہے تھے وہ انسانی جان کا اس طرح مذاق اڑا رہا تھا۔ مالوہ کے سید اور مشائخ قرآن اٹھائے ہوئے جان کی سلامتی مانگتے ہوئے آئے۔ ظالم نے ان بے قصوروں کو بھی قتل کرا دیا۔

ادہم خان نے فتح کی ساری روداد شہنشاہ کے پاس لکھ کر روانہ کی اور غنیمت میں ملنے والے چند ساتھی صادق محمد خان کے ذریعے حضور میں روانہ کر دیے۔ جتنے عمدہ عمدہ ہاتھی تھے اپنے لیے اور باز بہادر کی حرم کی[9] عورتوں اور طوائفوں کو بھی اپنے حرم میں داخل کر لیا۔

اکبر کو جب یہ حال معلوم ہوا تو وہ بہ نفس نفیس 21 شعبان 968ھ/1560ء کو آگرہ سے سارنگ پور پہنچا اور ادہم خان سے سارا مال[10] وصول کر کے 29 رمضان کو آگرہ واپس آ گیا۔

خان زمان سے بدگمانی

اسی سال عدلی کے بیٹے شیر خان نے جو باپ کے مرنے پر چنہار میں اس کا قائم مقام بنا ہوا تھا ایک بڑی فوج لے کر جونپور پر حملہ کر دیا۔ خان زمان نے ابراہیم خان اوزبک، مجنوں خاں قاقشال اور شاہم خان جلایر کی مدد سے اسے شکست دی اور نمایاں کامیابی حاصل کی۔

اس واقعہ کے بعد ہی اکبر کو خان زمان کے متعلق بدگمانی ہوگئی اور وہ خود جونپور کے ارادے سے عازم سفر ہوا۔ جب کالپی پہنچا تو وہاں کے حاکم عبداللہ اوزبک نے بادشاہ کی مہمانی کا شرف حاصل کیا۔ یہاں سے سواری کڑہ کی طرف گئی۔ کڑہ میں خان زمان اور بہادر خان بھی جونپور سے آ کر حاضر خدمت ہوئے اور نذرانے میں عمدہ ہاتھی اور نفیس تحائف پیش کیے۔ بادشاہ نے ان دونوں کو خلعتیں اور گھوڑے دے کر ان کی جاگیروں پر رخصت کر دیا۔

اسی سال 17 ذی الحجہ کو بادشاہ سلامت آگرہ واپس تشریف لے آئے۔

اجمیر کی زیارت

969ھ/1551ء میں اکبر نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی زیارت کے لیے اجمیر کا ارادہ کیا اور وہاں پہنچ کر درگاہ کے مجاوروں کو کثیر انعامات عطا کیے۔ اسی سفر میں جب شاہی قافلہ سانبھر کے قصبہ میں پہنچا تو انبیر کے حاکم راجہ بہارمل اور اس کا بیٹا رائے بھگوان داس حاضر ہوئے۔ راجہ نے اپنی ایک بیٹی بھی بادشاہ کے نکاح میں دے دی۔

اکبر نے مرزا اشرف الدین حسن کو جس کی جاگیر اجمیر کے علاقے میں تھی، میرٹھ کے قلعہ پر حملہ کرنے کے لیے مامور کیا۔ یہ قلعہ اجمیر سے بیس کوس پر تھمل راجپوت کے قبضے میں تھا۔ اس مہم کے انتظام کے بعد اکبر دار السلطنت واپس ہوگیا۔

میرٹھ کے قلعہ پر چڑھائی

مرزا شرف الدین میرٹھ کے قلعہ پر چڑھائی کر کے محصور کی اس شرط پر جان بخشی کہ وہ

سب قلعہ خالی کر کے نکل جائیں اور مال و اسباب قلعہ ہی میں چھوڑ دیں۔ محصور صلح کی شرائط کے مطابق قلعہ کو چھوڑ کر چلے گئے لیکن اس کے ایک سپاہی دیوداس نے قلعہ سے نکلتے وقت کچھ لوگوں کی مدد سے سارے مال و اسباب میں آگ لگادی اور شرف الدین کے لشکر پر حملہ کر کے بہت سے آدمیوں کو قتل کردیا۔ آخر خود بھی لڑتے ہوئے مارا گیا اور اس کے ساتھ جو دو سو آدمی تھے وہ بھی ہلاک ہوگئے۔ قلعہ، شاہ بداغ خان اور اسکے بیٹے عبدالمطلب خان اور دوسرے امیروں کی کوشش سے فتح ہوا۔

باز بہادر کا انجام

جب ادہم خان دربار میں چلا گیا تو مالوہ میں پیر محمد خان حاکم ہوگیا اور وہاں اس نے ایک بڑا لشکر جمع کر کے برہانپور اور بیجا گڑھ کے قلعوں کو فتح کیا۔ نربدا ندی کے دوسرے ساحل تک فوجی کاروائی کر کے اس طرح قتل عام کیا کہ وہ سارا علاقہ بے چراغ ہوگیا۔

باز بہادر شکست کھانے کے بعد اس علاقہ کے کئی اور حاکموں کے ساتھ یہاں سے وہاں پھر رہا تھا۔ اتفاق سے ایک مرتبہ پیر محمد خان اپنے لشکر سے جدا ہوگیا۔ باز بہادر نے موقع پاکر اس پر حملہ کردیا۔ پیر محمد خان گھبرا کر منڈو کی طرف بھاگا، دشمن کے خوف سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ دریائے نربدا میں گھوڑے ڈال دیے۔ اس وقت کچھ اونٹ بھی دریا پار کر رہے تھے۔ ایک اونٹ بدحواس ہوکر اس کے گھوڑے پر آگرا اور وہ اس کے ساتھ ہی ڈوب کر مرگیا۔ پیر محمد خان کی وفات کے بعد مالوہ پر متعینہ سردار وہاں ٹھہر نہ سکے اور دربار میں واپس چلے آئے حسب الحکم انھیں قید کردیا گیا چند روز بعد انکو رہائی ملی۔

مغل سرداروں کی واپسی کے بعد باز بہادر نے اپنے وطن پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔ بعد میں عبداللہ خان اوزبک نے معین الدین احمد خان فرنخودی کی مدد سے دوبارہ حملہ کر کے اسے پھر مالوہ سے بے دخل کردیا۔ باز بہادر چند روز تو رانا اودے سنگھ کی پناہ میں چتوڑ اور اودے پور میں رہا۔ چند دن اس نے گجرات میں گزارے، آخر مجبور ہوکر دربار شاہی حاضر ہوکر اکبر کے مصاحبوں میں شامل ہوگیا۔ چند دن اسے قید میں رکھا گیا تھا بعد میں رہا کردیا

گیا۔ لیکن موت سے چھٹکارا کہاں؟ رہائی کے چند دن بعد ہی اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔
مالوہ کی مہم کے بعد عبداللہ خان اوزبک ہانڈیہ کو اور اس کے معاون امیر اپنی اپنی جاگیروں پر چلے گئے اور معین الدین احمد خان دربار میں حاضر ہوگیا۔

اسی سال خواجہ عبداللہ مروارید (جو ایک مشہور وزیر گزرا ہے) کا پوتا خواجہ محمد صالح صدارت کے عہدہ پر فائز ہوا لیکن اسکو صرف دیوان کے اختیارات حاصل تھے انعامات، اراضی کے عطیات اور امداد و وظائف دینے کا اسے اختیار نہیں دیا گیا تھا۔

سفیر ایران کی آمد

اسی سال شاہ طہماسپ کی طرف سے ایک سفیر سید بیگ ولد معصوم بیگ ہمایوں بادشاہ کی تعزیت کے سلسلے میں شاہی مکتوب لے کر آیا۔ دربار میں اس سفیر کی تعظیم و تکریم کی گئی اور بادشاہ نے اسے سات لاکھ تنکہ انعام دیا اور خلعت اور گھوڑا عطا فرمایا۔ امرا نے بھی اس کی ضیافت کی اور تحفے دیے۔ وہ ہندوستان سے بے شمار تحائف لے کر لوٹا۔

ادہم خان کی بغاوت

بادشاہ نے اتکہ خان کو جس کا لقب اعظم خان تھا، پنجاب سے بلا کر مملکت کا وزیر مطلق بنا دیا تھا۔ ادہم خان کو بادشاہ کے تقرب پر بڑا ناز تھا اور وہ اس بات سے سخت ناراض بھی تھا کہ ماہم اتکہ سے وکالت کا عہدہ چھین کر اتکہ خان کو دے دیا گیا۔ اس پر چند حاسد امیروں نے خاص طور سے منعم خان اور شہاب الدین احمد خان نے اسے اتکہ خان کے خلاف اس قدر ورغلایا کہ اس نے غضب ناک ہوکر عین دربار میں اتکہ خان پر حملہ کر کے اسے ٹکڑے ٹکڑے کردیا اور اسی طرح سے تلوار لے کر حرم شاہی کے دروازہ پر جا کر کھڑا ہوگیا۔ شاہنشاہ بھی تلوار کھینچے ہوئے باہر نکلے اور اس سے پوچھا "یہ آخر تو نے کیا کیا"؟ اس نے بے باکی سے جواب دیا "ایک غدار کو میں نے کیفر کردار تک پہنچا دیا"۔ شہنشاہ کے حکم(۱۱) سے ادہم خان کے ہاتھ پیر باندھ کر محل کی چھت پر سے نیچے گرا دیا گیا۔ اس کے

جسم میں چونکہ جان باقی رہ گئی تھی اس لیے شہنشاہ نے حکم دیا "اسے دوبارہ گراؤ"۔

ادہم خان کے چالیسویں کا کھانا کھلانے کے بعد اس کی ماں ماہم انگہ (12) بھی بیٹے کی غم میں مرگئی۔ اسی سال میرے والد (صاحب تصنیف منتخب التواریخ) شیخ ملوک شاہؒ بھی 27 رجب کو آگرہ میں انتقال فرما گئے۔ میں نے ان کی میت بساور میں لے جا کر دفن کی تھی۔ یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ والد مرحوم کے پیر شیخ پنجو سنبل جن کے ساتھ مرحوم کی بڑی عقیدت و ارادات تھی اسی سال وہ محبوب حقیقی سے جا ملے۔

منعم خان کا فرار اور گرفتاری

منعم خان خانخاناں اور محمد قاسم خان میر بحر اس خوف کے مارے کہ کہیں وہ ادہم خان کو بھکانے کے الزام میں پکڑے نہ جائیں اور دوسری بعض وجوہات کی بنا پر بھی سیر کے بہانہ سے کشتی میں بیٹھ کر دریا پار کر گئے اور وہاں کے بعض زمینداروں کی مدد سے دو تین سوار ساتھ لے کر روپڑ اور بجوارہ کے راستے پہاڑ کے دامن کی طرف نکل گئے۔ وہاں سے ان کا ارادہ کابل چلے جانے کا تھا کیونکہ وہاں منعم خان کا لڑکا غنی خان حاکم تھا۔ لیکن جب وہ دوآبہ میں سرت کے پرگنہ پہنچے جو میر محمد منشی کی جاگیر میں تھا تو قاسم علی خان سیستانی نے جو پرگنہ کا شقدار تھا، جنگل میں ان کو دیکھ لیا اور ان کے انداز کو دیکھ کر سمجھ گئے کہ یہ بھاگے ہوئے ہیں اُس نے وہاں کے اوباشوں کی ایک جمعیت لے کر انھیں گھیر لیا اور دونوں کو باندھ کر سید محمود بارہہ کے آدمیوں کو جو اس علاقہ میں ٹھہرے ہوئے تھے مطلع کیا۔ سید محمود نے اپنے عزیزوں اور لڑکوں کو ان دونوں کے ہمراہ کر کے ان کو پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ آگرہ بھیج دیا۔ جب ان کے واپس آنے کی خبر ملی تو شاہنشاہ نے افسروں کی ایک جماعت کو ان کے استقبال کے لیے روانہ کیا اور دوبارہ وکالت کا عہدہ پہلے سے کہیں زیادہ اعزاز کے ساتھ منعم خان کے حوالے کر دیا تا کہ وہ اس ذمہ داری کو شہاب خان اور خواجہ جہان کی مدد سے سرانجام دے۔

گکھڑوں کی شکست

اسی سال خان کلاں میر محمد خان اتکہ نے کمال خان گکھڑ کی مدد کے لیے ایک بڑی فوج لے کر گکھڑوں کے وطن پر چڑھائی کی اور سخت جنگ کر کے کمال خان کے چچا سلطان آدم کو اسیر کر لیا اس کا لڑکا لشکری کشمیر کی جانب بھاگ گیا لیکن بعد میں گرفتار ہو گیا اور دونوں باپ بیٹے اپنی موت مر گئے۔ خان کلاں وہ سارا علاقہ کمال خان گکھڑ کے حوالے کر کے آگرہ واپس آ گیا۔

ایک روز شاہنشاہ نے ایک بڑا جشن منعقد کیا تھا۔ اس محفل میں خان کلاں میر اتکہ نے ایک قصیدہ جسے وہ اپنے خیال میں بڑا کارنامہ سمجھ رہا تھا، پڑھنا چاہا۔ محفل میں تمام امراء، سردار، اہل علم اور بڑے بڑے شاعر جمع تھے۔ جب خان کلاں نے اپنے قصیدہ کا مطلع اٹھایا اور یہ مصرع پڑھا:

بحمد اللہ کہ دیگر آدم فتح گکھڑ کردہ

اچانک اس کا رشتہ دار عبد الملک خان اٹھ کر آگے آیا۔ اس وقت شاہنشاہ پوری توجہ سے اس کا قصیدہ سن رہے تھے، بلکہ یہ مجلس اسی قصیدہ کے لیے منعقد کی گئی تھی اور خان کلاں کو بادشاہ سے بھاری صلے کی امید تھی، عبد الملک خان نے سامنے آ کر بلند آواز سے کہا:

میرے خان "دیگر آدم، نہیں بلکہ "دیگر آدمیم" کہو، کیونکہ دوسرے بہت سے بد نصیب بھی تمہارے ساتھ تھے۔ عبد الملک کی اس اصلاح پر ساری مجلس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ خان کلاں نے اپنی پگڑی زمین پر رکھ دی اور فریاد کی۔

"اس بد تمیز مسخرے سے حضور ہی میرا انصاف کریں گے اس نے تو میری ساری محنت خاک میں ملا دی"۔

عبد الملک بڑا پر مذاق آدمی تھا، چنانچہ اس نے اپنے نام کا سجع بھی بڑا مضحکہ خیز بنایا تھا:

عبد ما چوں با ملک افزون کنی
پس الف لامی درو اندرون کنی

ملا شیری ہندی شاعر نے اپنا مشہور قصیدہ "مدح وقدح" اسی کے نام پر لکھا تھا۔ اس قصیدہ کا ایک شعر ہے:

اگر گوار بیاید مقابل تو گریز
کہ صباحی و مقابل نمی شوی بگوار

مدرسۂ خس

اسی سال مولانا علاؤالدین لاری جنھوں نے شرح "عقائد نسفی" پر حاشیے لکھے ہیں، خان زماں کے پاس جونپور گئے۔ یہاں انھوں نے ایک چھپر ڈال کر مدرسہ قائم کیا اور تعلیم و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ اس مدرسہ کی تاریخ بناء ہے:

"مدرسۂ خس"

بعد میں وہ حج کے لیے تشریف لے گئے اور اسی سفر میں سفر آخرت کے لیے کمر باندھ لی۔

کابل کے ہنگامے

اسی سال کابل کے حالات بھی خراب ہو گئے اور ایک مختصر سی مدت میں کابل پر کئی ایک حاکموں کا تقرر و تبادلہ ہو گیا۔ منعم خان جب کابل سے ہندوستان آیا تھا تو اس نے حیدر خان آختہ بیگی کو وہاں اپنا نائب بنا دیا تھا، لیکن اس کی بدسلوکی کی وجہ سے اس کی جگہ اپنے بیٹے غنی خان کو قائم مقام بنا دیا، وہ بھی نالائقی میں حیدر خان سے کچھ کم نہیں تھا چنانچہ اس نے کابل کے ایک صاحب اقتدار میر تولک خان قوچین کو بے سبب ہی قید کر دیا۔ بعد میں تولک خان نے قابو پا کر غنی خان کو قید میں ڈال دیا۔ غنی خان بڑے وعدے وعید کے بعد اس قید سے رہائی پائی، پھر اس نے تولک خان سے بدعہدی کی اور اس پر حملہ کر دیا۔ تولک خان نے اس سے مقابلہ نہ کیا اور اپنی جاگیر چھوڑ کر ہندوستان چلا آیا۔ ہمایوں بادشاہ کی بیوی جوجک بیگم نے جو ہمایوں کے دس سالہ لڑکے مرزا حکیم بیگ کی والدہ تھی، شاہ ولی بیگ اتکہ اور منعم خان کے بھائی فضائل بیگ (مرزا کامران نے اسے اندھا کر دیا تھا اس

لیے اس کو کور کہتے تھے) اور اس کے لڑکے ابو الفتح بیگ کی مدد سے کابل کے قلعہ کے دروازے بند کر لیے اور غنی خان کو اندر داخل نہ ہونے دیا۔ غنی خاں بھی مجبور ہو کر ہندوستان آ گیا چونکہ باپ (منعم خاں) اس سے ناراض تھا اس لیے یہاں اس کی سرخروئی کا کوئی ذریعہ نہ نکل سکا اور وہ جونپور میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ اسی حال میں وہ اپنے دن پورے کر گیا۔

فضائل بیگ مذکور تو بیگم کی جانب اور ابو الفتح بیگ باپ کی جانب سے کابل کے نائب بن کر گئے اور وہاں انھوں نے اپنے لیے اچھی اچھی جاگیریں مخصوص کر لیں اور مرزا کی عمل داری میں کمزور جاگیریں چھوڑ دیں۔ شاہ ولی اتکہ کو ان کی یہ کارروائی بڑی ناگوار گزری اس نے علی محمد اسپ کی مدد سے بیگم کے اشارے پر ایک رات ابو الفتح بیگ کو جب کہ وہ نشے میں چور تھا، قتل کر دیا۔ اس کا باپ اپنا سارا مال متاع لے کر ہزارہ کی طرف کوچ کر گیا میرزا کے آدمیوں نے اس کا پیچھا کر کے اسکو تہہ تیغ کر دیا۔

جوبک بیگم کا اقتدار

شاہ ولی بیگ نے بیگم کی تائید و مدد سے کابل کا سارا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے کر اپنا خطاب عادل شاہ رکھ کر خود مختار بن بیٹھا۔ اس کی مرمت کے لیے شہنشاہ نے منعم خان کو کابل کی حکومت اور میرزا حکیم بیگ کی اتالیقی پر مقرر کر کے چند امراء کے ساتھ روانہ کیا۔ منعم خان کے مقابلے پر جوبک بیگم میرزا کو ہمراہ لے کر کابل کے پورے لشکر کے ساتھ جلال آباد پہنچ گئی۔ بیگم کے مقابلہ میں منعم خان اور اس کے تمام مددگار امیروں محمد قلی خان برلاس، شہاب خاں کے بھائی حسن خان وغیرہ کو پہلے ہی حملہ میں بری طرح شکست کھانی پڑی۔ یہ لوگ سارا لاؤ لشکر تباہ کر کے بڑی بری حالت میں بادشاہ کی خدمت میں واپس آئے۔ اس فتح کے بعد بیگم[13] نے شاہ ولی کو غداری کے الزام میں گرفتار کر کے قتل کرا دیا۔

شاہ ابو المعالی کی بغاوت

اسی سال شاہ ابو المعالی مکہ سے واپس آیا۔ اسی زمانہ میں میرزا اشرف الدین حسین آگرہ سے بھاگ گیا تھا اس کے تعاقب میں بادشاہ نے حسین قلی خان اور صادق محمد خان وغیرہ کو مقرر کیا تھا۔ جب شاہ ابو المعالی راستے سے وہاں پہنچا تو میرزا اشرف الدین کے بہکانے سے اس نے بھی بغاوت کا رخ اختیار کر لیا اور فتنہ و فساد مچاتے ہوئے ہر جگہ لوٹ مار کرنے لگا۔ حسین قلی خان کے رشتہ دار اسماعیل قلی خان احمد بیگ اور اسکندر بیگ اسکا پیچھا کرنے لگے۔ اسی تاخت و تاراج میں شاہ ابوالمعالی نے نارنول کے قلعہ کے سرکاری خزانے کو لوٹ کر اپنے ساتھیوں میں تقسیم کردیا۔

محمد صادق خان اور اسماعیل قلی خان نے حملہ کرکے نارنول کے علاقے میں ابو المعالی کے بھائی خان زادہ کو جسے شاہ سوندان بھی کہتے تھے، گرفتار کرلیا۔ بھائی کی گرفتاری سے ابو المعالی بے چارہ ہوگیا اور مجبوراً اس نے ہندوستان کو چھوڑ کر کابل کی راہ لی۔ پنجاب میں اس نے اسکندر بیگ اور احمد بیگ کو جو اپنے ساتھی امیروں سے جدا ہو گئے تھے۔ ان کے ملازموں سے سازش کرکے گھیر لیا اور اسے قتل کردیا۔ ماہ جوبک بیگم والدۂ میرزا محمد حکیم کے پاس ایک عریضہ روانہ کیا جس میں اس نے مرحوم ہمایوں بادشاہ کے ساتھ اپنے خلوص و عقیدت کا اظہار کیا تھا اور اس کے سرنامے پر یہ شعر لکھا تھا:

ما بدین در نہ پی حشمت و جاہ آمدہ ایم
از بدحادثہ این جابہ پناہ آمدہ ایم

جوبک بیگم نے اس کے جواب میں لکھ بھیجا:

کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست

ابو المعالی کا کابل پر قبضہ

جب شاہ ابو المعالی وہاں پہنچا تو بیگم نے اس کے ساتھ اپنی لڑکی کا نکاح بھی کردیا اور کابل کا سارا نظم و نسق ابو المعالی کے ہاتھ میں آگیا۔ کچھ دن بعد ہی ابو المعالی نے بعض شر

پسندوں جیسے شوکون ولد قراچہ خان وغیرہ کے بہکانے سے بیچاری بیگم کو قتل کرا دیا، حیدر قاسم کوہ بر کو بھی جو شاہ ولی بیگ کے بعد کچھ عرصے تک کابل کا وزیر مطلق رہا تھا شہید کر دیا اور اس کے بھائی محمد قاسم کوہ بر کو قید میں ڈال دیا۔

شاہ ابو المعالی کے اس خون خرابے پر لوگ بگڑ گئے اور ایک بڑی جماعت بیگم کے انتقام کے لیے مقابلہ پر آ گئی۔ کابل کے قلعہ میں فریقین میں سخت لڑائی ہوئی۔ ان لوگوں نے محمد قاسم کو قید خانہ سے نکال لیا۔ محمد قاسم یہاں سے نکل کر بدخشاں چلا گیا اور وہاں مرزا سلیمان کو شاہ ابو المعالی کی بغاوت کو کچلنے کے لیے آمادہ کیا۔ میرزا محمد حکیم نے اپنے قاصد بھیج کر اس کو کابل آنے کی دعوت دی۔

مرزا شرف الدین حسین کی بغاوت

میرزا شرف الدین حسین نے بادشاہ کا بخوبی اعتماد حاصل کر لیا تھا اور ناگور سے دارالخلافہ آگرہ آ گیا تھا۔ میرزا کا خاندانی تعلق چار واسطوں سے خواجہ عبید اللہ احرارؒ سے ملتا ہے: شرف الدین حسین ولد خواجہ معین الدین ولد خواجہ خاوند ولد خواجہ یحییٰ ولد خواجہ احرار۔ آگرہ میں رہتے ہوئے ان دنوں جب کہ اس کے والد مکہ معظمہ کی زیارت سے واپس آ چکے تھے۔ شرف الدین حاسدوں کے بہکاوے میں آ کر بغیر کسی ظاہری وجہ کے بادشاہ کی طرف سے بدگمان ہو گیا اور ناگور واپس چلا گیا۔ بادشاہ نے اس کے تعاقب میں صادق محمد خان اور ایک جمعیت کو حسین قلی خان کے ہمراہ کر کے روانہ کیا اور انھیں ہدایت کی کہ پہلے تو اسے تسلی اور دلاسہ دے کر سیدھی راہ پر لائیں اور اگر نہ مانے تو کام تمام کر دو۔ مرزا شرف الدین ناگور جاتے ہوئے اجمیر کا قلعہ ترخان دیوانہ کے حوالہ کرتا گیا، لیکن دیوانہ بھی قلعہ خالی کر کے اس کے پیچھے چلا گیا۔ جالور کے مقام پر مرزا شرف الدین حسین کی شاہ ابو المعالی سے ملاقات ہوئی تھی، ان دونوں نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ شاہ ابوالمعالی تو حسین قلی خان کی فوج پر جو حاجی پور میں رکی ہوئی تھی حملہ کرے گا، اس کے آنے تک مرزا شرف الدین اسی جگہ شاہی فوج کو پریشان کرتا رہے گا۔ اس منصوبے پر پوری طرح عمل نہ ہو سکا

کیونکہ جب شاہ ابو المعالی کو خبر ملی کہ صادق محمد خان اور دوسرے امیر اس کے مقابلہ پر بڑی فوج لے کر آ رہے ہیں تو وہ اس قرار داد کو چھوڑ کر پہلے نارنول گیا اور وہاں کے حاکم میر گیسو شقدار کو گرفتار کر کے اس سے کچھ روپیہ وصول کرلیا۔ پھر سیدھا کابل کی طرف نکل گیا۔ شاہی لشکر سے احمد بیگ، اسکندر بیگ، صادق محمد خان اور اسماعیل قلی خان الگ ہو کر اس کا پیچھا کرنے لگے۔

احمد بیگ اور اسکندر بیگ نے مرزا شرف الدین کے چند آدمیوں کو اپنے پاس ملازم رکھ لیا تھا اور ان پر کافی بھروسہ کرنے لگے تھے۔ ان ملازموں نے ایک مفسد شخص زمانہ قلی نامی کے ذریعے شاہ ابو المعالی کو یہ پیغام بھیجا کہ تم فلاں جگہ ڈٹے رہو، جس وقت یہ دونوں سردار وہاں پہنچیں گے ہم ان کا کام تمام کردیں گے۔ اس سازش کے مطابق جب وہ دونوں مقررہ مقام سے گزرے تو شاہ ابو المعالی نے اچانک گھات سے نکل کر ان پر حملہ کردیا اور ان مفسد مخبروں نے ان دونوں کو قتل کردیا۔ مقتول سرداروں کے ساتھی منتشر ہو کر بھاگ گئے۔

دہلی میں ہلچل

جب اس واقعہ کی تفصیلات اکبر کو معلوم ہوئیں تو وہ اس بغاوت کو ختم کرنے کے لیے خود دہلی آیا۔ بادشاہ کی آمد کے بعد دہلی میں ایک ہنگامہ سا برپا ہوگیا۔ دہلی پہنچنے کے بعد بادشاہ کے دل میں آیا کہ وہ دہلی کے امرا اور شرفاء کی بیٹیوں سے نکاح کرلے، چنانچہ بادشاہی خواجہ سرا اور مشاطہ عورتیں لڑکیوں کے انتخاب کے لیے دہلی کے گھرانوں میں آنے جانے لگیں اور دہلی والوں میں بڑی ہلچل سی مچ گئی۔ اکبر کو اس بات پر شیخ بدھ اور آگرہ کے امرائے بہرہ نے آمادہ کیا تھا۔ بادشاہ کا دل دہلی کی ایک عورت پر آگیا تھا، وہ عورت عبد الواسع کی زوجہ تھی۔ بادشاہ کی خواہش اور مطالبہ پر عبد الواسع نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ اسے شاہی حرم سرا میں داخل کردیا گیا اور بیچارہ عبد الواسع اس شرم کے مارے دہلی چھوڑ کر دکن میں بیدر جا کر بس گیا۔

قاتلانہ حملہ

دہلی کے قیام کے دوران ایک دن بادشاہ سیر کرتے ہوئے بیگم کے مدرسہ کی طرف جا نکلا، مدرسہ کی چھت پر سے فولاد نامی ایک لڑکے نے جو مرزا شرف الدین حسین کا غلام تھا، بادشاہ کو نشانہ بنا کر تیر چھوڑ دیا، نشانہ چوک گیا اور تیر بادشاہ کے جسم کو چھوتا ہوا نکل گیا۔ خوش قسمتی سے بادشاہ کی جان بچ گئی۔ امراء نے مجرم کے خلاف باقاعدہ تحقیقات کرنے اور مقدمہ چلانے کی رائے دی تاکہ ان سب لوگوں کا پتہ چل جائے جو اس قاتلانہ حملہ کی سازش میں شریک ہیں، لیکن بادشاہ نے اس بات کو قبول نہ کیا اور اس لڑکے کو اسی وقت قتل کرادیا وہاں سے سوار ہوکر قلعہ دین پناہ میں آکر ٹھہر گیا۔ طبیبوں کے علاج سے چند دن میں ہی وہ زخم اچھا ہوگیا۔ صحت پانے کے بعد بادشاہ دہلی سے لوٹ کر 970ھ/1562ء میں آگرہ واپس آ گیا۔

مرزا سلیمان کی کابل پر فوجی کاروائی

اسی سال شاہ ابو المعالی کا معاملہ بھی ختم ہوگیا۔ محمد قاسم کوہ برکی تحریک پر مرزا سلیمان نے بدخشاں سے کابل پر فوجی کاروائی کی۔ ابو المعالی میرزا حکیم کو ساتھ لیکر مقابلہ کے لیے آیا۔ دونوں میں یہ لڑائی غور بند کے کنارے پر ہوئی۔ سخت مقابلہ کے بعد شاہ ابو المعالی کی فوج کا ایک پہلو پسپا ہونے لگا۔ اس محاذ کو سنبھالنے کے لیے ابو المعالی خود اس طرف روانہ ہوا اور سلیمان مرزا کے مقابلہ پر مرزا محمد حکیم کو چھوڑ گیا۔ اس کے پیٹھ پھیرتے ہی مرزا محمد حکیم نے اپنے خاص آدمیوں کو ساتھ لے کر دریا پار کیا اور سلیمان مرزا سے جا کر مل گیا۔ اس صورت میں ابو المعالی کے قدم اکھڑ گئے، وہ میدان جنگ چھوڑ کر فرار ہوگیا لیکن سلیمان۔ مرزا کے آدمیوں نے اس کا پیچھا کر کے چاریکاروں کے قصبہ میں اسے گرفتار کر لیا۔ کابل میں سلیمان مرزا کے سامنے اسے لایا گیا۔ سلیمان مرزا نے اسے اسی طرح مرزا محمد حکیم کے پاس بھیج دیا۔ شہزادہ نے اسی وقت اسے پھانسی پر چڑھا کر اپنی ماں کے قتل کا انتقام لے لیا۔ یہ واقعہ 17 ماہ رمضان 970ھ/1562ء میں پیش آیا۔

ان واقعات کے بعد سلیمان مرزا نے اپنی بیٹی کا عقد مرزا محمد حکیم سے کردیا اور اپنے ایک معتمد ملازم امید علی کو اس کا وکیل مقرر کر کے بدخشاں واپس چلا گیا۔

چنار کے قلعہ پر قبضہ

اسی سال عدلی کے ایک غلام جمال خان نے چنار کا قلعہ ایک دوسرے غلام فتو نامی کے سپرد کردیا۔ فتو نے قلعہ پر قابض ہونے کے بعد بادشاہ کے دربار میں عریضہ روانہ کیا، جس کے جواب میں بادشاہ نے فتو کے پیر شیخ محمد غوث اور آصف خان خواجہ عبدالحمید ہروی کو فتو کے پاس روانہ کیا ان لوگوں نے شرائط صلح طے کر کے فتو سے قلعہ کا قبضہ لے لیا اور قلعہ داری حسن خان ترکمان کو دے دی۔ فتو کو اپنے ہمراہ دربار شاہی میں لے آئے۔ یہاں اس نے بڑی عزت اور مرتبہ پایا۔ اسی دوران میں شیخ محمد غوث کا انتقال ہوگیا۔

اسی سال میرے نانا (صاحب منتخب التواریخ) مخدوم اشرف نے 20 رمضان کو رحلت کی۔

خواجہ اور راجہ کی نوک جھونک

971ھ/ 1563ء خواجہ مظفر علی تربتی کو خان کا خطاب اور وزارت کا عہدہ ملا۔ اس کے تقرر کا مادۂ تاریخ ''ظالم'' ہے۔ خواجہ کی راجہ ٹوڈرمل سے نہ نبھ سکی ان دونوں کے درمیان ذرا ذرا سی بات پر ہر روز ہی جھگڑا رہتا تھا۔ کسی ظریف نے ان دونوں کے متعلق اس ضرب المثل کو:

سگ کاشی بہ از صفا ہانی　　　گرچہ صد بار سگ زکاشی بہ

اس طرح بدل کر کہا ہے:

سگ راجہ بہ از مظفر خان　　　گرچہ صد بار سگ ز راجہ بہ

امرائے دربار نے راجہ ٹوڈرمل کے خلاف محاذ سا بنا لیا اور انھوں نے بادشاہ سے اس کی شکایتیں کیں۔ اکبر نے جواب دیا ''تم سب اپنی اپنی جاگیروں میں ہندوؤں کو ملازم رکھتے

ہو، یہ ہماری سرکار کا ہندو ہے، پھر کیوں ناراض ہوتے ہو؟"

ایک شخص نے راجہ کی مہر کے لیے یہ سجع تجویز کیا تھا:

آنکہ شد کار ہندو از و مختل

راجۂ راجہاست ٹوڈرمل

اسی سال بادشاہ نے قاضی لال کو جو بڑا ظریف آدمی تھا کسی جرم میں برن سے طلب کرکے قتل کرادیا تھا۔

رانی درگاوتی

اسی سال عدلی کے ایک بڑے امیر غازی سور نے بغاوت کی۔ یہ شخص کئی بار بادشاہی دربار میں حاضر ہوا اور ہر مرتبہ سرکش ہو کر بھاگ گیا، اس مرتبہ اس نے کنڑہ کے علاقے میں اچھی خاصی جمعیت فراہم کرلی اور آصف خان پر حملہ کردیا۔ آصف خان نے اسے شکست دی وہ اسی لڑائی میں مارا گیا۔ اس فتح سے آصف خان کا اثر و اقتدار بہت بڑھ گیا اور اس نے قوت حاصل کرکے کنڑہ اور کنطہ کے علاقہ پر حملہ کردیا۔ اس علاقہ میں اس وقت ستر ہزار گاؤں آباد تھے اور اس کا صدر مقام قلعہ چوڑا گڑھ تھا۔ وہاں کی رانی بڑی خوبصورت اور حسین عورت تھی اس کا نام درگاوتی تھا۔ آصف خان کے مقابلہ پر رانی بیس ہزار سوار پیادے اور سات سو جنگی ہاتھی لے کر آئی، فریقین میں بڑی سخت لڑائی ہوئی، آخر ایک محاذ پر رانی تیر لگنے سے بری طرح زخمی ہوگئی۔ اپنی ناموس کے خیال سے اس نے فیل بان کو حکم دیا کہ وہ اسے قتل کردے، فیل بان نے ایک خنجر مار کر اس کا کام تمام کردیا، لیکن حملہ آوروں میں سے ایک اوباش سپاہی نے رانی کے لاشہ سے ہی اپنی ہوس نکالی۔ رانی کو شکست دینے کے بعد آصف خان نے چوڑا گڑھ پر حملہ کردیا، وہاں رانی کے لڑکے سے کچھ مقابلہ ہوا لیکن وہ مارا گیا۔ آصف خان کو مال غنیمت میں اتنا خزانہ ملا جو شمار سے باہر تھا۔ اسی مال کا غرور تھا کہ آصف خان میں بڑی نخوت پیدا ہوگئی لیکن جلدی ہی اس کا غرور خاک میں مل گیا۔

ہاتھیوں کا شکار

اسی سال 12 ذی قعدہ کو عین موسم برسات میں بادشاہ نے ہاتھیوں کے شکار کے ارادہ سے نرور کی طرف کوچ کیا اور اس شکار میں اس نے ہاتھیوں کو گرانے اور پکڑنے کے لیے چند نئے طریقے ایجاد کیے۔ نرور سے شاہی سواری سارنگ پور ہوتی ہوئی مندو کے علاقہ میں پہنچی۔ عبد اللہ خان اوزبک اپنے بعض جرائم کی وجہ سے خوف زدہ تھا اس لیے وہ مندو سے بھاگ کر گجرات چلا گیا۔ منعیم خان نے جس کو اس مہم میں شجاعت خان کا خطاب ملا تھا اوزبک کو جا کر بہت کچھ سمجھایا اور اسے دلاسہ دیا لیکن وہ مطمئن نہ ہوا۔ بادشاہی ہراول سے اس نے کچھ مقابلہ بھی کیا۔ جب اکبر قریب پہنچ گیا تو وہ اپنے اہل و عیال اور مال و اسباب کو چھوڑ کر چند آدمیوں کے ساتھ گجرات میں چنگیز خان کے پاس چلا گیا۔ بادشاہ کے آدمی گجرات کی حدود تک عبد اللہ خان کا پیچھا کرتے رہے اور اس کے حرم اور ہاتھیوں وغیرہ کو پکڑ لائے۔ جو بچ گئے انھیں جاٹوں نے دھر لیا۔

گجرات کا حاکم چنگیز خان

چنگیز خان سلطان محمود گجراتی کا غلام تھا۔ سلطان کے مرنے کے بعد گجرات کا حاکم بن گیا تھا۔ عام طور پر مشہور ہے کہ اس کے عہد میں گجرات ایسا آباد تھا کہ پہلے اس کی مثال نہیں ملتی۔ علم و فضل کا وہاں بڑا دور دورہ تھا۔ جو بے سہارا بھی خان کا سپاہی بن جاتا تھا وہ ہر طرح سے خوشحال ہو جاتا تھا۔ چنگیز خان بڑا فیاض شخص تھا، وہ ہر روز اپنے پہننے کے پانچ چھ جوڑے لوگوں میں تقسیم کرا دیتا تھا اور اس کا ہر جوڑا پچاس، ستر یا اسی اشرفی سے کم دام کا نہیں ہوتا تھا۔

اس کی سخاوت کا ایک معمولی واقعہ مشہور ہے کہ ایک روز اپنے غلاموں کے ساتھ سیر کر رہا تھا، عبد اللہ خان اوزبک بھی اس کے ساتھ تھا، اتفاق سے اسی وقت نقدی اور اسباب سے بھری ہوئی دو تین کشتیاں اس کے نذرانے میں پیش کی گئیں، اس نے اسی وقت وہ کشتیاں عبد اللہ خان کو بخش دیں۔

شاہ عارف ایک عامل، جنوں کی تسخیر کے عمل میں بہت مشہور تھا۔ میں نے اسے لاہور میں دیکھا تھا۔ وہ لوگوں میں خزانے کے خزانے لٹایا کرتا تھا۔ یہ ساری دولت اسے گجرات ہی سے ملی تھی کیوں کہ اس کی اشرفیوں پر بھی چنگیز خان کا ہی سکہ کندہ تھا۔

اسی سفر کے دوران برہان پور کے میران مبارک شاہ نے قاصد بھیج کر اطاعت کا اظہار کیا۔ بادشاہ نے اپنے خواجہ سرا اعتماد خان کو ان قاصدوں کے ہمراہ بھیجا اور وہ جا کر میران شاہ کے بیٹے کو بڑے تحفوں اور نذرانوں سمیت اپنے ساتھ لے آیا۔

اسی سال دکن کے ایک نامی امیر مقرب خان نے بھی آکر اطاعت قبول کی۔

محرم 972ھ/1554ء میں بادشاہ نے مندو سے قصبۂ ناگچہ کا رخ کیا اور اس علاقہ کی حکومت قرا بہادر خان کو عطا کی۔ یہاں سے شکار کھیلتے ہوئے اجین، سارنگ پور اور گوالیار کے راستے سے بادشاہ 3 ربیع الاول کو آگرہ واپس آ گیا۔

اسی سال محل شاہی میں کسی حرم کے بطن سے حسن اور حسین نامی دو توام لڑکے پیدا ہوئے لیکن ایک مہینہ زندہ رہ کر دونوں مر گئے۔

نگر چین نامی شہر کی تعمیر

اکبر بادشاہ نے شہر نگر چین کو اسی سال تعمیر کرایا تھا جس وقت اکبر نامہ کی تصنیف ہو رہی تھی۔ ابو الفضل نے اس شہر کی تعریف میں چند سطریں مجھ (یعنی مصنف منتخب التواریخ) سے لکھوائی تھیں اب اس شہر اور اسکی عمارتوں کا کوئی نشان تک نہیں رہا۔

صدر الصدور کا عہدہ

اسی سال یا سال گذشتہ بادشاہ نے اندری کرنال کے قصبہ سے شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ[14] کے پوتے شیخ عبد النبی محدث کو بلا کر صدر الصدور بنایا اور انھیں یہ اجازت دی کہ مظفر خان کی مدد سے لوگوں کے روزینے اور معاش مقرر کیا کریں۔ چند دن بعد ہی وہ مستقل طور پر صدر الصدور ہو گئے۔ شروع شروع میں انھوں نے لوگوں کو اس قدر انعامات اور

روز نیے عطا کیے کہ اگر سابقہ بادشاہوں کے تمام عطیوں کو بھی جمع کیا جائے تو اس کے برابر نہ ہوں، بعد میں ان کا طرز عمل بالکل ہی برعکس ہو گیا۔

اسی سال خواجہ معظم سے جو رشتے میں بادشاہ کا خالو ہوتا تھا بعض نامناسب حرکتیں سرزد ہوئیں۔ اکبر اسے نصیحت کرنے اور ان باتوں سے منع کرنے کے لیے ان کے گھر گیا لیکن وہ بادشاہ کے آنے کی خبر سے اس قدر دہشت زدہ ہوا کہ اپنی بیوی کو قتل کر ڈالا۔ اکبر نے اسے گرفتار کر کے سزا دی۔ پانی میں غوطے دلائے اور گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا جہاں وہ مر گیا۔

کابل پر تیسرا حملہ

اسی سال تیسری مرتبہ مرزا سلیمان نے کابل کا رخ کیا۔ اس مرتبہ اس کے یہاں آنے کی وجہ یہ تھی کہ جب وہ شاہ ابو المعالی کے سد باب اور میرزا محمد حلیم کو حاکم بنانے کے بعد واپس ہو رہا تھا تو اس نے کابل کے اکثر علاقے اپنے لشکریوں میں بطور جاگیر تقسیم کر دیے تھے۔ اس کے آدمیوں اور مرزا کے درمیان ان بن ہو گئی اور مرزا نے بدخشانی امیروں کو کابل سے بے دخل کر دیا اس کا انتقام لینے کے لیے مرزا سلیمان نے ایک بھاری لشکر لے کر کابل پر چڑھائی کر دی۔ مرزا محمد حکیم میں اس سے مقابلہ کی قوت نہ تھی، اس لیے وہ باقی قاقشال اور چند معتمد سرداروں کو کابل میں چھوڑ کر جلال آباد چلا گیا۔

جب مرزا سلیمان نے اس کا پیچھا کیا تو وہ جلال آباد میں نہ ٹھہر سکا اور وہاں سے دریائے نیلاب کے کنارے پہنچ کر اس نے اکبر بادشاہ کے پاس ایک عریضہ روانہ کیا۔ مرزا سلیمان نے جلال آباد میں اپنے ایک سردار قنبر نامی کو تھوڑی سی فوج دے کر رکوا دیا اور خود پشاور سے کابل واپس چلا گیا۔ اکبر کے حکم کے بموجب پنجاب کے تمام امیر جیسے محمد قلی خان برلاس، اتکہ خان اپنی تمام جمعیت سمیت اور ملا قاسم خان، کمال خاں گکھڑ وغیرہ مرزا محمد حکیم کی مدد پر پہنچ گئے۔ ان لوگوں نے جلال آباد پر حملہ کر کے قنبر کو تین سو آدمیوں سمیت تہ تیغ کر دیا اور قنبر کا سر فتح کی خوشخبری کے ساتھ کابل میں باقی قاقشال کے پاس

بھیج دیا۔ اب مرزا سلیمان کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ وہ بدخشاں کی طرف بھاگ گیا اور مرزا حکیم فاتحانہ کابل میں داخل ہوا۔ اکبر بادشاہ نے اس کی اتالیقی کے لیے خان کلاں کو مقرر کیا۔ وہ تو وہاں رہ گیا اور دوسرے امرائے لشکر اپنی اپنی جاگیروں کو لوٹ گئے۔

خواجہ حسن نقشبندی

کچھ عرصہ بعد مرزا محمد حکیم نے اپنی بیوہ بہن کو جو شاہ ابو المعالی کے نکاح میں تھی، خان کلاں سے مشورہ کیے بغیر خواجہ نقشبندی کی اولاد میں سے خواجہ حسن نقشبندی کے نکاح میں دے دیا۔ خواجہ حسن کا مرتبہ اس رشتہ کی وجہ سے بڑھ گیا اور وہ کابل کا وکیل مطلق بن گیا۔ تمام امور سلطنت اس کے ہاتھوں انجام پانے لگے۔ اس کے دور حکومت پر ظریفوں نے یہ پھبتی کسی ہے:

گر خواجۂ ما خواجہ حسن خواہد بود
مارا نہ جوال ونی رسن خواہد بود

خواجہ حسن کے اثر و رسوخ کی وجہ سے خان کلاں کے ہاتھ بندھ گئے اور وہ معطل ہو کر رہ گیا۔ یہ صورت حال جب ناقابل برداشت ہو گئی تو وہ لاہور چلا آیا اور کابل کے سارے حالات بارگاہ شاہی میں لکھ کر روانہ کر دیے۔

شیخ الاسلام فتح پوری

اسی سال شیخ الاسلام فتح پوری چشتی نے جو 971ھ/1563ء میں حرمین شریفین سے تشریف لائے تھے، ایک نئی خانقاہ تعمیر کرائی۔ اس کی عمارت ایسی خوش وضع ہے کہ دنیا میں شاید ہی اس جیسی کوئی خانقاہ ہو گی آمد پر میں (صاحب تصنیف منتخب التواریخ) نے عربی میں ایک خط لکھ کر بدایوں سے روانہ کیا تھا اور ان کے خیر مقدم کی دو تاریخیں درج کی تھیں۔ پہلی تاریخ یہ ہے:

شیخ الاسلام مقتدای انام
رفع اللہ قدرہ السامی

از مدینہ چو سوی ھند آمد
آن ہدایت پناہی نامی
ھند از مقدم ہمایونش
یافت از سر خجستہ فر جامی
گیر حرفی و ترک کن حرفی
بہر سالش ز شیخ الاسلامی

دوسری تاریخ ہے:

شیخ اسلام ولی کامل آن مسیحانفس و خضر قدم
لامع از جبہہ او سر ازل طالع از چہرۂ او نورقدم
از مدینہ چوسوی ہندوستانت آن مسیحا نفس و خضر قدم
بشمر حرفی و مشمر حرفی بہر تاریخ زخیر المقدم

جس خانقاہ کا ذکر کیا گیا، وہ آٹھ سال میں مکمل ہوئی تھی۔

انھی دنوں آگرہ میں بنگالی محل اس کے علاوہ ایک اور محل کی تعمیر مکمل ہوئی۔ اس تعمیر کے سلسلے میں قاسم ارسلان نے یہ تاریخ کہی ہے:

چون ازپی عشرت شہ زیبا منظر فرمود بنا در خانہ فیض اثر
تاریخ یکی از عشرت آمد بیرون(دیگر) شد خانہ بادشاہ تاریخ دگر

بادشاہ سلامت نے 982ھ/1574ء میں ہاتھیوں کے شکار[15] کے لیے نرور اور کرہرہ کا ارادہ کیا اور وہاں شکاریوں کو ہاتھی پکڑنے کے لیے مقرر کر کے شاہانہ سواری گوالیار پہنچ گئی۔ گوالیار میں گرمی کی وجہ سے بادشاہ کو بخار آ گیا۔ جب بادشاہ صحت یاب ہوئے تو دارالخلافہ لوٹ آئے۔

آگرہ کے قلعہ کی تعمیر

اکبر نے اسی سال آگرہ کے قلعہ کا ارادہ کیا اور وہاں کے خشتی قلعہ کو ڈھا کر سنگین قلعہ بنانے کا حکم دیا۔ قلعہ کی تعمیر کے اخراجات کے لیے بادشاہ کے حکم سے فی جریب تین سیر

غلہ کا محصول لگایا گیا۔ یہ محصول سارے ملک میں امراء اور جاگیرداروں سے تحصیل کے کارندوں نے وصول کیا۔ یہ قلعہ پانچ سال میں بن کر تیار ہوگیا، اس کی دیوار کا عرض دس گز اور بلندی چالیس گز ہے۔ فصیل کے گرد جو گہری خندق ہے اس کے دونوں اطراف پتھر اور چونے کے پسے ہوئے گارے سے بنا ہوا ہے۔ اس خندق کا عرض بیس گز اور پانی کی سطح تک گہرائی دس گز ہے۔ خندق میں دریائے جمنا سے پانی لایا گیا ہے۔ قلعہ ہر لحاظ سے ایسا ہے کہ دنیا میں اس کا ثانی نہ ہو۔ اس کے دروازے کی تاریخ شیخ فیضی نے ''بنائی در بہشت'' کہی ہے۔ اس قلعہ کی تعمیر پر تقریباً تین کروڑ روپیہ خرچ ہوا۔ جب قلعہ مکمل ہوگیا تو اس میں ہندوستان کی تمام مالیات کا صدر خزانہ قائم کیا گیا اسی مناسبت سے یہ تاریخ نکالی گئی۔

''شد بنائی قلعہ بہر زر''

جو روپیہ اس قلعہ (16) میں پڑا ہوا ہے نہ معلوم کب اپنی بربادی کی داستان سنائے وہ اپنے زبان سے حال اس طرح بیان کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ''اخرجت الارض اثقالھا''

زراز بہر خوردن بود ای پسر
زبہر نہادن چہ سنگ و چہ زر

اوزبک سرداروں کی بغاوت

اسی سال خان زمان، ابراہیم خان اور اسکندر خان اوزبک نے بغاوت کی۔ اس بغاوت کا قصہ یہ ہے کہ عبد اللہ خان اوزبک کی سرکشی کی وجہ سے اکبر تمام اوزبکوں کی طرف سے بدگمان ہوگیا تھا۔ سکندر خان اوزبک اودھ کا جاگیردار تھا۔ اکبر نے زرور سے اشرف خان میر منشی کو بلا کر سکندر خان کو لانے کے لیے اودھ روانہ کیا۔ ابراہیم خان اوزبک تمام اوزبکوں کا سردار، جاگیردار اور حاکم بھی تھا، اودھ پہنچنے کے بعد تمام اوزبک سرداروں نے اکٹھا ہو کر مشورہ کیا اور سب نے بادشاہ کے خلاف بغاوت کا فیصلہ کر کے اشرف خاں کو قید کر لیا اور خود جونپور میں خان زمان کے پاس چلے گئے۔

اوزبکوں نے دو مقامات سے بغاوت شروع کی۔ لکھنؤ میں بغاوت کی ابتدا اسکندر خان اور ابراہیم خان کی سرکردگی میں ہوئی اور کڑہ مانک پور میں بغاوت کے سرگروہ خان زمان اور بہادر خان تھے۔ کڑہ پر باغیوں نے شاہم خان جلائیر اور شاہ بداغ خان پر حملہ کرکے شکست دے دی اور یہ دونوں نیم کھار کے قلعہ میں بند ہوگئے۔ محمد امین دیوانہ اسی بغاوت میں باغیوں کے ساتھ شہید ہوگیا۔ مجنون خان قاقشال بھی باغیوں کے سامنے نہ ٹھہر سکا اور وہ مانک پور کے قلعہ میں بند ہوگیا اور آصف خان کڑہ اور کتلہ کا علاقہ ایک جمعیت کی حفاظت میں دے کر کافی بڑے خزانے اور بھاری لشکر کے ساتھ مجنون خان کی مدد کے لیے پہنچ گیا اور خزانے کا منہ کھول دیا اس نے لشکریوں کا دل ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے لشکر میں اور بھی زیادہ اضافہ ہوگیا۔ ان لوگوں نے خان زمان کے مقابلہ میں ایک مضبوط محاذ بنا لیا اور بارگاہ شاہی میں عریضے روانہ کیے، غالی خان نے اپنے عریضے میں یہ شعر لکھا تھا:

ای شہسوار معرکہ آرائی روز رزم
از دست رفت معرکہ پا در رکاب کن

باغیوں پر اکبر کی فوجی کارروائی

جس وقت بادشاہ سلامت مالوہ کے سفر سے لوٹے تو انھیں اس بغاوت کی اطلاع ملی بادشاہ نے اسی وقت منعم خان خانخاناں کو آگے روانہ کردیا تاکہ وہ دریائے گنگا کو قنوج کے گھاٹ سے پار کرکے باغیوں کے مقابلہ میں صف آرائی کرے۔ اس کی روانگی کے بعد اکبر ماہ شوال 970ھ/1562ء میں میدان جنگ کے لیے سوار ہوا۔ جب سواری قنوج پہنچی تو قباخان گنگ جو باغیوں کے ساتھ ہوگیا تھا خانخاناں کی سفارش پر باریاب ہوا۔ بادشاہ نے اس کے جرم معاف کردیے، وہاں سے شاہی لشکر حملہ آور ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچا۔ سکندر خان کو مقابلہ کی ہمت نہیں ہوئی اور وہ لڑے بغیر پسپا ہوگیا نیز خان زمان اور بہادر خان سے جا کر مل گیا۔ یہ سب لوگ آصف خان اور مجنون خان کے مقابلہ کو ترک کرکے جونپور

کی طرف فرار ہو گئے اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ زہن ندی کو پار کر کے خیموں میں رہنے لگے۔

جون پور میں چھاؤنی

ان کی بغاوت کو کچلنے کے لیے شاہی لشکر سے یوسف محمد خان ولد اتکہ خان کو نامزد کیا گیا اس کے پیچھے بادشاہ نے بھی کوچ کیا اور جون پور کے سامنے چھاؤنی ڈال دی۔ اسی جگہ آصف خان، مجنون خان کے ہمراہ پانچ ہزار تجربہ کار سپاہیوں کے ساتھ لشکر میں حاضر ہوا اور بادشاہ کی خدمت میں نذرانے پیش کیے۔ جمعہ کے دن 975 ھ/1562 ء میں اکبر جونپور کے قلعہ میں داخل ہوا۔ آصف خان کو لشکر کی کمان دے کر باغیوں کے مقابلہ پر رخصت کیا۔ اس نے زہن کے راستہ پر خان زمان کے مقابل اپنا کیمپ لگا دیا۔ بادشاہ نے اس دوران حاجی محمد خان سیستانی کو بنگالہ کے حاکم سلیمان کرانی کے پاس سفیر بنا کر بھیجا۔ سلیمان کی خان زمان سے بڑی دوستی تھی اور اندیشہ تھا کہ وہ باغی خان کی مدد کرے گا۔ اس سفارت کی غرض یہ تھی کہ اسے خان زمان کی مدد سے روک دیا جائے۔ لیکن جب حاجی محمد خان رہتاس کے قلعہ پر پہنچا تو وہاں کے پٹھانوں نے جو خان زمان سے ملے ہوئے تھے اسے گرفتار کر کے خان زمان کے پاس بھیج دیا۔ خان زمان نے قدیم روابط اور آشنائی کی وجہ سے حاجی محمد خان کی بڑی تعظیم و تکریم کی اور اپنی والدہ کو اس کے ہمراہ کر کے بادشاہ کے پاس اپنے قصور معاف کرانے کے لیے روانہ کیا۔

جون پور کے قیام کے دوران اکبر نے حسن خان خزانچی اور مہاپاتر بھاٹ کو جو شیر شاہ اور سلیم شاہ کے دربار کا رکن تھا اور ہندی شاعری و موسیقی میں بے نظیر مہارت رکھتا تھا، اوڑیسہ کے راجہ کے پاس سفیر بنا کر بھیجا کہ وہ نہ تو خان زمان کی مدد کرے اور نہ ہی اسے اپنے یہاں پناہ دے بلکہ اپنے اثر سے کام لے کر سلیمان کو بھی مخالفانہ حرکتوں سے روک دے۔ سلیمان نے اس بات کو مان لیا اور بادشاہ کے لیے نفیس تحفے اور عمدہ ہاتھی روانہ کر کے اطاعت اختیار کر لی۔ یہ دونوں سفیر لوٹ کر آگرہ میں ملے۔

آصف خان کا فرار ہونا

انہی دنوں مظفر خان اور دوسرے چند با اثر سردار آصف خان کے مخالف ہو گئے ان کو آصف خان سے بھاری انعام و تحائف کی توقع تھی اور وہ مارے لالچ کے ان مطالبات کو کسی نہ کسی طرح سے ظاہر کرتے تھے۔ کچھ لوگوں نے اس سے صاف صاف چوراگڑھ کے مال غنیمت کا مطالبہ کر دیا۔ آصف خان زہن کی سڑک پر خان زمان کے مقابلہ میں محاذ جمائے ہوئے تھا۔ اس موقع پر ان لوگوں کے مطالبوں اور مخالفتوں سے وہ سخت پریشان ہو گیا اور آدھی رات کے وقت اپنے چھوٹے بھائی وزیر خان کو لے کر اپنی جمعیت کے ہمراہ کنخلہ کے راستے کڑہ کو چلا گیا۔ جب اس کے محاذ چھوڑ کر چلے جانے کی اطلاع بارگاہ شاہی میں پہنچی تو لشکر کی کمان منعم خان خانخاناں کو دے دی گئی اور شجاعت خان کو آصف خان کے تعاقب پر مقرر کیا۔

رہتاس کا قلعہ

شجاعت خان مانک پور سے کشتیوں پر سوار ہو کر آگے بڑھا تھا کہ اس کی آنے کی خبر آصف خان کو ملی اور وہ لوٹ کر دریا کے کنارے مقابلہ کے لیے آ گیا اور دونوں کے درمیان سخت جنگ ہوئی اور اس نے شجاعت خان کی کشتیوں کو گنگا پار کرنے سے روک دیا۔ مجبوراً شجاعت خان رات کے وقت پیچھے ہٹ کر گنگا کے دوسرے کنارے پر اتر گیا اور آصف خان نے فوجی کاروائی کر کے اس طرف کے سارے علاقے کو اپنی جاگیر میں شامل کر لیا۔ شجاعت خان دوسرے راستہ سے کڑہ چلا گیا اور وہاں سے دشمن کا پیچھا شروع کیا لیکن آصف خاں کافی دور نکل گیا تھا اس لیے وہ جون پور آ کر رکا۔

انہی دنوں رہتاس کے قلعہ کے حاکم فتح خان افغان تبتی نے اپنے بھائی حسن خان کو بادشاہ کے پاس سفیر بنا کر بھیجا۔ 972ھ/1564ء میں سلیمان کرانی[17] نے اس قلعہ پر حملہ کیا تھا لیکن جب اس نے شہنشاہ کے آنے کی خبر سنی تو محاصرہ اٹھا لیا تھا۔ غرض حسن خان نے حاضر ہو کر مناسب نذرانے گزارے اور درخواست کی کہ کسی سردار کو مقرر کر دیا

جائے تاکہ ہم قلعہ اس کے سپرد کریں۔ بادشاہ نے جون پور سے قلیج خان کو اس کے ہمراہ روانہ کردیا۔ بعد میں فتح خان اپنے بھائی کو اس سفارت پر بھیجنے سے پشیماں ہوا اور قلعہ میں کافی رسد کا سامان جمع کر کے اپنے بھائی کو لکھ کر بھیجا کہ تم جلد از جلد لوٹ آؤ کیوں کہ اب قلعے میں رسد وغیرہ کا ذخیرہ ہو چکا ہے اور قلعہ سپرد کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔ حسن خان نے اس خط کے ملنے پر قلیج خان کو دھوکہ میں رکھنے کی کوشش کی، بظاہر وہ اس کی بڑی اطاعت کرتا رہتا تھا لیکن قلیج خان جلد اس کی منافقت سے آگاہ ہوگیا اور قلعہ کا خیال چھوڑکر خالی ہاتھ لوٹ آیا۔

رہتاس کا یہ قلعہ بہار کے صوبہ میں چودہ کوس کے طول اور تین کوس کے عرض میں واقع ہے۔ اس کی بلندی پانچ کوس ہے۔ قلعہ کے اندر زراعت ہوتی ہے۔ پانی کی اتنی فراوانی ہے کہ جہاں کیل گاڑو پانی نکل آتا ہے۔ جب سے شیر شاہ نے یہ قلعہ فتح کیا تھا پٹھانوں کے قبضہ میں چلا آرہا تھا یہاں تک کہ فتح خان اس کا حاکم بنا اور اس نے سلیمان کے سامنے ہار نہ مانی، آخرکار فتح خان سے شاہی لشکر نے یہ قلعہ چھین لیا۔

صلح میں کہاسنی

جونپور میں بادشاہ چھاؤنی ڈالے ہوئے مقیم تھے اور انھوں نے منعم خان کو مقدمۃ الجیش کا سردار بنا کر خان زمان کے مقابلہ میں بھیجا تھا اور خود امور سلطنت کی انجام دہی میں مشغول رہے۔ جب منعم خان نرہن گھاٹ پر اسکے مقابلہ کے لیے پہنچا تو خان زمان نے بہادر خان کو سردار بنا کر سرور کی طرف روانہ کیا تاکہ وہ اس علاقہ میں شورش برپا کر کے جہاں تک ممکن ہے قبضہ کرلیں۔ باغیوں کی اس کاروائی کو روکنے کے لیے بادشاہ نے معزالملک مشہدی کو جو قطعاً سردار کی اہلیت نہیں رکھتا تھا، مقرر کیا۔ اس کے ساتھ لشکر کے بڑے امرا جیسے شاہ بداغ خان، اس کا لڑکا عبدالمطلب خان، سعید خان اور محمد معصوم خان فرنخودی وغیرہ کو بھی نامزد کیا گیا۔

اسی دوران منعم خان نے خان زمان سے سابقہ روابط کی بنا پر سفارت و مراسلت جاری

رکھی اور اسی میں اس نے چار پانچ مہینے گزار دیے اور باغیوں کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی۔
آخر بادشاہ نے صلح یا جنگ کے قطعی فیصلہ کی خاطر خواجہ جہان اور دربار خان کو جون پور سے زبین روانہ کیا۔ ان لوگوں کے آنے پر صلح کی باقاعدہ گفتگو ہوئی باغیوں کی طرف سے خان زمان دو تین آدمیوں کے ساتھ اور لشکر شاہی کے ساتھ کشتیوں میں بیٹھ کر ایک دوسرے سے ملے۔ آخر کار صلح اس شرط پر طے پائی کہ خان زمان اپنی والدہ کو اپنے چچا ابراہیم خان کے ہمراہ دربار میں بھیج دے اور جتنے مشہور اور عمدہ ہاتھی اسکے پاس ہیں وہ شاہی کارندوں کے سپرد کردے۔ جب اسے معافی مل جائے تو سکندر اور بہادر بھی دربار میں حاضر ہو جائیں۔
جب صلح طے پا گئی تو دربار خان واپس چلا گیا اور بادشاہ کو اسکی اطلاع دی۔

دوسرے دن خانخاناں اور خواجہ جہان خان کی والدہ اور ابراہیم خان کو ہمراہ لے کر مع ہاتھیوں کے بادشاہ کی خدمت میں پہنچ گئے اور دونوں نے خان زمان کے قصور کو معاف کر دینے کی سفارش کی، شاید اسے معافی مل جاتی، لیکن اسی وقت سردار سے میر معزالملک کی شکست اور فرار کی اطلاع پہنچی جسے سنتے ہی شہنشاہ کا پارہ چڑھ گیا اور وہ صلح ادھوری رہ گئی۔

معزالملک کی فوجی کاروائی

معزالملک کی شکست کا قصہ یہ ہوا کہ جب سکندر اور بہادر کے مقابلہ پر شاہی فوج پہنچی تو یہ دونوں اس جگہ رُک گئے، جہاں تک کہ وہ پیش قدمی کر چکے تھے اور معزالملک کو پیغام دیا کہ تم ہمارا واسطہ بن کر دربار سے ہمارے جرم کو معاف کرادو تاکہ جو کچھ ہاتھی اور مال غنیمت ہم نے جمع کر رکھا ہے وہ سب ہم دربار میں روانہ کردیں۔ جب ہماری خطائیں معاف ہو جائیں گی تو ہم خدمت میں حاضر ہو جائیں گے۔ میر معزالملک ایک فرعون صفت آدمی تھا اور یہ غرور شاید مشہدی سیدوں کو وراثت ہی میں ملا ہے اس لیے مشہور ہے:

اہل مشہد بجز امام شما
لعنۃ اللہ بر تمام شما

ان کی شان میں ایک شعر یہ بھی ہے:

روی زمین گر چہ زمردم خوش است
مشہدی از روی زمین گم خوش است

چنانچہ اس نے بڑے تکبر اور بد اخلاق کا مظاہرہ کیا اور اسکے اظہار اطاعت پر کہلا بھیجا کہ اب صرف تلوار ہی تمہارا فیصلہ کرے گی۔ ابھی معاملہ اسی نوبت پر تھا کہ بادشاہ کی طرف سے لشکر خان میر بخش اور میر ٹوڈرمل پہنچے تاکہ صلح یا جنگ کوئی ایک بات جلد از جلد طے پاجائے اگر مناسب ہو تو جنگ کریں ورنہ سکندر اور بہادر کو تسلی اور دلاسہ دے کر اپنے ساتھ لیتے آئیں۔

جنگ کی پیشکش

بہادر خان خود شاہی لشکر کی چھاؤنی کے قریب آیا اور اس نے میر معز الملک کو چند امیروں کے ساتھ بلا کر صلح کی گفتگو چھیڑی اور کہا کہ "خان زمان اپنی والدہ اور ابراہیم خان کو صلح کے لیے دربار میں بھیج رہا ہے بلکہ اب تک وہ بھیج بھی چکا ہوگا، اس لیے ہم کو اپنے قصوروں کی معافی کی امید اور توقع ہے، ہم اس سفارت کے جواب کا انتظار کررہے ہیں۔ جب تک یہ معاملہ ٹھیک نہیں ہوجاتا ہم لڑائی چھیڑنا نہیں چاہتے تم بھی دربار سے جواب آنے تک کچھ دن تک لڑائی کو ملتوی رکھو تو بہتر ہے"۔

معز الملک کی شکست

جنگ کے لیے بہادر خان کا یہ مطالبہ نہایت معقول تھا لیکن میر معز الملک کو اتنی سمجھ کہاں؟ وہ تو بس آگ بنا ہوا تھا اور راجہ ٹوڈرمل تیل سے کم نہیں تھے، وہ برابر اس آگ کو بھڑکاتے رہے، چنانچہ انھوں نے بہادر خان کو منہ توڑ جواب دیا ان کے اس رویہ سے بہادر خان اور اسکندر خان مایوس ہوگئے اور مقابلے کے لیے صف آرا ہوئے۔ میر معز الملک نے اس کے مقابلے پر محمد امین دیوانہ کو لشکر کی رہبری پر مقرر کیا اور آگے بڑھایا اور خود لشکر کے بیچ رُکا رہا۔ اپنے ساتھ تجربہ کار سپاہیوں اور عبدالمطلب خان، سلیم خان، کاکر علی خان، بیگ

نورین خان سرداروں کو مقرر کر کے دوسرے امیروں کو میمنہ اور میسرہ پر لگا دیا۔ دوسری طرف باغیوں کے ہراول پر تو سکندر خان اور اس کا داماد محمد یار تھا، قول بہادر خان خود کمان سنبھالے ہوئے تھا۔ فریقین میں سخت لڑائی ہوئی۔ جلد ہی محمد یار قتل ہوگیا اور اسکندر خان گھبرا کر کالی ندی میں کود پڑا اور تیر کر نکل گیا۔ اس کے اکثر ہمراہی ندی میں غرق ہوگئے۔ جو بچے وہ دشمن کی تلوار کا نشانہ بن گئے۔ ساری فوج لوٹ مار میں منتشر ہوگئی۔ میدان میں میر معز الملک اپنے چند سرداروں کے ساتھ تنہا رہ گیا۔ بہادر خان ابھی تک اپنے مور چے پر جما ہوا تھا، اس نے جب میر کو تنہا پایا تو اچانک اس پر حملہ کردیا اور ایک ہی حملہ میں اس کے قدم اکھاڑ دیے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ بہت سے جنگجو جوانوں نے خاص طور سے حسین خان خویش، مہدی قاسم خان اور باقی محمد خان وغیرہ نے جو میر معز الملک کی سرداری اور راجہ ٹوڈرمل کے حکم چلانے سے رنجیدہ تھے جس قدر جد وجہد کرنی چاہیے تھی، نہیں کی۔ البتہ شاہ بداغ خان نے بہادری کے خوب جوہر دکھائے۔ لڑتے لڑتے وہ گھوڑے سے گر پڑا، اس کے بیٹے عبدالمطلب خان نے اس کو سنبھالنے کی بڑی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہا آخر اپنی جان بچا کر نکل گیا اور اس کا باپ اوزبکوں کے ہاتھ قید ہوگیا۔ راجہ ٹوڈرمل اور خان کا لشکر پسپا ہوگیا، رات میں ان لوگوں نے ہاری ہوئی جنگ جیتنے کے لیے باغیوں پر حملہ کیا لیکن کچھ نہ کر سکے، باغیوں نے انکو منتشر کر کے بھگا دیا۔ دوسرے دن یہ سب اکٹھا ہو کر شیر گڑھ کی طرف چلے گئے اور ساری روداد دربار میں لکھ بھیجی۔

باغیوں کی اطاعت اور معافی

جب خان خاناں، خان زمان کی والدہ ابراہیم خان اور خان زمان کے معتمد آدمیوں میر ہادی صدر اور نظام آغا کو دربار میں لے کر آیا اور جنگی ہاتھی بھی حضور میں پیش کیے تو ابراہیم خان سر برہنہ گردن میں تلوار لٹکائے اور بجائے چادر کے کفن لپیٹے ہوئے زبان حال وقال سے کہہ رہا تھا:

"خواہی بدار خواہی بکش رائی رائی تست"

خان خاناں بھی ان لوگوں کی سفارش کرتے ہوئے ان کی خدمات کا تذکرہ کر رہا تھا، بادشاہ نے ان سب کے جرم معاف کر دیے، ان کی جاگیریں بحال کر دیں اور حکم دیا کہ جب تک لشکر یہاں ہے یہ لوگ دریا پار نہ کریں اور ان کے نمائندے آگرہ میں آ کر فرامین حاصل کر کے حسب فرمان اپنی جاگیروں کو سنبھال لیں۔ خان زمان کی والدہ نے یہ خوشخبری اپنے بیٹوں کے پاس بھیج دی اور بہادر و سکندر نے کوہ پارہ اور صف شکن ہاتھیوں کو جن کی وجہ سے یہ سارا فتنہ برپا ہوا تھا۔ نذرانوں اور تحفوں کے ساتھ بادشاہ کے پاس بھیج دیا۔ عین اسی مرحلہ پر ٹوڈرمل اور لشکر خان کا عریضہ جس میں لڑائی اور شکست اور امرا کی منافقت کا ذکر تھا پہنچا۔ اس پر بادشاہ نے حکم دیا، ہم نے خانخاناں کی خاطر سے خان زمان اور دوسروں کو معافی دے دی ہے اب تمام امیر دربار میں لوٹ آئیں۔ اسی سلسلے میں میر معز الملک اور راجہ ٹوڈرمل پر شاہی عنایات نازل ہوئیں جن لوگوں نے منافقت سے کام لیا تھا وہ عرصہ تک کورنش و تسلیمات سے محروم کر دیے گئے بعد میں پھر ان کو اپنے اپنے اعزاز دوبارہ مل گئے۔

خان زمان کی وعدہ خلافی

اسی زمانہ میں بادشاہ نے کوچ کیا، چنار کے قلعہ کی سیر کی اور اس قلعہ کے جنگل میں ہاتھیوں کا شکار کرنے کے بعد لشکر میں لوٹ آئے۔ جس زمانہ میں چنار کے قلعہ میں چھاؤنی تھی خان زمان نے عجلت کر کے دریائے گنگا کو پار کیا اور معاہدۂ صلح کے خلاف قصبۂ منو کے ملحقہ دیہات محمد آباد میں آ گیا اور اپنے گماشتوں کو جون پور اور غازی پور پر قبضہ کرنے کے لیے بھیج دیا۔ شہنشاہ کو اس کی حرکت ناگوار گزری، انھوں نے اشرف خان میر منشی کو جون پور بھیجا تاکہ خان زمان کی والدہ کو قلعہ میں نظر بند کر کے باغیوں کو گرفتار کر لیا جائے۔ پھر بادشاہ نے لشکر کو خواجہ جہان اور مظفر خان کی تحویل میں چھوڑا اور خود خان زمان کی بغاوت کو کچلنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ جب بادشاہ سروار ندی کے کنارے پہنچے تو غنیم کی مال و اسباب سے لدی ہوئی کشتیاں بادشاہی آدمیوں کے ہاتھ آ گئیں۔ بادشاہ نے ندی کے کناروں پر چوکیاں قائم کر کے گھنے جنگلوں کو طے کیا۔ جب معلوم ہوا کہ خان زمان سوالک

کی پہاڑی کی طرف بھاگ گیا۔ تو اس کا پیچھا چھوڑ کر لوٹ آئے۔

اسی اثنا میں بہادر خان چند بہادر اور تجربہ کار آدمیوں کے ساتھ جون پور پہنچا اور کمندوں کے ذریعے قلعہ پر چڑھ کر اپنی والدہ کو چھڑا لایا اور اشرف خان کو قید کر لیا لیکن جب اس کو بادشاہ کے لوٹ آنے کی خبر ملی تو وہ سکندر خان کے ہمراہ نرہن گھاٹ کے ذریعہ گنگا کو پار کر کے بھاگ گیا۔

بادشاہ کی سالگرہ کا جشن

پانچ رجب 973ھ/1565ء کو جون پور کے ملحقہ پرگنہ نظام آباد میں اکبر کی سالگرہ ہوئی۔ معمول یہ تھا کہ سالگرہ پر بادشاہ کو تولنے کا جشن منعقد ہوتا تھا جس میں شمسی اور قمری تاریخوں کے حساب سے سال میں دوبار سونے چاندی اور ہر قسم کے اجناس سے بادشاہ کو تولا جاتا تھا پھر یہ تول برہمنوں اور دوسرے محتاجوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا اس رسم کی مناسبت سے شعرا نے بڑے اچھے اشعار بھی کہے ہیں۔

اکبر کی واپسی۔ آگرہ

سالگرہ کے جشن کے بعد بادشاہ جون پور کے قلعہ میں داخل ہوئے۔ جب خان زمان کو بادشاہ کے قیام کی اطلاع ملی تو اس نے میرزا میرک کو جسے بعد میں رضوی خان کا خطاب ملا تھا خان خاناں کے پاس سفارش کروانے بھیجا وہ خان زمان کی والدہ کے ساتھ دربار میں حاضر ہوا، خان زمان کا پیغام اطاعت پیش کیا۔ خان خاناں نے میر عبد اللطیف قزوینی، ملا عبد اللہ مخدوم الملک اور شیخ عبد النبی صدر کے ساتھ دوبارہ خان زمان کے قصور معاف کرنے کی درخواست کی۔ بادشاہ نے یہ درخواست قبول کر لی۔ خواجہ جہاں مرتضیٰ شریفی[18] اور مخدوم الملک کو خان زمان کو توبہ کرانے اور معافی کی خوش خبری سنانے کے لیے روانہ کیا گیا۔ خان زمان نے ان لوگوں کا استقبال کیا اور قسمیں کھا کر اطاعت کا عہد کیا اور اپنے عزیزوں کو دربار میں کورنش بجالانے کے لیے کہا۔ خان زمان کے معاملہ کو سلجھانے کے بعد

بادشاہ نے 973ھ/1565ء کے آخر میں آگرہ واپس پہنچ کر آرام کیا۔ پھر وہاں سے نئے شہر نگر چین میں جا کر چوگان بازی، کتوں کی دوڑ اور جانوروں کے شکار میں مشغول ہو گئے۔ اسی موقع پر بادشاہ نے ایک آتشیں گولہ ایجاد کیا جسے اندھیری رات میں چھوڑا جاتا تھا۔ انہی دنوں محمد یوسف خان ولد اتکہ خان کی کثرت شراب نوشی سے موت ہو گئی تھی۔

اسی سال بادشاہ نے آصف خان کی بغاوت کو کچلنے کے لیے مہدی قاسم خان اُس کے داماد حسین خان اور خالدی خان کو چند اور امرا کے ساتھ تین چار ہزار کی جمعیت دے کر کڑہ کٹکہ کی طرف روانہ کیا۔ آصف خان نے چوراگڑھ کے قلعہ کو خالی کر دیا اور دربار میں معافی کے لیے عریضہ روانہ کیا لیکن، اس کی درخواست قبول نہ کی گئی۔ مجبور ہو کر اس نے خان زمان کو ایک خط لکھا اور خود بھی اپنے بھائی وزیر خان کو لے کر جون پور میں خان زمان کے پاس آ گیا، لیکن خان زمان نے پہلی ملاقات میں ہی اس سے ایسی لاپروائی برتی کہ وہ یہاں آنے پر سخت پشیمان ہو گیا۔

اس عرصہ میں مہدی قاسم خان نے کڑہ کے علاقہ کو اپنے قبضہ میں لے کر جاگیر داروں میں تقسیم کر دیا اور آصف خان کے تعاقب کو چھوڑ کر ہندیہ کے راستہ سے مکہ معظمہ کے ارادہ سے چلا گیا۔ حسین خان اپنے آدمیوں کے ساتھ اس کو چھوڑنے کے لیے دکن کے قریب ستواس کے قلعہ تک گیا تھا۔

مرزاؤں کی بغاوت

اسی زمانہ میں اچانک سلطان محمد مرزا کے بیٹوں ابراہیم حسین مرزا، شاہ مرزا اور محمد حسین مرزا نے بغاوت کر دی۔ سلطان محمد مرزا کا سلسلۂ نسب باپ کی طرف سے تو امیر تیمور صاحبقران اور ماں کی طرف سے سلطان حسین مرزا سے ملتا ہے اور اب وہ کافی بوڑھا ہو چکا ہے، بادشاہ نے اعظم پور کا پرگنہ اس کو جاگیر میں دیا تھا۔ اس کے بیٹوں نے سنبل کے علاقہ میں بغاوت کا رخ اختیار کیا تھا۔ اس وقت بادشاہ، خان زمان کے قصہ سے فارغ ہونے کے بعد محمد حکیم مرزا کی بغاوت کو دبانے کے لیے پنجاب گئے ہوئے تھے۔ منعم خان نے ان

بھائیوں کی مدافعت کی۔ وہ منعم خان کے مقابلے سے بھاگ کر دوآبہ میں چلے گئے اور دہلی سے گزر کر مالوہ جا پہنچے۔ وہاں سے تو دو بھائی شاہ میرزا اور محمد حسین مرزا تو ہندیہ چلے گئے اور ابراہیم حسین مرزا نے ستواس کا رخ کیا جو دس کوس کے فاصلے پر تھا۔ حسین خان دکن کے ایک امیر مقرب خان کی مدد سے قلعہ ستواس میں قلعہ بند ہوگیا۔ قلعہ میں کافی ذخیرہ نہ تھا اس کے لشکری گھوڑے، اونٹ اور بیل تک کاٹ کر کھا گئے، فاقہ اور بھوک سے ان کا برا حال تھا اور کسی طرف سے کوئی مدد نہیں پہنچ رہی تھی اس کے باوجود ان لوگوں نے میرزا ابراہیم حسین کی صلح کی پیشکش کو قبول نہیں کیا اور قلعہ میں بند فوج نے لڑنے میں کوتاہی نہیں کی۔ میرزا ابراہیم حسین نے ہندیہ میں مقرب خان کے بھائی برق دم خان کو قتل کر دیا تھا اور اس کے اہل وعیال کو بھی قید کر لیا تھا۔ جب مقرب خان اور حسین خان صلح پر راضی نہیں ہوئے تو اس نے برق دم خان کا سر نیزہ پر بلند کر کے مقرب خان کو دکھایا اور اس کی ماں کو بھی اس کے سامنے لا کر کہا کہ ھندیہ فتح ہو چکا ہے تمہارے عزیز رشتہ دار اور وہاں کے سارے لوگ گرفتار ہو چکے ہیں اب تم کس کے بھروسہ لڑائی پر کمر باندھے ہوئے ہو؟ یہ دیکھ اور سن کر مقرب خان کے ہوش اڑ گئے اور وہ اطاعت قبول کر کے مرزاؤں کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ انھوں نے اسے سلامتی کے ساتھ چھوڑ دیا۔ جب 975ھ/1567ء میں شہنشاہ لاہور سے آگرہ تشریف لائے تھے تو حسین خان دربار میں حاضر ہوا تھا، اس موقع پر اس کی جاگیر میں پٹیالی کے ساتھ شمس آباد کا پرگنہ بھی اضافہ کر دیا گیا تھا۔

حسین خان کی مصاحبت

میں (صاحب تصنیف منتخب التواریخ) اس سے ایک سال پہلے پٹیالی گیا تھا وہاں حسین خان سے جب ملاقات ہوئی تو میں نے اسے نہایت بااخلاق، منکسر مزاج، درویش صفت، بہادر، سخی، خوش اخلاق، پکا سنی، علم پرور اور علم دوست پایا۔ وہ میرے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آیا، چنانچہ اس کی رفاقت چھوڑ کر دوسری جگہ جانا اور کسی اور کی ملازمت اختیار کرنا میں نے مناسب نہ جانا اور اسی جگہ ٹھہر گیا اور دس سال اس گوشہ گمنامی میں اس کی دوستی اور رفاقت

میں گزار دیے۔ آسمان بھلا اس خوش وقتی کو کہاں دیکھ سکتا تھا، ہماری آپس میں کچھ ایسی رنجش ہوگئی کہ جدائی کے بغیر کوئی چارہ نہ رہا۔ اس نے میری خفگی کو دور کرنے کے لیے بڑی کوشش کی اور معذرت چاہی، یہاں تک کہ بدایوں جاکر والدۂ مرحومہ تک کو بیچ میں ڈالا، لیکن میرا دل ایسا بھرا تھا کہ میں اس کے پاس نہ گیا اور بادشاہ کی خدمت میں پہنچ گیا:

دل کہ رنجید کسی خورسند کردن مشکل است
شیشۂ بشکستہ را پیوند کردن مشکل است

آصف خان کا فرار

خان زمان نے آصف خان اور بہادر خان کو پٹھانوں کے علاقوں پر فوج کشی کے لیے مقرر کیا اور وزیر خان کو کسی بہانے اپنے پاس روک کر نظر بند کردیا۔ دونوں بھائیوں نے آپس میں خط و کتابت کرکے فرار ہوجانے کی ٹھانی، چنانچہ ایک مقرر رات کو وزیر خان تو خان زمان کے پاس سے بھاگ گیا اور اس کا بھائی آصف خان، بہادر خان کے پاس سے بھاگ کر آگرہ اور مانک پور کے راستہ پر تین کوس تک چلا گیا۔ بہادر خان نے آصف خان کا پیچھا کرکے راستہ روک دیا اور دونوں میں جون پور اور مانک پور کے درمیان ایک سخت جنگ ہوئی جس میں آصف خان کو شکست ہوئی اور وہ گرفتار ہوگیا۔ بہادر خان اسے ہاتھی پر عماری میں بیٹھا کر اپنے ساتھ لے چلا۔ اسی اثنا میں وزیر خان جون پور سے بھائی کو چھڑانے کے لیے وہاں پہنچ گیا اس وقت بہادر خان کی جمعیت مال غنیمت لوٹنے کے لیے منتشر ہوگئی تھی اس لیے وزیر خان کے اچانک حملہ کی بہادر خان مدافعت نہ کرسکا اور اسی حال میں اس نے حکم دیا کہ آصف خان کو عماری میں ہی قتل کردیں۔ لوگوں نے آصف خان پر حملہ کردیا۔ تلوار کا ایک زخم اسکی ناک پر آیا اور اس کی دو تین انگلیاں بھی کٹ گئیں، عین اس موقع پر وزیر خان نے تیزی سے بڑھ کر آصف خان کو قاتلوں کے گھیرے سے چھڑا لیا اور دونوں بھائی وہاں سے بھاگ کر کڑہ کی طرف چلے گئے اور بہادر خان کو خالی ہاتھ لوٹ جانا پڑا۔ جس زمانہ میں اکبر بادشاہ مرزا محمد حکیم کا پیچھا کرتے ہوئے لاہور کے

علاقے میں پہنچے تھے اور وہاں شکار میں مصروف تھے، وزیر خان خدمت سلطانی میں حاضر ہوگیا۔ مظفر خان کے وسیلہ سے اسے باریابی نصیب ہوئی۔ بادشاہ نے آصف خان کے نام معافی اور مہربانی کا فرمان لکھ دیا۔

کابل پر مرزا سلیمان کا چوتھا حملہ

اسی سال مرزا محمد حکیم بھی لاہور پہنچا تھا اس کے لاہور آنے کا سبب یہ تھا کہ جب تیسری مرتبہ مرزا سلیمان کابل سے واپس ہوگیا اور کابل پر مرزا حکیم کا پوری طرح قبضہ ہوگیا تو اس نے بادشاہی امیروں کو ہندوستان واپس کردیا اور خواجہ حسن نقشبندی کو اپنی وکالت کے عہدہ پر مستقل کردیا۔ اس کی اس کارروائی سے رنجیدہ ہوکر خان کلاں کابل چھوڑ کر لاہور چلا گیا۔ مرزا سلیمان کے لیے اس سے اچھا کیا موقع ہوسکتا تھا چنانچہ اس نے میدان کو صاف دیکھ کر چوتھی بار اپنی بیوی ولی نعمت بیگم کی مدد و تائید سے کابل پر چڑھائی کردی اور قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔ اس موقع پر مرزا حکیم نے کابل محمد معصوم کوکہ کے حوالہ کردیا اور خود خواجہ حسن نقشبندی کے ساتھ غور بند کی طرف چلا گیا۔ یہ محمد معصوم وہی شخص ہے جس نے بعد میں ہندوستان پہنچ کر بڑے فتنے اور بغاوتیں برپا کیں، ویسے یہ نہایت بہادر اور دلیر شخص تھا۔

جب مرزا سلیمان کابل پر بزور تلوار قبضہ نہ کرسکا تو اس نے اپنی بیوی ولی نعمت بیگم کے ذریعہ مکروفریب سے کام لینا چاہا، چنانچہ بیگم وہاں سے قراباغ پہنچی جو کابل سے دس کوس پر غور بند کی سرحد پر واقع ہے۔ وہاں اس نے مرزا سے صلح کا سلسلہ بنایا اور بڑی سخت قسمیں کھاکر اسے صلح کی گفتگو کے لیے بلایا۔ میرزا چند آدمیوں کے ساتھ اس کے لیے روانہ ہوگیا۔ خواجہ حسن بھی مصالحت پر آمادہ ہوگیا تھا لیکن باقی مسلے پر آمادہ نہیں ہوا تھا اس نے کھل کر کہہ دیا تھا کہ یہ عورت نہایت مکار اور چالباز ہے اس کے ہتھے میں نہیں آنا چاہیے۔ اس کا خیال صحیح تھا کیوں کہ ابھی مرزا محمد حکیم قراباغ پہنچنے بھی نہیں پایا تھا کہ مرزا سلیمان ایک بھاری جمعیت لے کر حملہ کرتا ہوا کابل سے وہاں پہنچ گیا اور گھات میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ مرزا محمد حکیم کے چند آدمیوں کی مرزا سلیمان کے

لشکریوں سے مڈبھیڑ ہوگئی، انھوں نے فوراً اس کی اطلاع مرزا حکیم کو پہنچادی اور وہ وہاں سے الٹے پاؤں غوربند بھاگ گیا۔ حملہ آوروں کے ڈر سے وہاں بھی اس کے قدم نہیں رکے اور وہ ہندوکش کی پہاڑی کے راستہ پر چلا گیا۔ خواجہ حسن تو چاہتا تھا کہ اسے حاکم بلخ پیر محمد خان کے پاس مدد حاصل کرنے کے لیے لے جائے لیکن باقی قاقشال نے اس ارادہ کی سختی سے مخالفت کی اور مرزا کو اکبر بادشاہ کے حضور میں لے جانے کے لیے پنجشیر کے راستے جلال آباد پہنچا۔ وہاں سے یہ لوگ دریائے نیلاب کے کنارے کنارے آگے بڑھے اور دریائے سندھ کو پار کر کے بارگاہ شاہی میں عریضہ ارسال کیا۔ یہ تو ادھر آئے اور خواجہ حسن اپنی جمعیت کو لے کر بلخ چلا گیا۔ کچھ مدت بعد وہاں وہ ایسی پریشانیوں میں گھر کر رہ گیا کہ زندگی اس پر عذاب بن گئی۔

مرزا حکیم فرار ہوا تو مرزا سلیمان نے کوتل کے منجد درّے تک اس کا تعاقب کیا اور اس کے لشکر کے پیچھے والے حصہ کو گھیر لیا۔ اس کا سارا مال واسباب لوٹ کر اسی جگہ اپنا پڑاؤ ڈال دیا۔

مرزا سلیمان کی واپسی

جب مرزا سلیمان، مرزا حکیم کی فکر میں کابل سے ہٹا تو محمد معصوم کابلی نے قلعہ سے نکل کر اس کے لشکر پر حملہ کر دیا اور اس کے سردار محمد قلی شغالی کو شکست دے کر چار باغ میں چھپ گیا۔ جب سلیمان کو یہ اطلاع ملی تو اس نے قاضی خان بدخشی کو سفیر بنا کر بھیجا۔ محمد معصوم پہلے تو صلح پر بالکل راضی نہ ہوا۔ قاضی خان چونکہ اس کا استاد تھا۔ اس لیے بعد میں وہ اس کا کہا ماننے پر راضی ہوگیا اور مرزا اس سے تھوڑی بہت پیش کش لے کر بدخشاں واپس چلا گیا۔

خوش خبر خان کی فتنہ پردازی

اس سے پہلے کہ مرزا محمد حکیم کا ایلچی دربار میں پہنچے اکبر نے کابل کے اس نئے ہنگامہ کا حال سن کر خوش خبر خاں سلول کے ذریعہ مرزا حکیم کے لیے سونے کے مرصع لگام والا گھوڑا

ہندوستان کے نفیس تحائف کافی رقم اور امرائے پنجاب کی امدادی فوجیں ایک فرمان کے ہمراہ روانہ کردی تھیں مرزا محمد حکیم نے فرمان شاہی کا بڑھ کر استقبال کیا اور دربار شاہی میں حاضر ہونے کا ارادہ کرلیا۔ اسی اثناء میں وہاں فریدوں خان[19] پہنچ گیا، جسے بادشاہ نے کابل کے معاملات کو سنبھالنے کے لیے نگرچین سے روانہ کیا تھا۔ اس نے وہاں پہنچ کر مرزا کو الٹی پٹی پڑھائی اور سارے معاملہ کو ایک دوسرے ہی رخ پر ڈال دیا۔ مرزا کو بہکانے میں شہاب خان کے بھائی حسن خان کا جو اس زمانہ میں کابل ہی میں تھا اور سلطان علی نامی خبر نویس کا جو ہندوستان سے بھاگ کر ایسے ہی کسی واقعہ کا انتظار کر رہا تھا، بڑا ہاتھ ہے۔ ان دونوں نے فریدون خان کی ہاں میں ہاں ملا کر مرزا حکیم کو مطمئن کردیا کہ لاہور پر قبضہ کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ لیکن خوش خبر خان کے حامیوں نے اس کی مخالفت کی آخر کار سب نے خوش خبر خان کو گرفتار کرلینے کا فیصلہ کیا۔ مرزا حکیم طبعاً بڑا با مروت آدمی تھا، اس نے خوش خبر خان کو علیحدہ بلا کر اسے وہاں سے رخصت کردیا۔ یہ خوش خبر خان اُس زمانہ میں جبکہ بادشاہ لاہور کے علاقہ میں شکار میں مصروف تھے، دریائے راوی میں ڈوب کر مرگیا۔

مرزا محمد حکیم کا لاہور پر حملہ

مرزا محمد حکیم نے بہر حال بغاوت پر کمر باندھ لی اور لوٹ مار کرتا ہوا بھیرہ تک پہنچ گیا اور وہاں سے غارت گری اور مسلسل کوچ کرکے لاہور کے سامنے دریائے راوی کے کنارے مہدی قاسم خان کے باغ میں اپنا کیمپ لگا دیا۔ اس کے مقابلے کے لیے میر محمد خان اور تمام اتکہ کے امرا نے پوری تیاری کرلی اور قلعہ میں بند ہوگئے۔ مرزا حکیم نے فصیل پر حملہ کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن ان امیروں نے اس کو حصار کے قریب تک پھٹکنے نہ دیا۔

جب ان امیروں کے عریضے بارگاہ سلطانی میں پہنچے تو بادشاہ نے آگرہ کو خان خاناں اور مظفر خان کی حفاظت میں دے کر 3 جمادی الاول 974ھ/1566ء میں خود کوچ کیا اور دہلی و سرہند کے راستے پنجاب کی طرف پیش قدمی کی۔ مرزا محمد حکیم کو جیسے ہی بادشاہ کے

7

حملہ کی اطلاع ملی اس کے ہاتھ پیر پھول گئے اور وہ جس راستہ سے آیا تھا اسی راستہ سے کابل واپس چلا گیا۔

لاہور سے مرزا کے تعاقب میں قطب الدین محمد خان اور کمال خان گکھڑ کو روانہ کیا گیا یہ لوگ کچھ دور تک جا کر بھیرہ سے واپس چلے آئے۔ انہی دنوں سندھ کے حاکم محمد باقی ترخان ولد مرزا محمد عیسیٰ کا عریضہ دربار میں پہنچا جس میں اس نے اپنی اطاعت کا اظہار کیا تھا، اور بھکر (20) کے حاکم سلطان محمود کی شکایت کی تھی کہ اس نے سندھ اور لاہور کے علاقے میں مداخلت کر کے نقصان پہنچایا ہے۔ بادشاہ نے اسکے حسب مدعا سلطان محمود کے نام فرمان لکھ دیا۔ لاہور میں قیام کے دوران خان خاناں کا عریضہ پہنچا کہ معز مرزا اور شاہ مرزا نے جن کو سنبل اور اعظم پور کے توابعات میں منتور کی جاگیر دی گئی تھی اپنے چچا ابراہیم حسین مرزا اور محمد حسین مرزا کے بہکانے سے بغاوت کر دی ہے۔ خالصہ کے بعض پرگنوں پر قبضہ کر لیا ہے اور جب ان کا پیچھا کیا گیا تو یہ مالوہ کی طرف بھاگ گئے ہیں۔

سیر و شکار

انہی دنوں بادشاہ نے ہانکے کا شکار کھیلا۔ اس شکار کے لیے تقریباً چالیس کوس سے جانوروں کو ہنکا کر گھیرے میں لایا گیا اور بتدریج اس گھیرے کو تنگ کر دیا گیا۔ اس گھیرے میں ہر قسم کے تقریباً ہزار جانور آ گئے تھے۔ بادشاہ نے خاص و عام کو درجہ بدرجہ شکار کرنے کا حکم دیا۔ شکار سے فارغ ہونے کے بعد بادشاہ نے اپنا گھوڑا دریائے راوی میں ڈال دیا۔

سوائے ایک دو آدمیوں کے جن میں خوش خبر خان بھی تھا باقی سارے ہمراہی سلامتی کے ساتھ دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔

اسی شکار کے دنوں میں مظفر خان وزیر خان کو اپنے ہمراہ لایا تھا اور بادشاہ نے آصف خان اور مجنون خان کے نام فرمان جاری کر دیا تھا کہ دونوں مل کر گڑہ اور مانک پور کی سرحدوں کی حفاظت کریں۔

خان زمان کی دوبارہ بغاوت

اسی اثنا میں خبر پہنچی کہ خان زمان، بہادر خان اور سکندر خان نے وعدہ خلافی کر کے بغاوت کردی ہے اور اپنے کچھ آدمی مرزا محمد حکیم کے پاس اس کو حملہ کرنے کی دعوت دینے بھیجے ہیں۔ جونپور میں میرزا حکیم کے نام کا خطبہ وسکہ بھی جاری کرنے کی فکر میں ہیں۔ ملا غزالی مشہدی نے مرزا حکیم کے متعلق یہ سجع نکالا تھا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم وارث ملک است محمد حکیم

مہابھارت کی یادگار

بادشاہ کو جب اس بغاوت کی خبر ملی تو انھوں نے خان زمان کے نمائندہ میرزا مبارک رضوی کو خان باقی خان کی حراست میں دے دیا اور پنجاب کے تمام معاملات خان کلاں اور اتکہ کے امرا کے سپرد کر کے 12 ماہ رمضان 974ھ/1566ء کو آگرہ کا ارادہ کیا۔ راستہ میں قصبۂ تھانیسر کی سیر کی جو قدیم دور کا بہت بڑا مذہبی مقام تھا۔ تھانیسر میں کرکھیت کا تالاب ہے جس میں آج سے چار ہزار سال پہلے کوروں اور پانڈوں کی لڑائی ہوئی تھی۔ ہندوؤں کے قول کے مطابق اس لڑائی میں تیراہ کروڑ بلکہ اس سے بھی زیادہ لوگ مارے گئے تھے۔ اس جگہ ہر سال ایک بڑا میلہ لگتا ہے۔ اس زیارت گاہ میں ہندو سونا، چاندی، جواہرات، قیمتی کپڑے اور نفیس چیزیں چڑھاتے اور خیرات کرتے ہیں اور پوشیدہ طور پر روپے دریا میں ڈال دیتے ہیں۔ اس تیرتھ میں سنیاسی اور جوگی، کورو اور پانڈو کی لڑائی کی یادگار میں ایک دوسرے سے جنگ بھی کرتے ہیں۔ بادشاہ نے ان کی جنگ کا تماشا بھی دیکھا اور بادشاہ کے اشارہ پر کچھ سپاہیوں نے اپنے بدن پر راکھ مل کر سنیاسیوں کا بھیس بنالیا اور سنیاسیوں کی طرف سے لڑنے لگے، کیوں کہ سنیاسی بیچارے صرف تین سو تھے اور ان کے مقابلے میں جوگی پانچ سو سے زیادہ تھے، لڑائی بڑی دلچسپ تھی۔ ادھر ادھر سے کچھ لوگ مارے گئے، آخر کار سنیاسوں کو فتح ہوئی۔

جب اکبر نے دہلی میں قدم رکھا تو مرزا میرک رضوی خان، باقی خان کی قید سے

چھوٹ کر اپنے آقاؤں کے پاس چلا گیا۔ خان باقی خان بھی سزا کے خوف سے باغیوں سے جا کر مل گیا۔

دہلی کے قیام میں حاکم دہلی تتار خان کی سعی سے پرگنہ بھوجپور کا جاگیردار شاہ فخر الدین مشہدی، شہاب خان ترکمان گرفتار ہو کر حضور میں پیش کیا گیا اور اسے اس جرم میں کہ محمد امین دیوانہ جب لاہور سے بھاگ کر اس کے پرگنہ میں گیا تھا تو اس نے پناہ دی تھی اور اسے گھوڑا اور سفر خرچ دے کر باغیوں کے پاس پہنچا دیا تھا۔ بادشاہ نے سزا کا حکم واپس لے لیا۔

باغیوں کے خلاف اکبر کی فوجی کاروائی

جب سواری آگرہ پہنچی تو خبر ملی کہ خان زمان نے شیر گڑھ عرف قنوج پر حملہ کر کے یوسف خان مشہدی کا محاصرہ کر لیا ہے۔ اکبر نے آگرہ کو خان خاناں کی نگرانی میں چھوڑا اور 26 شوال 974ھ / 1566ء میں جون پور کی طرف کوچ کر دیا۔ اس وقت اتنی سخت گرمی پڑ رہی تھی کہ ہڈیوں میں گودا تک حرارت کے مارے جلا جا رہا تھا۔

جب سکتیہ کے قصبہ میں چھاؤنی قائم ہوئی تو معلوم ہوا خان زمان مانک پور کی طرف جہاں اس کا بھائی بہادر خان تھا، بھاگ گیا ہے۔ بادشاہ نے قصبہ بھوجپور پہنچ کر چھے ہزار تجربہ کار سواروں کی جمعیت کو محمد قلی خان برلاس، مظفر خان، راجہ ٹوڈرمل، شاہ بداغ خان اور اس کے لڑکے عبدالمطلب خان اور حسین خان کی سرداری میں اسکندر خان پر حملہ کرنے کے لیے اودھ کی جانب مقرر کر دیا۔

لشکر کے ہراول کی کمان داری پر پہلے حسین خان کو مقرر کیا تھا، لیکن وہ قلعہ بندی کی مصیبتیں اٹھا کر پریشان حال اور بد حال ہو کر آیا تھا اور اپنے لشکر کے اخراجات کی وصولی کے لیے پرگنۂ شمس آباد کی طرف جو اسے ابھی ابھی جاگیر میں ملا تھا، گیا ہوا تھا۔ اسے وہاں سے واپس آکر لشکر کے ساتھ ہمرکاب ہونے میں کچھ دیر ہو گئی اس لیے بادشاہ نے اس کی جگہ ہراولی پر قیا خان کو مقرر کر دیا۔

ان دنوں میں حسین خان مذکور کے ساتھ وہ میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی کوچ کر گیا تھا، اس لیے میں اسی قصبہ میں ٹھہر گیا۔ وہاں ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا تھا جس کی شہر کے معتبر لوگوں نے شہادت دی تھی کہ کچھ ہی دن پہلے ایک دھوبی کا چھوٹا بچہ گنگا کے کنارے گھاٹ پر سو گیا تھا۔ اچانک وہ دریا میں گر پڑا اور تیز موج نے اسے وہاں سے بہا کر دس کوس کے فاصلے پر قصبہ بھوجپور کے کنارے ڈال دیا۔ وہاں اسکے رشتہ دار دھوبیوں نے بچے کو پہچان لیا اور صحیح ماں باپ کے پاس پہنچا دیا۔

باغیوں پر اکبر کا حملہ

جب رائے بریلی میں شاہی کیمپ لگا تو خبر آئی کہ خان زمان اور بہادر خان گنگا پار کر کے کالپی کی طرف جا رہے ہیں اسلئے بادشاہ نے لشکر کو خان جہاں کی سرکردگی میں کنڑہ کی طرف روانہ کر دیا اور خود نہایت تیزی کے ساتھ مانک پور پہنچ کر ہاتھی پر سوار ہو کر دریا پار کیا۔ اس وقت بادشاہ کے ساتھ چودہ سولہ آدمیوں سے زیادہ نہیں تھے، مجنون خان اور آصف خان جو ہراول پر مقرر تھے ہر گھڑی باغیوں کی خبر پہنچا رہے تھے، انھوں نے خبر دی کہ خان زمان اور بہادر خان جن کے سروں پر قضا منڈلا رہی تھی، رات بھر شراب پینے اور رنڈیوں کا ناچ دیکھنے میں مشغول رہے ہیں اور اب ان کی سرکشی کا پیمانہ بس لبریز ہو چلا ہے۔ خان زمان وغیرہ کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ بادشاہ خود انکے سر پر آ پہنچا ہے کیونکہ یہ لوگ میدان جنگ کی ہر آنے والی خبر کے متعلق یہی خیال کیے ہوئے تھے کہ یہ صرف مجنوں خان کی پیش قدمی سے متعلق ہے، چونکہ وہ مجنون خان کو گھاس کے تنکے کے برابر بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے اس لیے انکو اس حملہ کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔

خان زمان کی ہلاکت

بادشاہ اس دن سندر نامی ہاتھی پر سوار تھے اور اپنے ساتھ عماری میں انھوں نے مرزا کوکہ اعظم خان کو بٹھا رکھا تھا شاہی سواری تو لشکر کے قلب میں تھی۔ آصف خان اور امرائے

انکے میمنہ میں تھے۔ مجنون خان کچھ اور لوگوں کے ساتھ میسرہ پر مقرر تھا۔ ادھر خان زمان خان صبح کے وقت اپنے لشکر کو کوچ کا حکم دے کر سو گیا تھا کہ اچانک موت کی آہٹ نے اسے چونکا دیا۔ جب اس نے اچھی طرح دیکھا تو لشکر کی سج دھج دیکھ کر اسے یقین آگیا کہ خود شہنشاہ لشکر میں موجود ہیں، چنانچہ اس نے اپنی فوج کو فوراً بلا لیا اور صف آرائی کر لی۔ ایک بہادر جمعیت کو شاہی ہراول کے مقابلہ پر آگے بڑھایا۔ جب یہ دستہ آگے آیا تو بابا خان قاقشال اوقچیوں کے سردار نے اسکو تیروں کی زد پر لے لیا اور پیچھے دھکیل کر خان زمان کی لشکر گاہ تک پہنچا دیا۔ اس موقع پر بھاگنے والوں میں سے کسی کا گھوڑا پوری قوت سے جا کر خان زمان کے گھوڑے سے ٹکرا گیا اس صدمے سے خان کی پگڑی اس کے سر سے اتر کر کمند کی طرح اس کے گلے میں لپٹ گئی۔ بہادر خان نے جب یہ حال دیکھا تو بڑی بہادری کے ساتھ اس نے بابا خان پر حملہ کر دیا اور سے دھکیلتے ہوئے مجنون خان کی صفوں تک پہنچا دیا اس بھگدڑ میں مجنون خان اور بہادر خان ایک دوسرے کے مقابل آگئے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے نہایت دلیری اور بہادری کے ساتھ جنگ کی۔ عین اس وقت ایک تیر بہادر خان کے گھوڑے کو لگا اور وہ بدک کر زمین پر گر پڑا بہادر خان کو لوگوں نے گھیر کر گرفتار کر لیا۔ اس وقت بادشاہ ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہو گئے اور حسب الحکم کوہ پیکر ہاتھیوں کے حلقہ کو خان زمان کے لشکر پر دوڑا دیا گیا۔ ہیرانند نامی بادشاہی ہاتھی باغیوں کے ہاتھی اودیا سے جا کر بھڑ گیا اور اسے اتنی زور کی ٹکر ماری کہ وہ میدان میں ڈھیر ہو گیا۔ اس ہنگامہ میں ایک تیر خان زمان کے گھوڑے کو بھی لگا۔ وہ اسے نکالنے لگا تھا کہ گھوڑے کو ایک اور تیر آکر لگا اور گھوڑے کے بھڑک جانے سے خان زمان نیچے گر پڑا۔ اسی وقت نرسنگھ نامی ہاتھی کے ہاتھی بان نے خان زمان کی طرف رخ کیا خان زمان نے اس سے بہت کچھ کہا کہ میں ایک بڑا سردار ہوں اگر تو زندہ بادشاہ کے پاس پکڑ کر لے جائے تو تجھے بڑا انعام ملے گا، لیکن اُجڈ ہاتھی بان نے اس پر ہاتھی کو دوڑا دیا۔ خان زمان ہاتھی کے پیروں کے نیچے اس طرح پامال ہو گیا کہ اس کی ہڈیاں تک سرمہ ہو گئیں۔

بہادر خان کا قتل

جب جنگ کا میدان ٹھنڈا پڑا تو نظر بہادر، بہادر خان کو گرفتار کر کے بادشاہ کے سامنے لے آیا۔ بادشاہ اسے قتل کرنا نہیں چاہتے تھے اس لیے اس سے پوچھا کہ "بہادر کہو کیا حال ہے؟ اس نے جواب میں کہا: "الحمد لله علی کل حال" جب اس نے پانی مانگا تو بادشاہ نے اپنے خاصہ میں سے پانی کا پیالہ اسے دیا۔ امراء اس کے زندہ رہنے کو خطرناک سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے اصرار کر کے اس کو قتل کرا دیا۔ کچھ دیر بعد خان زمان کا سر بھی ملاحظے میں پیش کیا گیا۔ بادشاہ پس و پیش میں تھا کہ یہ خان زمان کا سر ہے یا نہیں؟ اسی وقت خان زمان کا وکیل رائے ارزانی جو اسیروں کی صف میں کھڑا تھا، آگے آیا اور مقتول کے سر کو اٹھا کر اپنے سر سے لگایا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اس کے علاوہ خواجہ دولت سرائے جو خان زمان کی ملازمت چھوڑ کر بادشاہ کی ملازمت میں آ گیا تھا اور اسے دولت خان کا خطاب ملا تھا اس نے کہا "خان زمان کے سر کی علامت میں بتاتا ہوں۔ وہ چونکہ ہمیشہ پان سیدھے کلے میں رکھا کرتا تھا، اس لیے اس کی سیدھی جانب کے دانت سیاہ ہو گئے تھے"۔ یہ لڑائی بروز پیر یکم ذی الحجہ 974ھ/1566ء کو پراگ عرف الہ آباس کے مضافات میں منکر وال کے قصبہ میں جلوس کے بارھویں سال میں ہوئی تھی۔

اس معرکہ میں جو لوگ قتل ہوئے ان میں ایک مرزا خوشحال بیگ بھی ہے، میں (صاحب منتخب التواریخ) نے مرزا کو مالوہ کے لشکر میں ادہم خان اور پیر محمد خان کے ساتھ ایک محفل میں دیکھا تھا۔ بلا شبہ وہ حسن صورت اور حسن سیرت کا مکمل نمونہ تھا۔ اس کی شخصیت دل سے بھلائی نہیں جا سکتی تھی۔

اسی سال علامہ عصر میر مرتضی شیرازی اس دنیائے فانی سے عالم بقا کو پہنچے۔ انکو پہلے دہلی میں امیر خسرو کے قریب دفن کیا گیا تھا، بعد میں جب صدر الصدور قاضی اور شیخ الاسلام نے عرض کیا کہ امیر خسرو ہندوستانی اور سنی تھے اور میر مرتضی عراقی اور رافضی ہیں اس لیے امیر خسرو کو ان کی قربت سے اذیت ہوگی۔ اس گزارش پر بادشاہ نے دوسری جگہ

دفن کرنے کا حکم دے دیا۔ یہ بات دونوں مرحومین کے بارے میں ہے بہر حال افسوس ناک تھی۔

اسی سال میرے ایک شناسا شیخ ابو الفتح جو شیخ سعد اللہ ولد شیخ بدھ کے بھائی ہوتے تھے اور بیانہ کے معززین میں سے تھے انتقال کر گئے۔

آگرہ میں افواہیں

میرزا نظام الدین سے میرے (صاحب تصنیف منتخب التواریخ) بڑے اچھے تعلقات تھے۔انھوں نے خود مجھ سے کہا تھا اور اس واقعہ کو اپنی تصنیف "تاریخ نظامی" میں بھی درج کیا ہے کہ خان زمان کی جنگ کے موقع پر افواہ باز خاص طور سے پوستی افیونی طرح طرح کی وحشت ناک خبریں پھیلاتے رہتے تھے۔ ایک دن چار احباب بیٹھے ہوئے خوش گپیاں کر رہے تھے تفریحاً ہم نے بھی سوچا بڑا مزا آئے گا اور ہم نے یہ افواہ پھیلا دی کہ بادشاہی فوج خان زمان اور بہادر خان کا سر لے کر آرہی ہے چنانچہ یہ خبر ہم نے چند لوگوں کو سنائی اور یہ سارے شہر میں پھیل گئی۔ اتفاق دیکھو کہ جس دن یہ افواہ پھیلی ہوئی تھی اس دن خان زمان اور بہادر خان قتل کیے گئے تھے اور تیسرے دن مراد بیگ کا باپ عبد اللہ ان دونوں کے سر لے کر آگرہ میں آیا اور وہاں سے دہلی، لاہور اور کابل لے گیا۔

اس فتح کے بعد جس کا باغیوں کو گمان بھی نہیں تھا اکبر الہ آباد گیا اور ان لوگوں کو جو بارگاہ سے بھاگ گئے تھے یا باغیوں کا ساتھ دے رہے تھے گرفتار کر کے سرکاری افسروں کے سپرد کر دیا۔ میرزا میرک رضوی کو جو دہلی سے بھاگ گیا تھا ہاتھی کے تلے دے دیا گیا مگر ابھی ہاتھی نے اسے اپنی سونڈ سے رگیدنا شروع ہی کیا تھا کہ بادشاہ نے اس کے سید ہونے کا خیال کر کے معافی عطا کر دی۔ چند دوسرے باغی بھی اپنی سزا کو پہنچے۔ خان زمان کے کچھ آدمیوں کی جنھوں نے اطاعت اختیار کر لی تھی جان بخشی کر دی گئی۔

دو دن بعد بادشاہ بنارس اور وہاں سے جون پور پہنچے اور اس شہر میں تین دن تک قیام کیا اس کے بعد تین چار دن میں حملہ کرتے ہوئے چار پانچ اشخاص کے ہمراہ کڑہ اور

مانک پور کی سڑک پر گنگا کے کنارے پہنچے شاہی لشکر اسی جگہ ٹھہرا ہوا تھا۔ یہاں سے کشتی پر بیٹھ کر کڑہ کے قلعہ میں سواری پہنچی۔

قاضی طوائیسی کی حق گوئی

جس وقت خان زمان کے آدمیوں کو قتل کیا جا رہا تھا، قاضی طوائیسی لشکر کے قاضی نے جو نہایت دیانت دار اور حق گو آدمی تھا، عرض کیا کہ ان لوگوں کو شکست دینے اور ان کے اموال پر قبضہ کر لینے کے بعد ان کا قتل شرعاً جائز نہیں ہے۔ بادشاہ کو اس کی یہ بات بری لگی اس لیے اس کو قضاوت سے معزول کر کے کڑہ کے قاضی یعقوب کو جو علم فقہ میں بڑی شہرت رکھتے تھے اور شیر شاہ کے قاضی فضیلت کا جسے لوگ قاضی فضیحت کہا کرتے تھے، داماد تھا۔ ان کو منتخب کر کے طوائیسی کی جگہ قاضی بنا دیا۔ یہ شخص علم و فضیلت کے باوجود مسخرہ پن اور ہزل گوئی کا عادی تھا۔ دس سال بعد اُسے بھی معزول کر دیا گیا اور اس عہدہ پر قاضی جلال الدین ملتانی کا تقرر ہوا۔

اکبر نے خان خانان کی طلبی کے لیے فرمان روانہ کر دیا تھا چنانچہ خان خاناں اسی منزل میں آگرہ سے آکر باریاب ہوا۔ بادشاہ نے بہادر خان اور خان زمان کی ساری جاگیر جون پور اور بنارس سے غازی پور اور قلعہ چنار تک اور ادھر زمانیہ سے لے کر چوسہ ندی کی گزرگاہ تک اس کو عطا کر دی اور گھوڑا و خلعت عطا فرمایا اور اس کام پر رخصت کر دیا۔ اس انتظام کے بعد اکبر نے ماہ ذی الحجہ کی 974ھ/1566ء میں عین بارش کے موسم میں کوچ کیا اور محرم 975ھ/ 1567ء میں پایہ تخت پہنچ گیا۔

سکندر اوزبک کے خلاف فوج کشی

محمد قلی خان برلاس اور مظفر خان کی جمعیت کو اودھ میں سکندر اوزبک کی بغاوت کو کچلنے کے لیے مقرر کیا گیا تھا ان لوگوں نے سکندر کو اودھ کے قلعہ میں گھیر لیا۔ جب اس کو خان زمان اور بہادر خان کے قتل کی اطلاع ملی تو وہ بھی بدحواس ہو گیا اور امیروں سے صلح کے

مذاکرات کرتا رہا۔ مصالحت کا تو بہانہ تھا امرائے شاہی کو دھوکہ میں رکھ کر وہ کشتی میں سوار ہوگیا اور سریو ندی کے دوسرے کنارے پر جا پہنچا۔ پھر وہاں سے اس نے مصالحت کی دوبارہ بات چھیڑی، چنانچہ شاہی لشکر کے چند امیر اس سے گفتگو کے لیے گئے۔ وہ بھی اپنے تین چار آدمیوں کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر آیا اور دونوں فریقوں نے صلح کا عہد و پیمان کرلیا۔ طے یہ پایا تھا کہ امرائے مذکور اسے بارگاہ شاہی میں لے جائیں گے اور سفارش کریں گے مگر اسے کچھ ایسا ہول تھا کہ اس عہد پر قائم نہیں رہ سکا اور پٹھانوں کے علاقہ میں چلا گیا۔ امیروں نے گورکھ پور تک اس کا پیچھا کیا اور سارا ماجرا دربار میں لکھ بھیجا۔ بادشاہ نے بذریعہ فرمان امراء کو طلب کیا اس وجہ سے اودھ میں محمد قلی خان برلاس کو متقرر کرکے یہ لشکر دارالسلطنت کی جانب چلا گیا۔

چتوڑ کے قلعہ پر حملہ

975 ھ/1567 ء میں چتوڑ کی تسخیر کا ارادہ کیا گیا اور بادشاہ نے بیانہ کو حاجی محمد خان سیستانی سے لے کر آصف خان کی جاگیر میں دے دیا، اس کے علاوہ اسے بیاور، وزیر پور اور ماندل گڑھ کی جاگیریں بھی عطا کی گئیں، تاکہ وہ پہلے جاکر لشکر کا ساز وسامان تیار کرلے۔ اس کے جانے کے بعد بادشاہ نے کوچ کیا اور باری کے راستہ سے شکار کھیلتے ہوئے مئو، میدانہ اور پھر وہاں سے سوپر کی طرف گیا۔ لشکر شاہی کی آمد پر رائے سرجن کے آدمیوں نے سوپر کے قلعہ کو خالی کردیا۔ بادشاہ نے اس قلعہ پر نظر بہادر کو اور کوتہ بلایہ کے قلعہ پر شاہ محمد خان قندھاری کو متقرر فرمایا۔ یہاں سے لشکر قلعہ کا کرون پہنچا اور شہاب الدین احمد خان اور شاہ بداغ خان کو مالوہ کا علاقہ جاگیر میں دے کر ان کو بادشاہ نے محمد سلطان کے بیٹوں میرزا الغ اور شاہ میرزا کی بغاوت کو کچلنے کے لیے متقرر کیا یہ دونوں باغی ہوکر گجرات میں سلطان محمود کے غلام چنگیز خان حاکم گجرات کے پاس چلے گئے اور مالوہ کا سارا علاقہ بغیر کسی جنگ کے محروسہ کے علاقے میں شامل کرلیا گیا۔

اکبر کی فوج کشی پر رانا اودے سنگھ(21) نے چتوڑ کے قلعہ پر اپنے ایک بہادر

اور دلیر سردار رائے بے مل کو جو قلعہ مرٹھ میں میرزا شرف الدین حسین سے جنگ کرکے بھاگ نکلا تھا، مقرر کر دیا اور خود اودے پور کی طرف کوہ نیلو کے گھنے جنگلوں اور بلند پہاڑوں میں جا کر چھپ گیا۔ آصف خان نے بہرام پور پر جو اس علاقہ کا آباد اور بارونق شہر ہے حملہ کیا اور تلوار کے زور پر قلعہ پر قبضہ کرلیا۔ راجہ کا سارا علاقہ پامال ہوگیا۔ حسین قلی خان نے اودے پور کوہ نیلو پر فوج کشی کی اور بڑی تباہی مچائی رانا مجبور ہوکر وہاں سے دوسرے مقام پر منتقل ہوگیا۔

قیامت خیز محاصرہ

بادشاہ قلعہ چتوڑ (22) کا محاصرہ کیے ہوئے تھے حکم شاہی کے مطابق قلعہ پر چڑھائی کے لیے سرنگیں کھدوائی گئیں۔ سرنگ اتنی چوڑی تھی کہ دس سوار اس میں اچھی طرح سے آجاسکتے تھے اور بلندی اتنی تھی کہ ہاتھی سوار ہاتھ میں نیزہ لیے ہوئے بہ آسانی گزر سکتا تھا۔ قلعے والوں کی آتش باری اور سنگ اندازی سے لشکر کے بہت سے آدمی ہلاک ہورہے تھے۔ ان کی لاشیں سرنگ میں پتھر اور اینٹ کی جگہ لگادی جاتی تھیں کافی عرصہ میں جاکر سرنگ اور نقب قلعے کی بنیادوں تک پہنچی۔ قلعہ کے دو متصل برجوں کو نیچے سے کھوکھلا کرکے بارود سے بھر دیا گیا اور بہادر مسلح سواروں کی ایک جمعیت ان برجوں کے قریب پہنچ کر سرنگ کے پھٹنے کا انتظار کرنے لگی کہ جیسے ہی یہ برج گرے وہ اس راستے سے قلعہ میں داخل ہوجائیں۔ اتفاق ایسا ہوا کہ دونوں نقبوں میں جب آگ لگائی گئی تو ایک نقب جس کا فتیلہ نسبتاً چھوٹا تھا، جلد پھٹ گئی دوسری نقب کا فتیلہ کچھ لمبا تھا اس لیے اس کے پھٹنے میں دیر لگی۔ پہلی نقب کے پھٹتے ہی ایک برج بنیاد سے اکھڑ کر فضا میں بکھر گئی اور حصار میں ایک بہت بڑا شگاف پیدا ہوگیا۔ منتظر سواروں نے جن کو دوسرے فتیلہ کا خیال نہیں رہا تھا بے محابا حملہ کردیا اور قریب پہنچ کر اندر جانے کا راستہ ڈھونڈنے لگے عین اسی وقت دوسرا فتیلہ سلگ اٹھا اور دوسرے برج کو بھی جہاں غیر اور اپنے تھے اڑادیا۔ چنانچہ لشکر کے اکثر غازی، بہادر سب کے سب سو سو، دو دو سو من وزنی پتھروں کے نیچے دب کر رہ

گئے۔ ہر طرف ہنگامہ مچ گیا:

این بہ جنت واد آب و آن بدوزخ برد جون
گر چہ خون گبر و مومن ہر دو یک جائی دوید

انسانی لاشوں پر کوے اور گدھ کافی دنوں تک جشن مناتے رہے۔ ایسے پانچ سو سپاہی جن میں سے اکثر کو بادشاہ کا تقرب حاصل تھا اس حادثہ کی نذر ہو گئے۔ ہندوؤں کے مقتولین تو شمار سے باہر تھے۔ محصورین نے راتوں رات زور لگا کر ان برجوں کی درمیانی دیوار کو دوبارہ تعمیر کرلیا اور محاصرہ میں کم وبیش تقریباً چھ مہینے لگ گئے۔

چتوڑ کے قلعہ کی فتح

25 شعبان 975ھ/1567ء منگل کی رات کو شاہی لشکر نے ہر طرف سے حملہ کر کے قلعہ کی دیوار میں شگاف ڈال دیے۔ اس موقع پر مسلمان حملہ آوروں کی توپوں اور بندوقوں کے شراروں سے جو روشنی پھیلی تو جے مل کی شکل اس روشنی میں دکھائی دی تو ایک بندوقچی نے اس کی پیشانی کو نشانہ بنایا اور وہ اسی جگہ سرد ہو گیا۔ اس کے گرتے ہی یہ عالم تھا جیسے چڑیوں کی ڈل پر پتھر آن گرا ہو۔ قلعہ بند فوج اپنے اپنے گھروں کی طرف بھاگ گئی اور لوگ اپنے اہل وعیال سمیت آگ میں کود گئے۔ اس طرح آگ میں جل کر مرنے کو ہندوستان میں ''جوہر'' کہا جاتا ہے۔ جو بچ گئے وہ اکبری تلوار کی نذر ہوئے اور تھوڑی سی تعداد قید ہو گئی۔ اس ہولناک رات میں ساری رات جنگجوؤں کی تلوار نیام سے باہر ہی رہی۔ دوسرے دن قیلولہ کے وقت تک مقتول راجپوتوں کی تعداد آٹھ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ اس خونی واقعہ کی تاریخ ہے:

دل گفت کہ بکشاد بزودی چتوڑ

دوپہر کے بعد قتال وجدال کا یہ سلسلہ بند ہوا اور سپاہی اپنے ٹھکانے پر لوٹ کر آ گئے۔ بادشاہ تین دن تک چتوڑ میں ٹھہرے رہے اور ہر طرف فتح نامے روانہ کیے اور آصف خان کو وہاں کی حکومت سپرد کر کے بروز منگل 25 شعبان کو شاہانہ سواری نے آگرہ کی طرف کوچ کیا۔

اجمیر کا پیدل سفر

جیسا کہ بادشاہ نے منت مانی تھی، اجمیر جانے کے لیے پیدل جانے کا ارادہ کیا اور بروز اتوار 7 رمضان کو اجمیر پہنچ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزار کی زیارت کی اور وہاں صدقہ، خیرات اور نذر گزار کر دس دن بعد واپسی کے لیے سوار ہوئے۔ اجمیر سے بادشاہ نے الور کا رخ کیا اور وہاں شیر کا شکار کیا۔ اس شکار میں شاہ محمد خان نے جو بہادری میں ایک دوسرا شیر تھا، شیر سے تنہا مقابلہ کیا۔ نتیجہ میں دونوں شیر مارے گئے بادشاہ یہاں پر لشکر سے علیحدہ ہوگئے اور نارنول پہنچے۔ نارنول میں شیخ نظام نارنولیؒ بڑے پایہ کے بزرگ تھے اکبر نے انکی زیارت کی اور اپنے لئے ان سے دعا کرائی پھر مسلسل کوچ کرتے ہوئے دار الخلافہ لوٹ آیا۔

اسی سال بدایوں میں میری دوسری شادی ہوئی۔ اسی سال اولیاء و مشائخ میں برگزیدہ شیخ عبد العزیز دہلویؒ نے آخری سفر اختیار کیا۔

976ھ/1567ء میں بادشاہ نے پنجاب سے تمام امراء، اتکہ خیل، کمال خان گکھڑ کو دربار میں بلالیا اور ان کی جاگیریں حسین قلی خان اور اس کے بھائی اسماعیل قلی خان کے سپرد کر کے انھیں اس صوبہ پر نامزد کر دیا۔ حسین قلی خان اور اس کا بھائی ناگور سے آئے اور رنتھمبور کی فتح کے بعد آگرہ سے پنجاب کی صوبہ داری کے لیے رخصت ہوئے۔ سنبھل اور بریلی کی سرکار خان کلاں کو دے دی گئی۔

باغی مرزاؤں کا تعاقب

محمد سلطان مرزا کے لڑکے گجرات میں چنگیز خان کی پناہ میں چلے گئے تھے۔ گجرات کے حاکم سے بھی ان کی بنھ نہ سکی اور وہ یہاں کی جاگیروں میں مداخلت کر کے بھاگ کر مالوہ آگئے۔ ان کے مقابلے میں محمد مراد خان اور مرزا عزیز اللہ مشہدی اجین کے قلعہ میں محفوظ ہوگئے۔ اشرف خان میر منشی اور صادق محمد خان ایک بھاری لشکر کے ساتھ رنتھمبور کی مہم پر بھیجے گئے انکو جب مرزاؤں کی حملے کی خبر ملی تو انھوں نے بادشاہ سے اجازت لے کر قلیچ

خان کے ساتھ جسے ان کے بعد اس قلعہ کو تسخیر پر مقرر کیا گیا تھا۔ مرزاؤں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے اجین کا رخ کیا۔ سرونج میں شہاب الدین احمد خان اور سارنگ پور میں شاہ بداغ خان بھی ان امیروں سے آ کر مل گئے، اس طرح ایک بڑی فوج منظم ہو گئی۔ مرزاؤں کو جیسے ہی اس لشکر کشی کی اطلاع ملی وہ اجین سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ بادشاہی امیروں نے ان کا پیچھا کیا جب مرزاؤں نے نربدا ندی کو پار کیا تو انھیں معلوم ہوا کہ جھجھار خاں حبشی نے ترپولیہ کے میدان میں چنگیز خان کو غافل پا کر قتل کر دیا ہے اور گجرات ترکتازیوں کے لیے خالی پڑا ہے۔ اس خبر کے ملتے ہی ان لوگوں نے گجرات کا رخ کیا اور پہلے ہی حملہ میں چپانیر کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ وہاں سے بڑھ کر بھڑوچ کے قلعہ کو گھیر لیا اور کچھ عرصہ بعد محصور قلعہ دار رستم خان رومی کو سازش اور حیلہ سے گرفتار کر کے قتل کر دیا اور اس قلعہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ قلیج خان اور صادق محمد خان دوسرے شاہی امیروں کے ساتھ نربدا کے کنارے سے لوٹ کر دربار میں آ گئے اور مندو کے جاگیردار اپنی اپنی جاگیروں پر چلے گئے۔

رنتھمبور کے قلعہ کی فتح

اسی سال 976ھ/1567ء کی پہلی رجب کو بادشاہ دہلی تشریف لائے اور چند دن پالم کے پرگنے میں ہانکے کا شکار کھیلتے رہے یہاں سے آخر ماہ شعبان کو شاہی لشکر قلعہ رنتھمبور پہنچا۔ تھوڑی مدت میں سرنگیں قلعہ کی دیواروں تک کھود لی گئیں۔ قلعہ کے مقابل رن کی نہایت دشوار گزار پہاڑی تھی۔ شاہی حکم پر سات آٹھ سو کہاروں نے مل کر پندرہ بڑی بڑی توپیں جو پانچ پانچ سات سات من کا گولہ پھینکتی تھیں اس پہاڑی پر پہنچا دیں۔ ان توپوں کی گولہ باری سے پہلے ہی دن قلعہ کے اندر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں۔ قلعہ کے حاکم رائے سرجن نے قلعہ چتوڑ کی بربادی اور وہاں کی تباہی و ذلت دیکھ کر اس کے ڈر سے ہتھیار ڈال دیے اور اپنی لڑکیوں وودا اور بھوج کو بعض زمینداروں کے ہمراہ بارگاہ شاہی میں بھیج دیا اور جان بخشی کی اجازت طلب کی۔ حسین قلی خان جہاں اس کی تسلی کے لیے روانہ کیا گیا جو رائے سرجن کو دربار میں لے آیا۔ اس نے قلعہ کی کنجی سپرد کر دی۔ اسی طرح بدھ کے دن 3

شوال کو یہ قلعہ فتح ہو گیا۔

اکبر نے دوسرے دن چند آدمیوں کے ہمراہ قلعہ کی سیر کی اور قلعہ مہتر خان سلطانی کے سپرد کر دیا اور خود حضرت خواجہ اجمیریؒ کے مزار کی زیارت کے لیے چلا گیا۔ اجمیر سے بادشاہ کی سواری بہت جلد 24 ذی قعدہ 976ھ / 1567ء کو آگرہ واپس ہو گئی اسی سال آگرہ کے نئے قلعہ کا دروازہ ہاتھی پول بن کر مکمل ہو گیا۔

اکبر شیخ سلیم چشتی کی خدمت میں

بادشاہ کے مسلسل کئی ایک لڑکے ہوئے تھے لیکن وہ کمسنی ہی میں اس دنیا سے گزر گئے اس سال بادشاہ کی ایک بیوی[23] حاملہ ہوئی۔ بادشاہ نے شیخ سلیم چشتی سیکری[24] سے دعا کرائی اور اس بیوی کو شیخ کے گھر پر بھجوا دیا۔ شیخ نے اس سے پہلے ہی شاہزادہ کی ولادت کی خوشخبری دی تھی اور شاہنشاہ کو اس سے بڑی مسرت ہوئی تھی اس لیے وہ اکثر شیخ کے گھر پر جاتے رہے اور بے چینی سے اس وعدہ کا انتظار کرنے لگے۔

شیخ سے اس تعلق و ربط و ضبط کی وجہ سے بادشاہ نے کوہ سیکری پر شیخ کی قدیم خانقاہ کے قریب ایک بڑی عمارت[25] کا سنگ بنیاد رکھا اور ایک نئی خانقاہ بنوائی جو وسعت و بلندی میں پہاڑ کا ایک حصہ معلوم ہوتی ہے اور دنیا میں ایسی مسجدیں کم ہی ہوں گی۔ یہ مسجد تقریباً پانچ سال کی مدت میں تعمیر ہوئی اس بستی کا نام فتح پور[26] رکھا گیا اس میں بازار، حمام، چوک وغیرہ بنائے گئے۔ امیروں نے بھی وہاں محل، باغات اور عمارتیں تیار کرائیں۔

شیخ سلیم چشتی نے اپنے گھر کی عورتوں کو بادشاہ سے بے پردہ کر دیا تھا، ان کے عزیزوں اور لڑکوں نے اعتراض کیا کہ آپ نے ہماری عورتوں کو ہم سے بیگانہ کر دیا ہے۔[27] شیخ نے جواب دیا، تم کو میں نے امیر بنا دیا ہے۔ دنیا میں عورتوں کی کمی تو نہیں ہے، دوسری بیویاں کرلو، آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے:

یا مکن با فیل بانان دوستی
یا بنا کن خانۂ در خورد فیل

ایک دلگداز داستان عشق

اس سال کا دلچسپ وعجیب واقعہ سید مکری گرم سیری کے لڑکے سید موسیٰ کی موت کا سانحہ ہے۔ سید موسیٰ کالپی کے معزز سادات گھرانے کا نوجوان تھا اور بادشاہی فوج میں ملازم تھا۔ وہ آگرہ میں ایک سنار کی لڑکی موہنی نامی پر عاشق ہوگیا اور دونوں میں عشق ومحبت کا رشتہ قائم ہوگیا۔ جس وقت رنتھمبور پر لشکر کشی ہوئی تھی وہ لشکر کے ساتھ نہیں گیا اور آگرہ کے قلعہ کے پاس جمنا ندی کے کنارے اپنی محبوبہ کے پڑوس میں ایک مکان لے کر رہنے لگا۔ یہ مکان میر سید جلال متوکل کے گھر کے قریب تھا۔ اس کا عشق جنون تک جا پہنچا تھا۔ چنانچہ اپنے بھروسے کے چند آدمیوں کو لے کر ایک دوبار اپنی معشوقہ کو اس کے گھر سے نکال لایا۔ لیکن ہر مرتبہ یا تو محافظ سپاہیوں نے یا سناروں نے اسے گرفتار کرلیا۔ اس طرح کوئی دوسال چار مہینے گزر گئے۔ اس عرصے میں یہ عاشق ومعشوق کبھی کبھی دور سے ایک دوسرے کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کرلیتے تھے۔ لیکن عشق تو روکے نہیں رُکتا اور یہ درد آخر کب تک؟ ایک رات موہنی کے اشارہ پر وہ کمند لگا کر اپنے محبوب کے کوٹھے پر جا پہنچا اور وہ رات دونوں نے ایک دوسرے کی ہم آغوشی میں گزاری لیکن دونوں پاکباز اور باعفت ہی رہے۔

رخصت ہوتے وقت اچانک دونوں نے یہ فیصلہ کیا کہ موہنی اپنے گھر بار کو وداع کرکے اور ننگ وناموس کا خیال چھوڑ کر اپنے چاہنے والے کے ساتھ ہی نکل جائے۔ غرض وہ دونوں اس محلے سے نکل کر بھاگ کر موسیٰ کے ایک دوست کے گھر پر پہنچے اور وہاں تین دن تک چھپے رہے۔ موہنی کے عزیزوں نے سید موسیٰ کے گھر کا محاصرہ کرکے ایک فتنہ مچادیا۔ سید موسیٰ جس کا میرے ساتھ بڑا یارانہ تھا۔ موسیٰ نے سناروں کو کسی نہ کسی طرح ٹال کر رخصت کردیا۔ جب موہنی کو اس ہنگامہ کی اطلاع ملی تو اسے سید موسیٰ کی زندگی کی فکر ہوئی کہ کہیں اس کے عزیز حاکم شہر کے ذریعہ اس کو نقصان نہ پہنچائیں۔ یہ سوچ کر اس نے اپنے چاہنے والے کو رخصت کردیا اور اس سے دوبارہ ملاپ کا وعدہ کیا۔ خود بدنامی سے بچنے کے لیے اپنے گھر لوٹ گئی۔ گھر جا کر اس نے ایک بڑا دلچسپ اور کارگر بہانہ کیا

کہ "اس رات میں بے خبر سو رہی تھی ایک حسین و جمیل شخص آیا اور میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میری آنکھ کھل گئی تو میں نے اس شخص کو موجود پایا اچھی طرح دیکھا تو اس کے سر پر جواہرات جڑاؤ تاج رکھا تھا اور اس نے میرے چہرے پر کوئی افسون پڑھ کر پھونکا اور جب میں مارے حیرت کے دم بخود رہ گئی تو مجھے اس نے اپنے پروں میں چھپالیا اور ایک ایسے شہر میں لے گیا جس کا ذکر داستانوں میں ملتا ہے۔ وہاں لے جا کر اس نے مجھے ایک نہایت خوبصورت اور شاندار محل میں رکھا۔

جاہل سناروں نے اس افسانہ کو صحیح سمجھ لیا۔ مصلحت یہی تھی کہ وہ اس واقعہ کو چھپاتے، لیکن غصہ کے مارے انھوں نے چند دن تک موہنی کو بالا خانہ میں قید کر دیا۔ سید موسیٰ بے چارہ درد فراق میں تڑپتا رہا۔ موہنی کے خیال میں تقریباً دیوانہ ہی ہو گیا۔ ان دونوں کی عشق بازی کا ہر جگہ چرچا ہونے لگا جہاں چار آدمی مل بیٹھتے بس یہ داستان چھڑ جاتی، پھر جس کے منہ جو بات چڑھتی کوٹھوں پہنچ جاتی، آخر کار موہنی نے ایک مشاطہ کے ذریعہ موسیٰ کے پاس کہلوا بھیجا اور اسے تسلی دی کہ میں نے بڑی مشکل اور حیلہ گری سے کام لے کر ان لوگوں کے ہاتھ سے نجات حاصل کر لی ہے اور ہر طرح مطمئن ہوں۔ سید موسیٰ نے اپنی محبوبہ کے کہنے پر عمل کیا اور ایک دن صبح اس کے پاس جا کر رخصت ہوا۔ دونوں نے رو دھو کر ایک دوسرے کو الوداع کیا۔ ایک راز دار کو وہاں چھوڑ کر وہ اپنی ملازمت پر لکھنو چلا گیا۔

موہنی نے موسیٰ کو خود سے دور بھیج تو دیا لیکن اس کے چلے جانے پر دن گزارنا اور رات کاٹنا اس کے لیے دوبھر ہو گیا جب فراق کے صدمے سہے نہ جا سکے تو چند دن بعد اس نے اس رازدار سے مل کر کہا رات کے وقت تم ہمارے گھر آ کر فقیروں کی طرح صدا لگانا اور میں دان دینے کے بہانے گھر سے نکل آؤں گی، پھر تم مجھے اس شہر سے نکال کر لے جانا چنانچہ مقررہ وقت پر وہ اپنے ماں باپ کے گھر سے نکل آئی۔ اس خادمہ کو جو اس کی نگرانی پر مقرر تھی کسی کام کے بہانے بھیج دیا اور راز دار کے ساتھ بھاگ گئی۔

ان لوگوں نے سفر کی تیاری پہلے ہی سے کر رکھی تھی۔ تین دن تک تو شہر میں چھپے رہے۔ جب ہر طرح اطمینان کر لیا تو فتح پور اور بیانہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ لیکن خدا کو 8

منظور نہ تھا۔ اتفاق سے موہنی کا ایک رشتہ دار اسی راستہ پر آنکلا اور اس نے موہنی کو پہچان کر پکڑ لیا۔

اس زمانہ میں آگرہ کا کوتوال پہلوان جمال تھا۔ اس کے سپاہی موقع پر آ پہنچے۔ انھوں نے موہنی کو تو اس کے رشتہ داروں کے حوالہ کیا اور بھگا لے جانے والے کو قید میں ڈال دیا۔ وہ بیچارا کافی عرصہ تک قید خانہ کی مصیبت میں مبتلا رہا آخر بڑی مشکل سے رہائی نصیب ہوئی۔

جب بے چارے سید موسیٰ کو اس واقعہ کی خبر ملی تو وہ پہلے ہی درد و فراق میں سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا اس وحشت ناک خبر کے سنتے ہی اس پر ایسی مایوسی چھائی کہ بس مرنے کے قریب آ گیا۔ وحشت و جنون کے عالم میں آگرہ جانا چاہتا تھا، لیکن بھائیوں اور دوستوں نے سمجھا بجھا کر، ڈانٹ ڈپٹ کر اسے اس ارادے سے باز رکھا۔ جب لشکر دار الخلافہ کو لوٹ آیا تو سید موسیٰ کا حال اور برا ہو گیا۔ چونکہ موہنی کو ایک محفوظ مقام پر رکھا تھا اس لیے ہزار کوشش کے باوجود وہ غریب اپنی محبوبہ کی ایک جھلک تک نہیں دیکھ سکا۔ سید موسیٰ کا ایک دوست قاضی جمال نامی ہندی کا شاعر تھا۔ یہ شخص کالپی کے علاقے میں سیوکن پور کا رہنے والا تھا۔ اپنے دوست کی یہ حالت اس سے دیکھی نہ گئی، جرأت سے کام لے کر ایک دن وہ مغرب کے وقت اُس مکان پر جا پہنچا جہاں پر موہنی نظر بند تھی اور اسے وہاں سے نکال کر ایک تیز گھوڑے پر سوار کر لیا اور دریائے جمنا کے چڑھاؤ کی طرف کنارے کنارے گھوڑے کو بھگا دیا۔ موہنی کے رشتہ دار اس کا پیچھا کرنے لگے اور سامنے سے شہر کے لوگ بھی دوڑ کر پہنچ گئے۔ گھوڑا بہت تیز تھا مگر راستہ میں بہت نالے اور گڑھے تھے اس لیے بچ کر نکل نہ سکا۔ جب موہنی نے یہ حال دیکھا تو اس نے خود کو گھوڑے سے نیچے گرا دیا اور قاضی سے کہا کہ تم بچ کر نکل جاؤ میرا سلام اس بے چارے تک پہنچا دینا۔

جب سید موسیٰ کو اس ناکامی کی خبر ملی تو وہ بالکل ہی مایوس ہو گیا۔ آگرہ کے قلعہ میں اپنے دروازے کو بند کر بیٹھ رہا اور اس صدمے کے مارے جلد ہی اس کی روح دنیا کی قید سے چھوٹ گئی۔ مرتے وقت اس نے انتہائی یاس و محرومی کے ساتھ یہ شعر تین مرتبہ پڑھا:

از یار دلم ہزار جان یافت
یاری بہ از دشمنی توان یافت

پھر اس نے کہا" اے اللہ اس درد کو مجھ بدنصیب کی روح کے ساتھ وابستہ رکھنا":

بزن بر سینہ ام خنجر جدا کن سر از تن ھم
درین خانہ تاریک راکشای در و روزن ھم

جب وہ مر گیا تو اس کی میت کو دفنانے کے لیے اٹھایا گیا۔ لوگ اس جوان مرگ کی موت پر ماتم کرنے لگے، اس کا جنازہ موہنی کے گھر کی طرف سے نکالا گیا۔ موہنی کو اس کے گھر والوں نے بیروں میں زنجیر ڈال کر قید کر رکھا تھا۔ اس نے کوٹھے پر سے اس شہید کا جنازہ دیکھا، تو جس حال میں تھی اسی حال میں مبہوت و متحیر رہ گئی۔ اس کا معمول یہ بن گیا کہ صبح سے شام تک کوٹھے پر کھڑی پُر اسرار نگاہوں سے اس طرح تکتی رہتی جیسے وہ برابر جنازہ کو سامنے سے گزرتا ہوا دیکھ رہی ہے۔ آخر کار اس کی یہ بے حسی ختم ہوئی اور اچانک بے قرار ہو کر اسی حالت میں ایک چیخ مار کر اونچے کوٹھے پر سے نیچے کود گئی اور بیروں کی زنجیر توڑنے لگی جیسے پھر دیوانہ وار بھاگتی ہوئی اپنے بدنصیب عاشق کے محلے میں جا پہنچی۔ اس کی حالت برابر بگڑتی چلی گئی۔ کبھی تو بے حس و حرکت مدہوش رہتی اور کبھی خاموش و حیرت زدہ نظر آتی۔ ماں باپ نے اس کا یہ حال دیکھا تو صبر کر کے بیٹھ رہے اور اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

جلد ہی اس بے چاری کا برا حال ہو گیا دیوانوں کی طرح اپنے آپ میں الجھتی رہتی۔ سینہ پیٹتی اور سید موسیٰ کے نام کا ورد کرتی رہتی۔ اسی حالت میں میر سید جلال متوکل کے جو ایک بزرگ درویش و عالم تھے آستانہ پر پہنچی اور ان کے سامنے کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کیا اور پھر اپنے عاشق کی قبر پر جا کر کھڑے قد سے اس طرح گری کہ پھر نہیں اٹھی۔ قارئین مجھے معاف کریں (صاحب تصنیف) میں نے اختصار کا وعدہ کیا تھا لیکن کیا کروں عشق کی اس دل گداز داستان نے میرے قلم کو بے قابو کر دیا۔

شیخ زادہ محبت کے جال میں

عشق و محبت کا ایسا ہی ایک واقعہ پہلے بھی پیش آچکا تھا۔ گوالیار میں شیخ محمد غوث کے

عزیزوں میں ایک نوجوان شیخ زادہ تھا جو پاک بازی اور نیک چال چلن میں مشہور تھا۔ آگرہ میں وہ ایک طوائف پر عاشق ہوگیا۔ یہ خبر شاہنشاہ کو ملی تو انھوں نے اس گانے والی کو ایک مصاحب مقبل خان کے حوالہ کردیا۔ اس شیخ زادے نے جان ہتھیلی پر لے کر اس محل پر کمند لگائی جس میں اس کی محبوبہ کو چوکی پہرہ میں رکھا گیا تھا اور وہاں سے اسے نکال کر لے گیا۔ بادشاہ نے شیخ محمد غوث کے لڑکے شیخ ضیاء الدین کو جو اس وقت اپنے باپ کے گدی نشین ہیں ان دونوں کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ انھوں نے سمجھا بجھا کر ان دونوں کو بادشاہ کے رو برو لے جاکر کھڑا کر دیا۔ بادشاہ نے ان دونوں کا نکاح کر دینا چاہا لیکن شیخ ضیاء الدین اور کچھ دوسرے لوگوں نے بادشاہ کو اس ارادے سے روک دیا۔ نوجوان شیخ زادہ اس مخالفت کی تاب نہ لاسکا اور خنجر کھینچ کر اپنا کام تمام کرلیا۔

اس کی تجہیز و تکفین پر علماء میں بڑا اختلاف پیدا ہوگیا تھا۔ شیخ ضیاء الدین کا کہنا تھا کہ حدیث شریف "من عشق و عف و کتم ثم مات مات شہیداً" کے مطابق وہ شہید عشق ہے اس لیے اس کو شہید کی شان و شوکت سے دفنانا چاہیے۔

ان کے علی الرغم شیخ عبدالنبی اور دوسرے عالم اور قاضی کہتے تھے وہ ناپاک مرا ہے آلودۂ فسق ہے نہ کہ آسودۂ عشق واللہ اعلم۔

اپنے عاشق کے پیچھے اس مطربہ کا برا حال ہوگیا چنانچہ اس نے سب کچھ چھوڑ کر ایک کفنی گلے میں ڈال لی اور عاشق کے مزار پر مجاور بن کر جا بیٹھی۔ چند ہی دن بعد اپنے چاہنے والے سے جا ملی۔

اسی سال شیخ گدائی کنبوہ دہلوی جو معزول کوتوال کی طرح بے آبرو جی رہا تھا اور جو زمانہ کی ڈھیل کی وجہ سے نہایت متکبر و مغرور ہو چکا تھا، فوت ہوگیا۔

کالنجر کے قلعہ پر قبضہ

977ھ/1569ء میں جب چتوڑ اور رنتھمبور کے قلعوں کی فتح کی خبریں ملک میں ہر جگہ پہنچیں

اور ہندوستان کے سارے قلعے شاہی حملے کی بدولت زمین بوس ہوتے ہوئے نظر آئے، تو بھٹہ کے حاکم چندر نے بڑی دوراندیشی سے کام لیا، اس سے پہلے کہ ذلیل وخوار ہونا پڑے، اس نے کالنجر کا قلعہ، جسے اس نے خوانده بہادر خان شروانی کے لڑکے بجلی خان سے بھاری قیمت دے کر خریدا تھا، بادشاہ کے سپرد کردینے کا فیصلہ کیا اور قلعہ کی کنجی نفیس تحائف کے ساتھ دربار میں بھجوادی۔ بادشاہ نے کالنجر کی کنجی مجنون خان قاقشال کو جس کی جاگیر قلعہ سے قریب تھی عطا کردی اور راجہ رام چندر کے نام تسلی آمیز فرمان روانہ کیا اور اسے جھوسی اور پریاگ کے قریب پرگنہ ارمل بشمول تمام عمارتوں کے جاگیر میں عطا کیا۔

شاہزادہ سلیم کی پیدائش

17 ربیع الاول 977ھ/1569ء دن کے سات بجے فتح پور میں شیخ سلیم چشتیؒ کے مکان پر[28] شاہزادہ سلطان سلیم کی ولادت ہوئی۔

شہنشاہ آگرہ سے نہایت تیزی کے ساتھ فتح پور پہنچے اور انتہائی خوشی کے عالم میں انھوں نے تمام قیدیوں کو رہا کردینے کا حکم دیا۔ شہزادہ کی ولادت کی مسرت میں سات دن تک شاہانہ جشن منعقد کیا گیا۔ اس موقع پر شاعروں نے مبارک بادی کے قصیدے کہے۔ خواجہ حسین مروی نے جو قصیدہ کہا تھا اس کے ہر مصرع سے بادشاہ کی تاریخ جلوس اور دوسرے مصرع سے شاہزادہ کی تاریخ ولادت نکلتی ہے۔ اس قصیدہ کے صلے میں بادشاہ نے اسے دو لاکھ تنکہ کا انعام دیا۔ اس قصیدہ کا مطلع ہے:

للہ الحمد از پی جاہ جلال شہریار
گوہر مہر از محیط عدل آمد برکنار

آخری شعر ہے:

شاہ ما پاینده باد و باقی آن شہزادہ ہم
روزھای بی حساب و سالہای بی شمار

آخر میں تاریخ کے متعلق مروی نے کہا ہے:

پادشاہا سلک لولوئی نفیس آوردہ ام ۔۔۔ هدیہ کان آمد باز جوئی گو شمار
کس ندارد ہدیہ زین پہ اگر دارد کسی ۔۔۔ ہر کہ دارد گو بیا چیزی کہ دارد گو بیار
یک بہ یک اشعار مروی بسکہ بی عیب آمدہ ۔۔۔ ہر یکی جوئی زوی مقصود در یای دربار

مصرع ازل زوی سال جلوس بادشاہ

از دوم مولود نور دیدۂ عالم بر آر

شیخ یعقوب صیرفی کشمیری نے بھی اسی اسلوب میں ایک قصیدہ کہا تھا لیکن کیا فائدہ جس کو صلہ ملنا تھا مل چکا۔

جمعہ 12 شعبان کو بادشاہ نے اپنی منت کے مطابق شہزادے کی ولادت کے شکرانے میں آگرہ سے پیدل اجمیر کا سفر کیا۔ ہر روز چھ سات کوس طے کرتے تھے۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ[29] کی زیارت کرنے کے بعد رمضان المبارک میں وہاں سے واپس آئے اور دہلی میں قیام فرمایا۔ چند دن دہلی کے اولیاء اللہ کی زیارت کی پھر جمنا کے دوسرے کنارے پر شکار کھیلا اور وہاں سے دارالخلافہ لوٹ آئے۔

رافضیوں کو قتل کی سزا

اس سال بادشاہ نے میرزا مقیم اصفہانی اور ایک شخص میر یعقوب کشمیری کو رافضی ہونے کے جرم میں فتح پور میں قتل کرا دیا۔

مرزا مقیم لکھنؤ میں کچھ عرصہ تک حسین خان کی ملازمت میں رہا تھا۔ حسین خان سیدوں کا بڑا معتقد تھا اس لیے وہ مرزا کے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آتا تھا اس نے مرزا کو اپنی سرکار کا وکیل بھی بنا دیا تھا۔ حسین خان کے عزیزوں اور بھائیوں نے خان کو بتلایا کہ یہ مرزا کٹر رافضی ہے اس لیے خان اس سے نفرت کرنے لگا، مرزا بھی حسین خان کی ملازمت چھوڑ کر بارگاہ شاہی میں جا پہنچا۔ بادشاہ نے اس پر مہربانی کی اور اسے کشمیر کے حاکم حسین خان کے پاس وکیل بنا کر بھیج دیا۔ اس زمانہ میں کشمیر میں چند

متعصب رافضیوں نے قاضی حبیب کو جو کچے سنی تھے، مذہبی تعصب میں حملہ کر کے زخمی کر دیا۔ قاضی ابھی زندہ ہی تھے کہ کشمیر کے حاکم حسین خان نے مفتیوں کے فتوے کے مطابق قاتل کو سزائے موت دے دی۔ مرزا مقیم نے اس معاملہ میں مداخلت کی اور اپنے اثر سے کام لے کر ان مفتیوں کو اس جرم میں کہ انھوں نے قاتل کے قتل کا فتویٰ کیوں دیا؟ ایک نہایت متعصب اور شرپسند رافضی کے حوالہ کر دیا اس نے قاتل کے قتل کا فتویٰ کیوں دیا، ایک نہایت متعصب اور شرپسند رافضی کے حوالہ کر دیا اس نے تین چار مفتیوں کو قتل کر دیا۔ اس معاملے کے کچھ عرصہ بعد ہی مرزا مقیم اور حسین خان کا وکیل میر یعقوب حسین خان کی لڑکی کو بادشاہ کے پاس پیش کش کی رسم کے لیے لے آئے۔ اس موقع پر یہ واقعہ بادشاہ کے علم میں لایا گیا۔ بادشاہ نے ان دونوں کو شیخ عبدالنبی اور اس کے رشتہ دار دوسرے چند علماء کے فتوے پر فتح پور کے میدان میں قتل کرا دیا۔ اس واقعہ کا ذکر کشمیر کی تاریخ میں بھی جیسا میں (صاحب تصنیف یعنی ملا عبدالقادر بدایونی) نے مرتب کیا ہے درج کیا گیا ہے۔

سوالک پہاڑی کے بت خانے

مہدی قاسم خان حج سے واپس آ کر قلعہ رنتھنبور میں حاضر ہوا تھا۔ اکبر بادشاہ نے لکھنؤ کا پرگنہ حسین خان سے لے کر اس کی جاگیر میں دے دیا۔ اس کارروائی سے حسین خان کو بہت رنج ہوا۔ مہدی قاسم خان کی لڑکی اس کے نکاح میں تھی، اس سے خان کو محبت بھی تھی لیکن محض انتقام کے مارے اس نے اپنے چچا غضنفر بیگ کی لڑکی سے نکاح کر لیا اور مہدی قاسم خان سے تعلقات منقطع کر لیے۔ کچھ عرصے بعد اس نے مہدی قاسم خان کی لڑکی کو خیرآباد میں اس کے بھائیوں کے پاس بھیج دیا اور جہاد کا ارادہ کر کے لکھنؤ سے اودھ کے راستے سوالک کی پہاڑی کا رخ کیا۔ پہاڑی کے بت خانوں کے متعلق یہ جھوٹی شہرت تھی کہ وہاں بت کدوں کی اینٹیں سونے اور چاندی کی ہیں اور بڑے بڑے خزانے جمع ہیں۔ سوالک کی اس مفروضہ دولت کی لالچ میں اس نے اس مہم کا راستہ اختیار کیا تھا۔

حسین خان کا سوالک پر حملہ

پہاڑیوں کا طریقہ ہے کہ جب بھی کوئی ان کے علاقہ پر حملہ کرتا ہے تو وہ تھوڑا بہت مقابلہ کر کے پہاڑوں کے اندر چھپ جاتے ہیں اور وہاں اونچی اونچی خطرناک پہاڑیوں پر مضبوط مورچہ بندی کر لیتے ہیں۔ حسین خان بھی انکو پسپا کرتے ہوئے اس مقام تک جا پہنچا جہاں پر محمد خان کا بھانجہ سلطان محمود شہید ہوا تھا۔ اس جگہ شہیدوں کی بہت سی قبریں تھیں۔ حسین خان نے شہدا کے لیے فاتحہ پڑھی اور ان کی شکستہ قبروں پر چبوترے کی تعمیر کرائی اور پھر وہاں پہاڑوں کے اندر اور آگے تک پیش قدمی کی اور وہاں کے ایک بہت بڑے زمیندار راجہ رنگا کے علاقہ پر حملہ کر کے قصبہ وجرائیل کا سارا علاقہ تاخت و تاراج کر دیا۔ وہاں سے اجمیر تک جو راجہ رنگا کا پایہ تخت تھا اور تبت کے مال واسباب، مشک، ریشم اور سونے چاندی کی بہت بڑی منڈی تھی وہاں تک، صرف دو دن کا راستہ رہ گیا تھا، لیکن جیسا کہ ان پہاڑوں کی خصوصیت ہے کہ گھوڑوں کے ہنہنانے، نقارہ کی آواز اور آدمیوں کے شور کی وجہ سے سخت بارش ہونے لگی اور جلد ہی غلہ اور گھاس کا قحط پڑ گیا، لشکری بھوکے مرنے لگے۔ حسین خان نے اپنے لشکر کو، شہر فتح کرنے کی بہت ترغیب دی اور وہاں کے سونے جواہر اور خزانوں کا بڑا لالچ دیا لیکن لشکری ایسے بدحواس ہو چکے تھے کہ وہ کسی طرح بھی اقدام کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اسے واپسی پر مجبور کر دیا۔ واپسی کے وقت ہندوؤں نے حسب معمول راستے روک دیے اور لشکریوں پر تیروں کی بوچھار کر دی ان کے تیروں میں زہر آلود ہڈیوں کے پھل لگے ہوئے تھے لشکر کو جگہ جگہ پر گھیر گھیر کر سنگ باری کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حسین خان کے اکثر تجربہ کار اور جنگ آزما بہادر، ان پہاڑوں میں شہید ہو گئے اور جو لوگ زخمی ہو کر واپس آئے وہ بھی پانچ چھ ماہ سے زیادہ نہ رہ سکے۔ زہر کے اثر سے وہ بھی اپنے ساتھیوں سے جا ملے۔ اس واقعہ کی تاریخ "تیغ بی مزہ" نکالی گئی۔

حسین خان کی ناکام واپسی

حسین خان سوالک کی پہاڑی سے ناکام و نامراد دربار میں لوٹ کر آیا۔ اس نے پہاڑیوں

سے انتقام لینے کے لیے بادشاہ سے کانت وگولہ کی جاگیر کے لیے جو اس پہاڑ کے دامن میں واقع ہے درخواست کی، بادشاہ نے اس کی درخواست قبول کرلی۔ اس نے وہاں جاکر کئی بار پہاڑ کے دامن کے علاقوں پر حملہ کیا اور ان کو تہ وبالا کردیا لیکن پہاڑ کے اندرونی علاقوں میں داخل نہیں ہوسکا۔ اس کے لشکر کے بہت سے آدمی جو پہلی مرتبہ موت کے پنجے سے بچ کر نکل آئے تھے اس مرتبہ وہاں کے زہریلے پانی کے اثر سے بغیر جنگ کے ہی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرگئے۔ چند سال بعد حسین خان نے جان ہتھیلی پر لے کر پہاری علاقے پر جی جان سے حملہ کیا اور دور تک اندر چلا گیا، لیکن اسے ان خونی پہاڑوں میں واپس آنا نصیب نہ ہوا۔

بھائی اور بیٹے کا انتقال

اس سفر کے موقع پر میں (صاحب تصنیف منتخب التواریخ یعنی ملا عبدالقادر بدایونی) حسین خان سے اجازت لے کر لکھنؤ سے بدایوں آگیا تھا۔ بدایوں آنے کے بعد میں نے اپنے مرحوم بھائی شیخ محمد کو جسے میں نے دل و جان سے پالا پوسا تھا اور وہ اپنے اخلاق و عادات میں نہایت سعادت مند لڑکا تھا، ایک اچھے گھرانے میں شادی کروادی۔ یہ شادی، شادی نہیں بلکہ بربادی تھی کیوں کہ تین ماہ بعد ہی شیخ محمد اور میرا لڑکا عبداللطیف بیمار پڑے اور ایک کے پیچھے ایک اس سرائے فانی سے کوچ کرگئے۔

ہمایوں کے مقبرہ کی تعمیر

اسی سال دہلی میں جمنا کے کنارے میرک مرزا غیاث کے زیر نگرانی ہمایوں بادشاہ کا مقبرہ آٹھ نو سال بعد مکمل ہوگیا۔ یہ عمارت واقعی نہایت حیرت انگیز اور پر فضا ہے۔

شاہزادہ مراد کی ولادت

جمعرات کے دن تیرہ ماہ محرم 978ھ/1570ء کو شیخ سلیم ؒ کے مکان پر شاہزادہ مراد کی ولادت ہوئی۔ بادشاہ نے سابقہ جشن کی طرح ایک شاہانہ جشن منعقد کیا۔

قلعہ اجمیر کا سنگ بنیاد

فتح پور میں بادشاہ نے بارہ دن قیام کیا اس کے بعد نذر گزارنے کے لیے اجمیر تشریف لے گئے اس مرتبہ وہاں ایک قلعہ کی بنیاد رکھی اور امراء کو عمارتوں کی تعمیر کا حکم دیا گیا۔ جمعہ کے دن 4 جمادی الآخر کو وہاں سے کوچ ہوا اور بادشاہ ناگور پہنچے۔ اس شہر کے بڑے تالاب کو کھدوانے کے لیے امیروں کو مامور کیا گیا اور اس کا نام ''شکر تلاؤ'' رکھا گیا۔

اسی زمانہ میں حاکم مارواڑ مالدیو کا لڑکا چندر سین دربار میں حاضر ہوا۔ بیکانیر کا راجہ رائے کلیان مل بھی اپنے لڑکے رائے سنگھ کے ساتھ آیا، کلیان مل اپنی لڑکی کو پیش کش کے لیے لایا تھا چنانچہ وہ حرم میں داخل کر لی گئی، باپ کو تو بیکانیر واپس جانے کی اجازت مل گئی لیکن بیٹے کو خدمت شاہی میں ہمراہ رہنے کا حکم ہوا۔ راستہ میں بادشاہ نے گورخر کا شکار کیا۔ یہ شکار اب تک نہیں کیا گیا تھا۔ پھر بادشاہ شیخ فریدالدین گنج شکر کی زیارت کے لیے اجودھن کی طرف جو پاک پٹن کے نام سے مشہور ہے، گئے۔ وہاں مرزا عزیز کوکہ اعظم خان جاگیردار تھا، اس نے بادشاہ کے اعزاز میں ایک بہت بڑا پر تکلف جشن منعقد کیا اور بادشاہ کے نذرانے میں نفیس اور قیمتی تحفے دیے ایسی ضیافت کم ہی دیکھنے میں آئے گی۔

پٹن سے بادشاہ لاہور تشریف لائے اور حسین قلی خان کے مہمان رہے، پھر حصار فیروزہ کے راستے دوبارہ اجمیر تشریف لے گئے اور وہاں سے مسلسل کوچ کر کے فتح پور لوٹ آئے۔

ٹھٹھہ کی فتح

میر خلیفہ کا لڑکا محب علی خان پیشۂ سپاہ گری ترک کر کے مدت سے بیٹھا ہوا تھا، اس کی بیوی ناہید بیگم کی سفارش پر جس کی ماں مرزا عیسیٰ خان حاکم ٹھٹھہ کے عقد میں تھی، بادشاہ نے اسے علم ونقارہ عطا کیا اور ملتان میں جاگیر عطا فرمائی۔ حاکم ملتان سعید خان مغل کو اس کی مدد کے لیے فرمان لکھا اور اسے اس کے پوتے مجاہد خان کے ساتھ جو ایک دلیر اور بہادر نوجوان تھا ٹھٹھہ کو فتح کرنے کے لیے مقرر کر دیا وہ دارالخلافہ سے ملتان آیا اور اپنی جاگیر

کے انتظام کے لیے چار سو سوار مقرر کر کے بھکّر کے حاکم محمد سلطان کے پاس پیغام بھیجا کہ "تم نے بارہا یہ بات کہی تھی کہ اگر تم جیسلمیر کے راستے سندھ کی فتح کا ارادہ کرو تو میں تمہارے لیے مدد روانہ کروں گا ورنہ میں بھکّر سے اس فوجی مہم کی اجازت نہیں دونگا کیوں کہ مجھے تم پر بھروسہ نہیں ہے"۔ اس کے اس انکار پر محبّ علی خان اور مجاہد خان کو اس لڑائی میں فتح حاصل ہوئی اور بھکّر کی فوج شکست کھا کر ماتیلہ کے قلعہ میں محصور ہوگئی۔ آخر وہ قلعہ بھی صلح اور امان کی شرط پر محبّ علی خان کو مل گیا۔ سلطان محمود نے بھکّر کے قلعہ سے اپنے بقیہ لشکر کو توپچیوں اور تیر اندازوں کے ساتھ مقابلہ پر بھیجا۔ وہ بھی شکست کھا کر بھاگے اور قلعہ میں بند ہوگئے اس حملہ کے وقت قلعہ میں لوگوں کا ہجوم سا ہوگیا تھا۔ لوگوں کی کثرت کی وجہ سے قلعہ کی ہوا خراب ہوگئی اور قلعہ والوں میں وبا پھوٹ پڑی۔ یہ وبا ایسی سخت تھی کہ روزانہ کم و بیش ہزار آدمی جان سے جا رہے تھے۔ 983ھ/1575ء میں اسی معرکہ کے دوران سلطان محمود جو کافی بوڑھا اور ضعیف ہو چکا تھا فوت ہوگیا اور بھکّر کا قلعہ بادشاہی فوج کے قبضہ میں آگیا۔ بادشاہ نے قلعہ کے ذخیروں اور مال و اسباب کی تحقیق کے لیے میر گیسو کو فتح پور سے روانہ کیا تھا۔

اسکندر خان اوزبک کی اطاعت اور وفات

اسکندر خان اوزبک پٹھانوں کو چھوڑ کر منعم خان خانخاناں کے پاس اپنی جان کی حفاظت کے سبب آگیا۔ چنانچہ منعم خان جون پور سے اس کو لے کر اسی سال دربار میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے دونوں کو مرصع تلوار، چہار پارچہ خلعت اور سنہری زین والا گھوڑا انعام میں دیا نیز اسکندر خان کو لکھنؤ کی جاگیر عطا فرمائی۔ اسے خان خاناں کی مدد پر مقرر کر کے جونپور رخصت کردیا۔ اسکندر خان نے لکھنؤ پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد ہی دس جمادی الاول 980ھ/1572ء میں وفات پائی۔

میرا ایک دوست جمال ولد شیخ منگن بدایونی جو نہایت حسین و جمیل شخص تھا، سنبھل میں عید قرباں کے دن تیر اندازی کر رہا تھا۔ اسے ایک اجنبی شخص نے پان کا بیڑا دیا۔ جیسے

ہی اس نے یہ پان کھایا وہ مر گیا۔

979ھ/1571ء میں آگرہ میں ایک شاندار محل اور اس طرح فتح پور کے نئے شہر میں دوسرا محل بن کر تیار ہو گیا۔

شیخ سلیم چشتیؒ کی وفات

اسی سال ماہ رمضان المبارک کے آخر میں شیخ سلیم چشتیؒ فتح پوری نے جو ہندوستان کے برگزیدہ شیخ اور بلند مرتبہ بزرگ تھے، رحلت فرمائی۔

عشق کا خمیازہ

اس سال مجھے (صاحب تصنیف ملا عبدالقادر بدایونی) ایک ہولناک واقعہ سے دوچار ہونا پڑا۔ قصہ یہ ہے کہ جس وقت محمد حسین خان کو کانت وکولہ کی جاگیر دی گئی تو میں بھی تقدیر کا مارا کچھ عرصہ تک اس کی ملازمت میں اس جگہ رہا۔ مجھے اس صوبہ کی صدارت اور فقرا کی خدمت سپرد کی گئی تھی۔ قنوج کے علاقے میں بمقام مکن پور حضرت شاہ مدار[30] کا مزار ہے میں اس کی زیارت کے لیے وہاں گیا ہوا تھا۔ انسانوں کی کمزوری آدم سے چلی آرہی ہے۔ آخر میں نے بھی انسان کا دودھ پیا ہے، خطا و نسیان سے بالا تر نہیں ہوں میری آنکھوں پر بھی غفلت و جہالت کا پردہ پڑ گیا اور یہاں ایک خوبرو کی کرشمہ وار ادا نے مجھے محبت کے جال میں پھنسا لیا۔ میں اس حرص و ہوس کو عشق سمجھ بیٹھا۔ پھر جو کچھ گزری گزری، اس درگاہ میں مجھ سے جو بے ادبانہ حرکت سرزد ہو گئی تو اس کا خمیازہ خدا کا شکر ہے کہ مجھے اس دنیا میں ہی مل گیا۔ میرے معشوق کی قوم کے چند افراد نے حملہ کر کے مجھے زخمی کر دیا چنانچہ میرے سر ہاتھ کندھے پر پے در پے تلوار کے تو زخم لگے مگر دوسرے تمام زخم تو مندمل ہو گئے لیکن سر کا زخم بڑا گہرا تھا تلوار ہڈی کو توڑتی ہوئی بھیجے تک پہنچ گئی تھی اور بائیں ہاتھ کی ایک انگلی کی رگ بھی کٹ کر انگلی لٹکنے لگی تھی بس صرف جان رہ گئی تھی لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں اس حادثہ کو جھیل گیا۔ قصبۂ بانگر مئو میں ایک ماہر جراح نے علاج کیا

اور ہفتہ بھر کے اندر ہی تمام زخم ٹھیک ہو گئے۔ اسی بیماری اور مصیبت میں میں نے منت مانی کہ اچھا ہو جاؤں تو حج کروں گا، لیکن افسوس ہے میں نے ابھی تک اپنے وعدے کو پورا نہیں کیا ہے۔ غرض کچھ صحت پانے کے بعد میں وہاں سے کانت وکولہ چلا گیا، غسل صحت کے بعد ہی میں دوبارہ بیمار ہو گیا۔ حسین خان کو خدا جنت عطا کرے، باپ اور بھائی کی طرح میری خدمت کی۔ ان دنوں سردی سخت پڑ رہی تھی اس لیے سر کا زخم دوبارہ ہرا ہو گیا تھا۔ اس نے چوب گز[31] کا مرہم اور کھانے کے لیے گز کا حلوا تیار کرا دیا۔ میں وہاں سے بدایوں چلا آیا۔ وہاں طبیب نے سر کے زخم کو دوبارہ کھول کر مرہم پٹی کی۔ اس علاج میں ایسی تکلیف ہوئی کہ بس میں موت کے منھ میں جا کر نکل آیا۔ اسی دوران ایک دن میں نے کچھ نیند اور کچھ بیداری کے عالم میں ایک خواب دیکھا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ سپاہی مجھے پکڑ کر آسمان پر لے گئے ہیں، وہاں با قاعدہ کچہری لگی ہوئی ہے جس میں دیوانی کے کارندے اور محرر کام میں مصروف ہیں اور چوکیداروں کا ایک جتھا شاہی اجلاس کی طرح ہاتھ میں چھڑیاں لیے ہوئے لوگوں کو ہٹانے اور مودب رکھنے میں مصروف ہے۔ مجھے پیش کیا گیا تو ایک محرر ایک کاغذ کو ہاتھ میں لے کر بغور دیکھنے لگا پھر اس نے کہا" یہ وہ شخص نہیں" اسی عالم میں میری آنکھ کھل گئی اور میں بہت شرمندہ ہوا۔ میں نے بچپن میں جو افواہ[32] سن رکھی تھی اس موقع پر مجھے اس کا یقین سا ہو گیا۔

بدایوں کی آتشزدگی

اسی سال بدایوں میں آتش زدگی کا بہت بڑا واقعہ پیش آیا۔ اس حادثہ میں اتنے ہندو اور مسلمان ہلاک ہوئے کہ ان کا شمار ممکن نہیں تھا۔ جلی ہوئی لاشوں کو گاڑیوں میں بھر بھر کر دریا میں بہا دیا جاتا تھا۔ ہندو اور مسلمان میت کی کوئی تمیز نہ تھی۔ بہت سے لوگ آگ سے بچ کر قلعہ کی فصیل پر چڑھ گئے تھے لیکن آگ نے پیچھا نہ چھوڑا اور وہاں تک پہنچ گئی، چنانچہ بہت سی عورتیں اور مرد فصیل پر سے دوسری طرف کود گئے، بہت سے گر کر مر گئے اور جو بچے وہ معذور و اپاہج ہو گئے۔ آگ بجھانے کے لیے جس قدر پانی ڈالتے تھے اس کے شعلے اور

بلند ہوتے جاتے تھے۔ پانی بھی تیل کا کام کر رہا تھا۔ میں (صاحب منتخب التواریخ یعنی ملا عبد القادر بدایونی) نے اس آتش زدگی کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اس کی لپٹیں میرے کان تک پہنچ چکی تھیں۔ اس حادثہ سے پہلے کا قصہ ہے کہ دو آپ کا ایک مجذوب بدایوں آیا تھا میں اسے اپنے گھر لے آیا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ تنہائی میں اس نے مجھ سے کہا ''اس شہر سے نکل جاؤ''۔ میں نے پوچھا ''کیوں؟'' مجذوب نے جواب دیا ''یہاں قدرت ایک کھیل کھیلنے والی ہے''۔ وہ عجب رند و مست معلوم ہو رہا تھا اس لیے مجھے اس کی بات کا یقین نہ آیا لیکن اس نے غلط نہیں کہا تھا:

چہ پرسی از بداؤن وز احوال پریشانش — کہ آیات عذاب النار نازل گشتہ در شانش

گجرات پر فوج کشی

980ھ / 1572ء میں گجرات فتح ہوا۔ گجرات میں بڑا انتشار اور طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ بادشاہ نے گجرات پر حملہ کی تیاریوں کا حکم دے دیا اور فوج کو حاضر ہو جانے کے لیے فرمان جاری کر دیے۔ گجرات کی مہم کے لیے 20 صفر کو پایہ تخت سے روانگی عمل میں آئی۔ 15 ربیع الاول کو اجمیر میں لشکر نے چھاؤنی قائم کی۔ اجمیر میں بادشاہ نے پہلے تو حضرت معین الدین چشتیؒ کے مزار کی زیارت کی پھر دوسرے دن وہ میر سید حسین خنگ سوارؒ کی زیارت کے لیے پہاڑ کے اوپر تشریف لے گئے میر موصوف کی شان میں یہ شعر مشہور ہے:

شکر اللہ بدل تاختہ انوار علی — از حسین ابن علی ابن حسین ابن علی

ان زیارتوں سے فارغ ہو کر بادشاہ نے ہراول میر محمد خان کلاں کی سرکردگی میں آگے روانہ کر دیا اور شاہی سواری مسلسل کوچ کر کے نویں جمادی الاول کو ناگور پہنچی۔

شاہزادہ دانیال کی ولادت

اجمیر کے قیام کے دوران میں (صاحب تصنیف منتخب التواریخ، ملا عبد القادر بدایونی)

جمعرات کی رات کو دوسری ماہ جمادی الاول کو ایک مجاور شیخ دانیال کے گھر میں شاہزادہ دانیال کی ولادت ہوئی۔ بادشاہ کو یہ خوشخبری ناگور کی دوسری منزل میں پہنچائی گئی شیخ دانیال کی نسبت سے شاہزادہ کا نام دانیال تجویز کیا گیا۔

سروہی کی جنگ

جب لشکر شاہی میرٹھ پہنچا تو خبر ملی کہ سروہی کے مقام پر ایک راجپوت نے ایلچی گری کے بہانے خان کلاں پر جمدھر[33] سے حملہ کر دیا۔ جمدھر، خان کے سینہ میں اندر تک گھپ گیا اور اس کی نوک شانہ کی پیچھے نکل آئی۔ لوگوں نے حملہ آور کو اسی وقت مار ڈالا۔ خان کلاں کو گہرا زخم آیا تھا، لیکن خیریت ہوئی کہ وہ زخم دس پندرہ دن میں بھر گیا۔ جب لشکر سروہی پہنچا تو سو ڈیڑھ سو راجپوتوں نے اپنی رسم کے مطابق کچھ نے نوبت خانہ میں اور کچھ نے راجہ سروہی کے محل میں جان دے دینے کا اقرار کیا اور مقابلہ کرنے کے لیے نکل آئے۔ سب کے سب مارے گئے۔ دہلی کے حاکم تاتار خان کا لڑکا دوست محمد جسے "تاتار بچہ" کہا جاتا تھا اسی جنگ میں شہید ہوگیا۔

اسی جگہ بادشاہ نے بیکانیر کے رائے سنگھ کو جودھ پور پر مقرر کیا تاکہ گجرات کا راستہ محفوظ رہے اور گوگنڈہ اور کومبلمیر کے حاکم رانا کیکا کی طرف سے کوئی مزاحمت پیش نہ آئے۔ راجہ بھگوان داس کے لڑکے مان سنگھ کو ایک تیار شدہ فوج کے ساتھ ایدر کی طرف مقرر کیا گیا تاکہ وہ شیر خان فولادی کے لڑکوں کا پیچھا کرے جو اپنے اہل و عیال سمیت اس جانب جا رہے تھے۔

احمد آباد کی فتح

پہلی رجب کو پٹن شہر کے سامنے شاہی لشکر نے کیمپ لگا دیا۔ پٹن سید محمود کے بھائی سید احمد خان بارہہ کو جاگیر میں ملا تھا۔ اسی مقام پر پٹھانوں کا پیچھا کرنے کے بعد مان سنگھ کافی مال غنیمت لے کر حاضر ہوا۔ شیر خان افغان، سلطان محمود گجراتی کے غلام اور وزیر مطلق

اعتماد خان کے ساتھ تقریباً چھ ماہ سے احمد آباد(34) کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ اصل میں اعتماد خان نے سلطان محمود گجراتی کے لڑکے مظفر کو قید کر رکھا تھا اور اس کے نام سے خود حکمرانی کر رہا تھا۔ جب اسے اکبر کے فوجی مہم کی اطلاع ملی تو محاصرہ اٹھالیا اور پٹھانوں کی جمعیت پریشان ہوگئی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر بروز اتوار 9/رجب کو سلطان مظفر بارگاہ شاہی میں حاضر ہوگیا۔ بادشاہ نے اسے شاہ منصور وزیر کے، جس کا حال آگے آئے گا، سپرد کردیا اور اس کے خرچ کے لیے ماہانہ تیس روپے کی رقم منظور کی۔ بعد میں وہ شاہی قید سے بھاگ گیا، لیکن راجہ سورت کے ہاتھوں قید ہوگیا۔ جس وقت راجہ نے اس کو گرفتار کر کے جونا گڑھ میں اعظم خان کے پاس روانہ کیا تو اس نے راستہ میں اُسترے سے اپنے آپ کو ہلاک کرلیا۔

دوسرے دن اعتماد خان، شاہ ابو تراب، سید حامد بخاری، اختیار الملک حبشی، ملک الشرق، وجیہ الملک، الغ خان حبشی، جھجھار خان حبشی اور گجرات کے دوسرے تمام امراء بارگاہ سلطانی میں حاضر ہوئے۔ اعتماد خان احمد آباد شہر کی کنجی اپنے ساتھ لیتا آیا تھا۔ بادشاہ نے اپنی ایک حرم کا لحاظ کر کے حبشیو کو معتمد امرا کے سپرد کردیا۔

جمعہ کے دن 14 رجب کو احمد آباد کے ساحل پر خیمہ گاہ بنائی گئی اور اکبر کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ اسی مہینہ کی 20 تاریخ کو سید محمود خان بارہہ اور شیخ محمود بخاری نے شاہی بیگمات کو لشکر میں پہنچایا۔ پیر کے دن دوسری شعبان کو لشکر نے احمد آباد سے کھنبایت کی طرف کوچ کیا۔ یہ فوجی مہم ابراہیم حسین مرزا اور محمد حسین مرزا کے خلاف کی گئی تھی ان لوگوں نے عرصہ سے بھڑوچ، بڑودہ اور سورت پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اسی موقع پر اختیار الملک حبشی جو گجرات کا نامی گرامی سردار تھا احمد آباد سے احمد نگر کی طرف بھاگ گیا۔ بادشاہ نے بے اعتباری کی وجہ سے اعتماد خاں کو شہباز خاں کنبوہ کے حوالے کردیا۔ شعبان کی 6/تاریخ کو کھنبایت کی بندرگاہ پر قیام ہوا اور 14/تاریخ کو لشکر بڑودہ کے قصبے میں پہنچا۔ بادشاہ نے گجرات کا سارا نظم ونسق میرزا عزیز کوکہ کے سپرد کر کے اس کو احمد آباد رخصت کردیا۔

ابراہیم حسین مرزا سے مقابلہ

17 ماہ شعبان کو خبر پہنچی کہ ابراہیم حسین میرزا نے قلعۂ بھڑوچ میں رستم خان رومی کو قتل کرایا ہے اور اب وہ اس راستے سے بھاگنا چاہتا ہے جو لشکر گاہ سے آٹھ کوس کے فاصلے پر تھا۔ بادشاہ نے شاہزادہ سلیم کی کمان میں لشکر کو اسی جگہ ٹھہرا لیا۔ خواجہ جہاں اور دوسرے امراء کو بھی لشکر کی نگہداشت کے لیے مقرر کیا۔ شہباز خان کو سورت پر متعینہ امیروں سید محمود بارہہ اور شاہ قلی خان محرم کو بلانے کے لیے روانہ کر دیا اور ملک الشرق گجراتی کو بدرقہ پر مقرر کر کے میرزا ابراہیم حسین کے بغاوت کو کچلنے کے لیے حملہ کیا۔ جب وہ مہندری ندی کے کنارے پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ چالیس سواروں نے ندی پار کی اور دوسری طرف کی خبر لے کر آئے کہ میرزا ابراہیم حسین دوسرے کنارے پر قصبہ سرنال میں ٹھہرا ہوا ہے۔ امرائے شاہی نے ہتھیار سجا لیے۔ سورت پر متعینہ امیر بھی اسی رات آ کر لشکر سے مل گئے۔ بادشاہ نے مان سنگھ کو ہراول پر مقرر کیا اور ایک سو سپاہیوں نے ندی پار کر لی۔

مرزا ابراہیم حسین کے ساتھ ایک ہزار سوار تھے۔ اسے شاہی لشکر کے حملے کی خبر ملی اور وہ سرنال کے قصبہ سے ایک دوسرے راستے سے نکل گیا اور ایک جنگل میں پہنچ کر مقابلہ کی تیاری کرنے لگا۔ مہندری ندی کے کٹاؤ اور راستے کی خرابی کی وجہ سے مان سنگھ ایک طرف نکل گیا اور بادشاہ کسی اور راستے پر جا پہنچے۔ آخرکار دشمن سے مڈبھیڑ ہوئی اور ابراہیم حسین نے بابا خان قاقشال پر حملہ کر کے اگلے دستے کو کافی دور تک پسپا کر دیا۔ دونوں طرف سے کچھ لوگ مارے گئے اور انھوں نے بادشاہ کی جمعیت پر حملہ کر دیا۔ اس وقت بادشاہ ایک ناہموار تنگ مقام پر جو جھاڑیوں سے گھرا ہوا تھا، ٹھہرے ہوئے تھے۔ حملہ آوروں میں سے تین شخص آگے بڑھے، ایک نے راجہ بھگونت داس کا رخ کیا۔ راجہ نے جھاڑی کے پیچھے سے اس پر نیزہ پھینک کر مارا اور وہ زخمی ہو کر بھاگ گیا۔ بادشاہ سب سے آگے کھڑے ہوئے تھے۔ دوسرے شخص نے ان پر حملہ کر دیا۔ لیکن وہ بادشاہ کے مقابلہ پر ٹھہر نہ سکا اور بھاگ گیا۔ مقبول خان، غلام سرخ بدخشی اور دونوں کے تعاقب میں روانہ ہوا پھر

چاروں طرف سے بادشاہی لشکر نے میرزا ابراہیم حسین کی جمعیت کو گھیر لیا اور وہ مغلوب ہو کر جنگ کے میدان سے بھاگ گیا۔ اسی معرکہ میں اس کے بے شمار آدمی مارے گئے اور چونکہ فتح ہو چکی تھی اس لیے بادشاہ نے لوگوں کو پیچھا کرنے سے روک دیا اور میرزا ابراہیم حسین چند گنتی کے ساتھیوں کے ساتھ احمد نگر کے راستہ سروہی کی طرف چلا گیا وہاں سے وہ ناگور پہنچا۔ جب امرائے شاہی نے اسے شکست دے کر وہاں سے بھگا دیا تو دہلی کے راستے سنبھل کے علاقے میں چلا گیا۔ اس کا انجام کیا ہوا؟ یہ ہم آگے بیان کریں گے۔

سورت کے قلعہ کی فتح

بادشاہ اس معرکہ سے 18 شعبان کو رخصت ہو کر بڑودہ میں لشکر سے آکر مل گئے اور وہاں سے سورت کے قلعہ کی فتح کے لیے روانہ ہوئے۔ اس قلعہ کو گجرات کے وزیر خداوند خان نے فرنگیوں کی روک تھام کے لیے سمندر کے کنارے 947ھ/1540ء میں تعمیر کرایا تھا چنگیز خان کے مرنے کے بعد باغی مرزاؤں نے اس قلعہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ جب گجرات فتح ہو گیا تو مرزاؤں نے اپنے اہل و عیال کو اس قلعہ میں ٹھہرایا اور وہاں کا نظم و نسق ہمایوں بادشاہ کے قورچی ہم زبان نامی کے سپرد کر دیا۔ یہ شخص شاہی ملازمت میں تھا اور غداری کر کے مرزاؤں سے جا ملا تھا۔ اس انتظام کے بعد وہ سارے ملک میں فساد مچاتے پھر رہے تھے۔ جب مرزا ابراہیم حسین کی شکست کی خبر قلعہ والوں کو ملی تو کامران مرزا کی لڑکی گلرخ بیگم جو ابراہیم حسین مرزا کی بیوی تھی اپنے لڑکے میرزا مظفر حسین کو ساتھ لے کر دکن کی طرف رخصت ہو گئی۔ میرزا مظفر حسین کو اس وقت بادشاہ کی دامادی کا شرف حاصل ہے۔ شاہ قلی خان محرم اور صادق محمد خان نے میرزا کے خاندان کا پیچھا کیا اور تھوڑا بہت مال غنیمت چھین کر لوٹ آئے۔

بادشاہ اپنے پہنچنے سے پہلے راجہ ٹوڈرمل کو قلعہ میں آمد و رفت کے راستوں اور دوسرے حالات کی تحقیق کے لیے روانہ کر دیا تھا اس نے تمام حالات کا جائزہ لے کر بادشاہ کو اطمینان دلایا کہ قلعہ تھوڑے وقت میں بہ آسانی فتح ہو جائے گا۔ اس رپورٹ پر شاہی

لشکر 7 ماہ رمضان کو قلعہ کے دروازے پر پہنچا اور اس کا محاصرہ کرلیا۔ مورچے لگا دیے گئے اور حملہ کر کے قلعہ والوں کو بڑی طرح تنگ کر دیا۔ دو ماہ کے عرصہ میں اونچے اونچے پشتے بنا کر توپچی اور بندوقچی اس غضب کی آتش باری کرنے لگے کہ قلعہ والوں میں سے کسی کو اٹھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی، بادشاہ نے دوسری جانب ایک تالاب کے کنارے قیام کیا اور مورچے آگے بڑھا کر پانی کا راستہ بند کر دیا۔ اب قلعہ والے ہر طرح مجبور ہو گئے۔ ہمزبان اور دوسرے محصور امیروں نے ایک طالب علم مولانا نظام الدین کو جو ایک اچھا مقرر تھا جان کی معافی کے لیے بادشاہ کے پاس روانہ کیا۔ اسے امرا کی سفارش پر باریابی کی اجازت ملی اور بادشاہ نے قلعہ والوں کی درخواست قبول کر لی اور اسے معافی دیے جانے کے لیے" قلعے والوں کو تسلی اور دلاسہ دے کر حضور میں لے آئے۔ دیانت دار محرر بھی مقرر کیے گئے تاکہ وہ لوگوں کے نام لکھ لیں اور قلعہ کے مال و اسباب کو ضبط کر لیں۔ ہمزبان اور اس کے ساتھی جب حاضر کیے گئے تو بادشاہ نے ہمزبان کی اور اس کے چند ساتھیوں کو جنھوں نے محاصرے کے دوران نہایت گستاخانہ کلمے کہے تھے تنبیہ کی اور ان کو سرکاری کارندوں کے حوالہ کر دیا۔ بقیہ دوسرے اسیروں کو معاف کر دیا۔ یہ فتح 23 ماہ شوال 980ھ/1572ء کو حاصل ہوئی۔

دوسرے دن بادشاہ قلعہ کو دیکھنے کے لیے تشریف لے گئے اور اس کی مرمت کا حکم دیا۔ اس معائنہ کے دوران چند بڑی، بڑی دیگیں اور توپیں نظر سے گزریں، جس وقت سلیمان سلطان خواند کار روم نے گجرات کی بندرگاہوں کو فتح کرنے کے لیے ایک بڑی فوج کے ساتھ حملہ کیا تھا تو اس نے یہ سامان سمندر کے راستہ روانہ کیا تھا۔ چند وجوہ کی بنا پر اس کی فوج واپس چلی گئی تھی اور اس وقت سے وہ دیگیں سمندر کے کنارے پڑی ہوئی تھیں۔ جب خداوند خان نے سورت کا قلعہ بنوایا تو وہ ان سے چند دیگوں کو قلعہ میں اٹھوا لایا تھا جو باہر رہ گئی تھیں۔ انھیں بعد میں جوناگڑھ کے حاکم نے قلعہ میں پہنچا دیا تھا۔ بادشاہ نے انھیں دیکھ کر فرمایا کہ اس قلعہ میں جب ان کی کوئی ضرورت نہیں ہے تو آگرہ کے قلعہ میں پہنچا دی جائیں چنانچہ وہ وہاں پہنچا دی گئیں۔

سورت کے قلعہ کی تعمیر کا سبب

کہتے ہیں کہ خداوند خان نے یہ قلعہ فرنگیوں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے بنایا تھا، کیوں کہ یہ فرنگی مسلمانوں کو بہت ستانے لگے تھے اور مسلمانوں کے شہروں پر لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ جس وقت قلعہ بننے لگا تھا تو انھوں نے جہازوں پر سے آتش باری کر کے تعمیر کے کام میں خلل ڈالنے کی کوشش کی، لیکن وہ ناکام رہے۔ ماہر انجینئروں نے سمندر کے اندر تک قلعہ کی دیواریں پہنچا دیں اور قلعہ کے اطراف میں گہری خندق کھود کر خشکی کے دونوں جانب پتھر، چونا اور پکی اینٹوں کی مستحکم دیوار بنادی۔ اس فصیل کے ہر دو پتھروں کے درمیان لوہے کے قلابے لگائے گئے ہیں اور دروازوں میں سیسہ پگھلا کر کنکر پتھر جمادیے ہیں اس دیوار کی بلندی خندق کی چوڑائی کے برابر 20 گز اور طول 35 گز ہے۔ چاروں دیواروں کا عرض 15 گز ہے۔ قلعہ اس قدر بلند اور خوش منظر ہے کہ دیکھنے والا حیران رہ جائے، سمندر کی جانب قلعہ کے جو برج ہیں ان میں فرنگیوں، خاص طور سے پرتگالیوں کے طرز تعمیر کی طرح جھروکے بنائے گئے ہیں۔ فرنگیوں نے اس قلعہ کی تعمیر کے وقت بڑی رکاوٹیں ڈالنے کی کوشش کی تھی اور جنگ پر آمادہ ہو گئے تھے۔ آخر کار وہ مصالحت پر مجبور ہو گئے اور یہ شرط پیش کی کہ سمندر کی جانب جو احاطہ ہے اسے ڈھادیا جائے تو ہم ایک کثیر رقم دینے کو تیار ہیں۔ خداوند خان نے اسلامی حمیت کی بنا پر ان کی پیش کش کو قبول نہ کیا اور ان کی ضد میں اس حصہ کو بہت جلد مکمل کرادیا۔ بادشاہ نے اس قلعہ کی حکومت قلیچ خان کے لڑکے کو سپرد کی اور 14 ذی قعدہ کو وہاں سے احمد آباد کے لیے روانہ ہو گئے۔

اس محاصرہ کے دوران چند قابل ذکر واقعات پیش آئے تھے، پہلا یہ کہ میرزا شرف الدین حسین جو دس سال سے برابر باغی ہو کر مارا مارا پھر رہا تھا ولایت بگلانہ کے راجہ بھارجیو کے ہاتھوں گرفتار ہو کر حضور میں پیش کیا گیا۔ حاضر ہونے میں اس نے بے ادبی اور خود سری کا مظاہرہ کیا اس لیے اسے تنبیہ کر کے شاہی کارندوں کے حوالے کر دیا گیا۔ بھڑوچ کی منزل میں چنگیز خان کی والدہ نے جھجھار خان حبشی کے خلاف چنگیز خان کو ناحق قتل کرنے کے الزام میں فریاد کی اور خون کے بدلے کا مطالبہ کیا۔ اس معاملہ کی تحقیقات

کرائی گئی۔ چونکہ قاتل نے اپنے جرم کا اقرار کرلیا تھا، اس لیے اس کو ہاتھی کے پیر کے نیچے ڈال دیا گیا۔

باغیوں کے مشورے

اسی سورت کے محاصرہ کے دنوں میں ابراہیم حسین میرزا شکست کھا کر سرنال سے پٹن گیا اور وہاں محمد حسین میرزا اور شاہ میرزا سے جا کر مل گیا اور سورت کے قلعہ کو بادشاہی فوج سے چھین لینے کے لیے ان مرزاؤں نے مشورہ کیا اور یہ طے پایا کہ ابراہیم حسین مرزا ہندوستان جا کر وہاں فتنہ برپا کرے اور محمد حسین مرزا اور شاہ مرزا شیر خان فولادی کے ساتھ مل کر پٹن کا محاصرہ کرلیں تاکہ بادشاہ ان کے مقابلہ کے لیے سورت چھوڑ کر احمد آباد آجائیں۔

شیر خان فولادی کی بہادری

حسب قرار داد جب مرزاؤں نے حملہ کیا تو سید احمد خان بارہہ پٹن میں محصور ہوگیا اور بڑی دلیری سے لڑتا رہا۔ اس کی مدد کے لیے قطب الدین محمد خان مالوہ اور چندیری کے جاگیر داروں کو ساتھ لے کر پہنچ گیا۔ رستم خان، عبد المطلب خان، شیخ محمود بخاری دہلوی وغیرہ بھی احمد آباد سے اعظم خان کے ساتھ پٹن پہنچ گئے۔ امدد پر آنے والی فوج سے مقابلہ کے لیے محمد حسین مرزا، شاہ مرزا اور شیر خان فولادی نے محاصرہ اٹھا لیا اور پٹن سے پانچ کوس کے فاصلہ پر آگے بڑھ کر بادشاہی فوج پر حملہ کردیا اور ایسی سخت لڑائی کی کہ تاریخ میں یادگار ہے گی۔ انھوں نے بادشاہی لشکر کی اگلی صف کو اعظم خان کے ساتھ پیچھے دھکیل دیا اور صف بندی نیز فوج کے بائیں بازو کو بھی منتشر کردیا۔ شاہی امرا نے بھی بڑی ثابت قدمی سے ان کی مدافعت کی، آخرکار میدان بادشاہی لشکر کے ہاتھ رہا اور مخالف فوج منتشر ہوگئی۔ اس وقت لشکری غنیمت سمیٹنے میں مصروف ہوگئے اور خان اعظم چند ہمراہیوں کے ساتھ میدان میں ٹھہر گیا۔ شیر خان فولادی افیون کھاتا تھا، افیونیوں کو ہمیشہ قبض رہتا ہے

جس وقت جنگ ہو رہی تھی وہ طہارت خانہ چلا گیا تھا، اس لیے افیون کی پینک اور قبض کی وجہ سے وہ اپنے دو تین ہزار آدمیوں کو لیکر اس وقت پہنچا جب کہ اس کے ساتھی بھاگ چکے تھے اور میدان خالی پڑا تھا اس نے آتے ہی شیخ محمد بخاری کے دستہ پر حملہ کر دیا۔ شیخ محمد بخاری نے آخر تک جم کر مقابلہ کیا اور لڑتے ہوئے مارا گیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر اعظم خان نے اپنی جگہ سے حرکت کی، اس کی فوج نے چاروں طرف سے حملہ آوروں کو گھیر لیا۔ شیر خان فولادی بھی مجبور ہو کر بھاگ گیا اور اپنے ساتھیوں سے جا کر مل گیا، جب اس سے پوچھا گیا کہ تم نے اپنے ہی پیرزادہ شیخ محمد بخاری کو کیوں شہید کر دیا؟ تو اس نے جواب دیا "ہم نے یہ سنا تھا کہ تمام مغل سرداروں میں شاہ بداغ خان اور ایک دوسرا سردار نہایت جم کر مقابلہ کر رہے ہیں انہی کے گمان میں ہم نے شیخ محمد پر حملہ کیا اگر ہم کو اس کا یقین ہوتا کہ وہاں شیخ محمد ہے تو ہرگز اس کے قتل کا ارادہ نہ کرتے"۔

اس شکست کے بعد محمد حسین میرزا دکن کی جانب چلا گیا اور شیر خان جوناگڑھ کے حاکم امین خان غوری کی پناہ میں چلا گیا۔ یہ فتح 18 ماہ رمضان 980ھ/1572ء میں حاصل ہوئی۔ اعظم خان نے سید احمد خان بارہہ کو بدستور سابق قلعہ پٹن پر ہی مقرر رکھا اور خود سورت میں جا کر حاضر ہوا۔

اختیار الملک حبشی سرکاری محافظوں کی قید سے احمد آباد میں بھاگ گیا تھا۔ اس کی گرفتاری کے لیے قطب الدین محمد خان اور دوسرے چند امیر مقرر کیے گئے تھے۔ اختیار الملک بھاگ کر باغیوں سے جا ملا اور لڑ بھڑ کر بعض مقامات پر اس نے قبضہ کر لیا۔ امرائے شاہی نے اس پر حملہ کر کے اسے وہاں کے قلعوں اور جنگلوں سے بھگا دیا اور سارے علاقہ میں تھانے قائم کر کے محافظ دستے مقرر کر دیے۔ اس انتظام کے بعد یہ لوگ اس وقت جب کہ لشکر سورت سے لوٹ کر محمود آباد پہنچا تھا دربار میں حاضر ہو گئے۔

گجرات سے واپسی

آخر ماہ ذی قعدہ میں بادشاہ احمد آباد پہنچے، دس دن تک وہاں قیام رہا۔ احمد آباد کی حکومت

بادشاہ نے اعظم خان کے سپرد کی۔ امرائے اتگہ کو گجرات میں جاگیریں عطا کیں۔ مظفر خان کو ڈھائی کروڑ کی جاگیر عطا ہوئی اور اسے مالوہ کا سارا علاقہ اجین اور سارنگ پور کی حکومت بھی عطا ہوئی۔ اس انتظام کے بعد بادشاہ عید قربان کے دن احمد آباد سے روانہ ہوئے اور منزل بہ منزل کوچ کرتے ہوئے محرم 981ھ/1573ء کو اجمیر واپس آئے۔ اسی اثنا میں سعید خان کا عریضہ آیا کہ مرزا ابراہیم گرفتار ہوا اور دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اسی سال 2 صفر کو شاہانہ سواری دارالخلافہ پہنچی۔

ابراہیم حسین مرزا کی بغاوت

مرزا ابراہیم حسین گجرات سے ہندوستان میں بغاوت پھیلانے کے لیے سب سے پہلے میرٹھ گیا۔ وہاں ایک قافلہ کو جو آگرہ جا رہا تھا لوٹ لیا اور ناگور چلا گیا۔ یہاں خان کلاں کا لڑکا فرخ خاں گھر گیا۔ مرزا نے شہر کے باہر بستیوں کو لوٹ لیا اور ایک دن وہاں ٹھہر کر نارنول چلا گیا ابھی وہ نارنول سے 20 کوس کے فاصلے پر تھا کہ اتفاق سے رام رائے اور رائے سنگھ جو گجرات کے راستہ کی حفاظت کے لیے مقرر کیے گئے تھے، تقریباً ایک ہزار سواروں کے ساتھ جودھ پور سے حملہ کرتے ہوئے ناگور پہنچے اور فرخ خان نے ان کے ساتھ میرزا کا پیچھا کیا اور موضع کھتولی کے علاقے میں جا کر کیمپ لگا دیا، ان کے آنے پر مرزا وہاں سے بھاگ گیا اور شاہی فوج کو پتہ نہ چل سکا کہ وہ کس طرف کو نکل گیا ہے اور کہاں ہے؟ فوج میں جو مسلمان روزہ دار تھے وہ افطار کے ارادہ سے ایک تالاب کے کنارے ٹھہر گئے۔ مرزا کچھ دور تک جانے کے بعد لوٹ آیا اور دوسری ماہ رمضان 980ھ/1572ء کو ان پر رات میں چھپ کر حملہ کر کے، دو طرف سے ان پر تیر برسانے شروع کر دیے۔ ان لوگوں نے بھی مورچہ سنبھال لیا اور ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ مرزا کے ساتھ 700 سے زیادہ آدمی نہ تھے۔ جب بادشاہی دستے نے دلیری سے حملہ کیا تو یہ مقابلہ پر ٹھہر نہ سکے اور منتشر ہو گئے۔ مرزا میدان چھوڑ کر بھاگ گیا، اندھیری رات میں اس کی فوج گاؤں اور دیہاتوں میں منتشر ہو گئی اور اس کے سپاہی جگہ جگہ گرفتار اور قتل ہو گئے۔ ان میں

سے ایک سو سپاہی فرخ خان کے ہاتھوں گرفتار ہوئے اور تہ تیغ کر دیے گئے۔ ان میں سے بعض زخمی ہو کر بہ مشکل مرزا سے جا کر مل گئے۔ مرزا نے تین سو آدمیوں کو لے کر لوٹ مار کرتے ہوئے گنگا اور جمنا کو پار کیا اور اپنی سابقہ جاگیر پرگنہ اعظم پور پہنچ گیا۔ اب اس نے سوچا اگر میں سنبھل کے قلعہ میں جس کے پیچھے کماؤں کا پہاڑ ہے اور آگے گنگا جیسی گہری ندی ہے وہاں چلا جاؤں اور ایک فوج جمع کر لوں تو بہت سے لوگ میرے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جائیں گے لیکن اس کا خیال بس خیال ہی رہا کیوں کہ بادشاہی امیروں نے ہر طرف سے اس کے راستے روک دیے تھے۔

راجہ اویسر سے لڑائی

مہدی قاسم خان، ابراہیم حسین مرزا کے دہلی آنے سے پہلے حسین خان اپنی جاگیر کانت و کولہ اور پٹیالی کے سرکشوں کی خبر گیری کے لیے گیا ہوا تھا اسی اثنا میں مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطان پوری اور راجہ بہاڑا مل نے جو وکیل اور وزیر مطلق تھے۔ فتح پور سے اس کے پاس خط بھیجا کہ ابراہیم حسین مرزا دو جگہوں پر شکست کھا کر دہلی کے علاقے میں آیا ہوا ہے اور پایہ تخت بالکل خالی پڑا ہے اس لیے تم جلد از جلد یہاں پہنچ جاؤ۔ حسب طلب وہ دار الخلافہ کی طرف روانہ ہو گیا جس وقت وہ موضع اودہ سے کوچ کر رہا تھا پرگنہ جلیسر سے اس کے پاس خبر آئی کہ راجہ اویسر نے جو بادشاہ کے جلوس سے برابر اب تک آگرہ کے علاقے میں ڈاکہ زنی اور لوٹ مار کرتا رہا ہے بادشاہی امرا کے خلاف حملہ کر دیا ہے اور مردانہ وار حملہ کر کے بعض بہادر اور تجربہ کار آدمیوں کو ہلاک کر رہا ہے اور اب وہ پرگنہ جلیسر میں موضع نوراہی کے جنگل میں چھپا ہوا ہے۔

خوفناک حملہ

ماہ رمضان کی چودہویں دوپہر کو جب کہ اکثر لوگ روزہ سے متفرق ہو کر راستہ طے کر رہے تھے کہ اچانک گولی چلنے اور تیر چھوڑنے کی آواز آئی اور معاً لڑائی چھڑ گئی۔ راجہ اویسر نے

گنواروں کی مدد سے اونچے اونچے درختوں پر تختے رکھوا کر مچانیں بنائی تھیں، وہاں سے اس نے شاہی رسالہ پر بندوقوں اور تیروں سے آتش باری کر دی۔ اس اچانک حملہ سے بعض مارے گئے اور بعض زخمی ہوئے۔ ایک گولی حسین خان کے زانو کو زخمی کرتی ہوئی نکل گئی اور وہ زین سے جھک کر گھوڑے کی گردن پر ضعف کے مارے بے ہوش ہو گیا، وہ گر پڑتا لیکن بڑے حوصلہ سے اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور زین پر بیٹھ گیا میں (صاحب تصنیف منتخب التواریخ) نے اس پر پانی کے چھینٹے مارے جو لوگ آس پاس تھے ان کو گولی لگنے کا علم تک نہیں ہوا وہ یہ سمجھے کہ روزہ کی وجہ سے غشی ہو گئی ہے۔ میں نے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر ایک درخت کے نیچے لے جانا چاہا تاکہ تیروں کی بوچھار سے پناہ مل جائے۔ اسی حالت میں اس نے اپنی آنکھ کھولی اور خلاف عادت مجھے غصہ سے گھور کر دیکھا۔ جھٹکے سے اشارہ کرتے ہوئے کہا باگ پکڑنے کا یہ کونسا موقع ہے؟ پھر اس نے فوج کو گھوڑوں سے اتر آنے کا حکم دیا۔ اسے اسی جگہ چھوڑ کر سب لوگ گھوڑوں سے اتر کر پیادہ ہو گئے۔ اس کے بعد ایسی سخت لڑائی ہوئی اور جانبین سے اتنے آدمی قتل ہوئے کہ ان کی گنتی محال تھی۔ آخر کار شاہی فوج کے مٹھی بھر سپاہیوں کو فتح نصیب ہوئی اور مقابل مقابلے سے بھاگ کھڑے ہوئے، لڑتے لڑتے سپاہیوں کے بازو ایسے شل ہو گئے تھے کہ تلوار مارنے اور تیر چھوڑنے کی سکت نہ رہی تھی۔ اس گھنے جنگل میں کچھ اس طرح اژدہام ہو گیا تھا کہ دونوں فریق بھڑ گئے تھے اور دوست دشمن میں فرق کرنا مشکل ہو گیا تھا، کمزوری اور ضعف کے مارے سپاہیوں میں شناخت و تمیز کا فرق نہ رہا تھا۔ بعض خدا کے ایسے بندے بھی تھے کہ اس سخت اور دشوار دن میں بھی اپنے روزہ کی حفاظت کرتے رہے۔ مجھ (ملا عبدالقادر) میں اتنی برداشت نہیں تھی، چنانچہ جب میں بالکل ہی بے طاقت ہو گیا تو میں نے ایک چلو پانی سے اپنے حلق کو تر کر لیا۔ بعض تو پانی نہ ملنے کی سبب پیاس سے مر گئے۔

حسین خان کا حملہ

اس فتح کے بعد حسین خان نے کانت وگولہ کا رخ کیا اور ان مقامات پر جنگی احکامات عمل

میں لائے۔ اس وقت ابراہیم حسین مرزا سنبھل سے پندرہ کوس پر لکھنؤ کے پرگنہ میں پہنچا ہوا تھا۔ حسین خان زخمی ہونے کے باوجود پالکی میں سوار ہو کر میرزا کے مقابلہ پر بانس بریلی پہنچ گیا۔ مرزا حسین خان ابراہیم حسین مرزا کی بہادری سے بخوبی واقف تھا اور جانتا تھا کہ اس سے لڑ کر وہ کسی حال میں بھی سرخرو نہیں ہو سکتا اس لیے وہ امروہہ کے راستہ لوٹ گیا۔ لکھنؤ کے علاقے میں ہمارے اور اس کے لشکر کے درمیان سات کوس کا فاصلہ تھا۔ اگر اس وقت مقابلہ ہو جاتا تو اس صورت میں جب کہ حسین خان زخمی تھا نہ معلوم کیا نتیجہ برآمد ہوتا؟ مرزا سے اس موقع پر بڑی فاش غلطی سرزد ہوئی کہ اس نے اس حال میں کہ حسین خان کے لشکر کا نظام درہم برہم تھا اس پر حملہ نہ کیا۔

امرائے سنبھل سے مشورے

سنبھل کے قلعہ میں وہاں کا حاکم معین الدین خان فرنخودی اور دوسرے جاگیردار امرا ایک بڑی فوج کے ساتھ قلعہ میں بند ہو گئے۔ جب آدھی رات کو انھوں نے حسین خان کے نقارہ کی آواز سنی تو یہ سمجھ کر کہ مرزا ابراہیم حسین نے حملہ کر دیا، بدحواس ہو گئے۔ جب جب لوگوں نے قلعہ کے نیچے جا کر آواز دی کہ حسین خان مدد کے لیے پہنچا ہے تو اس وقت دم میں دم آیا اور لوگ استقبال کے لیے دوڑے۔ دوسرے دن سب امیر شیخ الاسلام فتح پوری کے خلیفہ شیخ فتح اللہ ترین کے مکان پر جمع ہوئے اور طے پایا کہ سب لوگ گنگا کے کنارے تولک خان، قوچین بیگ، نورین خان، رحمان قلی خان، کاکر علی خان اور دہلی کے ان تمام امیروں سے جا کر ملیں جو مرزا سے مقابلہ کے لیے گنگا کے کنارے آہار کے پرگنہ میں ٹھہرے ہوئے ہیں ان سے مشورہ کے بعد جو کچھ طے پائے اس پر عمل کیا جائے۔ اس موقع پر حسین خان نے کہا خدا کی شان، یہاں مرزا چند گنتی کے سواروں کے ساتھ پہنچا ہے اور سنبھل کے قلعہ میں تمہاری تعداد اس کے مقابلے میں دو تین گنی ہے پھر تم میں بیس تیس کے قریب قدیم تجربہ کار امیر اور سردار موجود ہیں اور تم لوگ مرزا سے ڈر کر آہار کے قلعہ میں جو ایک چوہے دان کی طرح ہے جا کر چھپنا چاہتے ہو۔ اس طرح تو مرزا دلیر ہو کر

سارے حدود سرکار میں افراتفری پھیلا دے گا۔ اب صرف دو ہی راستے ہیں۔ یا تو تم لوگ گنگا کو پار کر کے ان چند پرانے قلعوں پر جو مرزا کے راستے میں ہیں قبضہ کر لو اور اسے گنگا پار نہ کرنے دو اور میں اس کے پیچھے سے تیزی سے جاتا ہوں، پھر جو بھی ہوگا سامنے آجائے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ میں تیزی سے آگے بڑھ کر اس سے پہلے گنگا پار کر کے اس کا راستہ روک دیتا ہوں اور تم پیچھے سے حملہ کر دو، بس وفاداری کا یہی تقاضا ہے حسین خان کے اس دلیرانہ مشورے کو کسی نے قبول نہ کیا، مجبوراً حسین خان ان سواروں کو لے کر جو اس کے ساتھ تھے آہار کے امیروں کے پاس چلا گیا اور ان کو بھی اس نے اس چھوٹے سے قلعہ میں آکر بند ہو جانے پر سخت لعنت ملامت کی اور ان کے سامنے بھی اپنی وہی تجویز رکھی اور کہا کہ اس وقت دشمن سرکار کے حدود میں اس طرح آگیا ہے جس طرح کوئی خرگوش لشکر کے درمیان گھر جائے۔ اگر ہم تیزی سے نقل و حرکت کریں تو اس مہم کو سر کر سکتے ہیں اور اس کو زندہ گرفتار کر سکتے ہیں اور اس فتح کا سہرا لازماً ہمارے ہی سر رہے گا۔ لشکریوں نے جواب دیا کہ ہم مخدوم الملک اور راجہ بہاڑمل کے حکم کے مطابق مرزا کو دہلی کے علاقے سے بھگا کر سنبھل تک لے آئے ہیں، اب یہاں سے ساری ذمہ داری سنبھل کے صوبہ دار معین الدین احمد خان اور اس علاقے کے جاگیرداروں کی ہے ہمیں تو صرف دہلی کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے، مرزا سے جنگ کرنے کا نہیں۔

مرزا کا لگاتار تعاقب

اس اثنا میں خبر ملی کہ مرزا نے امروہہ پر حملہ کر کے تاخت و تاراج کر دیا اور اب وہ گنگا پار کر کے لاہور کی طرف حملہ کر رہا ہے۔ حسین خان نے امیروں کو اس طرح ٹال مٹول کرتے دیکھا تو فوراً ہی ان سے الگ ہو گیا اور حملہ کرتے ہوئے گڈھ مکتیشور پہنچ گیا تاکہ مرزا کو بغیر مقابلہ کیے آگے بڑھنے نہ دیا جائے۔ بادشاہی امیروں میں سے ترک سبحان قلی اور فرخ دیوانہ ہی ایسے امیر تھے جنھوں نے حسین خان کا ساتھ دیا تھا لیکن جب وہ اس منزل پر پہنچا تو آہار کے امیروں نے خط بھیجا کہ تم جلدی نہ کرو ہم بھی تمہارے ساتھ

آ رہے ہیں چنانچہ وہ سب آ کر حسین خان سے مل گئے لیکن ان کے دل اندر ہی اندر پھٹے ہوئے تھے۔ ادھر مرزا بساط خالی پا کر بڑی بے خوفی سے اپنا مہرہ آگے بڑھائے جا رہا تھا اور راستہ میں جو بھی شہر پڑتا تھا اُسے بری طرح لوٹ لیتا تھا۔ چنانچہ سننے میں آیا کہ اس نے پائل کے قصبے میں مسلمان گھرانوں کو بری طرح تاخت وتاراج کر دیا اور اس قصبہ میں بارہ کنواری لڑکیوں کی عصمت دری کی۔ دوسرے شہروں کا بھی یہی حال تھا۔ حسین خان مرزا کے پیچھے لگا ہوا تھا اور اس کے پیچھے دوسرے امیر بھی تعاقب میں شامل تھے یہاں تک کہ سب آگے پیچھے سرہند جا پہنچے۔ یہاں پہنچ کر دوسرے تمام امیروں نے اپنے خیمے لگا دیے اور ٹھہر گئے لیکن حسین خان بھلا کہاں رکنے والا تھا، وہ اپنے آدمیوں کو لے کر جو پورے سو بھی نہیں تھے مذکورہ دو امرا کے ساتھ سرہند سے حملہ کرتے ہوئے لدھیانہ پہنچ گیا۔ وہاں خبر ملی کہ مرزا لاہور کے قریب پہنچ چکا ہے اور وہاں کے لوگ قلعہ میں بند ہو گئے ہیں

میرزا آگے بڑھ کر شیر گڑھ اور جھنی وال تک جا پہنچا۔ اس وقت حسین قلی خان نگرکوٹ اور قلعہ کانگڑہ کی تسخیر پر لگا ہوا تھا جب اسے مرزا کے متعلق اطلاعات ملیں تو اس نے ہندوؤں سے صلح کر لی اور نگرکوٹ والوں سے پانچ من سونا اور بادشاہی خطبہ پڑھنے کی شرط پر صلح کر لی اور وہاں سے میرزا یوسف خان عدلی کے غلام فتو مسند عالی، اسماعیل قلی خان، راجہ بیربر اور دوسرے امیروں کے ہمراہ مرزا کے تعاقب میں حملہ کرتے ہوئے ننکرہ پہنچ گیا۔

شیخ داؤد علی جھنی وال

حسین خان دیوانہ سہی لیکن وہ ان تمام احمقوں سے زیادہ عقل مند تھا اس کو جب حسین قلی خان کی پیش قدمی کی خبر ملی تو اس نے قسم کھائی کہ جب تک میں حسین قلی خاں سے جا کر نہ ملوں اس وقت تک کھانا نہیں کھاؤں گا، چنانچہ اس نے وہاں سے کوچ کیا، تکونڈی کے راستہ میں دریائے بیاہ (بیاس) کو پار کیا اور حملہ کرتے ہوئے شیر گڑھ میں جھنی کے قریب پہنچا۔ وہاں اس نے حضرت غوث قطب الاقطاب شیخ داؤد قادری جھنی وال کی خدمت میں حاضری دی۔ جب محفل میں دسترخوان بچھایا گیا تو حسین خان نے اپنی قسم کا حوالہ دے کر

کھانے سے معذرت چاہی حضرت نے فرمایا "قسم کا کفارہ آسان ہے اور دوستوں کا دل دکھانا بڑی نادانی ہے"۔ خان نے اس وقت ایک غلام کو آزاد کر کے کفارہ ادا کیا اور کھانا تناول کیا نیز حضرت کی دعاؤں سے فیض یاب ہوا۔ وہ رات اس نے اسی جگہ بسر کی اس وقت اس کے سارے لشکر کی مہمانی حضرت کے لنگر کی طرف سے کی گئی۔ گھوڑوں کے لیے حضرت کے خاص مزرعہ سے گھاس اور دانہ مہیا کیا گیا۔ حسین خان نے صبح وہاں سے کوچ کیا۔

میں اس کی روانگی کے تیسرے دن لاہور سے شیر گڑھ پہنچا اور حضرت موصوف کی خدمت میں چار دن تک رہا۔ میں نے وہاں جو انوار و فیوض دیکھے اور سنے ان کا اس سے پہلے میں تصور تک نہیں کر سکتا تھا میں نے اس سلسلے میں فی البدیہہ چند شعر کہے تھے جسے حضرت نے پسند فرمایا وہ شعر یہ ہیں:

ای منزہ نسبت ایجاد تو از ماء و طین   ذات پاک چون پیمبر رحمۃ للعالمین
ہست اسم اعظمت داؤد از تاثیر آن   چون سیمان جن و انس آمد ترا زیر نگین

ثم وجہ اللہ یقین من نمی شد سالھا
روی تو دیدم عیان شد نکتہ عین الیقین

میرا تو ارادہ (صاحب تصنیف منتخب التواریخ) ہو گیا تھا کہ میں ترک دنیا کر کے حضرت کی خانقاہ کی صفائی کا کام کرنے لگوں لیکن حضرت راضی نہ ہوئے اور فرمایا کہ بس اب تم ہندوستان چلے جاؤ! مجبوراً میں ان سے رخصت ہو کر نہایت غمگین اور پریشان حال روانہ ہوا خانقاہ سے نکلتے وقت غم کے مارے بے اختیار میری چیخیں نکل گئیں جب حضرت کو اطلاع ہوئی تو انھوں نے باوجود اس معمول کہ ان کی خانقاہ میں تین دن سے زیادہ کسی کو ٹھہرنے کی اجازت نہیں تھی، چوتھے دن بھی مجھے رہ جانے کی اجازت دے دی اور مزید افادات عطا فرمائے اور جو باتیں بتائیں ان کی لذت سے دل اب تک مسرور ہے:

می روم سوی وطن زین درد دل بی اختیار   نالہ دارم کہ پنداری بغربت می روم

مرزا ابراہیم حسین کا فرار

حسین خان ازبک جب طلبہ پہنچا تو اس نے حسین قلی خان کے نام خط بھیجا کہ چونکہ میں 400 کوس سے حملہ کرتے ہوئے یہاں پہنچا ہوں اگر آپ مجھے بھی اس فتح میں شامل کرلیں اور ایک دن لڑائی میں توقف کریں تو یہ آپ کی محبت سے بعید نہیں ہے۔ حسین قلی خان نے خوش آمدید کہا اور اس کے جلودار کو رخصت کردیا، لیکن وہ اسی دن تیزی سے طلبہ کے قصبے کے باہر ملتان سے چالیس کوس کے فاصلہ پر پہنچ گیا۔ اس وقت مرزا اس کے حملہ سے بے خبر تھا، اور شکار پر گیا ہوا تھا۔ میرزا کے کچھ آدمی تو کوچ کی تیاری میں لگے ہوئے تھے اور بعض ادھر ادھر منتشر تھے۔ اس حال میں حسین قلی خان نے ان پر حملہ کیا لیکن ناہموار زمین پر اس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور وہ گر پڑا۔ اسے اسی وقت گرفتار کرلیا گیا۔ جب مرزا ابراہیم حسین شکار سے لوٹ کر آیا تو سارا معاملہ چوپٹ ہو چکا تھا، پھر بھی اس نے بڑی دوڑ دھوپ کی اور دلیرانہ حملے کیے لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ مجبوراً لگام پھیر کر فرار ہوگیا۔ فتح کے دوسرے دن طلبہ سے حسین خان اپنے 80،90 سواروں کو لیے ہوئے نقارے بجاتے ہوئے پہنچا۔ حسین قلی خان نے جنگ کی ساری تفصیل اسے بتائی اور جس نے جو کچھ کارہائے انجام دیے، ایک ایک کرکے سنائے۔ حسین خان نے کہا یہ تو سب ٹھیک ہوا لیکن دشمن زندہ بچ کر نکل گیا تم کو اس کا تعاقب کرنا چاہیے تھا۔ جب تک وہ گرفتار نہ ہو مہم ادھوری ہی رہے گی۔ حسین قلی خان نے جواب دیا ہم نگر کوٹ سے مسلسل حملہ کرتے ہوئے آئے ہیں اور پہاڑی علاقہ پر ہمارے لشکریوں نے بڑی دوڑ دھوپ کی ہے اور ساری فوج تھکی ہوئی ہے چونکہ یہ فتح ہر حیثیت سے مکمل فتح تھی اس لیے ہم نے مزید اقدام نہ کیا۔ اب دوسرے حوصلہ آزمائی کریں ان کی باری ہے۔

مرزا ابراہیم کی گرفتاری

حسین خان نے اس امید میں کہ اس کی یہ پانچ سو کوس کی مسلسل دوڑ دھوپ ٹھکانے لگ جائے اور کامیابی کا سہرا سر بندھ جائے۔ حسین قلی خان سے رخصت ہو کر آگے کوچ کردیا۔

جو لوگ بہت زیادہ تھک گئے تھے ان کو اس نے ہاتھی اور نقارہ کے ساتھ لاہور واپس بھیج دیا اور اپنے چار سو سواروں کے ساتھ بیاس اور ستلج کے کنارے پر قیام کیا۔

اس وقت چھتیل قوم کے آدمیوں نے جو ملتان کی پس ماندہ رعیت ہیں اس پر شب خون مارا اور پتھر برسانے لگے میرزا نے اپنے مٹھی بھر آدمیوں کے ساتھ جن میں سے بعض زخمی اور اپاہج ہو چکے تھے اور بری طرح تھکے ہوئے تھے قوم سے مقابلہ کیا، لیکن چھتیل اس پر غالب آگئے۔ اسی دوران ایک تیر مرزا کی گدی میں لگا اور منھ کو پھاڑتا ہوا نکل گیا۔ جب معاملہ اُلٹ گیا تو اس کے آدمی میرزا کو چھوڑ کر ادھر اُدھر بھاگ نکلے لیکن وہ جہاں بھی گئے موت سائے کی طرح ان کے پیچھے لگی رہی۔ میرزا کو دو قدیم غلاموں نے فوراً ہی قلندروں کا لباس پہنا دیا اور ایک طرف لے کر چلے گئے۔ مرزا نہایت کمزور ہو گیا تھا۔ اس لئے وہ اسے لے کر ایک گوشہ نشین درویش شیخ زکریا کے ٹھکانے پر رات گزارنے کے لیے پہنچے۔ شیخ نے بظاہر بڑی مہربانی کا سلوک کیا لیکن خفیہ طور پر ملتان میں سعید خان کے پاس اس کی اطلاع بھیج دی۔

ہر کجا گوشہ نشینی است درو مکری ہست
(جہاں کہیں گوشہ نشینی ہے اس میں مکر و فریب ہے)

سعید خان نے اپنے غلام دولت خان نامی کو اسے گرفتار کر کے لانے کے لیے روانہ کر دیا اور بادشاہ کے پاس اس گرفتاری کی اطلاع ایک عریضہ کے ذریعہ بھیجی جو بادشاہ کو گجرات سے اجمیر واپسی کے وقت ملی۔ حسین خان کو جب مرزا کی گرفتاری کی خبر ملی تو وہ ملتان پہنچا اور سعید خان سے ملاقات کی۔ اس نے مرزا سے ملنے کے لیے کہا تو حسین خان نے کہا ''اگر ملاقات کے وقت میں تسلیمات بجالاؤں تو بادشاہ کی وفاداری کے خلاف ہوگا اگر ایسا نہ کروں تو مروت کے خلاف کہ مرزا دل میں کہے گا اس قلیچی کو دیکھو کہ ستو اس کے محاصرے میں امان پانے پر تو اس نے جھک جھک کے سلام کیے تھے اور اب جب کہ ہم مصیبت میں گرفتار ہیں یہ بے نیازی دکھا رہا ہے''۔ جب مرزا کو اس کی بے تکلفانہ گفتگو کی اطلاع ہوئی تو اس نے کہا'' وہ آئے اور بغیر تسلیمات کے کلام کرے اس کو سب کچھ معاف

ہے۔" غرض حسین خان ملنے کے لیے گیا اور باوجود اجازت کے وہ تسلیمات بجالایا۔ مرزا نے اس سے افسوس کرتے ہوئے کہا" ہم بغاوت نہیں کرنا چاہتے تھے، لیکن جب جان پر بن گئی تو ہم اپنی جان ہتھیلی پر لے کر ایک غیر ملک میں چلے گئے وہاں بھی ہمیں چین سے رہنے نہ دیا گیا، تقدیر میں بہر حال یہ شکست لکھی تھی، لیکن کاش ہم تیرے ہاتھوں شکست کھاتے کہ تو ہر حال میں اپنوں میں سے ہے لیکن یہ ذلت حسین قلی خان کے ہاتھوں اٹھانی پڑی جو دین و مذہب کے اعتبار سے غیر ہے"

حسین خان اس ملاقات کے بعد اپنی جاگیر کانت وگولہ کو واپس چلا گیا اور میرزا اسی قید میں کچھ عرصہ بعد زندگی کے بندھنوں سے رہا ہوگیا۔ کانت وگولہ سے حسین خان دربار شاہی میں حاضر ہوا اور پنجاب سے حسین قلی خان، مسعود حسین مرزا کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر دوسرے جنگ بندیوں کے ساتھ فتح پور لایا۔ یہ قیدی لگ بھگ 300 کی تعداد میں تھے، ان کے منہ پر گدھے، سور اور کتوں کی کھال کی پٹیاں باندھ کر حضور میں لایا گیا تھا۔ ان میں سے چند کو طرح طرح کی عقوبتوں کے ساتھ قتل کرادیا گیا اور باقی کو چھوڑ دیا گیا۔ مرزا کے تقریباً 100 سرداروں نے جن کو خان کا خطاب حاصل تھا، شکست کے بعد ملتان کے راستے میں حسین خان کے پاس جان کی معافی کی درخواست کی تھی۔ حسین خان ان سب کو اپنے پرگنوں پر لے کر چلا گیا تھا، پھر اس نے ان کو اپنے اپنے گھروں کو چلے جانے کی اجازت دے دی تھی۔

حسین قلی خان نے ان لوگوں کا بادشاہ کے سامنے ذکر چھیڑ دیا۔ حسین خان نے فوراً کہا چونکہ اسیروں کو قتل کرنے کا حکم نہیں ہے اس لیے میں نے اس جماعت کو بادشاہ پر تصدق کر کے چھوڑ دیا۔ بادشاہ نے اس بات کو درگذر کردیا اور اس سے کوئی پوچھ تاچھ نہ کی۔ انہی دنوں سعید خان ملتان سے میرزا ابراہیم حسین کے سر کو جسے مرنے کے بعد جسم سے جدا کردیا گیا تھا لے کر بارگاہ میں حاضر ہوا۔

راجہ بیربر کی قدر و منزلت

980ھ/1572ء میں حسین قلی خان نے نگرکوٹ کا قلعہ فتح کرلیا۔ اکبر کو بچپن ہی سے

برہمنوں، مسخروں اور دوسرے ہندوؤں کے ساتھ بڑی موانست اور ربط و ضبط تھا، چنانچہ تخت نشینی کے آغاز میں ایک بھکاری برہمن بر ہم داس نامی جو مسخرہ اور گیت گو تھا اور ہندوؤں کی مداحی کر کے زندگی بسر کیا کرتا تھا، کالپی سے بادشاہ کی خدمت میں آیا، یہ شخص چونکہ کافی چالاک اور ہوشیار تھا اور بادشاہ کا مزاج بھی اس سے ملتا تھا اس لیے بہت جلد اچھے مناصب پر پہنچ گیا اور بادشاہ کا ندیم خاص بن گیا۔ پہلے اسے "کب رائے" یعنی ملک الشعراء کا خطاب ملا بعد میں راجہ بیربر[35] یعنی نامور بہادر کا خطاب مرحمت کیا گیا۔

جب اکبر نگر کوٹ کے حاکم راجہ جے چند سے جو شاہی ملازمت میں داخل ہو گیا تھا ناراض ہوا اور اسے قید کر دیا تو اس نے نگر کوٹ کا قلعہ راجہ بیربر کو جاگیر میں دے دیا اور لاہور کے حاکم حسین قلی خان کو فرمان بھیجا کہ نگر کوٹ پر قبضہ کر کے اسے راجہ بیربر کے حوالے کر دیا جائے۔ حسب فرمان حسین قلی خان نے پنجاب کے تمام امیروں مرزا یوسف خان، قزاق خان کے لڑکے جعفر خان اور فتو مسند عالی وغیرہ کو ساتھ لے کر نگر کوٹ کی طرف کوچ کیا اور پہلے دھمیری گوالیار اور کوٹلہ کو جو نہایت بلند قلعہ ہے، تلوار کے زور پر فتح کر لیا اور ملحقہ سارے علاقے پر قبضہ کر کے وہاں محافظ مقرر کر دیے۔

نگر کوٹ پر حملہ

ان قلعوں کی فتح کے بعد حسین قلی خان نے ایک دشوار گزار راستہ سے نگر کوٹ پر فوج کشی کی اس راستہ کو میں (مؤلف منتخب التواریخ) 998ھ/1580ء میں دیکھا ہے، جب کہ میں نگر کوٹ کی سیر کے لیے گیا تھا۔ بلاشبہ یہ راستہ اس قدر خراب اور دشوار ہے کہ اگر کہا جائے کہ اس پر چڑھتے ہوئی چیونٹی کے پیر بھی پھسل جاتے ہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ خان نے اس راستہ سے ہاتھی، گھوڑے، اونٹ، ساز و سامان، بڑی بڑی توپیں اور دیگیں اوپر چڑھائیں اور قلعہ کا کنگرہ کا محاصرہ کر لیا۔

جے چند کا لڑکا بدھی چند یہ سمجھ کر کہ اس کا باپ قید میں مر چکا ہے، قلعہ میں بند ہو گیا۔ نگر کوٹ کا مندر شہر کے باہر واقع ہے۔ یہ ہندوؤں کی بہت بڑی زیارت گاہ ہے، 10

چنانچہ دور دراز سے لاکھوں بلکہ کروڑوں ہندو تہوار کے دنوں میں وہاں جمع ہو جاتے ہیں اور ڈھیروں سونا، روپیہ پیسہ، کپڑے اور دوسری قیمتی اور نفیس چیزیں وہاں چڑھاوے کے لیے لاتے ہیں۔ حسین قلی خان نے پہلے ہی حملہ میں اس مندر کو فتح کر لیا اور بہت سے پہاڑیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مندر کے گنبد پر سونے کا ایک چتر چڑھا ہوا ہے، اُسے لشکریوں نے تیر مار مار کر چھلنی کر دیا اب تک وہ تیر اس چتر میں لگے ہوئے ہیں۔ تقریباً دو سو کالی گائیں اس بت خانے کے نام پر چھوڑی ہوئی تھیں۔ ہندو گائے کی بڑی تعظیم اور پرستش کرتے ہیں۔ اس بت خانہ کو انھوں نے دارالامان سمجھ کر یہ گائیں وہاں چھوڑ رکھی تھیں مسلمانوں نے ان گایوں کو ذبح کر دیا اور عین تیروں کی بارش میں ان گایوں کے خون کو اپنے موزوں میں بھر بھر کر دینی حمیت اور تعصب کی وجہ سے مندر کی دیواروں پر چھڑک دیا۔ اس معرکہ میں مندر کے برہمن اور مجاور تو اتنے مارے گئے کہ شمار سے باہر تھے، یہی وجہ ہے کہ اپنے یا بیگانے تمام ہندو بیربر کو جو بزعم خود ہندوؤں کا پیر بنا ہوا تھا بڑی لعنت و ملامت کرتے ہیں، کیونکہ یہ آفت اس کی وجہ سے نازل ہوئی تھی۔

شاہی لشکر نے بیرونی شہر پر قبضہ کر لیا اور اونچے اونچے مورچے بنا کر بڑی توپوں سے راجہ بدھی چند کے محل پر گولے برسانے شروع کر دیے۔ گولہ باری سے تقریباً 80 آدمی ہلاک ہو گئے۔ بدھی چند اس ہلاکت سے بمشکل بچ سکا، پھر اس نے صلح کی سلسلہ جنبانی کی، قریب تھا کہ قلعہ فتح ہو جائے کہ میرزا ابراہیم حسین کی بغاوت کی خبر ملی نیز وہ لاہور کے قریب پہنچ چکا ہے۔ اس کے علاوہ حسین قلی خان کے لشکری بہت تنگدست ہو چکے تھے۔ اسی وجہ سے خان نے صلح کی پیش کش کو منظور کر لیا اور اکبری وزن کے مطابق پانچ من سونا جو اس مندر کی سال کی آمدنی کے مساوی ہے اور بہت سے قیمتی کپڑے اور ہر جنس کی نفیس چیزیں نذرانہ میں وصول کر کے مسجد کے محراب کو تعمیر کرا دیا تھا۔ اس کے بعد ہی حسین قلی خان میرزاؤں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔

جب وہ جھاری کے قصبہ میں پہنچا تو مشہور بزرگ خواجہ عبد الشہید نبیرۂ خواجہ احرار کی خدمت میں حاضر ہوا۔ خواجہ نے اسے فتح کی بشارت دی اور اپنا خاص کپڑا بھی عنایت فرمایا

یہ اسی دعا کی تاثیر تھی کہ یلغار کرتے ہوئے قصبہ طلابہ میں پہنچا اور باغی مرزا پر فتح پائی۔

بنگالہ کے حاکم کا انتقال

سلیمان کرانی بنگالہ کا حاکم، جس نے اپنا خطاب "حضرت اعلیٰ" رکھا تھا، کافروں کے مرکز کٹک اور بنارس کو فتح کیا تھا، جگناتھ کو دارالاسلام بنا دیا تھا اور کامروپ سے اڑیسہ تک کا علاقہ اس کی عملداری میں تھا اسی سال فوت ہوگیا۔ اس کا لڑکا بایزید اس کی جگہ تخت پر بیٹھا لیکن پانچ چھ مہینے کے اندر ہی پٹھانوں نے اسے قتل کر دیا اور اس کا چھوٹا بھائی داؤد بن سلیمان اس علاقہ پر قابض ہوگیا۔

اسی سال مشہور بزرگ شیخ نظام الدین انبیٹھی نے وصال فرمایا۔

گجرات پر دوسرا حملہ

981ھ/1573ء میں بادشاہ نے گجرات کی شورشوں کو دبانے کے لیے دوبارہ سفر کیا۔ یہ سفر بادشاہ نے سانڈنی پر سوار ہو کر کیا۔ نو دن میں وہ یلغار کرتے ہوئے فتح پور سے احمد آباد پہنچ گئے اور اس گروہ سے جس نے اعظم خان کو محصور کر رکھا تھا سخت لڑائی لڑ کر فاتح و مظفر جلد ہی دارالخلافہ واپس تشریف لے آئے۔

گجرات جانے کا سبب یہ تھا کہ بادشاہ نے گجرات کو پہلی مرتبہ فتح کیا تو احمد آباد، خان اعظم کے سپرد کر دیا تھا۔ بادشاہی لشکر کی واپسی کے بعد وہاں ہر مقام پر سرکشوں نے فتنہ و فساد مچانا شروع کیا یہاں تک کہ اختیار الملک گجراتی نے حبشیوں کی جمعیت فراہم کر کے احمد نگر اور اس کے اطراف کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ محمد حسین مرزا بھی دکن سے لوٹ کر آ گیا تھا اور سورت کو فتح کر لینے کے منصوبے باندھ رہا تھا چونکہ قلیچ خان سورت میں قلعہ کے اندر بند ہوگیا تھا اس لیے اس نے کھمبایت پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ اعظم خان نے اختیار الملک کے خلاف فوجی کاروائی کی۔ دونوں فریقوں میں احمد نگر اور ایدر کے درمیان کئی ایک لڑائیاں ہوئیں، اعظم خان نے قطب الدین محمد خان کے لڑکے نورنگ

خان کو سید حامد کے ہمراہ محمد حسین مرزا کی سرکوبی کے لیے کھمبایت کی طرف روانہ کیا۔ اس فوج سے محمد حسین مرزا کی متعدد لڑائیاں ہوئیں۔ اس نے پوری بہادری اور مردانگی سے حریف پر حملے کیے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ آخر وہ شکست کھا کر اختیار خان کے پاس چلا گیا۔ شیر خان فولادی کے لڑکے جھجار خان حبشی کا لڑکا بھی اس سے آکر مل گیا تھا اس لیے اختیار خان کی فوجی طاقت بڑھ گئی اور اعظم خان کے مقابلہ میں اس کا پلہ بھاری ہو گیا۔ یہ سب ایک دوسرے راستہ سے حملہ کر کے احمد آباد پہنچنا چاہتے تھے، لیکن اعظم خان تیزی سے کوچ کر کے احمد آباد پہنچ گیا اور بھڑوچ سے قطب الدین احمد خان کو بھی بلا لیا۔ چونکہ اس کو اپنے بعض آدمیوں پر پورا بھروسہ نہیں تھا اس لیے وہ احمد آباد میں قلعے کے اندر بند ہو گیا۔ گجرات کے تمام باغی بیس ہزار کا لشکر لے کر جس میں مغل، گجراتی، پٹھان، حبشی اور راجپوت شامل تھے، احمد آباد پہنچے اور اس کا محاصرہ کر لیا ہر روز دونوں طرف سے سخت لڑائی ہو رہی تھی، خان کلاں کا لڑکا فاضل محمد خان اسی معرکہ میں مارا گیا۔ خان اعظم ہر روز جنگی صورت حال لکھ کر دربار میں بھیج رہا تھا اور اس نے متعدد عریضے بادشاہ کی تشریف آوری کے لیے لکھے۔

بادشاہ نے دیوانی کے عمال کو حکم دیا کہ ان امیروں کے لیے جو گجرات کی پہلی مہم میں شامل نہیں تھے۔ اس مہم کا سازوسامان فراہم کر دیں اور ان جنگجو سپاہیوں کو جنھوں نے گزشتہ پورا سال سفر کی زحمتوں میں گزارا تھا اور خستہ حال ہو رہے تھے، نقد و روپیہ ادا کریں۔ پھر بادشاہ نے حسین قلی کو خان جہان کا خطاب عطا کیا اور اسے پنجاب کے امیروں کے ساتھ اسی صوبہ پر اور سعید خان کو ملتان پر متعین کر دیا اور شجاعت خان کو پیش خیمہ کے ساتھ آگے کوچ کرنے کا حکم دیا۔

اونٹنیوں پر بادشاہی حملہ

بادشاہ 24 ربیع الثانی کو تیز رفتار اونٹنیوں پر سوار ہو کر ٹیسا اور ٹوڈہ کے راستے روانہ ہوئے۔ 100 کوس کی مسافت صرف دو دن میں طے کی۔ اسی مہینہ کی 26 تاریخ کو سواری اجمیر پہنچ

گئی، وہاں مزار کی زیارت کر کے اسی دن شام کو آگے کوچ کر دیا اور قصبہ بالیانہ میں پہنچ کر لشکر کا معائنہ کیا اور مختلف سمتوں پر فوجوں کو نامزد فرمایا۔ خان خاناں بیرم خان مرحوم کے لڑکے میرزا خان کو جو اب خانخاناں بن چکا ہے دکن کی مہم پر مقرر کیا گیا ہے اس کی مدد کے لیے سید محمود خان بارہہ، صادق محمد خان اور امرا کی ایک جماعت کو متعین کیا گیا۔ میمنہ کی سرداری میر محمد خان کلاں کے سپرد ہوئی، میسرہ پر وزیر خان کو مقرر کیا گیا، ہراول پر محمد قلی خان اور ترخان دیوانہ متعین ہوئے۔ بادشاہ کے جلوس میں تجربہ کار سوار تھے جنھیں ہزاروں سواروں میں سے منتخب کیا گیا تھا۔

تیسری جمادی الاول بروز منگل بادشاہی لشکر احمد آباد سے 20 کوس کے فاصلہ پر کری کے قصبہ میں جا کر اترا۔ باغیوں کی ایک فوج قلعہ سے نکل کر راستہ روکنے کے لیے مقابلہ پر آئی لیکن دیکھتے ہی دیکھتے وہ شاہی فوج کی یلغار کی نذر ہوگئی، چونکہ قلعہ پر قبضہ کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا، اس لیے لشکر وہاں سے پانچ کوس اور آگے بڑھ کر ٹھہر گیا۔ بادشاہ نے اس جگہ ستانے کے لیے قیام فرمایا۔ نویں دن اس منزل سے کوچ ہوا اور احمد آباد سے 3 کوس کے فاصلے تک بغیر باگیں کھینچے لشکر حملہ کرتا رہا۔ اس جگہ بادشاہ نے اسلحہ خانہ خاص سے لوگوں کو ہتھیار تقسیم کیے اور سب لوگ پوری طرح ہتھیاروں سے آراستہ ہو گئے، بادشاہ نے اعظم خان کو بلانے کے لیے پہلے ہی آصف خان کو روانہ کر دیا تھا۔ اس وقت مخالف غافل تھے، جب انھوں نے نرگا بجتا ہوا سنا تو پریشان ہو کر گھوڑوں کی طرف دوڑے اور محمد حسین مرزا دو تین سواروں کے ہمراہ تحقیق کے لیے دریا کے کنارے پہنچا۔ اس طرف سے ترک سبحان قلی بھی دو تین آدمیوں کے ساتھ اس کنارے پر آیا ہوا تھا، مرزا نے پوچھا "بہادر یہ کس کی فوج ہے؟" اس نے کہا "شہنشاہ کی فوج ہے" میرے قاصدوں نے بادشاہ کو 14 دن پہلے فتح پور میں چھوڑا ہے، اگر یہی بادشاہی فوج ہے تو وہ ہاتھی جو ہمیشہ آگے رہتے ہیں کہاں ہیں؟ اس کو جواب دیا گیا کہ نو دن کے اندر بھلا ہاتھی چار کوس کی یلغار کیسے کر سکتے ہیں۔

باغیوں کا زبردست حملہ

محمد حسین مرزا ایک آراستہ فوج کے ساتھ مقابلہ پر آیا اور اختیار الملک کو پانچ ہزار سوار دے کر اس نے خان اعظم کے مقابلہ پر بھیجا تا کہ وہ اسے قلعہ پر چڑھائی کرنے سے روک دے۔ بادشاہی فوجوں نے دریا کو پار کرلیا۔ محمد حسین مرزا نے بڑھ کر ڈیڑھ ہزار جان نثار مغلوں کے ساتھ جن میں سے ہر ایک کو خان کا خطاب حاصل تھا اور وہ بڑے بڑے مناصب اور جاگیروں کے امیدوار تھے، بادشاہ کے ہراول پر جس کی کمان محمد قلی خان اور ترخان دیوانہ کے ہاتھ میں تھی حملہ کردیا اور اس کے قدم اکھاڑ دیے۔ اسی وقت حبشیوں اور پٹھانوں نے یک لخت وزیر خان کے میسرہ پر حملہ کردیا، جوالانگری کے مقام پر فریقین میں سخت خون ریز معرکہ ہوا۔

محمد حسین مرزا کی گرفتاری

ان دنوں اکبر ہر وقت "سورۃ یاسین" کا وظیفہ پڑھتا رہتا تھا۔ جب اس نے اپنے ہراول کو درہم برہم دیکھا تو وظیفہ چھوڑ کر خود ہراول کی مدد کے لیے آگے بڑھا اور دشمنوں کی صفوں کو زیر و زبر کر کے منتشر کردیا۔ اس حملہ میں بہت سے آدمی مارے گئے سیف خان کوکہ بہادری سے بڑھ کر دشمنوں کی صفوں میں گھس گیا لیکن جس کا نمک کھایا تھا وہ آخر پھوٹ کر نکلا، اس کا گھوڑا زخمی ہوگیا اور مجبوراً اسے میدان کارزار سے منھ موڑنا پڑا۔ جب وہ فرار ہو رہا تھا، تھوہر کی ایک جھاڑی اس کے سامنے آگئی۔ اس نے ایڑ لگا کر پھلانگ جانا چاہا لیکن موت نے اس کی باگیں تھام لی تھیں چنانچہ زین سے پھسل کر زمین پر آرہا۔ ایک ترک سپاہی گدائی علی نامی اس کے تعاقب میں لگا ہوا تھا، اس نے اپنے گھوڑے پر سے اسی وقت جست لگائی اور اس کو دبوچ لیا اور گرفتار کر کے بادشاہ کی خدمت میں حاضر کردیا۔ بادشاہ نے نرمی اور ملامت سے فہمائش کی اور اسے رائے سنگھ کے حوالہ کردیا۔

وزیر خاں حبشیوں اور گجراتیوں کے مقابلہ میں بڑی بہادری سے لڑ رہا تھا، لڑائی کا پلہ اس وقت ڈانواڈول ہی تھا کہ مخالفوں کو محمد حسین مرزا اور شاہ مرزا کی شکست کی خبر ملی۔ اس

خبر کو سنتے ہی ان کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ میدان سے پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔ اسی طرح خان کلاں نے شیر خان فولادی کے لڑکے کو شکست دے کر بھگا دیا اور میدان دشمنوں کے وجود سے پاک ہو گیا۔

اختیار الملک کا اکبر پر حملہ

فتح کے بعد میدان کے کنارے ایک ٹیلے پر بادشاہ نے قیام فرمایا اور بہادروں کی کارگزاریوں کا جائزہ لینے لگے۔ اس موقع پر خلاف توقع اختیار الملک گجراتی 5000 سواروں کو جو خان اعظم کا راستہ روکنے کے لیے متعین کیے گئے تھے شہر سے لے کر نکلا اور جنگل کا راستہ کاٹ کر اچانک سامنے آ گیا۔ بادشاہ کے ساتھ جو لوگ تھے وہ سخت بدحواس ہو گئے اور افراتفری مچ گئی۔ اکبر نے ایک دستہ کو تیر اندازی کا حکم دیا اور "سورن یا معین" کے نعرے لگانے لگا۔ بہادروں نے غنیم کی پہلی صف کو جو سب سے آگے تھی تیروں کی زد پر رکھ لیا۔ جو لوگ بہادری کے ساتھ پیش قدمی کر رہے تھے حسین خان ان میں سب میں آگے تھا۔ بادشاہ نے اپنی خاص ہلالی تلوار، جو ایک مشہور تلوار تھی اسے عطا فرمائی۔ اختیار الملک ایک ہی حملہ میں پسپا ہو کر بھاگ نکلا، اس کا گھوڑا بھی تھوہر کی جھاڑیوں میں جا کر پھنس گیا۔ سہراب بیگ ترکمان اس کا پیچھا کر رہا تھا اس نے بڑھ کر اختیار الملک کو گرفتار کر لیا۔ اس موقع پر اختیار الملک نے سہراب بیگ سے کہا" اے جوان تو ترکمان معلوم ہوتا ہے اور ترکمان حضرت علی مرتضیٰ کے غلام اور ان کے فدائی ہوتے ہیں، میں بخاری سید ہوں اس لیے مجھے چھوڑ دے۔ سہراب بیگ نے جواب دیا میں تجھے کس طرح چھوڑ دوں تو اختیار الملک ہے اور میں نے تجھے پہچان کر ہی تیرے تعاقب میں خون پسینہ ایک کیا ہے، پھر وہ گھوڑے سے اتر آیا اور ایک ہی وار میں اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ اس کے گھوڑے کو کوئی دوسرا لے اڑا تھا، اس لیے وہ اس کے سر کو اپنے دامن میں چھپا کر حاضر ہوا اور بادشاہ کے سامنے یہ سوغات رکھ دی۔ بادشاہ نے اسے کافی انعام واکرام عطا کیا۔ اس لڑائی میں تقریباً ایک ہزار سوار مارے گئے بادشاہ نے عبرت کے لیے ان سروں کو جمع کرا کے وہاں مینار لگوا دیا۔

محمد حسین مرزا کا قتل

جس وقت اختیار الملک کا یہ ہنگامہ برپا تھا، رائے سنگھ کے کارندوں نے محمد حسین مرزا کو ہاتھی سے اتار کر دستی نیزوں سے اس کا کام تمام کر دیا اس کا اور اختیار الملک کا سر آگرہ بھیج دیا گیا۔

اعظم خان سے ملاقات

اسی دوران اعظم خان قلعہ سے نکل کر دربار میں حاضر ہوا۔ بادشاہ اس سے بغل گیر ہوئے اور اس سے دوسرے امیروں کا حال احوال پوچھتے رہے۔ اعتماد خان کے مکان میں بادشاہ نے پانچ دن قیام فرمایا اور قطب الدین محمد خان کو اس کے لڑکے نورنگ خان کے ساتھ بھڑوچ اور چاپانیر کی طرف شاہ میرزا کی بغاوت کو کچلنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ خان کلاں کو پٹن کی حکومت دی گئی اور وزیر خان کو دولقہ اور دندوقہ کے علاقہ پر نامزد فرمایا۔ شاہ قلی خان محرم راجہ بھگونت داس اور خان بخشی کے لشکر کو ایدر کے راستہ سے آگرہ اور فتح پور جانے کا حکم ملا کہ نیا لوگ اودے سنگھ کے علاقہ کو پامال کرتے ہوئے جائیں۔ اسی حملہ میں بدنگر کا شہر ان لوگوں کے ہاتھوں فتح ہوا۔

گجرات کا نظم و نسق

بادشاہ نے 16 جمادی الاول کو احمد آباد سے کوچ فرمایا اور محمود آباد میں جا کر سلطان محمود گجراتی کے محل میں قیام فرمایا۔ دولقہ سے خان اعظم اور دوسرے تمام گجرات کے امرا کو اپنے اپنے مقام پر جانے کی اجازت عطا فرمائی۔ مرزا غیاث الدین علی قزوینی بخشی کو آصف خان خطاب عطا کیا۔ گجرات کی دیوانی اور بخشی گری کا عہدہ اس کے سپرد کیا گیا۔ 3 رجمادی الثانی کو بادشاہ اجمیر پہنچے، سانگا نیر کی جگہ راجہ ٹوڈرمل کو جو آگرہ میں 1000 جہازوں اور کشتیوں کی تیاری کے سلسلہ میں ٹھہرے ہوئے تھے گجرات کے مال غنیمت اور حساب کتاب کے لیے مقرر فرمایا۔ 7 رجمادی الآخر کو شاہانہ سواری پایہ تخت پہنچی۔ اس ساری

مہم میں ڈیڑھ ماہ سے زیادہ کا عرصہ نہ لگا۔

اس ماہ کی 25 تاریخ کو شاہزادوں کی ختنہ کرائی گئی۔ رجب کی دوسری تاریخ کو شاہزادہ سلطان سلیم کو مولانا میر کلاں محدث ہروی کے پاس، بسم اللہ کے لیے بٹھایا گیا۔ مولانا میر کلاں مشہور بہ محدث میرک شاہ بن میر جمال الدین کے شاگرد تھے۔

اسی سال بادشاہ نے مظفر خان کو سارنگ پور کی حکومت سے واپس بلا کر وزیر مطلق کے عہدہ پر مامور فرمایا۔ اس کے القاب میں جملۃ الملک کے خطاب کا بھی اضافہ ہوگیا۔ شیخ محمد بخاری جنگ پٹن میں اور سیف خان احمد آباد کی آخری لڑائی میں مارا گیا تھا۔ ان دونوں کے قرضے تقریباً ایک لاکھ روپیہ کے تھے۔ بادشاہ نے یہ قرض شاہی خزانے سے ادا فرما دیے۔

اکبر کی اجمیر روانگی

اسی سال بادشاہ نے راجہ ٹوڈرمل کو جو گجرات کی مالی رپورٹ تیار کر کے لایا تھا، تلوار عطا فرمائی اور اسے لشکر خان بخشی کے ساتھ جسے ہندوستان میں اکثر لوگ "شرخان" کہا کرتے تھے، بنگالہ کی مہم کا ساز وسامان کرنے کے لیے منعم خان خانخاناں کے پاس بھیج دیا۔ شہراللہ کنبوی لاہوری کو شہباز خان کا خطاب عطا فرمایا اور اسے میر بخشی کے عہدے پر مقرر کردیا۔ انہی دنوں میر محسن رضوی جو دکن کی سفارت پر گیا ہوا تھا وہاں کے فرمانرواں کے عمدہ تحائف لے کر دربار حاضر ہوا۔ اکبر نے بنگال کی فتح کی دعا مانگنے کے لیے اجمیر کی زیارت کا ارادہ کیا۔ جب وہ فتح پور سے چار کوس پر موضع دائرہ میں پہنچا تو خواجہ احرار کے پوتے خواجہ عبدالشہید میرزا شرف الدین کو رہائی دلانے کے لیے پہنچے اور اس کی سفارش کی، بادشاہ نے ان کی سفارش کو قبول نہیں کیا، اگرچہ تعظیم وتکریم میں کوئی کوتاہی نہ برتی، خواجہ نے بھی فاتحہ پڑھ کر بادشاہ کو رخصت کیا، لیکن دل میں رنجش تھی۔ اس لیے آزردہ خاطر واپس ہوئے۔ بادشاہ نے اجمیر سے سات کوس پہلے ہی پیادہ سفر شروع کیا اور 12 ذی القعدہ مزار مقدس کی زیارت فرمائی۔

جشن شاہانہ

اسی مہینے کی 17 تاریخ کو آفتاب برج حمل میں داخل ہوا۔ جیسا کہ ہر سال اس خاص دن کی تعظیم میں عید منائی جاتی تھی، بادشاہ نے اس بار بھی ایک بڑا جشن منعقد کیا اور حاضرین محفل میں سے ہر گروہ کو ایک ایک لاکھ روپیہ عطا فرمایا۔ 23 ذی قعدہ کو بادشاہ اجمیر سے لوٹ کر پایہ تخت پہنچے اور بنگالہ کے سفر کی تیاری شروع ہوگئی۔ کشتیاں تیار کرنے کا حکم صادر کیا گیا، ان میں سے ایک کشتی، شیر کے سر اور ایک دوسری مگرمچھ کے سر کی وضع کی تھی۔ یہ دونوں سمندری جہاز کی طرح بڑی اور بلند تھیں۔

دربار اکبری میں رسائی

اسی سال ماہ ذی الحجہ کے آخر میں، میں (صاحب تصنیف) حسین خان کی ملازمت ترک کرکے بدایوں سے آگرہ پہنچا اور جمال خان قورچی اور جالینوس مرحوم حکیم عین الملک کے وسیلے سے دربار شاہی میں باریاب ہوا۔ ان دنوں علم کی بڑی قدرو قیمت تھی، پہلی حاضری میں ہی بادشاہ سے مخاطبت کا اعزاز حاصل ہوا اور ہم نشینوں میں داخل کرلیا گیا۔ بادشاہی محل کے علماء کا یہ حال تھا کہ وہ ہمیشہ اپنی علمیت کا ڈنکا بجانے کی فکر میں لگے رہتے تھے، کسی دوسرے کو ذرہ برابر بھی اہمیت نہ دیتے تھے اور بحث مباحثہ کرکے اس کو نیچا دکھانے اور خود سر بلند ہونے کی تدبیریں کرتے رہتے تھے۔ میری جوانی کا عالم تھا، اللہ کی عنایت سے قوت طبع، ذکاوت اور دلیری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اس لیے میں (صاحب تصنیف) جلد ہی ان میں سے اکثر علماء پر چھا گیا۔

جس وقت میں دربار میں حاضر ہوا تھا تو بادشاہ نے میری تعریف کرتے ہوئے کہا تھا، بدایوں کا یہ عالم حاجی ابراہیم سرہندی کا مزاج ٹھکانے لگا دے گا۔ بادشاہ کی خواہش تھی کہ حاجی ابراہیم کو نیچا دکھایا جائے۔ میں نے اس پر بڑے چست الزامات لگائے جو بادشاہ کو پسند آئے۔ شیخ عبدالنبی صدر الصدور کے پاس میرا وسیلہ اور رسائی نہیں تھی، اس لیے وہ مجھ سے کچھ ناخوش ہی تھا۔ وہ اس مناظرہ کے وقت میرے فریق کی ہی طرف داری کرتا رہا

تھا اور وہی مثل سامنے آ گئی: سانپ کا کاٹا افیون کھانے لگا

بعد میں عبد النبی کے ساتھ یہ پرخاش ختم ہو گئی اور ہماری آپس میں خوب نبھنے لگی۔
ان دنوں شیخ مبارک ناگوری کا لڑکا شیخ ابوالفضل کہ اس کے علم و عقل کا ستارہ اوج پر تھا، باریاب ہوا اور بڑے اعزاز و اکرام سے نوازا گیا۔

ہرن مینار

اسی سال اجمیر کے راستہ میں بڑی عمدہ اور بلند عمارتوں کی تعمیر انجام کو پہنچی۔ چونکہ اکبر درگاہ کا نہایت معتقد تھا اور ہر سال لازماً اجمیر جاتا تھا، اس لیے اس نے آگرہ سے اجمیر تک ہر منزل پر ایک محل بنانے کا حکم دیا تھا اور ہر کوس پر ایک ایک منارہ اور کنواں بھی بنوایا۔ بادشاہ نے اپنی زندگی میں جتنے ہرنوں کا شکار کیا تھا ان سب کے ہزاروں سینگ رکھے ہوئے تھے۔ یہ سینگ ہرن منار پر بطور یادگار لگوا دیے۔ ان میناروں کی تاریخ ''میل شاخ'' ہوتی ہے۔ کاش اس کے بجائے باغ یا سرا بنوائی جاتی!

اسی سال شہباز خان کمبو کی رائے پر ''داغ'' اور ''محلّہ'' کی رسم کا آغاز ہوا۔ تمام ممالک محروسہ میں تحصیل کے ''کروڑیوں'' کا تقرر کیا گیا اور بادشاہ نے تمام ملک کے خالصہ ہونے کا حکم صادر فرمادیا۔

بنگال پر فوج کشی

982ھ/1574ء میں صفر کی آخری تاریخ کو اکبر نے بنگالہ کی فتح کے ارادہ سے کوچ کیا اور ''مہنک سر'' نامی کشتی میں سوار ہوا۔ بنگال میں جو حالات پیدا ہو گئے تھے وہ اس سفر کا سبب بنے۔ وہاں سلیمان افغان کرانی جس نے سلیم شاہ کے عہد سے بنگالہ کے سارے علاقہ پر قبضہ کر کے خود مختار حکومت قائم کر رکھی تھی، فوت ہو چکا تھا۔ اس کا لڑکا بایزید چند دن تک اس کا جانشین رہا، لیکن اپنی بدسلوکی کی وجہ سے اپنے بھتیجے ہنسو اور دوسرے امیروں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے بعد سلیمان کا چھوٹا لڑکا داؤد جو اس کا ولی عہد تھا، بادشاہ بن گیا۔

اس نے بادشاہ بننے کے بعد اطاعت کی وہ روش ترک کردی جس پر سلیمان کاربند تھا۔ دربار میں عریضے بھیجنے بھی بند کردیے۔

بادشاہ کو سلیمان کے انتقال کی خبر سورت کے قلعہ میں ملی تھی۔ بادشاہ نے اس وقت خان خاناں منعم خان کو جو اس زمانہ میں جونپور میں تھا فرمان بھیجا تھا کہ وہ داؤد کی خبر لے اور بہار کے علاقے کو فتح کرلے۔ خانخاناں نے ایک بھاری لشکر لے کر حملہ کردیا اور دو لاکھ روپیہ نقد اور قسم قسم کے نفیس تحفے پیش کش میں وصول کر کے مصالحت کرلی اور واپس آ گیا۔

امیر الامراء لودھی کا قتل

اس وقت داؤد حاجی پور میں تھا۔ اس کا ایک سردار لودھی جو امیر الامراء کے منصب پر فائز تھا اور اڑیسہ کی حکومت پر اسے مقرر کیا گیا تھا، باغی ہوگیا تھا اور قلعہ رہتاس پر قبضہ کر کے خود مختاری کا دعویٰ کر رہا تھا۔

جگناتھ کے حاکم قتلو خان کی مدد سے داؤد نے دو ہاتھی عطا کرنے کا اسے لالچ دیا اور بڑی تدبیر سے اس پر قابو پا کر قید کردیا۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ داؤد چند ساتھیوں کے ساتھ شکار پر گیا تھا۔ اس وقت لودھی نے سلیمان کے ملازمین میں سے دس ہزار سوار اپنے ساتھ لیے اور داؤد کو ختم کردینے کا ارادہ کرلیا۔ داؤد اسی وقت شہر میں لوٹ آیا اور فوج کے آدمیوں کو اپنے ساتھ ملا کر ان میں تفرقہ پیدا کردیا اور لودھی کو حسن تدبیر سے گرفتار کر کے سارے مال واسباب کو ضبط کرلیا۔ لودھی کو اپنے قتل کا کامل یقین ہوگیا تھا لیکن اس آخر وقت میں بھی اس نے داؤد کو خیر خواہی کے طور پر نصیحت کی اور کہا "میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم کو میرے قتل کے بعد بڑی پشیمانی ہوگی اور اس وقت پشیمان ہونے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس کے باوجود میں ایک تدبیر بتاتا ہوں اگر تم اس پر عمل کرو گے تو فتح تمہارے قدم چومے گی۔ اس سے پہلے دو لاکھ روپیہ دے کر مغلوں سے میں نے صلح کرادی ہے اور اس صلح کے بھروسے پر اطمینان سے بیٹھے نہ رہو کیوں کہ مغل اس

تھوڑی سی رقم پر تمہارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے اس لیے خود پہل کر کے مغلوں کے خلاف دلیرانہ فوج کشی کر دو، یاد رکھو جو بھی پہل کر جائے گا وہی کامیاب رہے گا"۔

داؤد نے اس کی باتوں کو غرض آمیز سمجھ کر کوئی اہمیت نہ دی اور خان خاناں کی اس گرگ آشتی پر جو فقط دکھاوا تھی، بھروسہ کر کے اس نے اپنے خیر خواہ لودھی کو قتل کرا دیا اس کو قتل کر کے اس نے اپنے پیر پر کلہاڑی چلا دی تھی۔ اس کی حکمرانی پر بس اسی وقت سے زوال آ گیا۔ خان خاناں کو جیسے ہی یہ خبر ملی اس نے پٹنہ اور حاجی پور کی طرف کوچ کر دیا۔ اس وقت داؤد کو لودھی کی قدر معلوم ہوئی اور وہ اس کے قتل پر بڑا نادم ہوا، لیکن اب اس سے کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔

بادشاہی فوجوں کے مقابلہ پر داؤد نے پٹنہ کے قلعہ کی مرمت کرائی اور لڑائی شروع ہونے سے پہلے ہی وہ قلعہ میں بند ہو گیا لیکن اس کی بدمستی اور بے تدبیری کی وجہ سے اس کے اکثر امیر اس سے علیحدہ ہو کر منتشر ہو گئے۔

دلچسپ دریائی سفر

بادشاہ نے مذکورہ تاریخ پر میرزا یوسف خان کو لشکر کی سرداری پر مقرر کر کے خشکی کے راستہ روانگی کا حکم دے دیا اور شہاب الدین احمد خان کو آگرہ کی حفاظت پر چھوڑ کر خود دریا کے راستے روانہ ہو گئے۔

اس مہم میں بڑا شاہزادہ بھی بادشاہ کے ہمراہ تھا، اس وقت دربار کی سطح پر اتنی کشتیاں اور ڈونگے تھے کہ دریا کی سطح نظر نہیں آ رہی تھی۔ ملاح اپنی مخصوص زبان میں بڑی خوش آوازی کے ساتھ الاپ رہے تھے، ان کے گیت ایسے سریلے تھے کہ مچھلیاں پانی میں اور پرندے ہوا میں رقص کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ یہ سارا منظر اتنا دلکش تھا کہ اس کے بیان سے زبان قاصر ہے۔ روزانہ کشتیوں سے اتر کر سیر و شکار کیا جاتا تھا اور رات میں جب لنگر ڈال دیے جاتے تو علمی مباحثے اور شعر گوئی کی محفلیں ہوتیں اور آپس میں بڑی دلچسپ بحثیں ہوتیں۔

الہ آباد میں قیام

23 ماہ صفر کو پریاگ یعنی الہ آباد میں جہاں گنگا اور جمنا کا سنگم ہوتا ہے، قیام ہوا۔ یہاں کے مندر میں ہندو حصول ثواب اور مشاہدۂ تناسخ کے لیے طرح طرح کی سخت ریاضتیں کرتے ہیں۔ بعض تو اپنے سر آرے کے نیچے دے دیتے ہیں۔ بعض اپنی زبان کٹوا لیتے ہیں اور بعض تو کسی اونچے درخت سے دریا میں گر کر جان دے دیتے ہیں۔ یہاں پہنچنے پر بادشاہ نے ایک عالی شان عمارت کی تعمیر کا حکم دیا اور شہر کا نام الہ آباد رکھا۔ بنارس پہنچنے کے بعد شیر بیگ تورچی کو ایک تیز رفتار کشتی میں بٹھا کر خانخاناں کے پاس بھجوا دیا۔

دوسری ماہ ربیع الثانی کو بجی پور کے موضع سے جو جونپور کے مضافات میں ہے اور جہاں گودی ندی گنگا میں آ کر ملتی ہے، شاہزادہ، حرم شاہی، صدر الصدور اور قاضیوں کی کشتیاں گودی کے چڑھاؤ پر جونپور کی طرف روانہ ہو گئیں۔ بادشاہ بھی دو تین منزل تک ان کے ساتھ جا کر لوٹ آئے۔ اسی منزل میں سلطان محمود بھکری کے فوت ہونے اور اس کے علاقہ پر محب علی خان کے قابض ہو جانے کی اطلاع ملی، پھر خان خاناں کے حسب التماس بادشاہ نے گنگا میں تیزی سے سفر شروع کیا۔ اسی ماہ کی چھ تاریخ کو لشکر خشکی کے راستہ سے چل کر غازی پور شہر میں شاہی قافلہ سے آ ملا۔ اسی منزل میں خان خاناں کے پاس سے اعتماد خان خواجہ سرا حاضر ہوا اور خان خاناں کے لشکر کے تمام حالات تفصیل سے سنے اور عجلت سے روانگی کی استدعا کی۔

سید میر منجم کی پیش گوئی

اسی ماہ کی ساتویں تاریخ کو سید میر اصفہانی منجم نے جو خان زمان کی شکست کے بعد جونپور ہی میں مقیم تھا، نقیب خان کی فرمائش پر نجوم کی کتاب "اعظم" کا مطالعہ کیا اور مرکب و مرتب حروف کا استخراج کر کے اس نے فال نکالی تو یہ شعر برآمد ہوا:

بزودی اکبر از بخت ہمایون   برد ملک از کف داؤد بیرون

حسن اتفاق کہ جو کچھ پیش آیا اس فال کے مطابق پیش آیا۔ واپسی میں جب جونپور میں

بادشاہی لشکر نے کیمپ لگایا تھا تو سید موصوف دربار میں حاضر ہوا، پھر نجوم سے فال نکالی۔
اس وقت یہ شعر برآمد ہوا:

مژدۂ فتح بنا گاہ رسد
سر داؤد بدرگاہ رسد

میری (صاحب تصنیف منتخب التواریخ) اس ماہر نجومی سے انہی دنوں شناسائی ہوئی تھی، میں نے اس علم کو سکھانے کی درخواست کی تو اس نے قبول کرلیا اور کہا "یہ اہل بیت کا خاص علم ہے اور اس کے لیے چند شرائط کی پابجائی لازمی ہے"۔ آخر میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ شرطیں شیعوں کے بعض مسائل کی تقلید سے متعلق ہیں اور یہ فال بھی دوسرے فالوں کی طرح جعلی اور اختراعی ہوتی ہے کہ ہر شخص اپنی قوت ارادی سے کام لے کر ایسے فال برآمد کرسکتا ہے۔ اس کا مجھے (صاحب تصنیف) مشاہدہ بھی ہوا، بلکہ میں نے خود بھی تجربہ کرکے دیکھ لیا اور انہی دنوں سید کی تعلیم کا احسان اٹھائے بغیر ہی میں نے فال کے اس طریقہ کو سیکھ لیا۔

شاہی بیڑہ چوسہ میں

20 ماہ ربیع الثانی کو چوسہ میں قیام کیا گیا، یہاں خان خاناں کا عریضہ پہنچا کہ پٹھانوں کے سربرآوردہ امیر عیسیٰ خاں نیازی نے جو بہادری اور شجاعت میں کافی مشہور ہے، پٹنہ کے قلعہ سے جنگی ہاتھی اور ایک بھاری جمعیت لے کر شاہی فوج پر حملہ کردیا تھا، لیکن بادشاہ کے ایک غلام کے ہاتھوں مارا گیا۔ ان دنوں شہاب الدین احمد خان کا بھائی معصوم بن ہاشم خان خان خاناں کے لشکر میں تھا اور اس کا لڑکا بادشاہ کی خدمت میں کشتی پر رہتا تھا۔ وہ اپنے باپ کے پاس روزانہ لشکر کے حالات معلوم کرکے بادشاہ کو سنایا کرتا تھا۔ اس طرح اس نے بادشاہ کی خدمت میں بڑا تقرب حاصل کرلیا تھا یہاں تک کہ اس کو نیابت خان کا خطاب مل گیا، لیکن بعد میں چل کر کون سی ایسی بغاوت تھی جو اس نے نہیں کی اور بغاوت کا کون سا ایسا پھل تھا جو اسے چکھنا نہ پڑا۔

حاجی پور کے قلعہ کی فتح

اس مہینہ کی 16 تاریخ کو بچ پہاڑی کے مقام پر جو کہ پٹنہ سے دو تین کوس پر واقع ہے، قافلہ پہنچا۔ یہاں پانچ بلند گنبد ہیں جن کو پہلے زمانہ میں غیر مسلمانوں نے پکی اینٹوں سے بنوایا تھا۔ بادشاہ نے اس جگہ خان خاناں کے مکان میں قیام فرمایا۔ خان خاناں نے اس موقع پر مروارید سے بھرے ہوئے تھال نچھاور کیے اور بے شمار نفیس تحائف قیمتی کپڑے نذر میں گزارے۔ یہاں سے بادشاہ نے تین ہزار بہادر سوار عین طغیانی کے وقت کشتیوں میں بٹھا کر حاجی پور کے قلعہ پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیے۔ اسی قلعہ سے پٹنہ والوں کو مدد پہنچائی جاتی تھی۔ یہ جنگی کشتیاں تمام جنگی سامانوں سے لیس تھیں اور قلعہ شکنی کے سارے آلات ان میں رکھے گئے تھے۔ دیکھنے میں اتنی پر شکوہ اور شاندار تھیں کہ بس آدمی دیکھتا ہی رہ جائے۔ یہ جمعیت خان عالم کی سرکردگی میں روانہ ہوئی، راجہ گجپتی کو خان عالم کی مدد کے لیے مقرر کیا گیا۔ راجہ گجپتی اسی علاقہ کا بڑا با اثر آدمی تھا، اس کی قوت اور جمعیت ایسی تھی کہ اس نے خان زماں جیسے بہادر سردار کو دو سال تک ان جنگلوں میں سرگرداں رکھا تھا، ابھی تک وہاں کے جنگل جیسا کہ چاہیے پاک وصاف نہیں ہوئے ہیں۔ ان جنگلوں میں بکثرت حشرات الارض پائے جاتے ہیں۔ان دونوں نے حملہ کر کے خشکی اور تری دونوں طرف سے حاجی پور کو گھیر لیا۔ بادشاہ بھی محاذ پر پہنچے اور دریا کے اس طرف ایک بلند مقام پر ٹھہر کر جنگ کا نقشہ دیکھنے لگے دوری اور دھندلکے کی وجہ سے جنگ کی صورت حال واضح طور پر معلوم نہیں ہو رہی تھی، اس لیے تجربہ کار جوانوں کو ایک کشتی میں بٹھا کر عصر کے وقت حاجی پور کی طرف روانہ کیا گیا تا کہ صبح خبر لے کر آئیں۔ قلعہ والوں نے جب ان کو آتے دیکھا تو اٹھارہ کشتیوں میں سپاہی بھر کر ان کے مقابلہ کے لیے روانہ کیے۔ جب مقابلہ ہوا تو اس مختصر سی جماعت نے اس بڑے گروہ پر نمایاں کامیابی حاصل کی اور انکو راستہ سے ہٹا کر خان عالم کے بیڑے سے جا ملے۔ دشمن کی طرف سے فتح خان بارہہ بہت سارے پٹھانوں کے ساتھ بڑی سخت لڑائی کے بعد مارا گیا اور قلعہ تلوار کی زد پہ

فتح ہو گیا۔ مقتول سرداروں کے سر ایک کشتی میں رکھ کر بادشاہ کے ملاحظہ کے لیے روانہ کیے گئے۔ اس کشتی کو بادشاہ نے حفاظت سے داؤد کے پاس بھجوا دیا تا کہ وہ اس سے عبرت حاصل کرے۔ دوسرے دن بادشاہ پنج پہاڑی کے اوپر تشریف لے گئے اور قلعہ پٹنہ کا سرسری معائنہ کر کے اس کے اطراف و اکناف کے علاقہ کو ملاحظہ فرمایا۔ اس وقت پٹھان بڑی بڑی توپوں سے گولہ باری کر رہے تھے کہ ان کے گولے تین کوس کے فاصلے سے لشکر میں آکر پھٹتے تھے۔ میں بیانہ اور بجوانہ کے حاکم سید عبداللہ خان جوگان بیگی کے خیمے میں رہتا تھا ایک گولہ میرے سر پر سے دندناتا ہوا گزرا۔ اللہ نے بچالیا اور زندگی کی یہ مہلت مل گئی ورنہ نہ معلوم میں کہاں پہنچ گیا ہوتا۔

داؤد کا فرار ہونا اور پٹنہ کی فتح

حاجی پور کے فتح ہو جانے سے مخالفین کی کمر ٹوٹ گئی۔ داؤد کے پاس بیس ہزار سوار اور بے شمار جنگی ہاتھی تھے اور ایک بہت بڑا توپ خانہ بھی تھا لیکن اس سارے خدم و حشم کے باوجود شاہی حملہ سے ڈر کر اس مہینہ کی 21 تاریخ کو ایک کشتی میں بیٹھ کر قلعہ سے بھاگ گیا۔ سرہر ہندی بنگالی جس کا خطاب بکر ماجیت تھا اور جس نے لودھی کے قتل پر داؤد کو آمادہ کیا تھا۔ ایک کشتی میں خزانہ رکھ کر اس کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ گوجر خان کرانی جس کا خطاب رکن الدولہ تھا، ہاتھیوں کو لے کر جنگل میں نکل گیا۔ بہت سارے لوگ تو مارے خوف کے دریا میں غرق ہو کر مر گئے۔ بعض سراسیمہ ہو کر قلعہ کے برج اور فصیل پر سے نیچے کود پڑے اور خندق ان کی لاشوں سے پٹ گئی۔ کچھ لوگ گلی کوچوں میں ہاتھیوں کی لپیٹ میں آکر ہلاک ہو گئے۔ قلعہ کی بھاگی ہوئی فوج جب پن پن ندی پر پہنچی تو گوجر خان ہاتھیوں کو اس پل پر سے جسے ندی پر باندھا گیا تھا گزار کر نکل گیا اور اس کے پیچھے لوگوں کا پل پر اس قدر ہجوم ہوا کہ پل بوجھ برداشت نہ کر سکا اور ٹوٹ گیا۔ اس موقع پر بہت سے پٹھان سردار مال اسباب چھوڑ کر ندی میں کود پڑے اور اس میں غرق ہو کر رہ گئے۔ بادشاہ کو رات کے آخری حصے میں داؤد کے فرار ہو جانے کی خبر ملی اور وہ شہر پٹنہ میں داخل ہوئے۔ شہر میں

56 ہاتھی لشکر کے ہاتھ آئے اور فتح نصیب ہوئی۔

بادشاہ نے پٹنہ کی حفاظت اور انتظام پر خان خاناں کو مقرر کیا اور خود گوجر خان کے تعاقب میں جو داؤد کے تمام ہاتھیوں کو لے جا رہا تھا روانہ ہوگیا اور گھوڑے پر سوار ہوکر پن پن ندی کو پار کرکے دریاپور تک جو پٹنہ سے 36 کوس پر دریائے گنگا کے کنارے واقع ہے حملہ کرکے تقریباً چار سو مشہور ہاتھیوں کو پکڑلیا۔ گوجر خان البتہ اپنی جان سلامت لے کر نکل گیا۔ شہباز خان، میر بخشی اور مجنون خان نے دریاپور سے آگے بڑھ کر سات کوس تک اس کا پیچھا کیا اور وہاں سے لوٹ آئے۔ انھوں نے آکر بادشاہ کو اطلاع دی کہ گوجر خان بلھو ندی پار کرکے نکل گیا ہے، لیکن اس کے بہت سے آدمی پانی میں غرق ہوکر ہلاک ہوچکے ہیں۔

اسی مہینہ کی 21 تاریخ کو خان خاناں بھی دریا کے راستے سے دریاپور میں آیا، وہ اپنے ساتھ کشتیاں بھی لے کر آیا تھا۔ بادشاہ نے 6 دن وہاں قیام کیا اور خان خاناں کی مدد کے لیے اپنے ساتھ کے امراء کو دس ہزار سواروں کے ساتھ مقرر کیا اور اس پورے لشکر کی تنخواہ اور مراتب میں دس سے تیس تک اور دس سے چالیس تک کا اضافہ فرمادیا اور خان خاناں کو بنگالہ کا پورا ملک اور کشتیوں کا سارا بیڑا عطا کرکے وہاں سے غیاث پور کی طرف جو گنگا کے کنارے ہے بادشاہ واپس ہوا۔

اسی سال دوسری جمادی الاول کو یوسف خان کو لشکر کی سرداری پر مقرر کرکے مظفر خان کو فرحت خان کے ہمراہ رہتاس کے قلعہ کی تسخیر کے لیے روانہ فرمایا تاکہ وہ فتح کے بعد رہتاس کی حکومت فرحت خاں کے کے سپرد کرکے دربار میں چلا آئے۔

اسی مہینہ کی تیسری تاریخ کو بادشاہ کی سواری پٹنہ میں داخل ہوئی۔ وہاں بادشاہ نے سارے معاملات کا مناسب انتظام کیا اور داؤد کی عمارتوں کا سرسری طور پر معائنہ کیا۔ پٹنہ میں عجیب بات یہ دیکھنے میں آئی کہ وہاں بعض چھپر کے مکان تیس تیس، چالیس چالیس ہزار میں تیار ہوتے ہیں حالانکہ وہ تمام کے تمام لکڑی سے ہی بنائے جاتے ہیں۔

بنگال سے واپسی

چھٹی تاریخ کو بادشاہ جونپور پہنچے اور ایک مہینہ تک وہاں قیام فرمایا۔ جونپور اور بنارس کو خالصہ میں شامل کرلیا اور اس کا نظم و نسق میرزا میرک رضوی اور شیخ ابراہیم سیکری وال کے سپرد کرکے نویں جمادی الثانی کو جونپور سے دہلی کے لیے کوچ فرمایا۔ جب موضع خان پور میں کیمپ لگایا گیا تو قاضی نظام بدخشی فیروزہ کابلی کے ساتھ خدمت شاہی میں پہنچے۔ یہ صاحب بدخشاں اور ماوراء النہر کے بہت بڑے عالم تھے، تصوف و طریقت میں ان کا بڑا مرتبہ تھا۔ فیروزہ کابلی مرزا محمد حکیم کے گھرانہ کا لڑکا تھا یہ نہایت ذہین طالب علم تھا۔ خطاطی اور موسیقی کے فن میں بھی اس کو بڑا کمال حاصل تھا۔

بادشاہ نے قاضی نظام کو ایک مرصع شمشیر اور پانچ ہزار روپیہ نقد عطا فرمایا، انھوں نے بتدریج اپنی استعداد و عالی ظرفی کی وجہ سے قاضی خان کا خطاب اور بعد میں "غازی خان" کا خطاب حاصل کرلیا اور سہ ہزاری کے عہدے تک ترقی کی۔ البتہ فیروزہ کا معاملہ کچھ اس کے برعکس ہی ہوا، وہ اپنے مقام سے برابر تنزل ہی کرتا رہا۔ اسی جگہ خان خاناں کا عریضہ پہنچا کہ داؤد پٹنہ سے نکل کر گرہی چلا گیا تھا وہاں اس نے قلعہ کو مستحکم کرکے اپنے معتمد سرداروں کے سپرد کردیا اور وہاں سے ٹانڈہ کی طرف چلا گیا۔ جب شاہی فوجوں نے گرہی کی طرف پیش قدمی کی تو قلعہ والے مرعوب ہوکر جنگ کیے بغیر ہی قلعہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔

سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ

جمادی الآخر میں جب شیر گڑھ عرف قنوج میں قیام ہوا تو بادشاہ نے مجھے (صاحب تصنیف) بخاطیت سے نوازا اور مہربانی کے باعث حکم دیا کہ میں طوطی نامہ[36] کی طرح سنگھاسن بتیسی[37] کا ترجمہ کرکے اس کی نظم و نثر کو مرتب کروں اس کتاب میں بتیس حکایتیں ہیں جو مالوہ کے حاکم راجا بکرماجیت کے حالات سے متعلق ہیں۔ بادشاہ کا ارشاد تھا کہ میں آج ہی اس کام کو شروع کردوں اور اس کا ایک ورق لکھ کر دکھادوں۔ ایک صاحب علم برہمن کو اس کی ترجمانی کے لیے مقرر فرمایا، اسی دن میں نے جب ایک کہانی

کا پہلا صفحہ لکھ کر پیش کیا تو بادشاہ نے بڑی تحسین اور تعریف کی جب اس کتاب کا ترجمہ ہو گیا تو اس کا نام ''خرد افزا'' تجویز ہوا۔ اس میں اس کا تصنیفی پس منظر اور تاریخ بھی شامل کر دی گئی۔ بادشاہ نے اس کو پسند فرمایا اور تعریف کر کے اسے شاہی کتب خانہ میں داخل کرا دیا۔

خواجہ عبد الشہید کی بددعا

اسی دوران جب کراؤلی کے مقام پر شاہی قافلہ پہنچا تو خواجہ عبد الشہید، سمرقند واپس جانے کا ارادہ کر کے رخصت ہونے کے لیے آئے اور اکبر سے کہا ''میں اپنی ہڈیوں کو اسی سرزمین (سمرقند) میں پہنچانا چاہتا ہوں، پھر انھوں نے بادشاہ کی کمر سے ایک تلوار باندھی اور دوبارہ میرزا اشرف الدین حسین کی رہائی کے لیے درخواست کی''۔ اس بار بھی جب بادشاہ نے قبول نہ کیا تو انھوں نے نہایت رنجیدہ ہو کر فرمایا ''اب میں مزید کیا کہوں، یہ بات امن و امان کے لیے بہرحال مضر ہے، بس اپنے خدا سے یہی چاہتا ہوں کہ وہ تمہارے ایمان کو قائم کرے''۔ جیسا کہ انھوں نے کہا تھا وہ سمرقند پہنچتے ہی اپنے بزرگوں سے جا ملے۔

20 جمادی الثانی کو اسکندر پور کے قصبہ میں قیام ہوا تو یہ خبر پہنچی کہ داؤد نے ٹانڈہ کو بھی جو گنگا کے اس طرف گوڑ کے مقابل واقع ہے بغیر جنگ کیے چھوڑ دیا ہے اور صحرا نوردی کرتے ہوئے اڑیسہ کو چلا گیا ہے اور ٹانڈہ پر خانخاناں کا قبضہ ہو چکا ہے۔

اکبر کی دہلی آمد

اگرچہ وہ تین منزل پر تھا، لیکن بادشاہ نے آگرہ کے بجائے دار الملک دہلی کا رخ کیا اور پہلی ماہ رجب کو دہلی میں شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ داخل ہوا۔ چند دنوں تک مقدس مزاروں کی زیارت کی۔ انہی دنوں حسین خان ٹکریالی بھون گاؤں کے قریب حاضری کے لیے آیا، لیکن اسے باریابی کی اجازت نہ ملی بلکہ بادشاہ نے شہباز خان میر بخشی کو حکم دیا کہ

اُسے دولت خانہ کے احاطہ سے باہر نکال دیا جائے۔ حسین خان کو اس توہین کا بڑا صدمہ ہوا اور اس نے ہاتھی اونٹ، گھوڑے اور جنگی سازوسامان ہمایوں بادشاہ کے مقبرے کے طالب علموں، مستحقوں اور مجاوروں، مدرسوں اور خانقاہوں کو عطا فرمائے اور سب کچھ ترک کر کے "الف وار" قلندری اختیار کر لی:

این ہمہ طمطراق کن فیکون
شمہ نیست پیش اہل جنون

جب اس کی اطلاع بادشاہ کو ملی تو اس پر عنایت مبذول کی اور اپنی شال اتار کر اسے اوڑھائی۔ اپنے ترکش میں سے ایک تیر نکال کر بطور پروانگی عطا فرمایا اور حکم دیا کہ کانت، گولہ اور پٹیالی اور دوسرے علاقے جو ایک کروڑ بیس لاکھ کی جاگیر تھی، حسب سابق ایک فصل تک اس کے سپرد کی جائے اور سرکار کا کروڑی اس جاگیر میں مداخلت نہ کرے۔ جب وہ سواروں کا "داغ و محلہ" کرائے تو اسے مناسب تنخواہ پر جاگیر عطا کر دی جائے گی۔ حسین خان اپنی فیاضی اور کشادہ دستی کی وجہ سے اس قدر قلاش ہو چکا تھا کہ دس سوار رکھنے کی بھی اس میں طاقت نہیں تھی۔ اس قضہ کو رفع دفع کرنے کے لیے وہ مجبوراً اپنی جاگیر پر چلا گیا اور شمالی کوہستان کو فتح کرنے کی تیاریوں میں لگ گیا۔ اب مرتبہ وہ دربار سے ایسا گیا کہ پھر اسے لوٹ کر آنا نصیب نہ ہوا:

زر بدہ مرد سپاہی را تا سر بدہد
ورش زر ندہی سر بنہد در عالم

اجمیر کی زیارت کے لیے روانگی

اوائل شعبان میں بادشاہ نے دہلی سے اجمیر کا قصد کیا۔ نارنول کی منزل میں حسین قلی خان جہان مبارکباد کے لیے حاضر ہوا اور خان اعظم یلغار کرتے ہوئے احمد آباد سے حاضر خدمت ہوا۔ رمضان المبارک کے آغاز میں حسب سابق اجمیر سے 7 کوس کے فاصلہ پر بادشاہ پیدل زیارت کے لیے چلے اور درگاہ پر پہنچ کر داؤد کے لشکر کے نقاروں کی ایک

جوڑی جس کو درگاہ پر پیش کرنے کی بادشاہ نے منت مانی تھی، نذرانہ میں دی۔ حسب معمول ہر روز درگاہ میں راتوں کے وقت اہل اللہ اور صالحین کی محفل جمتی اور سماع کی مجلسیں منعقد ہوتیں، جن میں بادشاہ برابر حاضر رہتے۔ موسیقار اور قوال جو اپنے فن میں ایک سے ایک بڑھ کر تھے، دل سوز نغمے گا گا کر سناتے تھے اور چاروں طرف سے ان پر روپے پیسے کی بارش ہونے لگتی۔

دارالخلافہ کی جانب واپسی

اجمیر سے بادشاہ نے مالدیو کے لڑکے چندرسین کی بغاوت کو کچلنے کے لیے ایک تجربہ کار فوج کو مقرر کیا اس فوج کی سرداری محمد طاہر خان میر فراغت حاکم دہلی کے لڑکے طیب خان کے سپرد کی گئی۔ اس فوجی حملہ کا سبب یہ تھا کہ چندرسین کے بارے میں بادشاہ کو مسلسل یہ اطلاعات مل رہی تھیں کہ وہ جودھپور اور سیوانہ کے علاقہ میں سرکشی اختیار کر کے مسلمانوں کو پریشان کر رہا ہے۔ جب یہ فوج اس پر حملہ کرنے کے لیے پہنچی تو وہ گھنے جنگلوں میں بھاگ کر چھپ گیا اور فوج کی روانگی کے بعد ماہ رمضان کے وسط میں خان اعظم کو گجرات پر جانے کی اجازت عطا فرمائی گئی اور بادشاہ مسلسل کوچ کر کے رمضان کی آخری تاریخ تک فتح پور واپس تشریف لے آئے۔

سیوانہ کے قلعہ کی فتح

بادشاہ نے اسی سال شاہ قلی خان محرم، جلال خاں قورچی اور چند دوسرے امیروں کو سیوانہ کے قلعہ کی تسخیر کے لیے روانہ کیا۔ یہ قلعہ مالدیو کے پوتوں کے قبضے میں تھا۔ جلال خان قورچی بادشاہ کا خاص ندیم اور مصاحب تھا۔ نہایت ظریف اور خوش طبع آدمی تھا۔ مصاحبوں اور ندیموں میں بادشاہ کے مزاج میں کسی کو اتنی دسترس نہ تھی، جتنی جلال خان کو حاصل تھی۔ اس معرکہ میں اس نے بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا اور لڑتے ہوئے شہید ہو گیا۔ اس طرح اسے دنیا بھی ملی اور عاقبت بھی ہاتھ سے نہیں گئی۔ اس کے بعد اس مہم پر شہباز

خان کنبوہ کو روانہ کیا گیا۔ اس نے تھوڑے ہی عرصہ میں اس قلعہ پر قبضہ کرلیا۔

اسی سال بادشاہ نے میر گیسو بکاول کو سلطان محمود بھکری کے مال و دولت کی تحقیقات اور قلعہ بھکر کے انتظامات کے لیے مقرر فرمایا۔

اسی سال گجرات میں بڑی سخت وبا پھیلی اور غلہ اس قدر مہنگا ہو گیا کہ ایک من جوار کے دام ایک سو بیس تنکہ سیاہ تک چڑھ گیا، وبا اور قحط سے بے شمار لوگ ہلاک ہوئے۔

خواجہ امینا خواجہ جہاں کی وفات

اسی سال خواجہ امینا[38] خواجہ جہاں کا لکھنؤ میں اس وقت انتقال ہو گیا جبکہ بادشاہی لشکر پٹنہ سے لوٹ کر وہاں پہنچا تھا۔ خواجہ امینا کی کنجوسی ضرب المثل بنی ہوئی تھی، چنانچہ وہ رات کا بچا ہوا کھانا کھاتا تھا، لیکن یہ کفایت اس کی اپنی ذات تک محدود تھی، کیوں کہ وہ حاجت مندوں کی بہت امداد و اعانت کیا کرتا تھا، بلکہ اس معاملہ میں شاید ہی کوئی دوسرا اس کے مقابل آسکے۔

اس کا معمول تھا کہ ملازمت دلانے کے لیے ایک مقررہ رقم بطور رشوت لیا کرتا تھا اور بادشاہ کے پاس سفارش کر کے، جاگیر، نقارہ، خان یا سلطان کا خطاب دلایا کرتا تھا۔ جو لوگ ماوراء النہر، خراسان اور عراق سے ہندوستان آتے تھے وہ ان کو شاہی خزانہ سے معقول رقمیں دلایا کرتا تھا اور کوشش کر کے دوسرے امیروں سے بھی خاصا روپیہ فراہم کر دیتا تھا اور دوسروں کی طرح خود بھی اپنے شایان شان انکی مدد کرتا رہتا تھا۔

ملا حسام الدین ابراہیم اسفر کے ایک شاگرد حافظ تاشکندی تھے جو عربی کے مشہور عالم ہیں انھوں نے سورۂ محمدؐ پر ایک تفسیر لکھی ہے ان کے علمی مرتبہ کا اندازہ اس تفسیر سے بخوبی ہوسکتا ہے۔ وہ جب ہندوستان آئے تو خواجہ امینا نے بادشاہ سے اور دوسرے امیروں سے تقریباً تیس چالیس ہزار روپیہ اکٹھا کر کے انکو دلایا وہ پورے ساز وسامان کے ساتھ منعم خان خاناں کے پاس گئے اور وہاں سے بھی مالا مال ہو کر مکہ معظمہ کے ارادے سے روانہ ہوئے۔ انھوں نے 977ھ/1569ء میں اپنے وطن پہنچ کر انتقال فرمایا۔

ایک دلچسپ لطیفہ

انہی دنوں بادشاہ کی محفل میں ایک دلچسپ لطیفہ پیش آیا۔ اکبری مجلس میں حاجی ابراہیم سرہندی بھی تھا جو ہمیشہ علماء سے الجھتا رہتا اوراپنی بڑائی جتانے کے لیے مباحثے کرتا رہتا تھا اور بحث میں طرح طرح کے مغالطے پیدا کر کے مخالف کو پریشان کر دیتا تھا۔جس وقت ناشکندی نے اپنی تفسیر پیش کی تو حاجی نے مرزا مفلس کو چھیڑنے کے لیے پوچھ لیا کہ "موسیٰ" کون سا صیغہ ہے اور کس مادہ سے مشتق ہے؟ مرزا مفلس علوم عقلیہ کے بہت بڑے عالم تھے۔ اتفاق کی بات اس کا جواب جیسا کہ دینا چاہیے تھا، نہ دے سکے اور عوام نے یقین کرلیا تھا کہ حاجی ابراہیم علم کے لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتا ہے اور یہ بڑی ناانصافی کی بات تھی، کچھ لوگوں نے قاضی زادہ لشکر سے جسے بادشاہ نے متھرا کا قاضی بنایا تھا کہا تم بحث میں کیوں حصہ نہیں لیتے ہو؟ اس نے بے ساختہ جواب دیا" اگر حاجی ابراہیم مجھ سے "عیسیٰ" کا صیغہ پوچھ بیٹھے تو اس وقت بھلا میں کیا جواب دے سکوں گا؟ بلا شبہ ا س نے بڑی عمدہ بات کہی تھی۔

یادرفتگان

اس تاریخ سے اب تک[39] کہ دس سال کی مدت گزر چکی ہے ان مباحثہ کرنے والوں کی جماعت میں سے جو 100 سے زیادہ آدمیوں پر مشتمل تھی محقق و مقلد کوئی بھی تو نظر نہیں آتا ہے۔سب کے چہروں پر موت اپنا سیاہ نقاب اُڑھا چکی ہے، بے شک "کل نفس ذائقة الموت"

زخیل درد کشان غیر ما نماند کسی بیارباده که باهم غنیمتیم بسی

وہ محفلیں اجڑ گئیں اور ایک میں[40] سوگوار رہ گیا ہوں کہ جب بھی ان کی یاد آتی ہے تو میری غمزدہ آنکھیں حسرت کے ساتھ خون کے آنسو روتی ہیں اور دل نالہ و فریاد کرنے لگتا ہے۔ کاش وہ لوگ کچھ دن اور جی جاتے کہ بہر حال اس قحط الرجال میں ان کی ہستیاں بڑی غنیمت تھیں۔ اب کس سے بات کریں؟ تبادلہ خیالات کی لذت تو بس ان کے ساتھ

ہی چلی گئی۔ اب مجھ ناکارہ[41] کے لیے بجز اس کے کوئی چارہ نہیں رہا کہ انکی جدائی سے جلتا اور چپکے چپکے آہ و فریاد کرتا رہوں:

افسوس کہ یاران ہمہ از دست شدند — دریای اجل یگان یگان پست شدند

بودند تنک شراب در مجلس عمر — یک لحظہ زما پیشتر مست شدند

پیمائش اور کروڑیوں کا تقرر

اس سال اکبر نے ملک کی خوشحالی اور زرعی ترقی کی طرف توجہ فرمائی اور ملک کے سارے زرخیز و بنجر پرگنوں کی پیمائش کرائی[42] شہری، پہاڑی علاقوں، دریاؤں، میدانوں، جنگلوں، تالابوں اور کنوؤں کی تفصیلات جمع و مرتب کی گئیں اور جگہ جگہ کروڑیوں کو مقرر کر کے ہر ایک کروڑی کی تحویل میں اتنی اراضی دے دی کہ زراعت کے بعد اس سے ایک کروڑ تنکہ کا محصول وصول ہو سکے۔ وہی ملازم کروڑی بنائے گئے جن پر پورا بھروسہ تھا اور جو مخلص تھے، ان کو حکم دیا گیا کہ وہ تین سال کے عرصہ میں غیر مزروعہ خطوں کو قابل کاشت بنادیں تاکہ سرکاری خزانہ کی آمدنی میں اضافہ ہو جائے۔ ہر کروڑی سے اس رقم پر ضامن لیے گئے۔

اس پیمائش کی ابتداء فتح پور سے کی گئی۔ اس کے پہلے کروڑ کو آدم پور، دوسرے کو شیث پور اور اسی طرح ایوب پور وغیرہ کے نام دیے گئے اور ہر خطے پر سرکاری عامل تعینات کیے گئے، لیکن بندو بست کا یہ طریقہ کامیاب نہ ہوا اور ممالک محروسہ کے اکثر علاقے ان کروڑیوں کے مظالم کی وجہ سے بجائے آباد ہونے کے ویران ہو گئے، یہاں تک کے لوگ اپنے بال بچوں کو بیچ بیچ کر ادھر ادھر منتشر ہو گئے اور آمدنی کا تناسب بہت زیادہ گر گیا۔ ان کروڑیوں کے احتساب کے لیے راجہ ٹوڈرمل کو مقرر کیا گیا، اس نے ان سب کو اس طرح شکنجہ میں کسا کہ اکثر سخت سزاؤں کی وجہ سے مر گئے اور بیشتر کچہری کے قید خانہ میں کسی سزا کے بغیر ہی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دنیا سے بے گور و کفن رخصت ہوئے۔ ان گرفتاران بلا کا حال بعینہٖ ان ہندو فدائیوں کی طرح ہو گیا تھا جو کامروپ کے علاقہ میں خود کو ایک بت کے لیے وقف کر دیتے ہیں اور ایک سال تک جو من میں آتا ہے، کرتے رہتے ہیں۔ وہ

چاہے کتنا ہی بڑا گناہ اور جرم کریں انکے لیے سب کچھ معاف ہوتا ہے۔ لیکن سال گزرتے ہی ان میں سے ہر ایک کو پکڑ کر اس بت خانہ میں اکٹھا کرلیا جاتا ہے اور اس بت کے آستانہ پر ان کے سر قلم کردیے جاتے ہیں۔

داغ و محلّہ کا ضابطہ

کروڑیوں کی یہ حالت تھی اور امرائے شاہی کے یہ ٹھاٹھ تھے کہ خالصہ کے علاقوں کو چھوڑ کر تقریباً سارا ملک ان کی جاگیروں میں تقسیم تھا اور یہ لوگ رات دن عیش و عشرت میں مبتلا رہتے تھے ان کے گھرانوں کے خرچ اتنے تھے کہ ان کو روپے بٹورنے کے سوا اور کام نہ تھا۔ عیش پسندی سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ وہ سپاہیوں کی نگہداشت اور رعایا کی طرف توجہ کرسکیں۔ جب کسی لڑائی پر جانا پڑتا تو بجائے مقررہ فوج کے چند غلاموں اور اپنے شاگرد پیشہ مغل سپاہیوں کے ساتھ میدان میں حاضر ہوجاتے تھے۔ ان میں سے کسی کے پاس بھی کوئی کارآمد مضبوط فوج تیار نہ تھی۔

شہباز خان میر بخشی نے "داغ و محلّہ"(4) کا طریقہ جو سلطان علاؤالدین خلجی اور بعد میں شیر شاہ کے ضابطوں میں شامل تھا، از سر نو مرتب کرکے پیش کیا۔ اس قاعدہ کی رو سے طے پایا کہ پہلے امیروں کو بیسی کا عہدہ دیا جائے اور جب وہ اپنے عہدہ کے شایان شان بیس سوار بھرتی کرکے ان کا معائنہ کرادے اور اس کے حسب استعداد بادشاہ مزید ترقی دینا پسند فرمائیں تو اسے "صدی" کا عہدہ دیا جائے۔ اس صورت میں اس کے لیے لازم ہوگا کہ سپاہیوں کے علاوہ گھوڑے، اونٹ، ہاتھی اور دوسرے لوازمات فراہم کرکے حاضر خدمت کرے۔ اس تیاری کے بعد وہ ہزاری پھر دوہزاری اور پانچ ہزاری تک اس طرح ترقی کرتا چلا جائے۔ پنج ہزاری سے اونچا کوئی عہدہ نہیں تھا اور اگر کوئی امیر اس ضابطہ پر پورا نہ اترے تو اس کا زوال ہوجاتا تھا۔

فوج کے امراء کی چالبازیاں

داغ و محلّہ کا یہ ضابطہ اس لیے نافذ کیا گیا تھا کہ امیر مقررہ تعداد میں فوج رکھنے کے پابند

ہو جائیں، لیکن امیروں نے اس ذمہ داری سے بچنے کی تدبیر نکال لی، چنانچہ وہ حاضری اور معائنہ کے وقت اپنے آدمیوں اور بارگیروں کی بھیڑ اکٹھی کر لیتے تھے اور اپنے عہدہ کی مقررہ تعداد پوری کر لیتے تھے۔ جب ترقی مل جاتی تو ان کرایہ کے سپاہیوں کو رخصت کر دیتے تھے۔ لڑائی کے موقع پر حسب ضرورت نئی فوج بھرتی کر کے پہنچ جاتے تھے اور جنگ کے ختم ہونے پر خدا کی پناہ مانگتے ہوئے اپنی رنگ رلیوں میں مصروف ہو جاتے تھے۔ ان کا خزانہ روپیہ پیسہ بہرحال محفوظ ہی رہتا تھا اور ساری خاک بے چارے سپاہیوں کے سر پڑتی تھی کہ انھیں دوبارہ کمر باندھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

چنانچہ ان امیروں کے پاس پیشہ ور لوگ جولاہے، دھنیے، بڑھئی، بقال، ہندو اور مسلمان گھوڑا اور ساز کرائے پر لے کر اوپچی بنے داغ کے لیے پہنچ جاتے تھے اور ملازمت حاصل کر کے ان میں سے کوئی، احدی، کوئی ''داخلی'' بن جاتا تھا، خدمت ملنے کے چند دن بعد ہی ان کے پاس نہ وہ گھوڑا نظر آتا تھا اور نہ سامان سپاہ گیری، مہم آن پڑی تو انھیں پیادہ ہی گھسیٹنا پڑتا تھا۔

معائنہ کے وقت اکثر ایسا ہوا کہ بادشاہ نے سپاہیوں کو دیوان خانہ میں بلا کر اسی طرح وردیوں اور ہتھیاروں سے لیس ہاتھ پاؤں بندھوا کر ترازو میں تلوایا تو ان کا وزن کم وبیش ڈھائی من اور تین من تک نکلا۔ جب پوچھ گچھ کی تو پتہ چلا کہ یہ سارا ساز و سامان اور ہتھیار عاریتاً لیے ہوتے تھے۔

بادشاہ اس صورت حال سے بخوبی واقف تھے، لیکن کہا کرتے تھے کہ ہم لوگوں کو دیدہ و دانستہ یہ رعایتیں دیتے ہیں تاکہ وہ اپنی گزر بسر کرتے رہیں۔

کچھ عرصہ بعد دو اسپہ، یک اسپہ اور نیم اسپہ احدیوں کا تقرر کیا گیا۔ نیم اسپہ کا مطلب یہ تھا کہ دو سوار مل کر ایک گھوڑے کی پرورش کریں اور فی گھوڑا جو چھ روپیہ ماہوار ملتا تھا اس میں دونوں تین تین روپے لے لیں:

ایک در روزگار سن بین و پیرس

یہ رنگ ڈھنگ کچھ اچھے نہیں تھے۔ باوجود اس بدانتظامی کے یہ اکبر کی اقبال مندی ہی تھی

کہ اس کے تمام دشمنوں کا صفایا ہو گیا۔ بعد میں اتنے سپاہیوں کی بھی ضرورت نہ رہی اور امیروں کو بھی شاہی کارندوں کی ناز برداریوں سے چھٹکارا مل گیا۔

داؤد کا تعاقب

اسی سال بادشاہ سلامت نے داؤد کے تعاقب کے لیے منعم خان خانخاناں اور راجہ ٹوڈرمل کو اڑیسہ کی طرف روانہ کیا اور مجنون خاں قاقشال کا وہاں کے جاگیردار سلیمان منگلی سے مقابلہ ہوا۔ سلیمان کے پاس بڑا لاؤ لشکر جمع تھا اور وہ شان و شوکت اور بہادری میں بھی کافی مشہور تھا۔ اس مقابلہ میں سلیمان منگلی ہلاک ہو گیا اور قاقشال کی فوج کے ہاتھ اتنا مال غنیمت آیا کہ وہ اسے اٹھانے سے عاجز تھی۔ اس حملہ میں بہت سے پٹھان قیدی بن کر آئے۔ مجنون خان نے سلیمان کی لڑکی کا نکاح اپنے لڑکے جباری سے کر دیا۔ جباری ان دنوں بادشاہی امیروں میں شامل ہے! سلیمان کی شکست کے بعد مجنون خاں قاقشال کی لڑائی جلال الدین سور کے لڑکے سے ہوئی۔ جلال الدین کسی زمانہ میں اس علاقہ کا خود مختار حکمران تھا۔ یہ لڑائی گھوڑا گھاٹ کی حدود میں ہوئی۔ قاقشال نے اس علاقہ کے زمینداروں کی مدد سے اسے شکست دے کر بھگا دیا اور ٹانڈہ تک اس کا تعاقب کیا، اسی حملہ میں اس نے گوڑ کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ مجنون خان اور معین الدین فرنخودی نے ٹانڈہ کی ناکہ بندی کر دی اور خان خاناں کی کامیابی کی خبر کا انتظار کرنے لگے۔

جب داؤد کو شکست ہوئی اور خان خاناں کی واپسی کی خبر اڑی تو سارے پٹھان جو جنگلوں میں چھپے ہوئے تھے اکٹھا ہو کر موقع کا انتظار کرنے لگے۔ راجہ ٹوڈرمل، داؤد کے تعاقب پر لگا ہوا تھا وہ محمد قلی خاں برلاس، محمد قلی خان توقبائی اور مظفر مغل کو ساتھ لے کر متواتر کوچ کرتے ہوئے بنگال کے علاقہ کوالیاڑ تک پہنچ گیا۔ داؤد خاں وہاں سے دس کوس کے فاصلہ پر رین کساری نامی مقام پر ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں ایک بھاری فوج جمع کر کے وہ ہرپور میں قلعہ کے اندر چھپ گیا۔ داؤد کا ایک چچیرا بھائی جنید بہادری اور دلیری میں مشہور تھا، وہ پہلے شہنشاہ کی ملازمت میں تھا، ملازمت چھوڑ کر وہ آگرہ سے گجرات پھر وہاں سے

بنگالہ چلا گیا، اسی دوران وہ داؤد سے ملنے کے لیے رین کساری کے علاقے میں پہنچا۔ راجہ ٹوڈرمل نے میرزا ابوالقاسم گوسالہ کو جس کا لقب تمکین ہے، نظر بہادر کیساتھ اس کے مقابلہ پر روانہ کیا۔ یہ دونوں جنید سے شکست کھا کر راجہ کے پاس لوٹ آئے۔ اب راجہ خود اس کے مقابلہ پر گیا۔ جنید مقابلہ پر ٹھہر نہ سکا اور جنگل میں جا کر پناہ لے لی۔ یہاں سے راجہ کی فوج مدن پور جا کر کچھ وقت کے لیے ٹھہر گئی اسی جگہ محمد قلی خان برلاس بیمار ہو کر انتقال کر گیا۔

بادشاہی فوج میں اس کی وفات سے بڑا انتشار پھیل گیا اس لیے لشکر میدنی پور سے پیچھے ہٹ کر مدارن میں آ گیا۔ اس جگہ قیا خان گنگ امرائے لشکر سے ناراض ہو کر کسی جنگل میں چلا گیا۔ راجہ ٹوڈرمل نے یہ ساری صورت حال خانخاناں کو لکھ بھیجی۔ خان خاناں نے راجہ کی مدد کے لیے شاہم خاں جلائر اور لشکر خاں بخشی کو جسے عسکر خان اور استر خان بھی کہا جاتا تھا کچھ دوسرے افسروں کے ساتھ روانہ کیا۔ یہ لوگ بردوان میں راجہ سے جا کر ملے۔ راجہ نے اس جگہ تمام امرا کو چھوڑا اور خود قیا خاں کے پاس تنہا جا کر اسے منا کر واپس لے آیا، پھر وہاں سے کوچ کر کے مدارن کے راستے سے جھورہ پہنچا۔ جب لشکر برجین میں پہنچا تو خبر آئی کہ داؤد نے اپنے اہل و عیال کو تو گنگ بنارس میں چھوڑ دیا ہے اور لڑائی کی پوری تیاریاں کر لی ہیں۔ جب خانخاناں کو یہ خبر ملی تو اس نے تیز رفتاری سے کوچ کیا اور راجہ سے جا کر مل گیا۔

پٹھانوں سے خونریز لڑائی

پٹھانوں نے اپنی لشکر گاہ کے اطراف خندق کھود کر اچھی خاصی قلعہ بندی کر لی تھی۔ 20 ذی قعدہ 982ھ/1574ء کو تکتورہ کے علاقے میں دونوں فوجوں کے درمیان بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ دونوں طرف منگلوسی ہاتھی پر باندھے کھڑے تھے۔ داؤد کے ہاتھی چارہ گھاس کھا کر زور تازہ اور مست تھے۔ اس نے ہاتھیوں کو بادشاہی لشکر پر دوڑا دیا۔ خان خاناں نے اپنے لشکر کو حکم دیا کہ بندوقیں اور توپیں جو گاڑیوں پر رکھی ہوئی تھیں وہ ہاتھیوں کی صف پر چھوڑی

جائیں۔ توپوں کے چلتے ہی ہاتھی گھبراہٹ کے مارے پلٹ پڑے۔ اس موقع پر بندوقوں کی ضرب سے بہت سے پٹھان ہلاک ہوئے۔ داؤد کے مقدمۃ الجیش پر گوجر خان کماں دار تھا۔ اس نے بادشاہی ہراول پر حملہ کر دیا۔ ہراول کی کمان خان عالم، خواجہ عبداللہ، جنگ خواجہ، سید عبداللہ چوگان بیگی اور میرزا علی عالم شاہی کر رہے تھے۔ گوجر خان کا یہ حملہ اس غضب کا تھا کہ ان امیروں کے قدم اکھڑ گئے اور دشمن نے انھیں دھکیل کر التمش کی فوج تک جس کی سرداری قیاخان گنگ کر رہا تھا، پہنچا دیا۔ ہراول کے کمان دار خان عالم نے جم کر مقابلہ کیا اور لڑتے ہوئے مارا گیا۔ التمش کی فوج منتشر ہوگئی اور اس نے خان خاناں کی جمعیت میں آکر پناہ لی۔ اس بھگدڑ کی وجہ سے خانخاناں کی جمعیت کا شیرازہ بھی بکھر گیا۔ خان خاناں نے نظم قائم رکھنے کی بڑی کوشش کی، لیکن ایک مرتبہ منتشر ہونے کے بعد اس کی فوج جم نہ سکی۔ عین اسی حالت میں گوجر خان سر پر آپہنچا۔ خان خاناں کے مقابل آکر اس نے پے در پے تلوار کے کئی وار کیے۔ خان خاناں نے بڑے حوصلے سے کام لیا اور گوجر خان کے ہر حملہ کو اس نے اپنے تازیانہ پر روک لیا۔ اس نازک موقع پر ہاتھیوں سے گھبرا کر خانخاناں کا گھوڑا بھڑک گیا اور سنبھالے نہ سنبھلا۔ مجبور ہوکر خان خاناں نے حملے سے باگ پھیر لی اور بھاگی ہوئی فوج کو جمع کرنے کے بہانے سے تین چار کوس تک پیچھے ہوتا چلا گیا۔ پٹھانوں نے کافی دور تک اس کا پیچھا کیا۔ اس موقع پر قیاخاں گنگ اور دوسرے چند سرداروں نے پٹھانوں کے لشکر پر دونوں جانب سے تیر چلانے شروع کیے اور تیر بازی سے اس کے لشکر کو چھلنی چھلنی کر دیا۔ یہ مقابلہ اتنا سخت اور بھاری تھا کہ دونوں فریق لڑتے ہوئے تھک گئے۔ دونوں میں مزید نقل و حرکت کی طاقت نہ رہی۔ حسن اتفاق سے اسی وقت ایک تیر گوجر خاں کو ایسا لگا کہ وہ اسی وقت گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ اس کے گرتے ہی پٹھان میدان چھوڑ کر بدحواسی کے ساتھ بھاگ نکلے جن میں بہت سے مارے گئے۔ اسی وقت خان اعظم کا علم دار اس کا جھنڈا لے کر جیسے ہی خان خاناں کے پاس پہنچا اسے گوجر خان کے قتل کی خبر بھی مل گئی۔ اس اطلاع پر خان خاناں نے اپنی باگیں پھیر لیں اور چند ساتھیوں کے ساتھ خیمہ میں لوٹ کر آگیا۔ ان لوگوں نے آتے ہی پٹھانوں پر تیر

چلانے شروع کردیے۔

راجہ ٹوڈرمل اور لشکر خاں شاہی میمنہ پر متعین تھے۔ انھوں نے بھی پیش قدمی سے دشمن کے منتشرہ پر جس کا سردار اسماعیل خاں آبدار تھا اور اسے داؤد نے خان خاناں کا خطاب دے رکھا تھا، حملہ کردیا۔ اسی طرح شاہم خاں جلائر اور پاینده محمد خان مغل اور دوسرے سرداروں نے جو شاہی میسرہ پر تھے پٹھانوں کے میمنہ پر جس کا سردار حاکم اڑیسہ خان جہاں تھا، حملہ کردیا۔ دونوں پہلوؤں سے غنیم کی فوج کو دباتے ہوئے یہ لوگ داؤد کی خاص جمعیت تک جا پہنچے اور اس کے نامی گرامی ہاتھیوں پر تیروں کی بوچھار کرکے انھیں منتشر کردیا۔ اس حملہ سے داؤد کی جمعیت میں افراتفری مچ گئی۔ اس وقت خان خاناں فتح کے پھریرے لہراتا ہوا دور سے نمودار ہوا۔ گوجر خان کے مارے جانے کی خبر داؤد کو ملی۔ اس غیر متوقع صورت حال سے داؤد کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی اور وہ میدان چھوڑ کر فرار ہوگیا۔ اس کے وہ سارے ہاتھی برباد ہوگئے۔

صلح کی بات چیت

فتح کے بعد خانخاناں نے اسی جگہ پر زخمیوں کی مرہم پٹی اور علاج کے لیے کچھ دن تک قیام کیا۔ اسے بھی کافی زخم آئے تھے، جن کا علاج کیا گیا۔ لشکر خان بری طرح زخمی ہوچکا تھا اس لیے وہ جانبر نہ ہوسکا۔ اس اثنا میں داؤد بھاگ کر کٹک بنارس جا پہنچا تھا۔ خانخاناں نے اسی منزل سے راجہ کو شاہم خان جلائر، قیاخاں، سید عبداللہ، محمد قلی خان توقیائی اور سعید خان بدخشی کے ہمراہ اس کے تعاقب میں روانہ کیا اور طے پایا کہ وہ خود بھی زخموں کے ٹھیک ہوجانے کے بعد ان کے ساتھ آکر شامل ہوجائے گا۔ یہ فوج وہاں سے رخصت ہوکر کل کل گھاٹی پہنچ گئی اور ادھر داؤد اور تمام پٹھانوں نے کٹک بنارس کے قلعہ کو مقابلہ کے لیے مستحکم کرلیا اور جنگ کی تیاریاں کرنے لگے۔ غنیم کی تیاریوں کا حال سن کر خان خاناں بھی کٹک بنارس آپہنچا اور دریائے مہندری کے کنارے کیمپ لگا دیا۔ خان خانان کے پہنچنے کے بعد صلح کی کہا سنی شروع ہوئی اور بڑی ردو کد کے بعد امرا کے مشورے سے طے پایا کہ

داؤد خانخاناں سے آکر ملے اور حلف اٹھا کر مصالحت کا عہد کرلے۔ بنگال کا ایک وسیع علاقہ اسے عطا کر دیا جائے گا۔

داؤد اور خان خانان کی ملاقات

مقررہ دن شاہانہ انداز میں مجلس کو سجایا گیا۔ تمام امرا بہ لحاظ مراتب اپنے اپنے مقام پر بیٹھے۔ سراپردہ اور بارگاہ کے سامنے فوج کے دستے داؤد کے استقبال کے لیے کھڑے ہوئے تھے، بنگالہ کا حکمران نہایت شان وشوکت کے ساتھ افغان سرداروں کے ساتھ بنارس کے قلعہ سے باہر نکلا اور خان خاناں انتہائی تواضع کے ساتھ اس کی تعظیم بجالایا اور ادب کے ساتھ پیشوائی کرتے ہوئے اسے سراپردہ میں لے کر آیا۔ ملاقات کے وقت داؤد نے اپنی تلوار میان سے باہر نکال کر خان خاناں کے سامنے رکھ دی اور کہا کہ "جب سے تم جیسا عزیز دوست زخمی ہوا ہے میں ایسی سپاہ گری سے ہی بیزار ہو گیا ہوں"۔ خان خانان نے وہ تلوار لے کر ایک محافظ کے سپرد کردی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب مسند پر بٹھالیا۔ باپ کی طرح شفقانہ انداز میں مزاج پرسی کی۔ اس موقع پر طرح طرح کے کھانے، حلوے اور شربت تیار کیے گئے تھے۔ خان خانان نے اپنے معزز مہمان کو نہایت اصرار کر کے کھانا کھلایا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اہم امور پر گفتگو شروع ہوئی اور عہد نامہ کی تکمیل کی گئی۔ اس سے فارغ ہونے پر خان خانان نے ایک تلوار اپنے خاص اسلحہ خانہ سے منگائی۔ اس تلوار کا دستہ اور بندھن قیمتی جواہرات سے مرصع تھا۔ یہ تلوار اس نے داؤد کی کمر سے باندھتے ہوئے کہا کہ اب جب کہ آپ بادشاہ کے دولت خواہ بن چکے ہیں، یہ تلوار شہنشاہ کی طرف سے باندھ لیجیے، بنگال کے علاقہ کے متعلق میں بادشاہ سے درخواست کروں گا، حسب منشاء اس سلسلہ میں فرمان پہنچ جائے گا۔ غرض طرح طرح کے تکلفات کے بعد قیمتی تحائف دے کر خان خانان نے داؤد کو رخصت کیا اور یہ شگفتہ اور بارونق محفل برخاست ہوگئی۔ خان خاناں اس مہم سے 10 صفر 983ھ/1575ء کو ٹانڈہ کے صدر مقام پر لوٹ آیا اور وہاں سے اس نے سارے حالات کے متعلق عریضہ لکھ کر

بادشاہ کے پاس روانہ کیا۔ بادشاہ نے اس کی تجویز کے مطابق فرمان، بھاری خلعتیں، جڑاؤ تلوار اور مع ساز و سامان اور ایک عربی گھوڑا روانہ کر دیا۔ بنگالہ کے معاملات خان خانان کو عطا کر کے اسے وہاں کا مطلق العنان حاکم بنا دیا۔ 982ھ/1574ء میں بتاریخ 16 جمادی الثانی میاں شیخ داؤد جھنی وال نے وصال فرمایا۔ ان کی تاریخ وفات "یا شیخ داؤد ولی" ہے۔

جب بادشاہ اجمیر سے لوٹ کر آئے تو ماہ ذی قعدہ 982ھ/1574ء میں فتح پور کے پاس ایک عبادت خانہ کی بنیاد رکھی جو چار ایوانوں پر مشتمل تھا۔

شیخ ابو الفضل کا دربار میں داخل ہونا

انہی دنوں شیخ ابو الفضل ولد شیخ مبارک ناگوری جسے علامی بھی لکھا جاتا ہے اور اسی نے بے دینی کا یہ سارا ہنگامہ برپا کیا تھا، بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا۔ باریابی کے وقت اس نے "آیۃ الکرسی" کی تفسیر پیش کی، جس میں بہت سے قرآنی رموز و نکات درج تھے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ تفسیر دراصل اس کے والد کی لکھی ہوئی تھی۔ بادشاہ نے اس تفسیر کو پسند فرمایا، اس کی تاریخ "تفسیر اکبری" نکالی گئی۔ بادشاہ نے مغرور اور متکبر ملاؤں کے خاتمہ کی توقع مجھ(44) سے لگا رکھی تھی۔ اس کام کے لیے اب انہیں موزوں آدمی مل گیا۔ ابو الفضل کو پہلے ہی سے علما کے ساتھ بڑی نا اتفاقی تھی جس کا سبب یہ تھا کہ جس زمانہ میں اہل بدعت کی گرفتاریاں ہو رہی تھیں اور میر حبش جیسے لوگ قتل کیے گئے تھے۔ شیخ عبد النبی مخدوم الملک اور دوسرے تمام علماء نے متفقہ طور پر عرض کیا تھا کہ شیخ مبارک مہدی بھی بدعتی اور سخت گمراہ ہے۔ ان لوگوں نے کسی نہ کسی طرح اجازت لے کر شیخ کو حاضر کرنے کے لیے حاکم کو روانہ کر دیا تھا۔ شیخ مبارک اپنے بیٹوں کو لے کر کہیں چھپ گیا اور لوگوں نے اس کی مسجد کے منبر کو توڑ ڈالا۔ شیخ سلیم کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ اسی لیے شیخ مبارک نے ان کے ذریعہ سفارش کرانی چاہی۔ شیخ سلیم نے اپنے ایک مرید کے ہاتھ کچھ رقم سفر کے خرچ کے لیے اس کے پاس بھیج دی اور کہلوایا تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم یہاں سے

بھاگ کر گجرات چلے جاؤ۔ جب شیخ مبارک کو ان کی طرف سے نا امیدی ہوئی تو انھوں نے میرزا عزیز کوکہ کو وسیلہ بنایا۔ اس نے بادشاہ سے شیخ مبارک کی علمیت اور درویشی کی بڑی تعریف کی اور اس کے لڑکوں کے علم و فضیلت کو بھی سراہا اور کہا کہ اس کے پاس سرکاری انعام کی زمین نہیں ہے اور وہ ایک بھروسہ کرنے والا شخص ہے۔ ایسے درویش صفت آدمی کو آزار پہنچانا کچھ مناسب نہیں۔ کوکہ کی سفارش پر بادشاہ نے ان باپ بیٹوں کو سزا دینے کا خیال ترک کردیا اور کچھ ہی عرصہ بعد ان کے دن ایسے پھرے کہ شیخ ابو الفضل نے جلد ہی اپنی خدمات زمانہ سازی، بددیانتی، مزاج شناسی اور خوشامد کے ذریعہ بادشاہ کا بہت زیادہ تقرب حاصل کرلیا اور جیسے ہی موقع ملا اس نے بادشاہ کی پشت پناہی سے ان تمام لوگوں کو جنھوں نے اس کے خاندان کے خلاف چغلیاں کھائی تھیں اور ایذا رسانی کی ناکام کوشش کی تھی طرح طرح سے رسوا کیا اور مدتوں پہلے گزری ہوئی باتوں کا ایک ایک کرکے انتقام لیا۔ اس کے انتقام کی لپیٹ میں صرف ان کے مخالف ہی نہ آئے بلکہ وہ عام و خاص ہر ایک کی ایذا رسانی پر اتر آیا، چنانچہ اس کی وجہ سے کتنے ہی مشائخین، صالحین اور صاحب احتیاج اشخاص کی معاش اور وظیفے بند ہوگئے ان لوگوں کو وہ طرح طرح سے ایذائیں دیتا تھا اور زبان حال وقال سے مزے لے لے کر کہا کرتا تھا:

یا رب بہ جہانیان ولیلی بفرست نمرودان راچو پشہ فیلی بفرست
فرعون وشان دست برادر دستند موسیٰ و عصا درود نیلی بفرست

ان کی ان کارگزاریوں سے جب لوگ ہائے ہائے کرنے لگے تو وہ ان پر طنز کرتے ہوئے اکثر یہ رباعی پڑھا کرتا تھا:

آتش بدو دست خویش درخرمن خویش
چون خوزدہ ام چہ نالم از دشمن خویش
کس دشمن من نیست منم دشمن خویش
ای وای من دوست من و دامن خویش

بحث و مباحثہ کے وقت اگر کوئی کسی مجتہد کا قول پیش کرتا تو وہ نہایت جسارت سے کہا کرتا

تھا فلاں حلوائی، فلاں موچی اور فلاں چرم فروش کا قول ہمارے لیے حجت نہیں ہے۔ غرض علماء کا انکار اور ان کی توہین اس کا محبوب مشغلہ تھا۔

بادشاہی عبادت خانہ

983ھ/1575ء میں تین عبادت خانوں کی تعمیر مکمل ہوئی۔ ان کی تعمیر کا پس منظر یہ تھا کہ جب گزشتہ چند سالوں میں اکبر کو بڑی بڑی فتوحات نصیب ہوئیں اور روز بہ روز مملکت کی حدود میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ملک کا سارا نظم و نسق حسب منشا قائم ہوگیا اور ملک میں کوئی مخالف اور دشمن نہ رہا تو اس کا رجحان زیادہ تر عبادت اور ریاضت کی طرف مائل ہوا، چنانچہ اجمیر کی درگاہ معینیہ کے مجاوروں اور درویشوں کے ساتھ صحبتیں رہنے لگیں اور اس کے زیادہ تر اوقات اللہ و رسولؐ کے تذکرے میں گزرنے لگے۔ ان محفلوں میں وہ اکثر تصوف کی باتوں، فقہی مسئلوں اور علمی مباحثوں میں مصروف نظر آنے لگا۔ راتیں بھی اللہ کی عبادت میں گزرنے لگیں۔ کسی نے "یا ہو" اور "یا ہادی" کا وظیفہ بتادیا تھا۔ وہ عموماً راتوں میں یہ وظیفہ پڑھا کرتا تھا۔ ان دنوں اس کے دل پر اللہ کی عظمت کا بڑا اثر تھا چنانچہ ان نعمتوں کے شکرانے میں جو خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے عطا کی تھیں تقریباً ہر روز ایک پرانے حجرہ میں جو آبادی سے دور شاہی محلات کے قریب واقع تھا، پتھر کے فرش پر مراقبہ میں بیٹھا رہتا تھا۔ حاکم بنگالہ سلیمان کرانی کے متعلق اس نے سن رکھا تھا کہ وہ پچھلی رات کو اٹھ کر 150 مشائخین اور علماء کے ساتھ تہجد کی نماز با جماعت ادا کرتا تھا اور فجر کی نماز تک ان عالموں کی مجلس میں تفسیر و تذکیر میں مصروف رہتا تھا، فجر پڑھنے کے بعد ملکی معاملات، فوج اور لشکر کے حساب کتاب میں وقت گزارتا تھا۔ اس کے اس معمول میں کبھی فرق نہ آتا تھا، اکبر نے بھی اسی طرح اپنے اوقات تقسیم کر رکھے تھے۔ ان دنوں مرزا سلیمان کے آنے کی بھی خبر تھی۔ مرزا سلیمان صوفی منش، صاحب حال بادشاہ تھا۔ صاحب بیعت بھی تھا، لوگ اس کے ہاتھ پر مریدی کی بیعت کیا کرتے تھے، لہٰذا اکبر نے کچھ تو شوق عبادت میں اور کچھ آنے والے اس معزز مہمان کی خاطر شیخ عبد اللہ نیازی کے حجرہ پر ایک بڑی

عبادت گاہ تعمیر کرائی۔ عبد اللہ نیازی کے حالات ہم بیان کر آئے ہیں کہ وہ پہلے شیخ الاسلام چشتی کے مرید تھے بعد میں مہدوی سلسلہ سے وابستہ ہو گئے تھے۔ اس عبادت گاہ کے چاروں طرف ایک وسیع ایوان اور انوپ تلاؤ نامی حوض تیار کرایا گیا اور اس حجرہ کو "عبادت خانہ" نام دیا گیا جو بعد میں "عبادت خانہ" ہو گیا۔ ملا شیری نے اسی کے بارے میں ایک قصیدہ کہا تھا جس کا ایک شعر یہ ہے:

دریں ایام دیدم جمع با سوال قارونی
عبادت ہای فرعونی عمارت ہای شدادی

عبادت خانہ کی محفلیں

اکبر کا معمول تھا کہ ہر جمعہ کو نماز کے بعد شیخ الاسلام کی جدید خانقاہ سے اس عبادت خانہ میں آکر مجلس منعقد کرتا تھا اس محفل میں نامی گرامی علماء، مشائخین اور چند خاص مصاحب اور ندیم ہی شریک ہوا کرتے تھے۔ دوسرے کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ اس محفل میں عموماً علمی مباحث اور مذاکرے ہوا کرتے تھے۔

اسی محفل میں ایک دن جلال خان قورچی نے جو میر احسن اور کرم فرما تھا، اثنائے گفتگو میں کہا کہ میں شیخ ضیاء اللہ ولد شیخ محمد غوث سے ملنے آگرہ گیا تھا، ان کا مفلسی کے مارے ایسا برا حال ہے کہ ایک دن انھوں نے چند سیر چنے منگائے جس میں سے کچھ تو خود کھائے کچھ مجھے دے دیے اور ایک حصہ اپنے گھر والوں کے لیے بھیج دیا۔ یہ سن کر اکبر بہت متاثر ہوا اور شیخ ضیاء اللہ کو آگرہ سے بلوا کر اسی عبادت خانہ میں ان کے قیام کا انتظام کرا دیا۔

مذکورہ عبادت خانہ میں ہر جمعہ کی رات کو بھی محفل منعقد ہوتی تھی جس میں سادات، مشائخ، علماء اور امراء بھی حاضر رہتے تھے۔ بادشاہ کے قریب نشستیں لینے کے لیے اکثر تقدیم و تاخیر کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوتا تھا اور لوگ آپس میں بڑی بد تہذیبی کا مظاہرہ کرنے لگتے تھے۔ اس لیے اکبر نے باقاعدہ نشستوں کا تعین کر دیا کہ امراء تو مشرقی جانب بیٹھیں،

سادات مغربی جانب، علما کی نشست جنوبی حصے میں اور مشائخین شمال میں بیٹھا کریں۔ اکبر باری باری ہر ایک کی نشست گاہ میں جا کر ان کے مباحثوں میں حصہ لیا کرتا تھا۔ اس موقع پر طرح طرح کی خوشبوؤں سے پوری مجلس مہک اٹھتی تھی اور بادشاہ مستحق لوگوں کی جو مقربان دربار کے وسیلے سے وہاں پہنچ جاتے تھے، حسب مدارج مالی امداد بھی کرتا تھا۔ گجرات کی فتح کے موقع پر اعتماد خان گجراتی کی جمع کی ہوئی بہت ساری نفیس اور قیمتی کتابیں غنیمت میں آئی تھیں۔ ان کتابوں کو اکبر نے خود اپنے ہاتھ سے اس محفل میں آنے والے علماء میں تقسیم کیا۔ مجھے[45] بادشاہ نے جو کتابیں دی تھیں ان میں ایک "انوار المشکوٰۃ" تھی، جس میں "مشکوٰۃ الانوار" کے عنوان سے ایک فصل کا اضافہ بھی شامل تھا جو کتابیں بچ گئیں وہ امراء کو دوسرے تحفوں اور اشیاء کے عوض عطا کیں۔ مال غنیمت کو اکبر "ارباس" یعنی زوال دشمن کہا کرتا تھا۔

ایک رات اسی محفل میں علما کی مجلس میں بڑا ہنگامہ برپا ہو گیا اور وہ چیخ چیخ کر بحث کرنے لگے۔ ان کے شور و غل سے بادشاہ نے برہم ہو کر مجھ[46] سے کہا "اس کے بعد جو شخص بھی ناشائستہ بات کرے اس کی اطلاع مجھے دینا، میں اس کو مجلس سے اٹھا دوں گا"۔ میں نے اس وقت چپکے سے آصف خاں کو کہا "اس طرح تو تقریباً سبھی کو اٹھوانا پڑے گا"۔ اکبر نے مجھے یہ کہتے ہوئے دیکھ لیا تھا اس لیے پوچھا کیا کہہ رہے ہو؟ جو کچھ میں نے کہا تھا وہ دہرا دیا۔ وہ سن کر بہت خوش ہوا اور اپنے مصاحبوں کو بھی یہ بات بتائی۔

مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری

اس محفل میں مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطان پوری کو چھیڑنے اور تنگ کرنے کے لیے اکثر بلایا جاتا تھا۔ اس بزرگ عالم کو شیخ ابوالفضل جو اب ایک نئے دین کا مجتہد بنا بیٹھا ہے اور اس جیسے دوسرے نئے نئے باریافتہ لوگ بحث و مباحثہ میں الجھا کر کھلونا بنا لیتے اور اس کی ہر بات کو غلط ملط کر دیا کرتے تھے۔ ان مباحثوں کے دوران اکبر کا اشارہ پا کر بعض مصاحب اور امیر بھی الٹی سیدھی فرضی باتیں بنا بنا کر اس پر فقرے کستے تھے اس کا

بڑھاپا ان سب کے ہاتھوں میں اچھا خاصہ کھیل بن گیا تھا۔ ایک مرتبہ اسی شام کی محفل میں خان جہاں نے کہا مخدوم الملک نے فتویٰ دیا ہے کہ ان دنوں حج پر جانا فرض نہیں، بلکہ ایک طرح سے گناہ ہے۔ جب لوگوں نے وجہ دریافت کی تو اس نے یہ دلیل دی کہ حج کے لیے خشکی کا راستہ تو گجرات اور عراق کا ہے جو قزلباشوں کی لوٹ مار کی زد میں ہے اور اگر سمندر کے راستہ جائیں تو فرنگیوں سے پروانہ راہداری لینے کی ذلت اٹھانی پڑتی ہے ان کے پروانہ راہداری پر حضرت عیسیٰ اور بی بی مریم کی تصویر چھپی رہتی ہے جو بت پرستی کی ایک شکل ہے، اس لیے یہ دونوں حج کے راستے بند ہو گئے ہیں۔

اس کے متعلق خان زمان نے ایک بات یہ بھی بتائی کہ وہ زکوٰۃ سے بچنے کے لیے یہ بہانہ کرتا ہے کہ ہر سال کے اختتام پر سارا مال متاع اپنی بیوی کے نام کر دیتا ہے اور دوسرے سال کے ختم ہونے سے پہلے اپنے نام پر واپس لے لیتا ہے۔ غرض خان زمان نے مخدوم الملک کی کنجوسی، رذالت، خباثت، مکاری اور دنیاداری کے بہت سے قصے سنائے اور اس نے علما و مشائخین، خاص طور سے پنجاب کے مستحق لوگوں پر جو زیادتیاں کی تھیں وہ سب ایک ایک کر کے بتائیں۔ بس پھر کیا تھا بہت سے لوگوں کی زبانیں کھل گئیں اور لوگ اس کی اہانت اور مذمت کے لیے ایک سے ایک بڑھ کر قصے سنانے لگے آخر میں یہ طے پایا کہ اسے حج کے لیے زبردستی مکہ معظمہ روانہ کر دیا جائے۔ جب بادشاہ نے اس سے پوچھا کہ "تم پر حج فرض ہے تو اس نے جواب دیا نہیں"۔

شیخ عبدالنبی

ان دنوں مخدوم الملک کا ستارہ زوال میں آچکا تھا اور دربار میں شیخ عبدالنبی کا سورج چمکنے لگا تھا۔ چنانچہ بادشاہ تعظیم و احترام کی وجہ سے کبھی کبھی حدیث سننے کے لیے خود ان کے گھر پر چلا جاتا تھا۔ ایک دو مرتبہ تو اکبر نے ان کی جوتیاں بھی سیدھی کیں۔ بڑے شہزادے کو بھی تعلیم کے لیے انہی کے حجرہ میں بٹھایا گیا تھا۔ وہ عموماً مولانا عبدالرحمٰن جامی کی "چہل حدیث" کا درس دیا کرتے تھے۔

شیخ عبد النبی کو محدثی، حافظی اور امامی کا بڑا دعویٰ تھا، لیکن علمیت کا یہ حال تھا کہ "الحزم سوء ظن" کی حدیث جب بھی سناتا تو ہمیشہ "الحزم" کو "الخرم" ح کے بجائے "خ" اور "ز" کے بجائے "ر" پڑھا کرتا تھا۔ مدتوں تک اس کو اپنی اس غلطی کا احساس نہ ہوا۔ جس وقت بادشاہ اس سے برداشتہ خاطر ہو گئے تھے اور ملاؤں کا گروہ دربار سے نکل گیا تھا، مرزا عزیز کوکہ نے بادشاہ کو بتایا تھا کہ علم حدیث میں اس کی یہ قابلیت ہے جس پر وہ ناز کیا کرتا ہے، آپ نے اس کو سر چڑھا رکھا تھا۔ اس لیے اس کا مزاج عرش پر جا پہنچا۔

شیخ عبد النبی کا غرور و تکبر

اسی سال بادشاہ نے حکم دیا کہ جب تک کہ ممالک محروسہ کے تمام ائمہ اپنے وظائف اوقات اور معاش کے فرامین پر صدر (شیخ عبد النبی) کی مہر نہ لگوائیں" کروڑی ان کی رقمیں اجرا نہ کریں"۔ اس فرمان کی وجہ سے ہندوستان کے مشرقی کنارے سے لے کر بھکر تک کے اہل غرض شیخ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ ان میں سے جن کی سفارش کسی امیر اور مقرب نے کردی تو اس کا کام حسب منشا تکمیل پا گیا اور جن کو کسی کا وسیلہ نہیں ملا وہ بچارے سید عبد الرسول اور شیخ کے دوسرے کارندوں کے پاس دھکے کھاتے رہے۔ نہ صرف ان کو بلکہ شیخ کے فراشوں، دربانوں، سائیسوں اور حلال خوروں تک کو بھاری بھاری رشوتیں دے کر ان غریبوں نے اپنا کام بنایا اور جو یہ بھی نہ کر سکے وہ دربانوں کے ڈنڈے کھاتے رہے۔ بہت سے بدنصیب اس ہجوم میں گرمی کی تاب نہ لا کر وہیں جاں بحق ہو گئے۔ اس کی بادشاہ کو بھی خبر ہو چکی تھی۔ لیکن وہ اس صدر عالی قدر کی تعظیم کے منافی کچھ سوچ نہیں سکتا تھا، اس لیے بادشاہ نے اس کے منہ پر کوئی بات نہ کی۔

جس وقت وہ اپنی مسند جاہ وجلال پر متمکن ہوتا تھا اور عالی مرتبہ امیر اہل علم کو ساتھ لے کر سفارش کے لیے اس کے پاس جاتے تھے تو اس کے تیور بس دیکھنے کے لائق ہوتے تھے۔ تعظیم و تکریم کا کیا سوال وہ ہر ایک کو بُرا بھلا کہنے اور ڈانٹنے ڈپٹنے پر اتر آتا تھا اور جب بچارا بڑی عاجزی اور خوشامد کرتا تو ان عالموں کے لیے جو ہدایہ اور دوسری کتب

کتابیں پڑھا سکتے تھے سو بیگھے کے لگ بھگ کی آراضی منظور کرکے باقی زمین کو جس پر وہ ایک مدت سے قابض تھے قلمرد کر دیتا تھا۔ اس کے مقابلہ میں جاہلوں، کمینوں بلکہ غیر مسلمان کو اچھی اچھی زمینیں خود عطا کر دیتا تھا۔ اس طرح اسکے ہاتھوں علم کی بھی اور عالموں کی بھی قدر و قیمت روز بروز گھٹتی چلی گئی۔

اپنے اجلاس پر دو پہر کے بعد جب وہ نہایت غرور و تکبر سے کرسی پر بیٹھا ہوا وضو بنا رہا تھا تو اس کے استعمال کیے ہوئے پانی کے قطرے بڑے بڑے امیروں اور خاص خاص مصاحبوں کے سروں اور کپڑوں پر گر رہے تھے اور اس کو اس کا ذرہ برابر بھی احساس نہیں تھا۔ وہ لوگ بھی اہل علم اور فقراء کا کام نکلنے کے لیے سب کچھ برداشت کر رہے تھے اور خوشامد، چاپلوسی اور اس کی دلجوئی کی خاطر طرح طرح کی ذلتیں اٹھا رہے تھے۔ پورے شاہی عہد میں کسی صدرالصدور کا یہ اثر اور دبدبہ نہیں رہا جتنا کہ شیخ عبدالنبی کو حاصل ہوگیا تھا:

روستائی اگر شود قاضی　　　حلہای کند کہ بکشدش

منصب امامت پر تقرر

انہی دنوں بادشاہ نے مجھے(۹۶) امامت کی خدمت سپرد کی اور کچھ خرچ دے کر فرمایا بیستی عہدہ کے مطابق تم بھی بیس گھوڑوں کو داغ کرالو۔ اسی زمانہ میں شیخ ابوالفضل بھی دربار میں نیا نیا پہنچا تھا اور جیسا کے شبلیؒ نے جنیدؒ کے متعلق کہا تھا کہ "ہم دونوں ایک ہی تنور سے نکلے ہیں" میرا اور ابوالفضل کا معاملہ یکساں ہی تھا، لیکن وہ نہایت ہوشیار اور زمانہ ساز آدمی تھا۔ اس کو بھی جب بادشاہ نے بیستی کے عہدہ کے لیے گھوڑے داغ کرانے کے متعلق فرمایا تو اس نے فوراً ہی داغ اور محلّہ کرا کے اپنی ملازمت مضبوط کرلی اور ترقی کرتے کرتے دو ہزار کے عہدہ اور وزارت کے منصب تک پہنچ گیا۔ اس کے برعکس میں نے ناتجربہ کاری اور سادہ لوحی کی وجہ سے ملازمت کی اس پیشکش کو قبول نہ کیا، اس وقت مجھے مزاحیہ شعر یاد آگیا تھا جو کسی سید نے اپنے بارے میں کہا تھا:

مرا داخلی سازی و نیستی

صیناد مادر باپ نیستی

میں بس اس خام خیالی میں رہا کہ بجائے ملازمت کے مجھے مدد معاش کے لیے اگر بادشاہ کوئی آراضی وغیرہ عنایت فرمادیں تو ایک گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر آزادی کے ساتھ علمی خدمات میں مصروف رہوں گا کیونکہ قناعت اور توکل سے بڑھ کر دنیا میں کوئی اور پونجی نہیں ہو سکتی:

جاہ دنیا مطلب دولت فانی مگذار

جاہ دین بس بود و دولت اسلام ترا

لیکن میری بدنصیبی دیکھو، مجھے وہ بھی میسر نہ ہوا، آخر ماہ شوال 983ھ / 1575ء میں میں نے دربار سے رخصت کی درخواست دے دی۔ بادشاہ نے اسے منظور نہ فرمایا اور مجھے ایک گھوڑا اور ہزار بیگھہ آراضی عطا فرمائی جو اس زمانہ میں بیس گھوڑوں کے مقررہ رتبے کے لیے کافی ہوجاتی تھی۔ اس سلسلہ میں جو فرمان لکھا گیا تھا اس میں یہ عطیہ مدد معاش کے ضمن میں رکھا گیا تھا میں نے بہت کچھ عرض کیا کہ اس مختصر آراضی پر ہمیشہ خدمت سے وابستہ رہنا میرے لیے مشکل ہوگا، لیکن کوئی توجہ نہ کی گئی بادشاہ نے صرف یہ فرمایا، لشکروں میں قیام کے موقع پر امداد اور انعام تمھیں دیا جاتا رہے گا اس مختصر معاش پر بھی شیخ عبدالنبی نے کہا ہم نے تمہارے گروہ کے آدمیوں میں کسی کو اتنی امداد نہیں دی۔ جس امداد اور انعام کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اس وقت تک اس وعدے کو 22 سال ہو چکے ہیں بجز ایک دوبار کے پورا نہیں کیا گیا۔ وہ وعدہ تو بس ایک سراب سے زیادہ نہ تھا جس کے عوض خواہ نخواہ ان بیہودہ بندشوں اور لاحاصل خدمتوں میں پھنس کر رہ گیا۔ اب خدا ہی چاہے تو ان سے نجات ملے:

یا وفا یا خبر وصال تو یا مرگ رقیب

بازی چرخ ازین یک دو سہ کاری بکند

بہر حال جس طرح گزری اور گزر رہی ہے اس پر خدا کا شکر ہی ادا کرنا چاہیے:

بہ ہمہ حال شکر باید کرد

کہ مبادا ازین بتر گردد

جن فضول مشغلوں میں یہ عمر کٹی ان کے حسب حال فضولی بغدادی کا یہ قطعہ ہے جو اس نے حیرتی سمرقندی پر شاہ طہماسپ کے التفات و توجہ کے بارے میں کہا تھا:

من ز خاک عرب و حیرتی از ملک عجم — ہر دو گشتیم با ظہار سخن کام طلب

یافتیم از دو کرم پیشہ مراد دل خویش — او ز شاہ عجم و من نظر از شاہ عرب

شادی کا مسئلہ

اس زمانہ میں اکبر نے علما سے یہ مسئلہ پوچھا تھا کہ کتنی آزاد عورتوں کا نکاح میں رکھنا درست ہے۔ علماء نے کہا چار سے زائد آزاد عورتوں کو بہ یک وقت نکاح میں رکھنا منع ہے۔ اکبر نے کہا "ہم تو جوانی میں اس کے پابند نہیں رہے جتنی عورتوں کو چاہتے تھے نکاح میں لے لیتے تھے خواہ وہ آزاد ہوں یا غلام، اب اس کی تلافی کیسے ہو سکتی ہے؟" اس سلسلہ میں مختلف لوگوں نے مختلف باتیں بتائیں۔ اکبر نے پھر کہا "ہم نے شیخ عبدالنبی سے سنا ہے کہ ایک مجتہد کے نزدیک تو نو عورتوں سے بھی نکاح کیا جا سکتا ہے" علما نے کہا "ہاں: ایک مجتہد ابن لیلیٰ کا یہ رجحان ہے۔ بعض نے تو آیت پاک۔ "فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ و ثلاث و ربع" کے ظاہری مفہوم پر تو اٹھارہ عورتوں تک کو جائز ٹھہر دیا ہے۔ لیکن یہ ساری روایتیں مرجوح ہیں ان پر عمل درست نہیں ہوگا بادشاہ نے شیخ عبدالنبی سے بھی دریافت کرایا، اس نے جواب دیا "میں نے جو کچھ کہا تھا اس سے ان اختلافات کا ظاہر کرنا مقصود تھا، اس کے جواز کا میں نے فتویٰ نہیں دیا تھا"۔ عبدالنبی کا یہ جواب بادشاہ کو بڑا ناگوار گزرا اور اس نے کہا "اس طرح تو شیخ نے ہمارے ساتھ منافقت برتی کہ اس وقت تو کچھ کہا تھا اور اب وہ کچھ اور کہہ رہا ہے۔ بس اسی وقت سے شیخ عبدالنبی کی طرف سے اکبر کا دل کھٹک گیا۔

بادشاہ کے اصرار کو دیکھ کر علماء نے بڑے ردّ و بدل اور اختلافی روایتوں کو جمع کر کے آخر یہ فتویٰ دے دیا کہ "متعہ" کے طریقے پر جتنی عورتیں چاہیں نکاح میں رکھنا حلال ہے۔ یہ امام مالک کے مسلک میں جائز ہے۔ شیعہ تو اس لڑکے کو جو متعہ میں پیدا ہوا ہو دوسرے بچوں سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں، حالانکہ اہل سنت کا یہ رویہ نہیں ہے۔ غرض اس معاملہ میں بڑی بحثیں اٹھیں، ان کا خلاصہ "نجات الرشید" میں بیان کیا گیا ہے۔ نقیب خان نے امام مالک کی "موطا" دکھائی کہ اس میں تو ایک حدیث سے صراحتاً متعہ کی ممانعت نکلتی ہے۔

ایک رات "انوپ تلاؤ" کے حجرہ میں بادشاہ کے پاس قاضی یعقوب، شیخ ابو الفضل، حاجی ابراہیم اور ایک دو اور عالم بیٹھے ہوئے تھے، اس وقت شیخ ابو الفضل نے علما کی مخالفت کرتے ہوئے ان روایتوں کو جو اس کے والد نے جمع کر کے دی تھیں بیان کیا۔ بادشاہ نے مجھے بھی وہاں بلا کر پوچھا، تم کیا کہتے ہو؟ میں نے عرض کیا" ان تمام مختلف روایتوں اور طرح طرح کے مسلکوں کا جھگڑا بس ایک بات پر ختم ہو جاتا ہے۔ متعہ امام مالک اور شیعہ علماء کے نزدیک بالاتفاق مباح ہے اور امام شافعی اور امام اعظمؒ کے نزدیک حرام ہے اور جب مالکی مذہب کا قاضی اس کا حکم باضابطہ صادر کر دے تو اسی وقت امام اعظم کے مذہب میں بھی بلا اتفاق حلال ہو جاتا ہے بس یہی ایک کاٹنے کی بات ہے، اس کے علاوہ قیل و قال اور جنگ و جدال کے سوا کچھ نہیں"۔ بادشاہ کو میری یہ بات بہت پسند آئی۔ قاضی یعقوب نے اس وقت مجھ سے بحث کی۔ میں نے ان سے جواب دیا کہ "جو مسئلہ مختلف فیہ ہو وہ قاضی کے حکم کے بعد متفقہ ہو جاتا ہے"۔ اپنے اس دعویٰ پر امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے مسئلہ کو اور دوسری مثالوں کو میں نے بطور دلیل پیش کیا، نیز میں نے شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی کا قصہ بھی بیان کیا کہ جب وہ شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں بغداد پہنچے، تو انھوں نے شافعی مذہب کے طریقہ پر سورۂ فاتحہ پڑھی تھی۔ ان کے اس عمل پر علما نے بڑے طعنے دیے تھے لیکن دہلی کے قاضیوں نے نہ صرف اس کے جواز بلکہ مستحسن ہونے تک کا فتویٰ دے دیا تھا۔ جب میں نے یہ باتیں نہایت وضاحت کے ساتھ کہیں تو قاضی یعقوب کو قائل ہونا پڑا اور اس نے عاجز ہو کر کہا" میں کیا کہوں متعہ

کا مباح ہونا مبارک ہو"۔ بادشاہ نے فرمایا" اس مسئلہ میں ہم قاضی حسین عرب مالکی کو قاضی بناتے ہیں اور قاضی یعقوب کو آج سے معزول کرتے ہیں"۔ اسی وقت قاضی حسین کو وکیل بنایا گیا اور اس نے اپنے مذہب کے موافق متعہ کے جواز کا حکم دے دیا۔ تمام بوڑھے عالموں میں صدر سے لے کر مخدوم الملک اور قاضی وغیرہ تک کے لیے یہ ایک عجیب صورت حال پیدا ہوگئی، اور اسی روز سے ان سب کا زوال شروع ہوگیا۔

اس واقعہ کے چند دن بعد اکبر نے مولانا جلال الدین ملتانی کو جو بہت بڑے عالم تھے ان کی معاش روک دی گئی تھی، آگرہ سے بلا کر سارے ملک کا قاضی بنا دیا اور قاضی یعقوب کو گوڑ (بنگال) کی قضاوت پر بھیج دیا۔ اسی دن اختلافات کا دروازہ کھل گیا، یہاں تک کہ دین میں اجتہاد کی نوبت آگئی۔

جزیہ اور اللہ اکبر

اسی سال شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک کو بادشاہ نے حکم دیا کہ وہ پوری طرح تحقیق کر کے ہندوؤں پر جزیہ[47] لگائیں۔ اس سلسلہ میں سب جگہ فرامین بھی جاری کردیے گئے لیکن جلد ہی یہ حکم اٹھا لیا گیا اسی زمانہ میں بادشاہ نے دریافت کیا کہ اگر ہم اپنے سکہ اور مہر میں "اللہ اکبر" درج کروائیں تو کوئی حرج تو نہیں؟ اکثر نے تو جواب دیا کہ یہ بہت بہتر اور اچھا ہے لیکن حاجی ابراہیم نے مخالفت کی کہ اس سے تو کچھ اور باتوں کا احتمال ہوتا ہے اگر آیت ولذکر اللہ اکبر کو نقش کرالیا جائے تو یہ احتمال رفع ہو جائے گا۔ اکبر کو اس کی یہ بات پسند نہ آئی اور کہا" یہ تو قطعی بات ہے کہ بندہ سے اس عاجزی کے باوجود خدائی کا دعویٰ سرزد نہیں ہوسکتا، ہمارا مقصد تو صرف لفظی مناسبت ہے اس بات کو دوسری طرف لے جانے کا آخر کیا مطلب ہے؟"

اسی سال بادشاہ نے مسئلہ متعہ کی تحقیق سے پہلے ہی سید محمد میر عدل کو جس کا بادشاہ بڑا لحاظ کیا کرتے تھے۔ بھکر کی طرف نامزد کردیا تھا۔ ان کو شمشیر خاصہ، گھوڑا اور پوشاک عطا کی گئی۔ ان کا وہاں جانے کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کے بعد" میر عدلی" کے اہم

منصب پر ان جیسا کوئی نامور شخص نہیں ہو سکا۔ کہتے ہیں ایک دن حاجی ابراہیم سرہندی نے سرخ اور زعفرانی لباس کے جواز کا فتویٰ دے دیا تھا اور ایک حدیث بھی پیش کی۔ میر عدل مرحوم نے بھرے دربار میں اسے بدبخت اور ملعون کہا اور گالیاں دیتے ہوئے اس کو مارنے کے لیے ڈنڈا اٹھا لیا۔ وہ بڑی مشکل سے جان بچا سکا۔

حکیم ابو الفتح گیلانی اور ملّا محمد یزدی

اسی سال حکیم ابو الفتح گیلانی اور حکیم ہمایوں جس کا نام بدل کر پہلے ہمایوں قلی پھر حکیم ہمام رکھا گیا تھا اور نورالدین قراری، تینوں بھائی گیلان سے دربار میں حاضر ہوئے۔ بڑے بھائی نے آتے ہی ہاتھ پیر نکالے اور خوشامد اور جی حضوری کر کے وہ بادشاہ کے مزاج پر حاوی ہو گیا۔ دین و مذہب میں اختراعات کر کے بہت جلد اس نے بڑا تقرب حاصل کر لیا۔

کچھ عرصہ بعد ملا محمد یزدی جسے عام طور پر ''یزیدی'' کہا جاتا تھا، ایران سے آیا اور گیلان کے ان بھائیوں کے ساتھ مل کر بادشاہ کو شیعیت کی طرف مائل کرنے لگا، چنانچہ وہ صحابہ پر تبرے کی طرح زبان دراز کرتا تھا اور بادشاہ سے مہمل اور جھوٹے قصے بیان کرتا رہتا تھا۔

پیر بر حرام زادہ، شیخ ابو الفضل اور حکیم ابو الفتح تو اس یزیدی سے بھی آگے بڑھ گئے۔ انھوں نے بادشاہ کو سرے سے دین ہی سے منحرف کر دیا اور وحی، نبوت، معجزہ، کرامت اور شریعت کے مطلق انکار پر لے آئے۔ میں ان لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکا ان بدبختوں کا جو انجام ہونا چاہیے تھا وہی ہوا۔

بے دینی کے یہ سارے اسباب جب جمع ہو گئے تو اکبر نماز، روزہ اور دوسرے مسائل سے منحرف ہو گیا اور ان کا نام اس نے ''تقلیدیات'' رکھ دیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ ساری باتیں غیر معقول ہیں۔ پھر ''نقل'' کے بجائے ''عقل'' پر دین کو منحصر سمجھ لیا گیا۔ اسی زمانہ میں فرنگیوں(49) کی آمد و رفت بھی ہونے لگی اور بادشاہ نے ان کے بعض عقلی اعتقادات کو بھی قبول کر لیا:

ہر خیالی کہ عقل شان بندد
چرخ بر عقل اہل آن خندد

شیخ بدرالدین کی عظمت

اسی سال شیخ الاسلام چشتی کے صاحبزادہ شیخ بدرالدین نے جو صاحب سجادہ تھے، شاہی ملازمت سے توبہ کی اور اپنے باپ کی طرح گوشہ نشین ہو کر عبادت و ریاضت، ذکر و فکر اور تلاوت و تلقین کا مشغلہ اختیار کر لیا۔ ایک رات بادشاہ نے ان کو عبادت خانے میں بلایا وہ آئے تو پہلے کی طرح آداب بجا نہ لائے بادشاہ کو بڑا ناگوار گزرا اور اس نے نشست و برخاست کے انداز اور گفتگو سے ان کو بڑی اذیت پہنچائی۔ کچھ تو یہ قصہ اور کچھ اور اسباب ایسے ہوئے کہ وہ تین چار سال بعد ہی غیرت کے مارے بلا اطلاع اجمیر اور وہاں سے گجرات چلے گئے، پھر تنہا ایک کشتی میں بیٹھ کر حج کے لیے روانہ ہو گئے۔ بیت اللہ میں وہ اکثر وصال روزہ رکھا کرتے تھے اور تپتی دھوپ میں ننگے پیر طواف کرتے رہتے تھے اسی حال میں وہ اپنے رب سے جا ملے:

کمال از کعبہ رفتی بر در یار
ہزاران آفرین مردانہ رفتی

چوتھے وید کا ترجمہ

اسی سال شیخ بھاون جو دکن کا ایک عقلمند برہمن تھا دربار میں پہنچا اور اپنی مرضی سے مسلمان ہو کر بادشاہ کے مصاحبوں میں شامل ہو گیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ "بید اتھربن" کا جو ہندوؤں کا چوتھا مشہور وید ہے اور اس کے بعض احکام اسلام کے مطابق ہیں، ترجمہ کیا جائے۔ ہندی سے فارسی میں ترجمہ کے لیے مجھے نامزد کیا گیا۔ اس کتاب کی بعض عبارتیں نہایت پیچیدہ تھیں اور جو پنڈت مقرر تھا وہ اس کی صحیح تعبیر نہیں کر پاتا تھا، اس لیے اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ میں نے جب مشکل بادشاہ کے سامنے پیش کی تو بادشاہ نے یہ

کام پہلے تو شیخ فیضی کے اور بعد میں حاجی ابراہیم سرہندی کے سپرد کر دیا۔ وہ بھی خاطر خواہ اس کا ترجمہ نہ کر سکا۔ اس بید کے احکام میں ایک حکم یہ ہے کہ جب تک کہ ایسی عبارت جس میں "لام" بہت آتے ہیں جیسے کلمہ طیبہ "لا الہ الا اللہ" نہ پڑھی جائے کیوں کہ نجات نہیں ہوگی۔ ایک اور حکم ہے چند شرائط پر گائے کا گوشت کھانا مباح ہے، دوسرے یہ کہ میت کو دفن کیا جائے۔ جلایا نہ جائے۔ اسی بید کے احکام کو پیش کر کے شیخ بھاون نے ہندوستان کے اکثر برہمنوں کو بحث میں لاجواب کر دیا اور اس کی وجہ سے اس نے اسلام بھی قبول کر لیا تھا۔

گلبدن بیگم کی حج پر روانگی

اسی سال ماہ شعبان میں بابر بادشاہ کی صاحبزادی گلبدن بیگم جو بادشاہ کی پھوپھی ہوتی ہیں، نورالدین محمد مرزا کی بیٹی سلیمہ سلطان بیگم کے ساتھ جو پہلے بیرم خان خانخاناں کے عقد میں تھیں، بعد بادشاہ کے نکاح میں آگئی تھیں، حج کے لیے روانہ ہوئیں انھیں ایک سال تک گجرات میں ٹھہرنا پڑا۔ پھر انھوں نے حجاز پہنچ کر چار حج کیے۔ واپسی کے وقت ان کا جہاز ٹوٹ گیا اس لیے عدن میں ایک سال تک قیام کرنا پڑا۔ یہ دونوں ہندوستان کو 990ھ/ 1582ء میں لوٹ کر آئیں۔ اس وقت سے پانچ چھ سال تک بادشاہ کا یہ معمول رہا کہ وہ دربار کے کسی امیر کو "امیر الحاج" بنا کر لوگوں کو حج پر جانے کی عام اجازت دیتے تھے اور حاجیوں کو سفر کے خرچ، نقد روپیہ اور بھاری تحائف دے کر مکہ معظمہ روانہ کیا کرتے تھے۔ بعد میں یہ طریقہ برخواست کر دیا گیا۔

مرزا سلیمان کی ہندوستان میں آمد

مرزا سلیمان بابر کے زمانہ سے بدخشان کا مستقل حاکم تھا۔ اس نے اپنے دور حکمرانی میں بڑے بڑے انقلابات کا سامنا کیا، آخر میں جب اس کا مقابلہ پیر محمد خاں اوزبک اور اس کی بیوی ولی نعمت بیگم کی فوجوں سے ہوا تو اس کا لڑکا ابراہیم مرزا مارا گیا اور مرزا سلیمان

سخت مشکلات میں پھنس گیا۔ اسی اثنا میں ابراہیم مرزا کا لڑکا شاہرخ مرزا باغی بن بیٹھا اور اس نے سارے بدخشان پر قبضہ کرلیا۔ مرزا سلیمان کے لیے بدخشان میں ٹھہرنا ممکن نہ رہا۔ چنانچہ وہ وہاں سے نکل کر پہلے تو کابل میں مرزا محمد حکیم کے پاس مدد لینے آیا، لیکن جب دیکھا کہ مرزا حکیم مدد دینے پر راضی نہیں تو اس نے درخواست کی کہ اس کے ہمراہ ایک رہنما فوج کردی جائے تاکہ وہ اسے نیلاب (اٹک) کے کنارے تک خطرناک مقامات سے بہ حفاظت پہنچادے۔ مرزا نے بڑے ناز نخروں کے بعد اس کے ساتھ ایسے آدمیوں کو کردیا جو پہلی ہی منزل پر اسے تنہا چھوڑ کر کابل کو بھاگ گئے۔

مرزا سلیمان تن تنہا بے سرو سامان اپنی ایک لڑکی کو لیے ہوئے ہندوستان کے راستہ پر سفر کرتا رہا۔ بعض مقامات پر پٹھانوں نے اس کا راستہ بھی روکا، مرزا سلیمان بہادری کے ساتھ لڑتا بھڑتا ان سے بچ کر نکل آیا۔ اسی مقابلہ میں اسے ایک تیر کا زخم بھی لگا غرض وہ نہایت پریشانی کی حالت میں نیلاب (اٹک) کے کنارے پر پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے اپنے دو تین ذاتی گھوڑے عرضی کے ساتھ اکبر کے دربار میں روانہ کیے۔ بادشاہ نے آغا خاں خزانچی کے ذریعہ پچاس ہزار روپیہ، قیمتی تحفے اور چند عراقی گھوڑے مرزا کے استقبال کے لیے روانہ فرمائے۔ اس سے پہلے ہی راجہ بھگوان داس حاکم لاہور حسب فرمان پیشوائی کے لیے پہنچ چکا تھا اور ہر روز شاہی مہمانوں کی ضیافت و خاطر داری کررہا تھا، راستہ میں بھی جتنے حکام اور امراء تھے وہ بھی مہمانداری کے فرائض انجام دیتے رہے تھے، غرض مرزا سلیمان کو پورے، اعزاز واحترام کے ساتھ دار الخلافہ لایا گیا۔

اسی دوران اکبر نے گجرات سے خان اعظم کو بھی بلالیا اس جشن میں شرکت کے لیے وہ نہایت تیزی سے حملہ کرتے ہوئے، 4 رجب 983ھ کو فتح سے باریاب ہوا۔ ایک دن خان اعظم نے موقع پاکر داغ کے قانون اور کروڑیوں کے مظالم، فوج کے مالی معاملات، رعایا کی عام بدحالی اور بادشاہ کی بدعتوں کے متعلق کھری کھری باتیں سنائیں اور ان امور کے متعلق بڑی جرات کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اکبر کو اس کی باتیں بڑی تلخ معلوم ہوئیں اور وہ اس سے ناراض ہوگیا۔ اپنی عادت کے مطابق وہ اس حق بات کو

برداشت نہ کر سکا اور اسے حکماً کورنش سے روک دیا اور اس پر بادشاہی محافظ بھی مقرر کر دیے نیز دوسرے امیر بھی اس سے ملنے نہ پائیں۔ چند دن بعد اکبر نے خان اعظم کو آگرہ بھیج دیا، وہاں اسے اس کے باغ میں نظر بند کر دیا گیا۔

مرزا سلیمان کا شاہانہ استقبال

مرزا سلیمان جب متواتر کوچ کرتے ہوئے لاہور سے متھرا پہنچا تو بڑے بڑے امراء اور قاضی نظام بدخشی جس کو مرزا سلیمان نے قاضی کا خطاب دیا تھا اور اکبر کے دربار سے اسے غازی کا خطاب عطا ہوا تھا، استقبال کے لیے لے گئے۔ مرزا سلیمان اسی سال 15 رجب کو فتح پور کے قریب پہنچا۔ اس کی پیشوائی کے لیے دربار کے مصاحبین اور معزز افراد بھیجے گئے پھر خود بادشاہ تمام امرا کے ساتھ پانچ کوس تک اس کو لانے کے لیے تشریف لے گئے۔

مرزا سلیمان کا استقبال بڑی دھوم دھام کے ساتھ کیا گیا چنانچہ اس دن راستہ کے دونوں طرف پانچ ہزار ہاتھی کھڑے تھے جن میں سے بعض پر تو فرنگی مخمل کی اور بعض پر رومی زربفت کی جھولیں پڑی ہوئی تھیں اور وہ سونے اور چاندی کی زنجیروں سے آراستہ تھے۔ ان کے سروں پر اور ان کی گردنوں میں سیاہ اور سفید جھالریں لٹک رہی تھیں، ہاتھیوں کے ساتھ ساتھ سنہری زین والے عربی گھوڑے بھی صف بستہ تھے۔ ان گاڑیوں کے جو بیل تھے ان میں سے ہر ایک کے سر پر زردوزی کے تاج رکھے ہوئے تھے۔ اس ساز و سامان کی سنہری روپہلی جھلمل سے جنگل میں بس آگ لگ گئی اور دشت وکہسار لالہ زار بن گئے۔ جب مرزا سلیمان کی نظر دور سے بادشاہ کی سواری پر پڑی تو وہ بے تکلف ہو کر گھوڑے سے اتر کر دوڑنے لگا اور قریب پہنچ کر تسلیمات بجا لایا۔ شہنشاہ بھی ادباً گھوڑے سے اتر آئے اور اسے ان رسمی تکلفات۔ کو ادا کرنے سے روک دیا، تپاک سے بغل گیر ہو گئے۔ ملاقات کے بعد دونوں سوار ہو کر باتیں کرتے ہوئے چلے۔ مرزا سلیمان کی مہمانی کا انتظام انوپ تلاؤ کے دولت کدہ میں کیا گیا تھا۔ اس وقت انوپ تلاؤ کے در و دیوار اور

صحن کو منقش اور زریں سائبانوں سے سجایا گیا تھا۔ زرکار فرش بچھا ہوا تھا اور ہر قسم کا شاہانہ ساز و سامان سلیقہ سے جمایا گیا تھا۔ تخت سلطنت پر اکبر نے مرزا سلیمان کو اپنے پاس بیٹھا لیا اور شاہزادہ کو بلا کر مرزا سے ملایا۔ کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد بادشاہ نے بدخشاں کی تسخیر کے لیے روپیہ اور فوج سے مدد دینے کا وعدہ کیا مرزا نے ٹھہرنے کے لیے ہتیاپول کے برج میں جہاں نقار خانہ تھا ایک مکان کا انتظام کرا دیا تھا۔

فاتحہ خوانی کی بحث

مرزا سلیمان کبھی کبھی راتوں میں عبادت خانہ میں آتا تھا اور علما و مشائخین کی محفل میں بیٹھا کرتا تھا۔ اس پر وجد و حال طاری رہتا تھا اور بڑی اونچی باتیں کیا کرتا تھا۔ کبھی اس کی نماز باجماعت فوت نہیں ہوتی تھی۔ ایک دن میں نے نماز کی امامت کے بعد صرف دعا پڑھی، میرزا نے اعتراض کیا کہ تم نے فاتحہ کیوں نہیں پڑھی؟ میں نے کہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نماز کے بعد فاتحہ پڑھنے کا طریقہ نہیں تھا۔ بعض روایات میں تو اس کو مکروہ بھی کہا گیا ہے۔ اس نے کہا: ولایت (ایران) میں علم نہیں ہے علماء نہیں ہیں، وہاں تو فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔ میں نے کہا، ہمارا تعلق تو اللہ کی کتاب سے ہے، تقلید سے ہم کو کیا سروکار، بادشاہ نے فرمایا "بحث چھوڑو آئندہ پڑھ لیا کرو"۔ میں نے بادشاہ کے ارشاد کو قبول کرلیا، لیکن میں نے فاتحہ پڑھنے کے مکروہ ہونے کے بارے میں جو روایت تھی وہ ان کے سامنے بیان ضرور کردی۔

تورۂ چنگائی

انہی دنوں اکبر نے تورۂ "چنگائی" کی قدیم رسم کو جو متروک ہو چکی تھی۔ محض مرزا سلیمان کو دکھانے کے لیے دوبارہ رواج دیا۔ دیوان خانہ میں ایک بڑا دستر خوان بچھایا جاتا تھا اور لشکریوں کو رسماً اس دستر خوان پر کھانے کے لیے بلایا جاتا تھا۔ جب مرزا چلا گیا تو یہ رسم بھی بند ہوگئی۔ اکبر نے مرزا سلیمان کی مدد کے لیے حاکم پنجاب خان جہان کو فرمان لکھ دیا

کہ وہ پانچ ہزار مسلح سوار لے کر میرزا کے ساتھ بدخشاں کو جائے اور میرزا شاہرخ سے بدخشاں چھین کر میرزا سلیمان کے سپرد کر دے پھر لاہور لوٹ آئے، لیکن تقدیر میں کچھ اور ہی لکھا تھا، چنانچہ معاملات نے ایک دوسری ہی صورت اختیار کر لی۔

منعم خان خانخاناں کی وفات

منعم خان خان خانان بنگال پر مقرر تھا۔ جب داؤد سے صلح ہو گئی تو وہ ٹانڈہ سے جہاں کی آب و ہوا معتدل تھی کوچ کر کے لشکر کو گنگا کے اس پار گوڑ کے علاقہ میں لے گیا۔ گوڑ پہلے بنگالہ کا دارالسلطنت تھا، وہاں کی آب و ہوا نہایت خراب اور متعفن تھی۔ منعم خاں نے وہاں پہنچ کر شہر کی تعمیر کا حکم دیا۔ امرا نے اس کو اس ارادہ سے روکنا بھی چاہا لیکن موت ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر یہاں تک لے آئی تھی اس لیے وہ باز نہ آیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کی خراب آب و ہوا سے لشکر میں طرح طرح کی بیماریاں جن کا نام بھی کسی نے نہ سنا تھا پھیل گئیں۔ روزانہ بے شمار آدمی ان بیماریوں کا شکار ہو کر مرنے لگے۔ اس علاقہ میں ہزار ہا آدمی مقرر تھے ان میں سے بہ مشکل چند سو اپنے اپنے وطن کو لوٹ کر آ سکے باقی سب وہیں پیوند خاک ہو گئے۔

کثرت اموات کا یہ حال تھا کہ مردوں کو دفن کرنا ممکن نہ رہا تھا۔ مجبوراً ان کو پانی میں بہا دیا جاتا تھا اور ہر گھڑی کسی نہ کسی امیر کے فوت ہو جانے کی خبر خان خانان کو مل رہی تھی، لیکن نہ معلوم اس کے کانوں میں کس غفلت کی روئی بھری تھی کہ وہ اپنی ہٹ دھری سے باز نہ آیا اور اس کی نازک مزاجی سے ڈر کر امرا کو بھی ہمت نہ ہوتی تھی کہ وہ اس سے سختی کے ساتھ واپسی کا مطالبہ کریں۔ آخر موت نے آ کر اسے چونکا یا لیکن اب مہلت کہاں رہی تھی؟ خانخاناں بھی ان وباؤں کا شکار ہو کر بستر مرگ پر اس طرح گرا کہ پھر اسے اٹھنا نصیب نہ ہوا۔ اس کا انتقال 10 رجب 983ھ/1555ء میں ہوا۔

خان خانان نے اپنے پیچھے کوئی وارث نہ چھوڑا تھا اس لیے اس کا برسوں سے جمع کیا ہوا مال و متاع اور سرمایہ بحق سرکار ضبط کر لیا گیا:

چہ خوش گفت این نکتہ را نکتہ سنج
کہ زر زر کشد عاقبت گنج گنج

اس کے مرنے پر بنگال میں حقیقۃ امرا نے شاہم خاں جلائر کو اپنا سردار بنا لیا۔ جب خان خاناں کی موت کی خبر پہنچی تو دربار سے خان جہاں کو خانخاناں کا قائم مقام بنایا گیا۔ بادشاہ نے اسے زردوزی کی قبا اور چار سنہری تھال، مرصع شمشیر، سنہری زین والا گھوڑا عطا فرما کر بنگالہ کی حکومت پر مقرر کر دیا۔

خان خاناں کی وفات سے جو نئی صورت حال پیدا ہوگئی اسکے سبب میرزا سلیمان کی مدد کا ارادہ پیدا ہوا اور اکبر نے یا تو خود سلیمان کی درخواست پر یا سیاسی مصالحت کی بنا پر مرزا کو سمندر کے راستہ جہاز روانہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے سرکار کے خزانہ سے پچاس ہزار روپیہ اور گجرات کے خالصہ سے مزید بیس ہزار روپیہ دلوا کر قلیچ خان کے آذوقہ میں حج کے لیے رخصت کر دیا کہ وہ اسے سورت کی بندرگاہ سے جہاز پر چڑھا کر لوٹ آئے۔ مرزا سلیمان نے اسی سال حج کی سعادت حاصل کی، پھر وہ وہاں سے عراق کے راستہ واپس ہوا اور دوبارہ بدخشاں کی حکومت حاصل کر لی:

تو راہ نرفتہ ازاں نمودند   ورنہ کہ زداین در کہ برو نکشودند

مرزا سلیمان نے ہندوستان سے لوٹتے وقت اپنی لڑکی کا نکاح قندھار کے حاکم مظفر حسین مرزا سے جو اسی زمانہ میں لاہور آیا ہوا تھا، کر دیا۔ دوسری لڑکی کو کسی اور شخص سے بیاہ دیا تھا۔

حسین خاں کا پہاڑی علاقہ پر حملہ

حسین خان مرحوم جس سے میرے قدیم مراسم بلکہ دلی لگاؤ تھا۔ داغ محلہ کے قانون سے سخت عاجز ہوگیا تھا اس سلسلہ میں اسے بڑی پریشانیاں لاحق رہیں۔ جب وہ بہت تنگ آگیا تو اس نے اپنے خاص ساتھیوں کی جمعیت لے کر کانت وگولہ سے کوچ کیا اور بداؤں اور سنبھل سے گزر کر گنگا کا عبور کیا اور دو آبہ پہنچ گیا۔ اس علاقے کے باغی زمیندار عرصے

سے مالگزاری ادا نہیں کر رہے تھے کروڑی بے چارہ کا کیا ذکر؟ وہ سرکاری مطالبوں پر جاگیردار تک کو جواب نہیں دیتے تھے۔ حسین خان نے ان کی بغاوت کو کچلنے کے لیے ہی یہ فوجی حملہ کیا تھا۔ چنانچہ وہ ان باغیوں کے خلاف فوجی کارروائی کرتے ہوئے شمالی پہاڑی کے دامن تک پہنچ گیا۔

حسین خان پر ایک مدت سے اس پہاڑی کو فتح کرنے کی دھن سوار تھی۔ اس کے تصور میں ہمیشہ یہاں کے بت خانوں میں سونے چاندی کی اینٹیں ہی جمی رہتی تھیں۔ چنانچہ اس مرتبہ بھی اس مفروضہ دولت کی لالچ میں کسی بھاری لشکر کو لیے بغیر ہی اس نے بسنت پور کا محاصرہ کر لیا۔ بسنت پور پہاڑی میں نہایت دشوار گزار بلندی پر واقع ہے۔ اسے اس مہم میں مصروف دیکھ کر کروڑیوں کو اس سے نپٹنے کا موقع مل گیا چنانچہ تھانیسر کے کروڑی ملک الشرق گجراتی اور دوسرے کروڑی اپنے اپنے قلعوں کے دروازے بند کر کے بیٹھ گئے اور حسین خاں کے متعلق یہ جھوٹی خبر اڑا دی کہ وہ باغی ہو چکا ہے۔ دربار شاہی میں بھی عریضے بھیج کر اس کی اطلاع کرا دی۔

سعید خاں مغل کی حسین خاں کے ساتھ بڑی گہری اور دیرینہ دوستی تھی، وہ انھی دنوں ملتان سے دربار میں آیا ہوا تھا۔ بادشاہ نے اس سے حسین خاں کے حالات اور اس کی بغاوت کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے اس کی تردید کر دی۔ بادشاہ نے اس سے رعایا کی تلف شدہ مویشیوں اور مالی نقصانات کے سلسلہ میں حسین خاں کی طرف سے ضمانتی تحریر بھی مانگی تھی اور اس نے حسین خاں کی طرف سے ضمانت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ (۱) انکار کی وجہ سے ان کی آپس میں جو دوستی تھی وہ جاتی رہی:

این دغل دوستان کہ می بینی مگسانند گرد شیرینی
پیش تو از موافق تر اند در عقب از سایہ سابق تر اند

حسین خاں کو قابو میں لانے کے لیے بادشاہ نے سید ہاشم ولد محمود بارہہ اور میر سید محمد عدل کے لڑکوں کو امرا کی ایک جمعیت کے ساتھ لکھنؤ کی جانب رخصت کیا اور روانگی سے پہلے ہی حسین خاں کے لڑکے کو ان کی نگرانی میں دیا۔

حسین خاں کا انتقال

حسین خاں بسنت پور کی پہاڑی میں لڑتے ہوئے زخمی ہو گیا۔ ایک گولی اس کے شانہ کو توڑتی ہوئی نکل گئی اور اس مہم میں اس کے بہت سے تجربہ کار آدمی بھی ضائع ہوئے۔ جب وہ ہر طرف سے مجبور ہو گیا تو ناکام اور نامراد پہاڑی علاقہ سے لوٹ آیا اور کشتی میں سوار ہو کر دریائے گنگا کے راستہ پٹیالی کی طرف جہاں اس کے اہل وعیال مقیم تھے روانہ ہوا، لیکن جب گڑھ مکتیشور پہنچا تو سرکاری آدمیوں نے اس زخمی حالت میں اسے گرفتار کرلیا اور آگرہ لے جا کر حسب الحکم صادق محمد خاں کی حویلی میں نظر بند کر دیا۔ صادق محمد خاں سے ہندوستان کی فتح بلکہ قندھار کے زمانے سے ہی دینی تعصب کے سبب اس کی ان بن رہتی تھی اور آج اسی کے گھر رہنے کی ذلت اسے برداشت کرنی پڑی۔ بادشاہ کے حکم سے شیخ بینا طبیب اس کے علاج کے لیے فتح پور سے آگرہ آیا، اس نے معائنہ کرنے کے بعد اطلاع دی کہ حسین خان کا زخم نہایت خطرناک ہے۔ بادشاہ نے معالجہ کے لیے حکیم عین الملک کو جانے کا حکم دیا۔ قدیم روابط کی بنا پر میں بھی حضور سے اجازت لے کر عین الملک کے ساتھ گیا۔ عرصہ بعد اس سے میری ملاقات ہوئی اور دو بچھڑے ہوئے دوست گزرے ہوئے زمانہ کی یادوں کو سنبھالے نہایت رقت وحسرت کے ساتھ ایک دوسرے سے ملے:

هر جا من و معشوق بهم باز رسیدیم — از بیم بداندیش لب خویش گزیدیم
بی واسطۂ گوش و لب از راه دل و چشم — بسیار سخن بود که گفتیم و شنیدیم

ابھی میں اسے اور وہ مجھے دیکھ ہی رہے تھے کہ بادشاہی جراح آگئے اور انھوں نے ایک بالشت لمبا نشتر زخم میں ڈال کر اسے چیر دیا۔ مجھے دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس بہادر نے اس نشتر زنی پر اُف نہ کی، نہ اس کی پیشانی پر کوئی بل آیا بلکہ وہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ مسکراتا ہی رہا۔ وہ منظر قیامت کے نظارے سے کچھ کم نہ تھا۔ جب میں اس سے مل کر رخصت ہوا تو مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ ہماری بس آخری ملاقات ہے۔ چنانچہ فتح پور پہنچنے کے تین چار دن بعد اطلاع ملی کہ حسین خاں سخت اسہال میں مبتلا ہے۔ اسی عارضہ میں آخر

کار وہ تکمیل کر مر گیا۔ بلاشبہ وہ شہید تھا کیوں کہ کافروں کے لگائے ہوئے زخم ہی کے باعث وہ فوت ہوا:

نیامد کسی در جہان کو بماند
مگر آن کزو نام نیکو بماند

حسین خاں نہایت فیاض تھا۔ مستحقوں اور محتاجوں کے لیے مٹھی بھر بھر کر روپیہ صرف کرتا تھا۔ اس کی یہ سخاوت اور دردمندی آخر اس کے کام آئی اور اس کا کفن دفن خواجہ محمد یحییٰ نقشبندی جیسے پایہ کے بزرگ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ وہاں سے اس کی میت کو پٹیالی کے گورستان میں جو اس کا خاندانی مقبرہ تھا، لے جا کر سپرد خاک کیا گیا۔

جس وقت میں بھکر کے سفر میں میر عدل مرحوم کے ساتھ جا رہا تھا تو میں نے اس تونگر دل درویش کی وفات کی داستان میر عدل کو سنائی۔ وہ اس خبر کو سن کر زار زار رونے لگا اور اس کی پاک دلی، دلیری اور چستی کی بڑی تعریف کرتے رہے اور فرمایا جو شخص دنیا سے بے نیاز رہنا چاہے تو اسے اسی طرح زندگی گزار کر دنیا سے رخصت ہونا چاہیے جیسا کہ حسین خان نے کیا اور جس طرح وہ دنیا سے رخصت ہوا اتفاق دیکھو کہ میر عدل سے میری یہ ملاقات بھی بس آخری ہی تھی۔ انھوں نے بھی اس موقع پر خود فرمایا تھا کہ "ہمارے سارے دوست رخصت ہو چکے ہیں۔ معلوم نہیں اب تم سے بھی دوبارہ ملنا نصیب ہوتا ہے یا نہیں"۔ ان کی بات سچ نکلی اور وہ بھی جلدی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

حسین خان کے اوصاف

میں تقریباً نو سال تک اس پیارے دوست حسین خان کی خدمت میں رہا، سپاہ گری اور دنیا داری کی ظاہری وضع کے باوجود میں نے جو وصف اس میں پائے اس زمانہ کے بیشتر پیشواؤں اور مرشدوں میں ان کا عشر عشیر بھی دکھائی نہیں دیتا، وہ نہایت درست عقیدہ کا سنی تھا، ہمت اور شجاعت میں بھی اس کی کوئی مثال نہیں تھی۔ منکسر مزاج ایسا کہ چھوٹے بڑے ہر ایک کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتا تھا۔ دنیا سے بے نیازی میں اس جیسا کسی کو نہ پایا۔

لوگوں کی خدمت میں ہر دم کوشاں رہتا تھا، توکل اور زہد میں اس کے پایہ کا کوئی دوسرا نہیں تھا، اگر وہ اس زمانہ میں ہوتا تو دین اور مذہب کی یہ بے قدری دیکھنی نہ پڑتی جیسی دیکھنے پر زمانہ نے مجبور کر دیا ہے۔

سادگی اور انکساری

جس زمانہ میں وہ لاہور کی حکومت پر فائز تھا، میں نے معتبر آدمیوں کی زبانی سنا کہ اس کی غذا حضور اکرم کی متابعت میں صرف جو کی روٹی تھی۔ اس زمانہ میں اس نے وہاں کی ہزار ہا پرانی مسجدوں اور مقبروں کی مرمت اور تعمیر کرائی تھی۔ ایک مرتبہ کوئی ہندو مسلمانوں کے بھیس میں اس کی مجلس میں آکر بیٹھ گیا وہ اسے مسلمان سمجھ کر بڑی تواضع اور انکساری کے ساتھ ملاقات کے لیے کھڑا ہو گیا۔ جب اسے حقیقت حال کا علم ہوا تو بڑی شرمندگی ہوئی اور اس نے عام حکم دے دیا کہ آج سے تمام ہندو اپنی آستینوں کے کنارے پر کسی نہ کسی رنگ کی پٹی سی لیا کریں تاکہ ہندو مسلمان میں تمیز ہو سکے۔ اسی حکم کی وجہ سے لوگوں میں اس کا نام "تکریہ" پڑ گیا۔ تکری پیوند کو کہتے ہیں جیسے عربی میں غیار، بروزن دیار، کہا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد اس نے یہ حکم بھی کیا تھا کہ حکم شرعی کے مطابق غیر مسلمان زین کی سواری نہ کریں بلکہ جانوروں پر پالان باندھا کریں۔

اس کی ہمراہی میں ہمیشہ سید اور اہل علم رہا کرتے تھے، ان کا ادب و لحاظ اس کو اس قدر تھا کہ محض اسی خیال سے کوئی بے ادبی نہ ہو جائے، سفر میں وہ کبھی سواری کی حالت میں نہیں سویا۔ تہجد کی نماز اس کی کبھی فوت نہ ہوئی۔ ۔ ۔ موں کر ں کے باوجود اس کے طویلے میں ایک گھوڑ ے سے زیادہ کبھی نہ رہا۔ وہ بھی بعض اوقات چاہے سفر میں ہو یا حضر میں کسی نہ کسی مستحق دیتا تھا اور خود پیدل ہو جاتا تھا۔ اس کے آدمیوں اور غلاموں کا یہ حال تھا کہ ان کے پا دو دو گھوڑے کوتل میں لگے رہتے تھے:

"خان مفلس غلام باسامان"

دنیا سے بے نیازی

اس نے قسم کھا رکھی تھی کہ کبھی مال جمع نہیں کرے گا۔ جب بھی اس کے سامنے سونا روپیہ لایا جاتا تو کہتا تھا کہ یہ تیر یا نیزہ ہے جو میرے پہلو میں چبھا جا رہا ہے۔ جب تک وہ مال بخش نہیں دیتا اس کو چین نہیں پڑتا تھا۔ اکثر یہ دیکھا گیا کہ پندرہ ہزار سے تیس چالیس ہزار روپیہ تک لوگوں نے پرگنوں کے حساب میں دبا لیا اور اس نے کوئی دھیان دیے بغیر فوج کے مصارف اور دوسرے اخراجات کی عرضی پر دستخط کر دیے اور اس کے پاس صرف رسد کا حصہ رہ گیا۔ اس نے منت مانی ہوئی تھی کہ جو بھی غلام اس کے ہاتھ آئے گا وہ بس اسی دن سے آزاد ہو جائے گا کبھی تین سے زیادہ عورتوں کو نکاح میں نہیں رکھا۔

ایک دن شیخ الہدیہ نے جو اس وقت کے بڑے عالی مرتبہ بزرگ تھے۔ حسین خاں کے اس بے ہنگام اخراجات اور آڑے وقتوں کے لیے پونجی نہ رکھنے پر اعتراض کیا اور اس کو اس عادت کو چھوڑنے کی نصیحت کی۔ ان کی یہ بات بڑی ناگوار گزری اور طیش میں آ کر کہا کہ اگر مال کو جمع کرنا جس کا ماتم کر رہے ہو سنت رسول ہے تو سرتابی کی مجال نہیں اور اگر ایسا نہیں تو ہم لوگ تم جیسے رہبران دین سے اس بات کی امید رکھتے ہیں کہ اگر ہم میں دنیا کی حرص و ہوس کا کوئی شائبہ بھی رہ گیا ہے تو اسے تم دور کرنے کی کوشش کرو، نہ یہ کہ تم اس جہان فانی کی متاع حقیر و بے مایہ کو ہماری نگاہوں میں بڑھا چڑھا کر پیش کرو اور اس طرح ہم کو اس کا لالچی بنا دو کہ ہم بخل و خست کی لعنت میں گرفتار ہو جائیں:

قرار بر کف آزادگان نگیرد مال

نہ صبر در دل عاشق نہ آب در غربال

بہادری اور سخاوت

میں اس کے ساتھ کسی میدانی حملہ میں شریک نہیں رہا، لیکن اکثر جنگل کی لڑائیوں میں اس کے ہمراہ رہنے کا موقع ملا ہے۔ ان لڑائیوں میں میں نے ایسی ثابت قدمی اور دلیری خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے جس کا ذکر بس داستانوں کے حملوں کے متعلق ہی سننے میں آتا

ہے وہ نہایت قوی ہیکل اور انتہائی دلیر تھا۔ جنگ کے دن بس ایک ہی کلمہ زبان پر رہتا تھا، "یا شہادت یا فتح" لوگ بہت کہتے تھے کہ حضور دعا میں فتح کو مقدم رکھیے لیکن وہ یہ جواب دیتا کہ مجھے زندہ لوگوں کی نسبت گزرے ہوئے لوگوں کے دیدار کا زیادہ اشتیاق ہے۔ اس کی دریا دلی اور سخاوت ایسی تھی کہ اگر روئے زمین کے خزانے اور سلطنت بھی اس کو مل جاتی تو وہ پہلے ہی دن سب کچھ لٹا کر قرض دار ہو جاتا۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ چالیس پچاس عراقی اور ترکی گھوڑے کسی سوداگر کو اس کی بتائی مجموعی رقم پر یہ کہہ کر اکٹھے خرید لیے کہ تو جانے اور تیرا خدا! پھر وہ سب ایک ہی نشست میں اپنے رفیقوں کو بخش بھی دیے، جن کو نہیں ملے ان سے عذر خواہی کرتا رہا۔

میں اس سے پہلی بار اس وقت ملا تھا جب کہ گڑھ کٹنگر پر لشکر کو مقرر کیا گیا تھا۔ اس نے آگرہ میں ایک عراقی گھوڑا 500 روپے میں خریدا اور اسی وقت مجھے عطا کر دیا۔ کہتے ہیں جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوا تو ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ رقم اس کے ذمہ قرض تھی۔ قرض خواہوں کے ساتھ اس کی ایسی خوش معاملگی تھی کہ اس کے انتقال پر تمام قرض خواہوں نے قرضہ کے دستاویز پھاڑ دیے اور اس کے لیے مغفرت کی دعا کی اور ان کے ورثا سے قرضوں کا کوئی مطالبہ اور جھگڑا نہ کیا۔

میں اپنی اس چھوٹی زبان سے حسین خاں کی تعریف و توصیف کا حق ادا کرنے سے قاصر ہوں، اب جب کہ میں پیری کی ذلتوں سے دوچار ہوں اس بات کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میری زندگی کا بہترین حصہ یعنی جوانی کے شروع کا زمانہ ان کی خدمت میں گزرا اور یہ اس کی ہی توجہات کا طفیل ہے کہ میری نشو ونما نہایت عمدہ طریقہ پر ہوئی کہ آج میں دنیا میں مشہور و معروف شخصیت کا مالک ہوں۔

اسی سال بادشاہ نے میری خوش آوازی کی وجہ سے چہار شنبہ کے دن کی امامت میرے سپرد فرمائی اور مجھے سات اماموں میں داخل کر دیا اور خواجہ دولت ناظر کو مقرر فرمایا کہ وہ اس دن اور رات میں پانچوں نمازوں کے وقت حاضری کی یاد دہانی کرا دے۔

تخت نشینی کا بائیسواں سال

انہی دنوں خواجہ امین الدین محمود کا جو خواجہ اینا کے نام سے مشہور ہے، انتقال ہو گیا اور اس کا چھوڑا ہوا کافی بڑا سرمایہ خزانہ عامرہ میں داخل کر لیا گیا۔ اسی سال کی 17 ذی قعدہ کو بادشاہ نے اجمیر کا سفر کیا۔ بدستور سابق ایک منزل سے پیادہ جا کر مرزا مبارک کی زیارت کی۔ اس مہینہ کی نویں تاریخ کو سورج برج حمل میں داخل ہوا اور جلوس شاہی کے بائیسویں سال کا آغاز ہوا۔

خان جہان کے نام فرمان

اس موقع پر یہ خبر ملی کہ منعم خاں خان خانان کے انتقال کے بعد بادشاہ میر داؤد کے مقابلہ پر ٹھہر نہیں سکے، گوڑ اور ماںڈو سے پسپا ہو کر حاجی پور اور پٹنہ آ گئے ہیں اور خان جہان کا لشکر چونکہ ابھی تک لاہور میں رکا ہوا ہے اس لیے وہ تیزی سے کوچ نہیں کر رہا ہے۔ اکبر نے ترک سبحان قلی کے ہاتھ خان جہان کو تیزی سے روانہ ہونے کے لیے فرمان روانہ کیا۔ چنانچہ خان جہان نے بائیس دن میں ایک ہزار کوس کا فاصلہ طے کیا۔ ابھی بادشاہ اجمیر ہی میں تھے کہ دوسری اطلاع ملی کہ خان جہان نے کرہی پہنچ کر داؤد کی پٹھان فوج سے ایک سخت جنگ کی اور ان پر فتح پائی۔ تقریباً ڈیڑھ ہزار پٹھانوں کو قتل اور زخمی کر کے اب وہ آگے بڑھ چکا ہے۔

رانا کیکا کی مہم پر مان سنگھ کا تقرر

اوائل محرم 984ھ / 1576ء میں اکبر مان سنگھ ولد بھگوان داس کو حضرت معین الدین چشتی کے روضہ میں ساتھ لے کر گیا اور وہاں خلوت میں حضرت سے مدد کی دعا کر کے مان سنگھ کو خلعت، گھوڑا اور دوسرے تمام لوازمات عطا فرمائے اور اسے کوکندہ اور کونبھل میر کے دارالحرب پر جو رانا کیکا کی عملداری میں تھا، فوج کشی کے لیے مقرر کیا۔ اس کی مدد کے لیے خاصہ کے اور دوسرے صیغوں کے پانچ ہزار سواروں کو امراء کی سرکردگی میں متعین فرمایا۔ اس مہم پر مان سنگھ کے ساتھ آصف خاں میر بخشی، غازی خان بدخشی، شاہ غازی خان تبریزی، مجاہد خاں، سید احمد خاں، سید ہاشم بارہہ، خاصہ خیل اور دوسرے امرا بھی مقرر کیے گئے تھے۔

جہاد کا شوق

لشکر کے کوچ کے وقت میں بھی قاضی خاں اور آصف خاں کو رخصت کرنے کے لیے ان کے ہمراہ دو تین کوس تک جہاں ان امیروں کی چھاؤنی تھی، گیا تھا۔ اس وقت میرے دل میں بھی جہاد کا شوق چٹکیاں لینے لگا اور میں وہاں سے اسی وقت لوٹ کر شیخ الاسلام شیخ عبد النبی صدر کی خدمت میں آیا اور ان کو بادشاہ کے پاس سفارش کے لیے آمادہ کیا۔ انھوں نے حامی تو بھر لی لیکن میرے معروضے کو اپنے وکیل سید عبدالرسول کے ذمے کر دیا۔ یہ صورت بالکل بے کار تھی اور معاملہ میں تاخیر کا اندیشہ تھا۔ نقیب خاں کے ساتھ میرا اچھا خاصا یارانہ تھا، میں نے اس کو وسیلہ بنایا، پہلے تو اس نے مجھے روکنا چاہا اور کہا اگر ہندو اس لشکر کا سردار نہ ہوتا تو سب سے پہلے تم کو اجازت دلوا دیتا۔ میں نے خان کو بخوبی سمجھایا کہ ہم تو بادشاہ سلامت کو اپنا سردار مانتے ہیں، مان سنگھ وغیرہ سے ہم کو کیا غرض؟ اور یہ معاملہ تو نیت کی درستی پر منحصر ہے۔ غرض نقیب خاں نے اس وقت جبکہ بادشاہ حرار شریف کے اونچے چبوترے کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے، میرا معروضہ پیش کیا۔ پہلے تو انھوں نے فرمایا اسکے ذمہ تو امامت کے فرائض ہیں، وہ کس طرح جا سکتا ہے؟ نقیب خاں نے عرض کیا اس نے جہاد کی نیت کر لی ہے۔ بادشاہ نے مجھے بلا کر پوچھا ''مصمم ارادہ ہے؟'' میں نے عرض کیا، ہاں۔ فرمایا، ''کیوں؟'' میں نے کہا، میں اپنے اعمال کی سیاہی کو جاں نثاری کے ذریعہ دور کرنا چاہتا ہوں''۔ اس پر فرمایا ''انشا اللہ تعالیٰ تم فتح کی بشارت لے کر آؤ گے۔ اتنا کہہ کر بادشاہ مراقبہ میں چلے گئے اور بڑی توجہ سے فاتحہ پڑھتے رہے اور جب میں نے چبوترہ پر ہاتھ بڑھا کر پابوسی کا ارادہ کیا تو انھوں نے اپنے پیر کھینچ لیے۔ جس وقت میں دیوان خانہ سے رخصت ہوا تو مجھے دوبارہ بلوایا اور دونوں ہاتھوں سے بھر کر 56 اشرفیاں عطا کیں اور مجھے رخصت کیا۔ اس زمانہ میں شیخ عبدالنبی سے سابقہ رنجشیں دور ہو گئی تھیں اور وہ مجھ پر مہربان ہو گیا تھا اس لیے میں اس سے بھی رخصت لینے کے لیے گیا، اس نے مجھ سے کہا ''یاد رکھنا جس وقت دشمن سے مڈبھیڑ ہو تو چونکہ حدیث نبوی کے بموجب یہ وقت دعا کی قبولیت کا ہوتا ہے تم مجھے دعائے خیر میں یاد کرنا اور بھولنا نہیں''۔

میں نے وعدہ کیا اور فاتحہ پڑھنے کی درخواست کی۔ پھر میں گھوڑا تیار کر کے اس لشکر میں اپنے ہم خیال دوستوں کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ یہ سفر اول سے آخر تک نہایت خوشگوار اور مبارک ثابت ہوا۔ آخر کار ہم فتح نامہ اور اس ہاتھی کو لے کر جو راناکیکا سے اس جنگ و جدال کا باعث ہوا تھا، فتح پور لوٹ آئے۔

داؤد کی دوبارہ بغاوت

اسی سال 20 محرم کو کوکندہ کے لشکر کا انتظار کرنے کے بعد بادشاہ فتح پور واپس ہوئے اور وہاں پہلی ماہ صفر کو پہنچ گئے۔ انہی دنوں مخبروں نے خبر پہنچائی کہ کرہی سے خانجہاں کے آگے بڑھنے کے بعد داؤد ٹانڈہ سے نکل کر آک محل کے موضع میں جس کے ایک طرف تو دریائے گنگا اور دوسری طرف پہاڑ ہے، آگیا ہے اور وہاں قلعہ اور خندق بنا کر شاہی لشکر کا مقابلہ کر رہا ہے۔ خواجہ احرار کے پوتے خواجہ عبد اللہ اس خندق کی لڑائی میں مردانگی سے لڑتے ہوئے شہید ہوگئے ہیں۔ دوسری طرف پٹھانوں کا سردار خانخاناں بھی قتل ہوگیا ہے۔ اس اطلاع پر بادشاہ نے پٹنہ و بہار کے حاکم ظفر خاں کو لکھا کہ ساری فوجیں اکٹھی کر کے خان جہاں کی مدد پر چلا جائے۔

چوگان بازی

ربیع الاول کے مہینہ میں بادشاہ میرزا محمد شریف کے ساتھ فتح پور میں چوگان کھیل رہے تھے۔ مرزا شریف نہایت ذہین، خوش مزاج اور خوش آواز نوجوان تھا اچانک وہ کھیل کے دوران گھوڑے سے گر پڑا اور اسی وقت مر گیا۔ شہنشاہ اس ناگہانی حادثہ پر دنگ رہ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر کیا کریں؟ قطب الدین محمد اتکہ نے آگے بڑھ کر گھوڑے کی باگ پکڑلی اور کہا خداوند آپ کھڑے کیا کر رہے ہیں؟ یہاں سے تشریف لے چلیں، تب وہ چونکے اور محل کو واپس آگئے۔ اس حادثہ کے متعلق شہر بلکہ سارے ملک میں کچھ اور افواہ اڑگئی، اس لیے بادشاہ نے اپنی صحت و عافیت کے متعلق فرامین ہر جگہ

روانہ کیے اور اس خبر سے جو شورش سی اٹھنے لگی تھی دب گئی۔ یہ فرمان کوکندہ میں مان سنگھ اور آصف خاں کے نام بھی گیا اور لشکر میں جو رنج و ملال پھیل گیا تھا مسرت و خوشی میں تبدیل ہوگیا۔

کوکندہ پر فوجی حملہ

کوکندہ ماہ ربیع الاول 984ھ/1576ء کے شروع میں فتح ہوا۔ مان سنگھ اور آصف خاں اجمیر کی فوج کے ساتھ مانڈل گڑھ کے راستے متواتر کوچ کرتے ہوئے بلدہ تک جا پہنچے۔ یہ مقام رانا کیکا کے صدر مقام کوکندہ سے سات کوس پر واقع ہے۔ رانا بھی مقابلے کے لیے نکل کر آیا۔ مان سنگھ ہاتھی پر سوار تھا اور اس کے ساتھ بادشاہی امرا جیسے محمد رفیع بدخشی، شہاب الدین کرد، پایندہ قزاق، علی مراد ازبک، راجہ لون کرن حاکم سانبھر اور دوسرے راجپوت قول (قلب لشکر) پر مقرر تھے اور بہادر نوجوانوں کی ایک جمعیت ہراول پر لگائی گئی تھی، انھی میں سے 80 سے زائد لشکریوں کو سید ہاشم بارہہ کی کمان میں ہراول سے آگے روانہ کیا گیا۔ اس قسم کے دستے کو "جوزہ ہراول" کہتے ہیں۔ میمنہ پر سید احمد خاں بارہہ اور دوسرے امیر تھے اور میسرہ پر قاضی خاں اور اس کے ساتھ سیکری کے شیخ زادے جو شیخ ابراہیم چشتی کے عزیز اور رشتے دار ہوتے ہیں، مقرر تھے۔ چنداول پر مستمر خاں سردار تھا۔

رانا کیکا کا زبردست حملہ

جب رانا کیکا درہ کے پیچھے سے نکل کر آیا تو اس کا لشکر دو حصوں میں بٹ گیا۔ اس کی ایک فوج جس پر حکیم سور افغان سردار تھا ہراول کے مقابلے میں پہاڑ کی مغربی سمت سے آگے بڑھی۔ اس وقت پیچ دار راستے کے کٹاؤ، ناہمواری اور جھاڑ جھنکار کی وجہ سے "جوزہ ہراول" اور "ہراول" ایک ہی راستے میں خلط ملط ہوگئے اور دشمن کے مقابلے میں مدافعانہ جنگ کرتے ہوئے پسپا ہوئے۔ لشکر میں جو راجپوت تھے اور ان کی کمان لون کرن سانبھری

کر رہا تھا وہ بھیڑوں کی طرح بائیں جانب بھاگ نکلے اور ہراول سے گزر کر انھوں نے میمنہ میں جا کر پناہ لی۔ اس وقت میں بھی ہراول کے سربرآوردہ سرداروں کے ساتھ تھا۔ میں نے آصف خاں سے کہا "اس وقت ہم راجپوتوں میں اپنوں اور غیروں کی بھلا کس طرح تمیز کر سکتے ہیں؟" اس نے حکم دیا برابر تیراندازی کرتے رہو یہ مت سوچو کہ کون زد میں آتا ہے چنانچہ ہم برابر تیروں کی بوچھار کرتے رہے اور اس پہاڑ جیسے انبوہ اور ہجوم میں ہمارا کوئی نشانہ خطا نہ ہوا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ تیر صحیح نشانے پر لگ رہے ہیں اور مجھے یقین سا آ گیا کہ مقصود حاصل ہو گیا اور جہاد کا ثواب لازماً مل گیا۔ سادات بارہہ اور غیور نے اس موقعے پر ایسی داد شجاعت دی جو رستم کے کارناموں کی یاد دلا دے۔ دونوں طرف سے بہت سے آدمی اس محاذ پر کام آ گئے۔ دشمن کی دوسری فوج جس کی کمان خود رانا کیا کر رہا تھا، گھاٹی میں سے نکل کر آئی اور قاضی خاں کو جو گھاٹی کے دہانے پر لڑ رہا تھا، آگے سے ہٹا کر اسے پسپا کرتی ہوئی سیدھی قلب لشکر پر حملہ آور ہوئی۔ سیکری کے شیخ زادے ایک ہی حملے میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ فرار کے وقت شیخ ابراہیم کے داماد شیخ منصور کے سرین پر، جو اس دستے کی کمان کر رہا تھا ایک تیر آ کر لگا۔ اس زخم سے وہ کافی عرصہ تک تکلیف اٹھاتا رہا۔ اس کے مقابلے میں قاضی خاں باوجود ملاگیری کے دشمن کے سامنے دلیری سے جما رہا۔ اس کے سیدھے ہاتھ پر ایک تلوار لگی جس سے اس کا انگوٹھا زخمی ہو گیا۔ جب مقابلے کی تاب نہ رہی تو وہ بھاگ کر قول میں آ گیا۔ وہ جمعیت جو دشمن کے پہلے حملے ہی میں لشکر سے نکل بھاگی تھی دریا پار کر کے پانچ چھ کوس تک برابر بھاگتی چلی گئی اور انھوں نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔

مہتر خاں کی ہوشیاری

اس نازک صورت حال میں مہتر خان نے بروقت کام کیا۔ وہ اپنے چنداول کو یکبارگی لے کر نقارہ بجاتے ہوئے آگے بڑھا اور اعلان کر دیا کہ خود بادشاہ سلامت حملہ کرتے ہوئے آ پہنچے ہیں، اس کی یہ چال کام کر گئی اور بھاگتی فوج کے قدم میدان میں جم گئے۔ مشہور

راجہ مان کا پوتا راجہ رام گوالیاری جو رانا کیکا کے آگے بڑھا چلا آرہا تھا اس نے راجا مان سنگھ کے راجپوت دستے کے مقابلے میں ایسی بہادری دکھائی کہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ مان سنگھ ہی وہ راجپوت تھے جو ہراول کے بائیں بازو سے بھاگ کر آصف خاں کی پسپائی کا باعث بنے تھے اور میمنہ کے سید زادوں کے پاس جا کر پناہ لے لی تھی۔ اگر اس وقت سادات ثابت قدمی سے جمے نہ رہتے تو سب کو رسوائی اٹھانی پڑتی۔

ہاتھیوں کی خوف ناک لڑائی

رانا نے بادشاہی ہاتھیوں کے مقابلے پر اپنے ہاتھیوں کو آگے بڑھایا اور دو مشہور مست ہاتھی ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ ہاتھیوں کا فوجدار حسین خاں جو مان سنگھ کے پیچھے ایک دوسرے ہاتھی پر سوار تھا، اس ریل پیل میں گر پڑا اور مان سنگھ اپنے ہاتھی پر مہاوت کی جگہ پر آ گیا۔ اس نے حیرت انگیز ثابت قدمی کا ثبوت دیا۔ جو دو ہاتھی لڑ رہے تھے ان میں سے ایک تو بادشاہ کے خاصے کا ہاتھی تھا اور دوسرا رانا کا ہاتھی "رام پرشاد" نامی تھا جو نہایت قوی ہیکل تھا، دونوں میں بڑے غضب کا مقابلہ اور دونوں پوری قوت سے ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے۔ اتفاق سے رانا کے ہاتھی کے مہاوت کو ایک تیر لگا اور وہ ہاتھیوں کی ٹکر کے صدمے سے زمین پر گر پڑا۔ عین اس وقت بادشاہی ہاتھی کا مہاوت نہایت تیزی کے ساتھ کود کر رانا کے ہاتھی کے سر پر بیٹھ گیا۔ اس نے یہ ایسا حیرت انگیز کارنامہ دکھایا تھا کہ کوئی دوسرا اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

رانا کیکا کا فرار ہونا

جب رانا نے میدان کا اس طرح رنگ بدلا ہوا دیکھا تو مقابلہ چھوڑ کر نکل گیا اور رانا کے لشکر میں بڑی افراتفری سی مچ گئی۔ شاہی محافظ دستے کے جوانوں نے جو مان سنگھ کی محافظت کر رہے تھے، اس موقعے پر آگے بڑھ کر ایسی لڑائی کی جو یادگار رہے گی۔ مان سنگھ نے بھی اس دن جس بہادری اور خوبی سے سرداری کے فرائض انجام دیے۔ اس سے ملا

شیری کے اس معرعے کی تصدیق ہوگئی:

""کہ ہندوی زند شمشیر اسلام""

اس معرکے میں جے مل چتوڑی کا لڑکا اور گوالیار کا راجہ رام ساہ اپنے بیٹے سالباہن کے ساتھ جو نہایت بہادری سے لڑ رہا تھا، مارا گیا۔ گوالیار کے راجاؤں کے خاندان میں کوئی دوسرا قابل جانشین نہ رہا ""خس کم جہان پاک""۔ رانا کیکا بھی جو مادھو سنگھ کے مقابل تھا، تیر کھا کر زخمی ہوگیا۔ حکیم سور سادات کے مقابلے سے بھاگ کر رانا کے پاس آگیا اور دونوں کی فوجیں یکجا ہوگئیں۔ رانا میدان میں ٹھہر نہ سکا اور مقابلہ ترک کر کے اونچے پہاڑوں پر جہاں وہ چتوڑ کی فتح کے بعد سے ٹھہرا ہوا تھا، محصور ہوگیا۔

یہ لڑائی سخت گرمی کے موسم میں ہوئی تھی، گرمی کے مارے دماغ پگھلا جا رہا تھا۔ ہم صبح سے دوپہر تک برابر لڑتے رہے اور تقریباً 500 آدمی اس حملے میں ہلاک ہوئے۔ ان میں سے 120 مسلمان اور باقی مرنے والے ہندو تھے۔ زخمیوں کی تعداد 300 سے زائد تھی۔ تیز دھوپ کی وجہ سے میدان جنگ تنور کی طرح دھک رہا تھا اور گرمی کی وجہ سے سپاہیوں میں نقل و حرکت کی قوت نہ رہی تھی۔ غالب گمان یہی تھا کہ رانا پہاڑ کے پیچھے گھات میں چھپا ہوگا اسی لیے لشکر نے اس کا تعاقب نہ کیا اور اپنے کیمپ کو لوٹ گیا، جہاں زخمیوں کی مرہم پٹی کی گئی۔

شاہی فوج کوکندہ میں

دوسرے دن وہاں سے کوچ کر کے ہم میدان کارزار میں گئے۔ لاشوں کی دیکھ بھال اور سب کی کارگزاریوں کا جائزہ لینے کے بعد درّے میں داخل ہوئے اور کوکندہ پہنچ گئے وہاں رانا کے چند فدا کار رہ گئے تھے جو اس کے محل کی حفاظت کر رہے تھے۔ چند معذور اور ضعیف لوگ بھی تھے اور یہ سب مل کر کل بیس آدمی تھے۔ ہندوؤں کی پرانی رسم کے مطابق کہ وہ شہر خالی کرتے وقت اپنی آبرو و ناموس کی خاطر خودکشی کر لیتے ہیں یہ بھی گھروں اور بت خانوں میں جمع ہوئے اور عجیب عجیب حرکتیں کرنے کے بعد انھوں نے تلواروں سے

اپنے آپ کو ہلاک کرلیا اور سیدھے دوزخ میں چلے گئے۔

اندیشہ تھا کہ رانا شب خون مارے گا، اس لیے امرائے شاہی نے شہر کی کو پہ بندی کردی اور خندق کھدوا کر اتنی اونچی دیوار بنوادی کہ سوار بھی اس پر چڑھ نہ سکے۔ جب لشکر شہر میں ٹھہر گیا تو مقتولین جنگ کی اور ہلاک ہونے والے گھوڑوں کی تفصیلی فہرست تیار کی گئی تاکہ وہ عریضے کے ساتھ منسلک کردی جائے۔ اس وقت سید احمد خاں بارہہ نے کہا ہمارا نہ تو کوئی آدمی مارا گیا نہ کوئی گھوڑا ضائع ہوا۔ ان کے نام بادشاہی دفتر میں پہنچانے سے کیا حاصل یہ فہرست پڑھنا چھوڑو اور سب سے پہلے غلے کی فکر کرو، وہ پہاڑی نہایت بنجر تھی چنانچہ لشکر میں اناج کی قلت ہوگئی۔کوئی بنجارہ غلہ بھی لے کر نہ آیا اور فوج بڑی تنگی میں مبتلا ہوگئی۔ امراء نے مجلس مشاورت منعقد کی اور امراء میں سے باری باری ایک ایک کو سردار بنا کر غلہ لانے کے لیے مواضعات کی طرف روانہ کیا گیا۔ ان لوگوں نے بلند ٹیکروں اور چوٹیوں پر پہنچ کر جہاں جہاں شکست کھائی ہوئی فوجوں کی ٹکڑیاں جمع تھیں سب کو قیدی بنا لیا اور ان کے مویشی پکڑ کر لے آئے، انہی مویشیوں کے گوشت پر گزر اوقات ہوتی رہی، البتہ پہاڑیوں میں آم اتنی کثرت سے تھے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ وہاں کے غریب لوگ عموماً صبح کے وقت کھانے کے بجائے یہی آم کھایا کرتے تھے اور رطوبت کی وجہ سے اکثر بیمار ہوجاتے تھے، وہاں کے آم کا وزن تقریباً اکبری سیر کے برابر تھا اس کو چھلکا بھی پتلا ہوتا تھا لیکن میٹھا اور مزے دار نہیں تھا۔

اسی اثنا میں دربار سے محمود خاں خواص حسب الحکم حملہ کرتے ہوئے کوکندہ آیا اور جنگ کی روداد معلوم کرکے دوسرے ہی دن واپس چلا گیا۔ ہر ایک کی کارگزاری بادشاہ کو سنائی۔ بادشاہ نے فوج کی کارکردگی کی تعریف کی لیکن یہ بات کہ رانا کا تعاقب نہیں کیا گیا اور اسے زندہ بچ کر جانے دیا بادشاہ کو پسند نہ آئی۔

رام پرشاد ہاتھی

امراء فتح نامے کے ساتھ ''رام پرشاد'' ہاتھی کو جو غنیمت میں ہاتھ آیا تھا بادشاہ کے پاس بھیجا

چاہتے تھے۔ اس ہاتھی کو بادشاہ نے متعدد بار رانا سے مانگا تھا اور وہ اپنی بدبختی سے اسے دینے پر کبھی راضی نہ ہوا تھا۔ آصف خان نے میرا نام لے کر کہا کہ "یہ محض دوستی اور ہمراہی کی خاطر اس لشکر کے ساتھ آیا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ فتح نامہ اور ہاتھی اس کے ذریعہ بھیج دیا جائے۔" مان سنگھ نے جواب دیا ابھی بہت سے کام کرنے ہیں، ان کو لشکر میں رہ کر ہر معرکے کے وقت صفوں کی امامت کرنا چاہیے۔ میں نے کہا "یہاں امامت کا اب کیا کام ہے؟" "اس وقت تو مجھے جا کر خود بادشاہ کی امامت کرنی ہے۔ میری بات پر وہ مسکرایا اور میرے ساتھ 300 سواروں کی حفاظت میں مذکورہ ہاتھی کو روانہ کر دیا۔ خود مان سنگھ بھی سیر وشکار اور تھانے قائم کرنے کے ارادے سے ہمارے ساتھ قصبہ موہن تک جو کہ گوگندہ سے 20 کوس کے فاصلے پر ہے آیا اور سفارش نامہ لکھ کر مجھے وہاں سے رخصت کیا۔

میں باکھور اور ماندل گڑھ کے راستے سے مان سنگھ کے وطن قصبہ انبیر پہنچا۔ ہمارا جہاں بھی گزر ہوتا تھا لوگ مان سنگھ کی جنگ اور کامیابی کا حال سننے کے لیے جمع ہو جاتے تھے اور لوگوں کو اس کا یقین نہیں آتا تھا۔ انبیر سے پانچ کوس کے فاصلے پر ہم پہنچے تھے کہ ہاتھی دلدل میں پھنس گیا جس قدر وہ آگے بڑھتا تھا اسی قدر اندر دھنستا جا رہا تھا۔ میرے ذمے اس قسم کی یہ پہلی ہی خدمت تھی۔ اس لیے میں سخت پریشان ہوا۔ آخر وہاں کے رہنے والے پہنچے انھوں نے بتایا کہ گزشتہ سال بھی اس جگہ سرکاری ہاتھی پھنس گیا تھا۔ اب ہاتھی کے نکلنے کی یہی صورت ہے کہ یہاں کنجال اور پتلا کیچڑ کافی مقدار میں پھیلا دو تاکہ دلدل کچھ نرم ہو جائے اور ہاتھی آسانی سے نکل آئے۔ سقوں نے اسی طرح کیا، جب انھوں نے بہت سا پانی لا کر ڈالا تو ہاتھی آسانی سے نکل آیا اور ہم انبیر میں داخل ہوئے۔ انبیر والے تو اس فتح کی وجہ سے بڑا فخر کرنے لگے۔

بارگاہ شاہی میں حاضری

ہم انبیر میں تین چار دن رہے اور قصبہ ٹوڈہ کے راستے سے جو میری جائے پیدائش ہے وہاں سے بسا ور جہاں میرا خاندان مقیم ہے، گئے اور وہاں سے اوائل ماہ ربیع الآخر میں فتح

پہنچ گئے۔ میں مان سنگھ کے والد راجہ بھگوان داس کے وسیلے سے فتح پور کے بادشاہی دیوان خانے میں باریاب ہوا اور کورنش بجالا کر امراء کے عریضے اور ہاتھی کو پیش کیا۔ بادشاہ نے پوچھا اس کا نام کیا ہے؟ میں نے عرض کیا "رام پرشاد" فرمایا چونکہ یہ سب پیر کے طفیل میں حاصل ہوا ہے اس لیے اس کا نام اب "پیر پرشاد" ہوگا۔ پھر مخاطب کیا کہ "امراء نے تیری تو بہت تعریف لکھی ہے سچ بتانا کہ تو کون سی فوج میں تھا اور کیا کارنامہ تو نے انجام دیا؟" میں نے کہا "یہ ناچیز بادشاہوں کے سامنے لرزاں و ترساں سچ ہی بیان کرنے کا عادی ہے۔ بھلا جھوٹ کس طرح کہہ سکتا ہے اور جو کچھ واقعہ تھا میں نے ٹھیک ٹھیک بتا دیا۔ بادشاہ نے پوچھا تم نہتے تھے یا مسلح؟ میں نے کہا، ایک زرہ اور تلوار میرے پاس تھی۔ فرمایا یہ سامان تم کو کہاں سے مل گیا؟ عرض کیا، سید عبداللہ خاں سے میں نے لیا تھا۔ بادشاہ نے بڑی تحسین و تعریف کی۔ ان دنوں ہمیشہ بادشاہ کے سامنے اشرفیوں کا ایک ڈھیر لگا رہتا تھا، چنانچہ مٹھی بھر اشرفیاں اٹھا کر جو کل 96 تھیں مجھے انعام دیا۔ پھر پوچھا "شیخ عبدالنبی سے ملاقات کی ہے؟" میں نے کہا راستے کی گرد جھاڑتے ہوئے سیدھے خدمت میں حاضر ہوا ہوں اُن سے کیسے مل سکتا تھا؟ پھر بادشاہ نے ایک اعلیٰ قسم کا نخودی دوشالہ اٹھا کر مجھے دیا کہ یہ لے جاؤ اور شیخ سے ملاقات کرو اور اُن سے کہنا کہ یہ دوشالہ ہم نے تمہارے لیے اپنے خاص کارخانے میں تیار کرایا ہے، اسے اوڑھ لو۔ میں وہ دوشالہ لے کر شیخ عبدالنبی کے پاس گیا اور اسے بادشاہ کا پیغام دیا۔ شیخ بہت خوش ہوا اور مجھ سے پوچھا کہ رخصت کرتے وقت میں نے تم سے کہا تھا مقابلے کے وقت مجھے دعا میں یاد رکھنا۔ میں نے کہا اس وقت تو میں نے یہ دعا "اللھم اغفر للمومنین وللمومنات وانصر من نصر دین محمد و اخذل من خذل دین محمد علیه الصلوۃ و السلام" پڑھی تھی۔ شیخ نے کہا یہ بھی کافی ہے۔ سبحان اللہ! کس قدر جائے عبرت ہے کہ یہی وہ شیخ عبدالنبی ہے کہ وہ جب دنیا سے رخصت ہوا تو ایسے بُرے حال میں کہ خدا کسی کو نہ دکھائے نہ سنوائے اور سب کو اس سے عبرت ہو:

ہر کرا پرورد گیتی عاقبت خوش بر نگشت
حال آن فرزند چون باشد کہ خصمش مادر است

اسی سال بادشاہ نے سید عبداللہ خاں کے ذریعہ خان جہاں کے پاس فرمان بھیجا اور اسے بہ نفس نفیس وہاں پہنچنے کی خوشخبری دی۔ اس وقت خاں جہاں کہل گاؤں کے قریب داؤد کے مقابلے میں مورچے جمائے مظفر خاں اور بہادر حاجی پور کے لشکر کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ بادشاہ نے اس کے لشکر کی مدد کے لیے ڈاک چوکی کے ذریعے پانچ لاکھ روپیہ بھیجا اور غلے سے بھری ہوئی بہت ساری کشتیاں آگرہ سے روانہ کرنے کا حکم دیا۔

بادشاہ کا ارادہ بنگال

اسی دوران خبر پہنچی کہ حاجی پور کے علاقے کے زمیندار گجپتی نے جو باغی ہوگیا تھا، فوج اکٹھی کر کے تھانہ آرہ پر جہاں فرحت خاں اور اس لڑکا میرک روائی مامور تھے، حملہ کر دیا اور دونوں کو شہید کر دیا ہے اور اس کی فوج کشی کی وجہ سے تمام راستے بند ہوگئے ہیں۔ اس اطلاع پر بادشاہ سن مذکور میں 25 ربیع الآخر کو فتح پور سے مشرقی ہندوستان کی طرف روانہ ہوئے اور پانچ کوس طے کر کے منزل کی اور اس منزل پر سید عبداللہ خاں داؤد کا سر لے کر حاضر ہوا اور سید میر کی فال جفر کا وہ شعر جو اس نے پٹنہ سے واپسی کے وقت جونپور میں نکالا تھا سچ ثابت ہوا۔ وہ شعر تھا:

مژدہ فتح بہ ناگاہ رسد

سر داؤد بدرگاہ رسد

داؤد کی شکست اور قتل

جس دن سید عبداللہ خاں کہل گاؤں کے قریب خاں جہاں کے لشکر میں پہنچا تو حملے کی تیاری کی گئی اور دوسرے دن کہ جب ربیع الآخر کی 15 تاریخ تھی خان جہاں اور مظفر خاں نے صف آرائی کی اور تمام امراء کو ان کی ذمے داریاں سپرد کیں۔ اس وقت داؤد بڑے نخوت وغرور کے ساتھ اپنے چچا جنید کرانی اور دوسرے سرداروں کو لے کر قلعے سے باہر آیا اور جنگ چھیڑ دی۔ پہلے ہی حملے میں توپ کا ایک گولہ جنید کو آکر لگا اور اس کے چیتھڑے

اڑ گئے۔ جب دونوں فوجوں کی مڈ بھیڑ ہوئی تو پٹھان شکست کھا کر بھاگ نکلے، اور داؤد کا گھوڑا ایک دلدل میں پھنس گیا۔ حسین بیگ اس کے پیچھے لگا ہوا تھا، وہ داؤد کی مشکیں کس کر اسے خان جہاں کے پاس لے آیا۔ داؤد سخت پیاسا ہو رہا تھا، اس نے پانی مانگا۔ لوگوں نے اسی کے جوتے میں پانی بھر کر اس کو پیش کیا۔ جب اس نے نہ پیا اور منھ پھیر لیا تو خانجہاں نے اپنے خاص پیالے سے اسے پانی پلایا۔ داؤد نہایت خوبصورت اور حسین تھا اس لیے خان جہاں اسے قتل کرنا نہیں چاہتا تھا، آخر امراء نے کہا کہ اس کو زندہ چھوڑنے میں فتنہ و فساد کا اندیشہ ہے۔ خان جہاں نے مجبور ہو کر اس کی موت کا حکم دے دیا اور اس کے سر کو کاٹ کر گھاس سے بھر کر خوشبو میں بسایا گیا اور عبد اللہ خاں کے حوالے کر کے روانہ کر دیا۔ اس فتح میں شاہی لشکر کو بہت سے ہاتھی اور مال غنیمت حاصل ہوا۔

اکبر کی اجمیر روانگی

بادشاہ اس فتح کے شکرانے میں اسی سال 23 جمادی الثانی کو دوبارہ اجمیر تشریف لے گئے اور ماہ رجب کی 6 تاریخ کو جس دن کہ خواجہ صاحب کا عرس تھا، وہاں پہنچے۔ خواجہ خاوند محمود کے لڑکے سلطان خواجہ کو "امیر الحاج" بنا کر چھ لاکھ روپیہ نقد اور دوسرا سامان حرمین شریفین کے مستحق لوگوں کے لیے اور حرم مبارک میں ایک عمارت بنوانے کے لیے روانہ کیا۔ جس وقت سلطان خواجہ رخصت ہونے لگا، بادشاہ بھی زائروں کی طرح ننگے سر ننگے پیر احرام باندھے حاجیوں کا لباس پہن کر اور تھوڑے بال ترشوا کر کچھ دور تک اس قافلے کے ہمراہ گئے۔ بادشاہ کو اس حال میں دیکھ کر لوگوں کو بڑی رقت ہوئی اور لوگ چیخیں مار کر نالہ و فریاد کرنے لگے۔ سلطان خواجہ کے بدرقے کے لیے قطب الدین محمد خاں، قلیچ خاں اور آصف خاں کو مقرر کر کے حکم دیا گیا کہ امراء اس قافلے کو کوکندہ سے بخیر و خوبی آگے پہنچا کر رانا کے سارے علاقے کو پامال کر دیں اور اس کا جہاں بھی پتہ چلے گھیر کر زندہ نہ چھوڑیں۔

شاہ طہماسپ کا انتقال

اس موقعے پر خبر آئی کہ ایران میں شاہ طہماسپ فوت ہوگیا ہے اور شاہ اسماعیل ثانی اس کا جانشین ہوا ہے۔ اس قافلے کی روانگی پر تاریخ نکالی گئی:

''اول دولت و فتح وظفر است''

اس وقت بادشاہ نے عام منادی کرادی کہ جو شخص چاہے قافلے کے ساتھ حج پر جا سکتا ہے، اس کا سفر سرکار سے ادا کیا جائے گا۔ چنانچہ بے شمار لوگ اس سال حج کی سعادت سے فیض یاب ہوئے۔ ایک زمانہ وہ تھا اور ایک زمانہ یہ ہے کہ کوئی شخص حج کا نام بھی نہیں لے سکتا اور حج کی اجازت کی درخواست پر ہی لوگ واجب القتل مجرم بن جاتے ہیں۔ "تلک الایام نداولها بین الناس"۔

ان دنوں جب کو کندہ کے لشکر کی عسرت و تنگی کی شکایتیں پہنچیں تو بادشاہ نے مان سنگھ، آصف خاں اور قاضی خاں کو وہاں سے طلب کرلیا۔ یہ لوگ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ ان کو بعض قصوروں پر چند دن کے لیے کورنش سے محروم کردیا اور غازی خاں بدخشی، مہتر خاں، علی مراد اوزبک، خنجری ترک اور دوسرے ایک دو افسروں کو جن میں میں بھی شامل تھا، ان سے مستثنیٰ کر کے شاہانہ عنایت سے نوازا گیا اور ان کے مناصب میں ترقی ہوگئی۔ باقی تمام لوگوں کا تنزل ہوگیا، اگرچہ بعد میں ان کو بھی بادشاہ نے معاف کردیا۔

خواجہ شاہ منصور کی حاضری

رانا کیکا شکست کھانے کے بعد اودے پور اور خان پور وغیرہ کے پہاڑوں میں قزاقی کرتا پھر رہا تھا۔ بادشاہ نے اس کی سرکشی کے لیے اسی مہینے کی 19 تاریخ رانا کے علاقے کی جانب کوچ فرمایا۔

اس زمانے میں خواجہ شاہ منصور شیرازی خدمت میں آیا بہت پہلے وہ کچھ عرصے بادشاہی خوشبو خانے کا مہتمم رہا تھا لیکن مظفر خاں سے دشمنی ہو جانے کی وجہ سے شاہی خدمت سے بھاگ کر جون پور میں منعم خاں کے پاس چلا گیا تھا۔ منعم خاں نے اس کی

بڑی قدر و منزلت کی اور خواجہ منصور ترقی کر کے دیوانی کے عہدے پر مامور ہوا۔ جب منعم خاں کا انتقال ہوگیا تو بادشاہ نے فرمان بھیج کر اسے دربار میں بلالیا۔ خواجہ منصور چونکہ نہایت تجربہ کار کاردان اور سنجیدہ آدمی تھا، اس لیے بادشاہ نے اسے تمام ممالک محروسہ کا دیوان بنادیا اور وہ امور ملکی میں راجہ ٹوڈرمل کا بااختیار شریک ہوگیا۔

مشہور ہے، اول حق بعد میں ظلم، آدمی اقتدار پانے کے بعد ظلم وستم پر اتر آتا ہے اور خواجہ کے ساتھ تو یہ بھی اتفاق پیش آیا کہ اسی سال دُمدار ستارہ مغرب کی جانب سے طلوع ہوا۔ چونکہ خواجہ منصور دنبالہ دار پگڑی باندھا کرتا تھا۔ اس لیے لوگوں نے اس کا نام ستارۂ دنبالہ دار یعنی "جھاڑو تارا" رکھ دیا خواجہ فوج کا حساب کتاب نہایت سختی کے ساتھ کرنے لگا اور اس کی جابے جا پکڑ دھکڑ سے لوگ ایسے تنگ آئے کہ وہ راجہ اور مظفر خاں کی سختیاں بھول گئے اور اس پر لعنتیں بھیجنے لگے۔

شاہ اسماعیل کا قتل

اسی سال خبر پہنچی کہ عراق کے بادشاہ شاہ اسماعیل ولد شاہ طہماسپ کو اس کی بہن پری خانم نے امراء کے ساتھ ساز باز کر کے قتل کرادیا ہے۔ میر حیدر معمائی نے اس کی تاریخ جلوس "شہنشاہ روی زمین" اور اس کی تاریخ وفات "شہنشاہ زیر زمین" نکالی۔ جو دمدار ستارہ طلوع ہوا تھا اس کا اثر عراق میں ظاہر ہوا اور وہاں اس واقعے سے بڑا انتشار پھیل گیا۔ تبریز، شروان اور مازندران پر رومیوں نے زبردستی قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد سلطان محمد خدابندہ جو شاہ طہماسپ کی دوسری بیوی سے تھا، تخت پر بیٹھا۔ اس لیے بادشاہ کے دور میں وہاں ایک بڑی اچھی تبدیلی ہوئی۔ مدت سے وہاں کی حکومت کے زیر سایہ جو صحابہ کے خلاف تبرا ہوتا تھا اور خلفائے ثلاثہ پر لعنت کی جاتی تھی وہ ختم ہوگئی۔ لیکن وہاں کی بے دینی ہمارے ملک ہندوستان میں سرایت کرگئی:

نفاق آمده در هند از بلاد عراق
عراق قافیه میدان به رنگذار نفاق

قلعہ ایدر پر حملہ

جس وقت قصبہ موھنی میں سرا پردۂ شاہی نصب ہوا تو قطب الدین خاں اور راجہ بھگوان داس کے نام فرمان جاری کیا گیا کہ دونوں سردار کوکندہ میں ٹھہرے رہیں اور قلیج خان دوسرے امرا کے ساتھ حاجیوں کے قافلے کو لے کر ایدر تک جو احمد آباد سے چالیس کوس پر ہے، جائے اور وہاں کے زائرین کو بھی قافلے کے ساتھ احمد آباد روانہ کرنے کا انتظام کرے۔ قافلے کو رخصت کرکے ایدر کے قلعے کا محاصرہ کرے اور راجہ نرائن داس کی بغاوت کو پوری طرح کچلنے کے لیے قلیج خان نے حکم کی تعمیل کی اور حاجیوں کے قافلے کو تیمور خاں بدخشی کے ہمراہ 500 سواروں کی حفاظت میں منزل تک پہنچا دیا۔ اس کے فوجی حملے سے ایدر کا راجہ بھی رانا کیکا کی طرح پہاڑوں اور جنگلوں میں جا کر چھپ گیا۔

بادشاہ کی مالوہ روانگی

اسی جگہ شہاب خاں اور شاہ بداغ خاں اپنے لڑکے عبد المطلب خاں کے ساتھ اور شاہ فخرالدین خاں اور مالوہ کے دوسرے جاگیردار دربار میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے غازی خاں بدخشی کو ہزاری کا منصب عطا کرکے شریف محمد خاں اتکہ، مجاہد خاں اور ترک سبحان قلی اور تین ہزار سواروں کی جمعیت کے ساتھ قصبہ موھنی میں ٹھہرنے کا حکم دیا۔ مداریہ کی پہاڑیوں میں عبدالرحمٰن ولد مؤید بیگ کو پانچ سو آدمیوں کی چوکی پر مقرر فرمایا۔ قطب الدین خاں اور راجہ بھگوان داس کو بھی کوکندہ سے لشکر میں طلب کیا گیا اور اودے پور پر شاہ فخرالدین اور جگناتھ کو مامور کیا۔ سید عبداللہ خان اور راجہ بھگوان داس کو اودے پور کے درہ پر مقرر فرمایا۔ ان انتظامات کے بعد بادشاہ کوچ کرکے بانس والہ اور ڈونگر پور پہنچے۔

اسی مقام پر بنگالہ سے راجہ ٹوڈرمل وہاں کا مال غنیمت اور 500 ہاتھی لا کر حاضر ہوا۔ اسی جگہ پر قلیج خاں کو ایدر سے بلا کر اس کی جگہ آصف خاں کو لشکر کا سردار بنا دیا اور قلیج خاں کو کھمبایت کے کلیان رائے بقال کے ساتھ سورت کی بندرگاہ پر بھیج دیا تاکہ وہ فرنگیوں سے پروانہ راہداری لے کر سلطان خواجہ کے جہاز کو اس پروانے کے نہ ملنے کی وجہ سے جو

وہاں لشکر ڈالے پڑا تھا روانہ کرادے اور مالوہ میں شاہی لشکر سے آ کر مل جائے۔

جلوس کا تیئسواں سال

اسی سال ماہ ذی الحجہ میں نوروز کا انعقاد ہوا اور جلوس کا تیئسواں سال شروع ہوا۔ اس مرتبہ نوروز کا جشن مالوہ کے قریب دیپالپور کے قصبے میں منایا گیا۔ میں ان دنوں بری طرح بیمار ہو گیا تھا اور بیاور ہی میں ٹھہر گیا تھا۔ میں نے جشن میں شرکت کے لیے بانس والہ کے راستے سے لشکر میں پہنچنے کا ارادہ کیا۔ ھنڈون میں سید عبداللہ خاں سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے اس راستے کو خطرناک بتایا اور مجھے لوٹا کر بجونہ لے آیا۔ چند دن شاہی امامت کی ذمے داریوں کا خیال کر کے رضوی خاں کے ساتھ گوالیار، سارنگ پور اور اجین ہوتے ہوئے 12 ذی الحج کو میں دیپال پور مالوہ پہنچا اور دربار میں حاضری دی۔ بادشاہ کی خدمت میں ایک نفیس حمائل شریف اور خطبوں کی ایک بیاض جس میں صنائع بدائع سے مرصع نہایت عمدہ خطبے درج تھے، پیش کیے۔ یہ دونوں چیزیں حافظ محمد امین قندھاری کی تھیں۔ حافظ جیسا خوش الحان شخص اس زمانے میں میں نے کسی اور کو نہیں پایا۔ جس وقت بیاور کے محل کروھہ میں منزل کی گئی تھی حافظ کے پاس سے یہ دونوں چیزیں چور اڑا لے گئے تھے۔ بعد میں عبداللہ خاں نے تفتیش کر کے ان کو حاصل کیا تھا اور انھیں میرے سپرد کر دیا تھا۔ جب میں نے بادشاہ کو یہ نذرانے میں پیش کیں تو وہ بہت خوش ہوئے اور حافظ محمد امین کو بلا کر مذاقاً فرمایا ایک حمائل شریف کسی جگہ سے ہمارے پاس تحفے میں آئی ہے میں وہ تمھیں عطا کرتا ہوں۔ حافظ نے دیکھتے ہی اسے پہچان لیا اور ایسے خوش ہوا جیسے اسے نئی زندگی مل گئی ہو، جھک جھک کر تسلیمات بجا لایا اور شکرانے کا سجدہ ادا کر کے عرض کیا۔ حضرت نے اسی دن عبداللہ خاں کو فرمایا تھا کہ اسے انشاء اللہ تو ہی تلاش کر کے لائے گا، آپ کی وہ بات پوری ہو کر رہی۔ بادشاہ نے مجھ سے ان نسخوں کے ملنے کا حال دریافت کیا تو میں نے عرض کیا کہ مزدوروں کی ایک جماعت بیاور کے قصبوں میں حوض اور کنوؤں کے کھودنے کا کام کرتی ہے اور اسی بہانے چوری ڈکیتی کرتی ہے۔ انھی

مزدوروں نے یہ چیزیں چرائی تھیں۔ ان میں سے ایک شخص نے اپنے ساتھیوں سے جھگڑ کر سید عبد اللہ خاں کے پاس مخبری کر دی۔ خاں نے سب کو پکڑ لیا اور انھوں نے اپنی چوریوں کا اقرار کر لیا۔ بادشاہ نے حافظ کو مخاطب کر کے کہا مطمئن رہو انشاء اللہ تمہارا دوسرا سامان بھی نکل آئے گا۔ اس نے عرض کیا میں تو صرف اس مصحف اور بیاض کے لیے فکرمند تھا، یہ آبا و اجداد سے ورثے میں ملی ہیں اور ان کے بغیر میں خطبے مرتب کرنے سے معذور ہو گیا تھا۔ بقیہ سامان کی تو مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ اس سفر سے واپسی میں جیسا کہ بادشاہ نے فرمایا تھا اس کا وہ سارا سامان جوں کا توں انہی بیلداروں کے پاس سے برآمد ہو گیا۔ عبد اللہ خاں نے یہ سامان فتح پور میں لا کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا تھا۔

اسی جگہ بادشاہ نے از سرِ نو مجھے امامت کرنے کا حکم دیا اور حسب سابق خواجہ دولت ناظر کو مقرر کیا گیا کہ ہفتے میں ایک دن اور ایک رات مجھے چوکی پر حاضر کر دیا کرے معاملہ اسی قسم کا تھا کہ: "نخوا مکتب میں نہیں جاتا بلکہ اسے تو لے جایا جاتا ہے۔" اس علاقہ کے انتظامات کے لیے چند دن تک دیپالپور میں قیام کیا گیا اور بعض بڑے امراء کو جیسے شہاب الدین احمد خاں وغیرہ کو مالوہ کے جاگیرداروں کے ساتھ راجہ علی خاں پر حملہ کرنے اور اس کے ملک فتح کرنے کے لیے برہانپور کی طرف روانہ کیا اور اس لشکر کے داغ و محلہ کا کام شہباز خاں بخشی کے سپرد کیا گیا۔ اسی منزل سے راجہ ٹوڈرمل کو اعتماد خاں گجراتی کے ساتھ گجرات کی جمع بندی کی تحقیقات اور وہاں کے انتظامات کے لیے مامور کیا گیا تھا۔

راجا نارائن داس کی شکست

اسی اثنا میں خبر آئی کہ آصف خاں نے ایدر کو فتح کر لیا ہے اور راجہ نرائن داس کو شکست ہوئی ہے۔ جب قلیج خاں کو علی مراد اوزبک کے ساتھ ایدر سے دربار میں بلا لیا گیا تھا اور آصف خان کو لشکر کی سرداری پر نامزد کیا گیا تھا تو راجہ ایدر، رانا کیکا اور دوسرے زمینداروں کی مدد سے فوج اکٹھی کر کے ایدر سے دس کوس کے فاصلے پر تھانہ پر حملہ آور ہوا اور رات کو حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ جب لشکر کو یہ خبر ملی تو آصف خاں، میرزا محمد مقیم تیمور بدخشی، میر ابو

المغیث بخاری اور میر محمد معصوم بھکری وغیرہ نے مشورہ کیا کہ تقریباً 500 سواروں کو تھانہ کی حفاظت پر چھوڑ کر پیش قدمی کی جائے اور راجہ پر حملہ کردیا جائے، چنانچہ چار ذی الحج 984ھ/ 1588ء کی صبح کو یہ لوگ سات کوس کا فاصلہ طے کر چکے تھے کہ دوسری طرف سے راجہ نارائن داس پوری تیاریوں کے ساتھ بڑھ آیا اور دونوں فوجوں میں لڑائی چھڑ گئی۔ میرزا محمد مقیم نے جو ہراول پر مقرر تھا سب سے آگے بڑھ کر حملہ کیا اور شہید ہوگیا لیکن اس کے زبردست حملے نے غیر مسلموں کے پیر بھی میدان سے اکھاڑ دیے اور وہ بُری طرح شکست کھا کر بھاگے اور پناہ گاہوں میں چھپ گئے۔ جب آصف خاں کا عریضہ بارگاہ میں پہنچا تو اس لشکر کے سرداروں کے نام عنایت آمیز فرمان روانہ کیے گئے۔

اسی سال میر سید محمد میر عدل نے جو بھکر کی حکومت پر مقرر ہوئے تھے میر سید ابو الفضل اور اپنے دوسرے بیٹوں کو سیوی پر حملہ کرنے بھیجا۔ ان لوگوں نے تھوڑی سی مدت میں اس قلعے کو فتح کرلیا۔ میر سید ابو القاسم ولد میر سید صفائی جو بھکر کے سربرآوردہ آدمی ہیں۔ دربار میں حاضر ہوئے ان کو احدیہ کا منصب عطا کیا گیا۔

شریف آملی کی آمد

انہی دنوں شریف آملی دیپال پور کے علاقے میں آکر باریاب ہوا۔ یہ مردود اور نابکار پاگل کتے کی طرح ایک ملک سے دوسرے ملک میں گھومتا پھرتا تھا اور ہمیشہ ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرلیتا تھا۔ بڑے مباحثے اور مجادلے کرتا رہتا تھا، انجام کار اس نے سارے اعتقادات ترک کرکے الحاد و بے دینی کو اپنا شعار بنا لیا۔ کچھ عرصے تک صوفیوں کے بھیس میں بلخ میں مخدوم شیخ حسین خوارزمی کے پوتے مولانا محمد زاہد کی خانقاہ میں درویشوں کے ساتھ گزر بسر کرتا رہا۔ اس کو درویشی سے کوئی تعلق خاطر نہ تھا اس لیے وہ وہاں ہمیشہ درویشوں کو اپنی ہرزہ سرائی اور نوک جھونک سے پریشان کرتا رہتا تھا تنگ آکر ان لوگوں نے اسے خانقاہ سے نکال دیا۔

بلخ سے نکلنے کے بعد وہ سیر و سفر کرتے ہوئے دکن جا پہنچا، وہاں کے لوگ بھی جب

اس کی خباثتوں سے واقف ہوئے تو انھوں نے اس کا قصہ ہی پاک کر دینے کا فیصلہ کر لیا لیکن ترس کھا کر اسے بس اتنی سزا دی کہ گدھے پر سوار کر کے بڑی رسوائی کے ساتھ اس کی تشہیر کرادی۔ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے اور یہاں کسی کو کسی سے کوئی واسطہ نہیں، ہر شخص جس طرح چاہے اپنی زندگی گزار سکتا ہے اس لیے وہ بھی دکن سے نکل کر آزادی کے ساتھ گھومتا پھرتا اسی زمانے میں مالوہ پہنچ گیا اور لشکر سے پانچ کوس کے فاصلے پر اپنا ٹھکانا بنایا اور طرح طرح کی الٹی سیدھی باتیں کرنے لگا اور نہایت زہریلے خیالات پھیلانے لگا۔ اس کی مجلس میں جاہل عوام حاضر ہونے لگے، خاص طور سے عراقیوں کا اس کے پاس مجمع لگا رہتا تھا۔ یہ عراقی تو ایمان سے ایسے نکلے ہوئے ہیں جیسے مکھن سے بال نکل آتا ہے، دجال نکلے گا تو سب سے پہلے اس کی پوجا کرنے والے بس یہی عراقی ہوں گے۔ اس بد بخت نے ان عراقیوں کے ذریعے یہ شہرت کی کہ وہ دسویں صدی کا مجدد ہے۔ اس پر بڑا ہنگامہ برپا ہوا اس کی خبر جب اکبر کو ہوئی تو اس نے ایک رات اسے اپنی مجلس میں بلا بھیجا اور قتالوں کی بنی ہوئی اس طویل مسجد میں جس میں پانچ وقت نماز ادا کی جاتی تھی اکبر نے اس سے خلوت میں باتیں کیں۔ جب وہ آیا تو اپنی مضحکہ خیز شکل، ناگوار ہیئت کذائی اور ٹیڑھی گردن کے ساتھ جھک کر کورنش[49] ادا کی اور کافی دیر تک ہاتھ باندھے ہوئے اپنی کنجی آنکھوں کو جھپکاتے ہوئے جو حضور اکرم کی دشمنی کی نشانی ہے کھڑا رہا۔ اس کے سراپا سے جھوٹ، ریاکاری اور منافقت نمایاں طور پر جھلک رہی تھی۔ کافی دیر کے بعد جب بادشاہ نے اسے بیٹھ جانے کا حکم دیا تو سجدہ کر کے اونٹ کی طرح دو زانو بیٹھ گیا۔ اکبر اس کے سامنے جا بیٹھا اور تنہائی میں باتیں کرنے لگا۔ سوائے حکیم الملک کے اس جگہ کسی اور کو کھڑے ہونے کی اجازت نہ تھی۔ دور سے کبھی کبھی اس کی آواز بلند ہوتی تھی۔ میں نے بس ''علم'' کا لفظ سنا۔ غرض اس نے بڑی خرافات بکیں اور انھیں حقائق اور اصل الاصول بتاتا رہا:

قومی نہ زظاہر نہ زباطن آگاہ　　آنگہ زجہالت بہ لطافت آگاہ

مستغرق کفرند و حقیقت گویند　　لا حول ولا قوۃ الا باللہ

شریف آملی کا مسلک محمود بسی خوانی کے مسلک کی نقل تھا۔ اس محمود نے امیر

تیمور صاحبقران کے زمانے میں گیلان کے ایک کاتو یسی خوان میں ظہور کیا تھا۔ اس نے 13 منحوس رسالے لکھے تھے جو ہر طرح کے زندقے سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک رسالہ کا نام "نیچال" تھا، جسے اس نے "علم لفظ و حال" کا نام دیا ہوا تھا۔ اس بد بخت کی تمام تصانیف کا خلاصہ "بحر و کوزہ" نامی ایک کتاب تھی۔ جو غلاظت اس کتاب میں اس نے جمع کی ہے اس کو سن کر ہی قے ہونے لگتی ہے۔ اگر شیطان اس کو سن لے تو مارے خوشی کے ناچ اٹھے۔ اس شریف کثیف نے بھی کمالات کا ایک مجموعہ بنا رکھا تھا جسے "ترشح ظہور" کا نام دیے ہوئے تھا۔ اس کتاب کی ترتیب اس نے میر عبد الاول کے مجموعے کی طرح رکھی تھی کہ اسکے ہر نامربوط عام فریب فقرے کا عنوان اس لفظ کو رکھا گیا ہے جس سے وہ فقرہ شروع ہوتا ہے۔ غرض یہ کتاب نہایت مضحکہ خیز تھی۔

خدا کی شان دیکھیں کہ باوجود اس جہالت کے اس مکار نے اس طرح لوگوں پر اپنی فضیلت کا سکہ جمایا کہ اب وہ ہزاری منصب دار بنا بیٹھا ہے اور بنگالہ میں "مذہب حق" کا داعی مقرر ہوا ہے۔ بادشاہ کے چار مخلص یاروں میں شامل ہے، مریدوں اور معتقدوں کے سامنے شاہی مراتب کی نیابت کرتا ہے۔ ان مراتب کا ذکر آگے آئے گا:

یار بودم قطب اسال قطب الدین شدم
گر بمانم سال دیگر قطب دین حیدر شدم

فتح پور واپسی

جب اس علاقے کے سارے انتظامات حسب منشا تکمیل پاگئے تو بادشاہ وہاں سے مسلسل کوچ کرکے سیرو شکار کرتے ہوئے رنتھمبور کے راستے سے 23 صفر 985ھ/1576ء کو فتح پور پہنچے۔ اس موقعے پر شیخ فیضی نے جس کو اب ملک الشعراء کا خطاب مل چکا ہے، ایک غزل کہی تھی جس کا مطلع ہے:

نسیم خوش دلی از فتح پور می آید
کہ پادشاہ من از راہ دور می آید

مرزا مظفر حسین کا گجرات پر حملہ

دو تین ماہ بعد گجرات میں غدر کی اطلاع ملی۔ اس مرتبہ جب راجہ ٹوڈرمل گجرات کے لیے مقرر ہو کر گیا تو مظفر حسین ولد ابراہیم حسین مرزا جو مرزا کامران کا نواسا تھا اور اس کو اس کی ماں گلرخ بیگم سورت کے محاصرے کے وقت دکن لے کر چلی گئی تھی۔ چند اوباشوں کی جمعیت لے کر گجرات میں فتنہ و فساد مچانے پہنچ گیا۔ اس وقت اس کی عمر صرف پندرہ سولہ سال تھی، اسے بہکانے والا اصل میں مہر علی نامی ایک شخص تھا جس نے میرزا ابراہیم کے پاس پرورش پائی تھی۔

مرزا مظفر حسین نے گجرات پہنچ کر بڑا ہنگامہ برپا کیا۔ اس کے مقابلے پر شریف محمد خاں اتکہ کا لڑکا باز بہادر اور گجرات کا دیوان بابا بیگ پرگنہ پتلاد میں پہنچے۔ مرزا نے ان کو شکست دی اور کھمبایت تک جا پہنچا۔ اب اس کے پاس دو تین ہزار سوار تھے وزیر خان حاکم گجرات کے پاس بھی تین ہزار سوار تھے لیکن اسے اپنے سپاہیوں پر پورا بھروسہ نہ تھا، اس لیے میدان میں مقابلہ کرنے کے بجائے وہ قلعے میں بند ہو گیا اور راجہ نے احمد آباد کی طرف کوچ کر دیا۔ اس کی آمد پر میرزا احمد آباد سے ہٹ کر دولقیہ کی طرف چلا گیا۔ وزیر خاں اور راجہ نے اس کا پیچھا کیا۔ اس مقام پر فریقین میں بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ باغی شکست کھا کر جو ناگڈھ کی طرف نکل گئے۔ اسی زمانے میں راجہ فتح پور واپس چلا آیا۔ اس کی واپسی کی خبر سن کر مرزا مظفر حسین نے دوبارہ جو ناگڑھ سے نکل کر احمد آباد پر حملہ کیا اور وزیر خاں پہلے کی طرح قلعے میں محصور ہو گیا۔ میرزا نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ اس کی فوج قلعے کی دیوار پر سیڑھیاں لگا کر چڑھنے لگی۔ قریب تھا کہ وہ لوگ قلعے کو فتح کر لیتے لیکن عین اس وقت ایک گولی مہر علی کے سینے میں آ کر لگی۔ مہر علی، مرزا کا وکیل مطلق اور روح رواں تھا۔ اس کے ہلاک ہوتے ہی میرزا بدحواس ہو کر میدان سے بھاگ نکلا اور سلطان پور اور ندر آباد کی طرف چلا گیا۔

راجہ علی خاں سے مصالحت

بادشاہی فوج کے ان امیروں نے جو شہاب الدین احمد خاں کی سرداری میں برہان پور پر

فوج کشی کے لیے بھیجے گئے تھے حملہ کر کے راجہ علی خاں کو قلعے میں محصور کر دیا تھا اور اس کی ساری مملکت کو تاراج کر دیا تھا۔ قلعے کے فتح ہو جانے میں کوئی کسر نہ رہی تھی لیکن محاصرے کے دوران قطب الدین محمد خاں کا امراء سے اختلاف ہو گیا اور وہ ناراض ہو کر اپنی جاگیر بھڑوچ اور بڑودہ کی طرف چلا گیا، جہاں مرزا مظفر نے غارت گری کر کے بڑا انتشار پھیلا دیا تھا۔ اس کے اس طرح محاذ سے چلے جانے کی وجہ سے برہان پور کی مہم میں بڑی دقتیں پیدا ہو گئیں۔ امرائے شاہی نے مصلحت یہی سمجھی کہ راجہ علی خاں سے معقول نذرانے وصول کر کے دربار میں بھیج دیں اور اپنی اپنی جاگیروں کو لوٹ جائیں۔

حکیم عین الملک کی دکن سے واپسی

انہی دنوں حکیم عین الملک شیرازی جو 983ھ/1575ء میں حاکم دکن عادل خاں کے وکیل کے ہمراہ سفارت پر گیا تھا، واپس آ گیا اور عادل خاں کے دیے ہوئے عمدہ ہاتھی اور قیمتی تحائف نذر میں پیش کیے۔ جب بانس بریلی کی فوجداری سے دیپ چند راجہ منجھولہ کو ہٹا دیا گیا تو وہاں کا فوجدار حکیم عین الملک کو بنا دیا گیا، اس نے وہاں سے ایک طویل عریضہ لکھا اور باتوں کے علاوہ اس میں یہ جملہ بھی تھا کہ: ''جب سے میں دربار سے علیحدہ ہوا ہوں اس جنگل بیابان میں میرے ساتھ کوئی ہم خیال دوست نہیں ہے، اگر جناب والا فلاں شخص کو (یہاں اس نے میرا نام لکھا تھا، یعنی مؤلف منتخب التواریخ) جو اس علاقے کے حالات سے بخوبی واقف ہے اور یہاں کے لوگوں کو اس پر بھروسہ و اعتماد بھی ہے اور دربار میں بھی اس کے ذمے کوئی اہم خدمت نہیں ہے، میرے پاس بھیج دیں تو اس کے حق میں بھی بڑی عنایت ہوگی اور اس بندہ درگاہ پر بھی احسان ہوگا''۔ بادشاہ کے حکم سے خواجہ شاہ منصور اس خط کے ایک ایک فقرے کو پڑھتا جاتا تھا اور حسب تجویز اس کا جواب لکھتا جاتا تھا۔ جب وہ مذکورہ فقرے پر پہنچا تو بادشاہ نے ''ہاں'' کہا یا ''نہ'' پتہ نہیں۔

حج کے لیے قافلے کی روانگی

985ھ/1577ء رجب ماہ میں خواجہ صاحب کے عرس کا زمانہ ہے، بادشاہ نے اجمیر کا عزم

کیا۔ جب سواری تودہ پر پہنچی تو شاہ ابوتراب جو شیراز کے بڑے بزرگ اور سلاطین گجرات کے پیر تھے، ملنے کے لیے آئے اور راجہ ٹوڈرمل بھی جو مرزا مظفر حسین کو شکست دینے کے بعد واپس ہو رہا تھا، بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا۔ میرٹھ کے قریب بادشاہ نے شاہ ابوتراب کو حاجیوں کا امیر بنا کر اعتماد خاں گجراتی کے ساتھ کافی رقم دے کر مکہ معظمہ کے لیے رخصت کیا اور عام منادی کرادی کہ جو بھی چاہے اس قافلے کے ساتھ حج کے لیے جاسکتا ہے۔ میں نے بھی شیخ عبدالنبی صدر سے درخواست کی کہ میرے لیے بھی آپ بادشاہ سے اجازت لے لیجیے تو اس نے پوچھا ''کیا تمہاری والدہ زندہ ہیں؟'' میں نے کہا ہاں۔ اس نے کہا تمہارا کوئی بھائی بند ایسا ہے جو ان کی خدمت کرتا رہے، میں نے کہا: ''نہیں'' صرف میں ہی ان کا سہارا ہوں۔ شیخ نے فرمایا اگر تم اپنی والدہ سے اجازت لے لو تو بہتر ہوگا۔ غرض مجھے حج کی سعادت نصیب نہ ہوئی اور اب میں اس محرومی پر حسرت و افسوس کرتا رہتا ہوں:

نگرد لطف تو کاری ووقت کار گزشت
نشد وصال تو روزی و روزگار گزشت

منوہر پور کی تعمیر

انبیر کے موضع موتان میں جو ایک قدیم شہر ہے اور اس وقت بالکل کھنڈر بنا ہوا تھا، بادشاہ کی سواری پہنچی تو اس نے وہاں شہر کی اور ایک بلند قلعے کی تعمیر کا حکم دیا قلعے کے دروازے اور باغ کی تعمیر کی ذمہ داریاں امرا کے سپرد کی گئیں۔ بادشاہ نے اس کی تعمیر میں اس توجہ سے اہتمام کیا کہ سانبھر کے حاکم رائے منوہر ولد رائے لونکرن کے نام پر اس کا نام منوہر پور تجویز کیا گیا۔ رائے منوہر کو مرزا منوہر بھی کہا جاتا ہے۔ وہ بڑے شاہزادوں کے ساتھ تربیت پاتا رہا تھا، ایسا ہنرمند اور باکمال نکلا کہ اب بڑے اچھے شعر کہہ لیتا ہے اس کا تخلص توسنی ہے۔

یہاں سے بادشاہ سلامت نے نارنول کے راستے دہلی کا ارادہ کیا اور شیخ نظام نارنولی

سے جو مشائخین عظام میں سے ہیں، ملاقات کی۔ دلی میں پہلے تو بادشاہ نے بزرگوں کے مزارات کی زیارت کی پھر پالم میں شکار کھیلتے رہے۔

پشاور کو روانگی

اسی سال ماہ رمضان المبارک کے آخری عشرے میں میرے پاس پشاور سے خبر آئی کہ میری ایک خادمہ کو کافی مدت اور آرزوؤں کے بعد ایک لڑکا پیدا ہوا ہے۔ میں نے بادشاہ کے پاس اشرفی کا نذرانہ پیش کر کے نام رکھنے کی درخواست کی۔ بادشاہ نے فاتحہ پڑھ کر پوچھا تیرے باپ اور دادا کا نام کیا ہے؟ عرض کیا ملوک شاہ ولد حامد۔ بادشاہ نے فرمایا: "اپنے اس بچے کا نام عبدالہادی رکھو" "ہادی" کا کلمہ اس زمانے میں رات دن بادشاہ کے ورد زبان رہتا تھا"۔ سات بادشاہی اماموں میں ایک محمد امین خطیب بھی تھے۔ انھوں نے بڑے اصرار سے کہا تھا کہ یہ فضول خیال چھوڑو اور حافظوں کو اپنے گھر پر جمع کر کے بچے کی درازی عمر کے لیے قرآن کا ختم کراؤ۔ میں نے اس کی بات پر دھیان نہ دیا۔ آخرکار وہ بچہ چھ ماہ کا ہو کر انتقال کر گیا۔ میں نے اس جگہ سے پانچ مہینے کی رخصت لی اور پشاور چلا گیا۔ بعض مصروفیتوں بلکہ بے کار مشغلوں میں پھنس کر حسب وعدہ خدمت پر واپس نہ جا سکا اور پشاور میں ایک سال تک رہ گیا۔ ان کوتاہیوں اور لوگوں کی مخالفتوں کی وجہ سے رفتہ رفتہ بادشاہ میری طرف سے بے توجہ ہوتے چلے گئے اور اب جب کہ اس واقعے کو اٹھارہ سال گزر چکے ہیں اسی معمولی خدمت سے چمٹا ہوا ہوں کہ نہ رہتے بنے نہ بھاگتے:

صبری نہ کہ از عشق بپرہیزم من
بختی نہ کہ بادوست در آمیزم من
دستی نہ کہ باقضا در آمیزم من
پائی نہ کہ از میانہ بگریزم من

جس وقت بادشاہ پنجاب کی طرف متوجہ تھے، ہانسی کے علاقہ میں شیر بیگ تواچی کا عریضہ پہنچا کہ مظفر حسین مرزا گجرات سے بھاگ کر دکن چلا گیا ہے، وہاں اسے راجہ علی خان نے

گرفتار کر کے قید کر دیا ہے۔ بادشاہ نے یکم ذی الحج 985ھ/1577ء کو مقصود جوہری کے ہاتھ راجہ علی خاں کے نام ایک فرمان بھیجا کہ وہ میرزا کو دربار میں روانہ کر دے۔

چوبیسواں سال جلوس

پہلی محرم ذ 986ھ/1578ء کو نوروز ہوا اور جلوس اکبری کا چوبیسواں سال شروع ہو گیا۔

اکبر پر ایک خاص کیفیت کا ظہور

بادشاہ نے پٹن میں حضرت گنج شکر کے مزار پر حاضری دی اور نندنہ کے نواح میں قمرغہ کے شکار کا ارادہ کیا۔ چار دن تک برابر جانوروں کو ہانکا گیا۔ جس وقت دونوں طرف سے ہانکے کے جانور شکار گاہ میں آکر جمع ہو گئے اور بادشاہ شکار کے لیے چلے تو اچانک بادشاہ پر ایک عجیب غیر معمولی حالت طاری ہو گئی اور ان کی ظاہری حالت کچھ اس طرح متغیر ہو گئی کہ اس کی تعبیر کسی طرح ممکن نہیں لوگ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ اسی وقت بادشاہ نے شکار بند کر دینے کا حکم دے دیا:

ہشدار کہ فیض حق بناگاہ رسد
ناگاہ رسد بر دل آگاہ رسد

بادشاہ نے اس درخت کے نیچے جہاں یہ کیفیت وارد ہوئی تھی فقیروں اور مسکینوں کو دل کھول کر خیرات دی اور وہاں ایک عمدہ عمارت اور وسیع باغ کی بنیاد رکھنے کا حکم دیا۔ سر کے بال ترشوائے، بہت سے مصاحبین اس کیفیت و حالت کی بڑھ چڑھ کر تصدیق و تائید کرنے لگے۔ جب یہ خبر مشرقی ہندوستان میں پھیلی تو لوگوں میں طرح طرح کی افواہیں پھیل گئیں اور رعایا میں بڑی ہلچل سی پیدا ہو گئی لیکن کچھ عرصے بعد حالات اعتدال پر آ گئے۔

مدد معاش کا نیا قانون

بھیرہ کی اقامت میں دارالخلافہ سے بیگم بادشاہ لشکر میں تشریف لائیں۔ بادشاہ نے پنجاب

کی حکومت سعید خاں مغول کو تفویض کی۔ میر قاضی حسین میبدی کے پوتے علی بغدادی کو پنجاب کے اماموں کی مدد معاش سے متعلقہ آراضیات کے عمل دخل اور اس سلسلے کے دوسرے کاموں پر مقرر کیا گیا، نیز قدیم محالات کو منسوخ کر کے باقاعدہ پیائش کی جائے اور تمام اماموں کو ایک ہی گاؤں کی آراضیات میں حصہ دار بنا دیا جائے۔ اس نئے انتظام سے تمام ممالک محروسہ کے اماموں میں بڑی بے چینی پھیل گئی۔ یہ سب شیخ عبدالنبی کی ضد میں ہوا اور اس میں اس کے کارندوں کی بد دیانتی کا بھی بڑا دخل ہے۔

بادشاہ کی فتح پور کو واپسی

یہاں سے بادشاہ نے فتح پور کو واپسی کے لیے کوچ کیا اور 3 جمادی الثانی کو خضر آباد سادھورہ کے قریب بادشاہ کشتی پر سوار ہو گئے۔ امرا اور عہدے دار بھی ان کے ساتھ کشتیوں پر ہی روانہ ہوئے۔ لشکر نے خشکی کے راستے کوچ کیا۔ اسی مہینے کی 29 تاریخ کو سواری شاہانہ دہلی میں داخل ہوئی اور یکم ماہ رجب کو کشتی سے اتر کر بادشاہ اونٹ پر سوار ہوئے۔ اسی مہینے کی چھ تاریخ کو اجمیر پہنچ کر عرس میں شرکت فرمائی اور دوسرے ہی دن دارالخلافہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ اس تیزی سے سفر کیا کہ روزانہ پچاس کوس کا دھاوا مارتے ہوئے نویں رجب کو بروز جمعہ صبح کے وقت تودہ کی منزل پر آ کر قیام فرمایا۔ میں بیاور سے لوٹ کر بادشاہ کے استقبال کے لیے اسی منزل میں حاضر ہوا اور ایک کتاب "چہل حدیث"۔[50] جس میں جہاد کی فضیلت اور تیر اندازی کے ثواب پر حدیثیں ہیں اور اس کا نام تاریخی ہے، خدمت عالی میں پیش کی۔ بادشاہ نے یہ کتاب کتب خانے میں داخل کرا دی اور میری وعدہ خلافی کا کوئی تذکرہ نہ کیا۔ اسی دن شام کو بادشاہ فتح پور پہنچ گئے۔

عبادت خانے میں علماء کے ہنگامے

فتح پور آنے کے بعد بادشاہ کے اکثر اوقات عبادت خانے میں علما کی محفل میں گزرتے تھے، خاص طور سے جمعہ کی راتیں شب بیداری میں گزرتی تھیں اور دینی مسائل کی تحقیق

اور اصول و فروع کی بحثیں گرم رہتی تھیں۔ ان مجلسوں میں علما کی زبانیں ایک دوسرے کے مقابلے میں تلواروں کی طرف خوب اپنے جوہر دکھاتی تھیں۔ مذہب و مسلک کے اختلافات اتنے شدید ہوگئے کہ ایک دوسرے کی تکفیر دھڑلے سے کی جانے لگی تھی۔ شیعہ، حنفی، شافعی، فقیہ، وحکیم کے موازنے و مقابلے سے گزر کر اصول و مبہات دین پر بھی زبانوں کی چھریاں بے باکی سے چلنے لگیں۔

علما کے جھگڑے اور اکبر کی بے دینی

انھی دنوں مخدوم الملک نے شیخ عبدالنبی کی مخالفت میں ایک رسالہ لکھ دیا تھا جس میں خضر خاں شروانی کو جس پر حضور اکرمؐ کے خلاف بدزبانی کا الزام لگایا گیا تھا اور میر حبش کو جس پر رفض کا الزام تھا، ناحق قتل کرادیا۔ لہٰذا اس کے پیچھے نماز نہیں ہوسکتی، اس لیے بھی کہ اس کے باپ نے عاق کردیا تھا اور وہ خود خونی بواسیر کے عارضے میں مبتلا ہے۔ شیخ عبدالنبی نے بھی اس کی جہالت اور گمراہی ثابت کرنے میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ درباری ملاؤں میں سے کچھ اِس طرف اور کچھ اُس طرف ہوگئے اور ایک دوسرے کو گمراہ اور جہنمی بتانے لگے۔ علما کے ان اختلافات اور جھگڑوں کی وجہ سے اہل بدعت کو خوب کھیل کھیلنے کا موقع ملا۔ انھوں نے حقائق کو مسخ کرکے بادشاہ کو، جو خلوص کے ساتھ طالب حق تھا، لیکن ان پڑھ ہونے کی وجہ سے حقائق کا ادراک کرنے سے قاصر تھا اور علماء کے ان مباحث کی وجہ سے عالم حیرت میں مبتلا تھا، اصل دین ہی سے پھیر دیا اور دین و شریعت کی بنیادوں پر ایسی ضرب لگائی کہ ان پانچ چھ سالوں میں اسلام کا نام تک نہیں رہا اور وہ ساری بساط چوپٹ ہوکر رہ گئی۔

اکبر کی بے دینی کا آغاز

جیسا کہ بیان ہوچکا ہے علما کے باہمی اختلافات اور ملحدوں کی مداخلت کی وجہ سے بادشاہ کی نظر میں اسلام اور علمائے اسلام کی وقعت گھٹتی چلی گئی۔ کچھ تو اکبر کی طبیعت اور کچھ

حالات کا تقاضا، بہرحال نتیجہ یہی نکلا کہ بادشاہ نے بہت جلد سارے مسلّمہ اعتقادات سے منکر ہوکر الحاد و بے دینی کی راہ اختیار کرلی۔ بچپن سے عہد جوانی اور جوانی سے اس پختہ عمری تک اکبر کی کچھ ایسی ہی ڈانواڈول روش تھی وہ کبھی ایک نظریہ اور اعتقاد کا پابند نہیں رہا۔ طبیعت میں تحقیق وتجسّس کا جذبہ تھا جسے بدعقیدہ مصاحبوں نے غلط رخ پر پھیردیا۔ ابتدا میں تو صرف طلب حق کا سچا جذبہ تھا، چنانچہ اسی جذبے کے تحت اکبر ہر دین اور مذہب کے معتقدات اور ان کی تاریخ کو سمجھنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اس موقعے پر علما نے ایسی نا سمجھی کا ثبوت دیا کہ بجائے یہ کہ وہ بادشاہ کو صراط مستقیم پر لے جانے کے لیے حق پسندی کا رویہ اختیار کرتے اپنے اعزاز و مرتبے کو بڑھانے کی خاطر ایک دوسرے کی تکفیر و تذلیل کرنے لگے۔ ایک ہی مسئلے کو جب علماء کا ایک گروہ حرام اور دوسرا حلال کہنے لگا تو بادشاہ نہایت حیران اور اُن کی بحثوں سے دل برداشتہ ہوگیا۔ دربار میں مختلف مذاہب و مسالک کے جو گمراہ کن عناصر جمع ہوگئے تھے انھوں نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا اور دین کے معتقدات کو خلاف عقل ثابت کرکے اس کے ذہن کو انکار و انحراف کی طرف مائل کردیا۔ یہ سب کس طرح ظہور میں آیا اس کی بڑی تفصیلات ہیں۔

بے دینی کے محرکات اور اسباب

اس زمانہ میں دربار شاہی میں تقریباً ہر ملک کے اہل علم اور مفکر موجود تھے اور مختلف مذاہب کے عالم اور رہنما بھی جمع ہوگئے تھے۔ یہ لوگ رات دن مختلف علوم ونظریات پر تبادلہ خیال اور طرح طرح کی نکتہ چینی میں مصروف رہتے تھے۔ بادشاہ کو بھی فتوحات و مہمات کی طرف سے پوری فرصت تھی اس لیے وہ بھی مشغلوں میں اپنے اوقات صرف کیا کرتا تھا اور جو اصول وکلیات اسے پسند آجاتے خواہ وہ مسلمانوں کے معتقدات کے موافق ہوتے یا مخالف، انھیں وہ دل و جان سے قبول کرلیتا تھا اور جو باتیں اس کی نگاہ میں نہیں بھاتی تھیں، ان کو وہ ترک کردیتا تھا۔ اس طرح اس نے ترک واختیار اور ردّ وقبول کے ایک خاص شعور اور جداگانہ معرفت کو اپنا معیار بنالیا اور عجیب طرح کے ہیولائی اعتقادات نے اس کے ذہن پر غلبہ پالیا۔

وحدت ادیان کا تصور

مجموعی طور پر ایک خیال اسکے ذہن پر پتھر کی لکیر بن گیا تھا کہ اصحاب علم و دانش تمام مذاہب میں موجود ہیں اور ہر قوم وملت میں عبادت گزار صاحبان کشف و کرامت کی کمی نہیں رہی ہے اس لیے حق ہر مذہب اور قوم میں یکساں طور پر موجود ہے۔ اس لیے حق کو ایک ایسے دین اور ایک ایسی ملت میں محدود و منحصر کر دینا ضروری نہیں ہے جو نسبتاً نیا اور نو پیدا ہو اور اس کے نزول پر ابھی ایک ہزار سال بھی نہیں گزرے ہیں۔ اس صورت میں ایک دین کا انکار اور دوسرے کا اقرار اور بغیر کسی سبب کے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا کسی طرح بھی معقول و مناسب نہیں ہو سکتا۔

بادشاہ کے اس خیال کو وہ ملحد اور برہمن حسب موقع پختہ اور اٹل بنانے کی کوشش کرتے رہتے تھے جو ان دنوں شاہی محفلوں اور خلوتوں میں پیش پیش نظر آتے تھے اور بہ لحاظ علم و دانش علوم رسمی اور انسانی احوال و نفسیات پر ان کی گہری نظر تھی، وہ بڑی خوبی اور مہارت کے ساتھ اپنے مذاہب اور نظریات پر عقلی اور نقلی استدلال کر کے دوسروں کی تکذیب کرتے رہتے تھے۔ ان لوگوں نے بادشاہ کی خام خیالیوں کو راسخ اعتقادات کی شکل دے دی اور نظریات کو اس طرح بدیہیات بنا کر پیش کیا کہ ان سے پھر جانا اکبر کے لیے ممکن نہ رہا۔

اس نقطۂ نظر کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ حشر و نشر اور دوسرے دینی اصول و معتقدات جن کا ماخذ حکمت نبوی ہے، معتبر اور قابل قبول نہ رہیں۔ دینی مباحث اور نظریات کے متعلق متکلمین میں شدید اختلافات ہیں علم کلام کی کتابوں میں ان کے معارضے اور مجادلے درج ہیں۔ حریفوں نے چن چن کر ان کو ایک خاص زاویے سے بادشاہ کے سامنے پیش کیا اور اپنے اپنے مسلک و مذہب کی طرف اسے کھینچ لے جانے کی کوشش کی:

صیاد رقیب آن سگی قدر را چند　　　کاندر رخ ہر کس چو گل از باد خند

از حد چو شد نصیحت آن شوخ گرہ　　　بر گوشہ ابرو ز دو سر پیش افگند

عقیدۂ تناسخ کا اقرار

سب سے پہلے اکبر نے پرکھوتم[31] نامی برہمن کو جو "نامہ خرد افزا" کی ترجمانی پر مقرر تھا، تنہائی میں بلا کر موجودات اور اشیاء کے ہندی اسماء معلوم کیے۔ اس کے بعد دیوی برہمن خلوت شاہی میں حاضر ہوا۔ دیوی برہمن سے مذاکرات کے لیے ایک خاص انتظام کیا گیا تھا۔ ایک چارپائی کو رسیوں سے اوپر کھینچ کر بادشاہ کی خواب گاہ کے جھروکے کے برابر لگا دیا جاتا تھا اور وہ راتوں میں اس معلق حالت میں بیٹھا ہوا اپنی دیو مالا کے قصے سنایا کرتا تھا۔ دیوی برہمن ان مترجمین میں ملازم تھا جو "مہابھارت" پر کام کر رہے تھے۔ ان نشستوں میں اس نے بادشاہ کو ہندو مذہب کے اسرار بت پرستی کے طریقے، آگ او رآفتاب کی پوجا اور ستاروں کی تعظیم کے رموز بتائے اور مشرک بادشاہوں اور خیالی دیوتاؤں جیسے برہما، مہادیو، بشن، کشن، رام اور مہامائی (جن میں سے بعض کو ہندو خدا اور بعض کو فرشتہ کہتے ہیں) کی عظمت و احترام پر دلیلیں پیش کیں۔ اس کے اپدیش بادشاہ کے دل پر اثر کر گئے اور وہ عقیدہ تناسخ پر عقیدہ لے آیا۔ خوشامدی درباری کہاں پیچھے رہتے وہ بھی تناسخ کے اثبات وصحت پر رسائل لکھ لکھ کر بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے میں دوڑ لگانے لگے۔ بادشاہ ہندوؤں کے مذاہب کی تحقیق کی طرف جن کے ہندوستان میں بے شمار فرقے ہیں اور ہر ایک فرقہ بے شمار کتابوں پر عقیدہ رکھتا ہے اور اس کے باوجود بدبخت اہل کتاب نہیں ہیں بہت زیادہ قائل ہوگیا۔ ہندو مذہب کی طرف میلان کے جو نتائج تھے وہ روز بروز منظر عام پر آنے لگے۔

وحدت الوجود کا اثر

انہی دنوں شیخ تاج الدین ولد شیخ زکریا اجودھنی دہلوی بھی جن کو اکثر صوفیا "تاج العارفین" کہتے ہیں۔ خلوت گاہ میں باریاب ہوئے، وہ شیخ زمان[32] پانی پتی کے شاگرد تھے جو بہت سی کتابوں کے مصنف تھے جن میں "شرح لوائح" کافی مشہور ہے۔ کتاب "نزہۃ الارواح" پر بھی انھوں نے ایک مبسوط شرح لکھی ہے۔ علم تصوف اور علم توحید میں وہ ثانی

شیخ ابن عربی سمجھے جاتے تھے۔ تاج الدین بھی راتوں میں معلق چارپائی پر اوپر جا کر رات رات بھر اہل تصوف کے شطحیات اور مزعومات سنایا کرتا، وہ چونکہ شرعی پابندیوں کا قائل نہیں تھا اور گمراہ صوفیوں کی طرح وحدت الوجود کا پکا معتقد تھا جس کا نتیجہ سوائے الحاد اور اباحت کے کچھ اور نہیں نکلتا۔ اس نے وحدت الوجود کے اس خطرناک نظریے اور "فصوص الحکم" کے دوسرے مسائل مثلاً ترجیح رجا بر خوف اور "ایمان فرعون" وغیرہ بخوبی بادشاہ کے ذہن نشین کرا دیے۔ تصوف کے ان نظریات کا بھی اکبر کے ذہنی فتور اور احکام شریعت سے اس کی بیزاری میں بہت بڑا دخل ہے، چنانچہ اس کا یہ عقیدہ ہو گیا تھا کہ کافر دوزخ کی آگ میں ڈالے تو ضرور جائیں گے لیکن یہ عذاب ان کے لیے دائمی نہیں بلکہ عارضی ہوگا۔ شیخ تاج الدین نے اس مسئلہ کو آیات قرآنی اور احادیث نبوی سے خوب تاویلیں کر کے بخوبی باور کرا دیا تھا اور جب اس نے بادشاہ کو تصوف کو ان بھول بھلیوں میں اچھی طرح سرگشتہ کرا دیا تو اس نے اپنی تعلیم و تلقین کا آخری اور اہم نکتہ جو سب سے زیادہ خطرناک تھا نکال کر سامنے رکھا۔

انسان کامل کا تصور

شیخ نے اکبر کے سامنے "انسان کامل" کا ایک تصور پیش کیا اور پھر اس انسان کامل کو خلیفہ وقت سے تعبیر کر کے خود اکبر کو اس کا مصداق قرار دے دیا۔ انسان کامل کے درجہ تو صرف عین واجب یعنی ذات خداوندی کا ہی ہے، اس لیے شیخ کی کمند انسان کامل سے گزر کر عین واجب تک جا پہنچی۔ حوالی موالی ناچتے کو نچانے والے تھے۔ انھوں نے باتوں کے طوطا مینا بنائے اور خوب شگوفے چھوڑے۔ بس کیا تھا طرح طرح کی خرافات اور اختراعات شروع ہو گئیں چنانچہ بادشاہ کے لیے سجدہ تجویز کیا گیا اور اس کا نام "زمین بوس" رکھا گیا۔ بادشاہ کے ادب و احترام کو اتنا بڑھایا کہ اسے فرض عین اور چہرہ شاہی کو "کعبہ مرادات" اور قبلۂ حاجات قرار دیا گیا۔ کسی نے زبان ہلائی بھی تو ہندوستان کے بعض مشائخین کے ساتھ ان کے مریدوں کے عمل کو پیش کر کے اس کا منہ بند کر دیا گیا۔

خیر و شر کی وضاحت

ایک اور بزرگ شیخ یعقوب کشمیری اور ان کے ہمنوا بھی اس تگ و تاز میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ شیخ یعقوب بھی بہت سی کتابوں کے مصنف اور اپنے عہد کے مقتدا اور پیشوا سمجھے جاتے تھے۔ انھوں نے قاضی ہمدانی کی ''تمہیدات'' سے بعض باتیں لے کر ان سے یہ فلسفہ ترتیب دیا کہ محمد ﷺ، اللہ کے اسم ''الہادی'' کا مظہر ہیں اور ابلیس دوسرے اسم ''المضل'' کا مظہر ہے۔ اس لیے دنیا کا یہ سارا جلوہ انھی دو اسماء کا جلوہ ہے اور خدا کے یہ دونوں مظہر اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ (مفہوم یہ تھا کہ چونکہ خیر و شر من جانب خدا ہیں اس لیے دونوں میں اصل کے لحاظ سے کوئی فرق اور امتیاز نہیں ہے)

شیعیت کی چھاپ

مذکورہ بالا ''خلوت معلق'' کے بلند پروازوں میں ملا محمد یزدی بھی تھا وہ اپنے اعتقاد کے مطابق خلفائے ثلاثہ کے خلاف طنز و طعن کر کے اور عموم صحابہ، تابعین، تبع تابعین، صلحائے سلف و علمائے خلف سب کو کافر بتاتا اور بادشاہ کی نظر میں اہل سنت والجماعت کا درجہ گھٹانے کی فکر میں لگا رہتا تھا۔ بجز شیعہ کے، سب کو اس نے گمراہ کر کے دکھادیا اور اکبر کے خیالات پر شیعیت کی بھی اچھی خاصی چھاپ پڑ گئی۔

اس صورت حال سے پہلے اکبر کے دل پر علما کا بڑا اثر تھا، یہاں تک کہ وہ ان کو بلحاظ رتبہ و عظمت امام غزالیؒ اور رازیؒ سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر سمجھتا تھا لیکن جب ان عالموں کی رکیک حرکتیں اس کی نظر میں آئیں اور ان کے تحریم و تکفیر کے مناقشوں سے وہ سخت متنفر ہوا تو اس کے دل سے نہ صرف یہ کہ ان جھگڑالو عالموں اور قاضیوں کی عظمت ہی گر گئی بلکہ ان پر قیاس کر کے وہ بزرگان سلف کا بھی منکر ہو گیا۔

عقیدۂ تثلیث کا اثبات

اسی زمانے میں دربار میں عیسائیوں کی بھی آمد و رفت ہونے لگی تھی۔ یورپ کے اہل علم کو

پادری کہا جاتا ہے اور ان کے مجتہد کامل کو "پاپا" کہتے ہیں، جسے مصلحت اور وقت کے لحاظ سے امور دین میں تغیر و تبدل کا اختیار حاصل رہتا ہے اور بادشاہ وقت بھی اس سے روگردانی نہیں کر سکتا۔ جب عیسائی ...ری بھی بادشاہ کی عنایت کی نظر سے نوازے گئے تو انھوں نے انجیل پیش کی اور عقیدہ ثالث ثلاثہ (عقیدہ تثلیث) کے حق ہونے پر مباحثے کرتے رہے۔ اکبر نے جو اپنے زعم حق پرستی میں دنیا بھر کی گمراہیوں کا خریدار بنا ہوا تھا، نصرانیوں کو بھی خالی ہاتھ جانے نہیں دیا۔ ان کی عیسائیت کی تصدیق کی اور عیسوی مذہب کو پھیلانے کی ہمت افزائی کی۔ حسب الحکم شاہزادہ مراد نے عیسائی پادری سے انجیل کے چند سبق پڑھے۔ شیخ ابو الفضل کو انجیل کے ترجمے کے لیے حکم دیا گیا، اس نے ترجمہ شروع کیا تو اس پر بسم اللہ کے بجائے یہ فقرہ لکھا!

"ای نامی وی ژژو کرستو"

شیخ فیضی نے قافیہ پر ردیف چڑھائی اور دوسرا مصرع کہا:

"سبحانک لا سواک یا ھو"

ان ملعون عیسائیوں کی جسارت اتنی بڑھ گئی کہ انھوں نے دجال ملعون کے اوصاف اور حضور اکرم ﷺ کے اوصاف میں مشابہت پیدا کرنے تک سے دریغ نہیں کیا۔ (اے اللہ معاف کر، یا اللہ پناہ دے)

آفتاب پرستی کا آغاز

بیر بر ملعون بھی ایک دس کی کا نٹہ تھا، اس نے آفتاب پرستی سے اکبر کی آنکھوں کو اس طرح خیرہ کیا کہ آفتاب ہی مظہر کامل اور سرچشمہ سعادت ہے اس کی تاثیر سے غلہ پکتا ہے، کھیتیاں لہلہاتی ہیں، پھلوں میں رس اور سبزہ میں تراوت پیدا ہوتی ہے۔ دنیا کی روشنی اور دنیا والوں کی زندگی آفتاب ہی سے وابستہ اور متعلق ہے۔ اس لیے وہی ایک ایسا وجود ہے جس کی عبادت اور تعظیم ہونی چاہیے۔ پرستش کے لیے اس کے طلوع کی طرف رخ کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ غروب کی طرف جو زوال کی نشانی ہے۔ آفتاب پرستی کے ذیل میں

اس نے آگ، پانی، پتھر، درخت اور تمام مظاہر عالم یہاں تک کہ گائے، اس کے گوبر، قشقہ اور زنار کے تقدس کو بھی خوب بڑھا چڑھا کر بتایا۔ بادشاہ جب ان باتوں کی طرف مائل نظر آئے تو دربار کے بدبخت علما اور فضلا بھی چراغ دکھانے لگے کہ آفتاب "نیر اعظم" ہے۔ "عطیہ بخش ہمہ عالم ہے، مربی بادشاہان ہے"۔ غرض آفتاب پرستی کا بھی دربار میں خوب فروغ ہوا اور نوروز جلالی کی تعظیم بڑے اہتمام سے کی جانے لگی چنانچہ ہر سال اس دن اکبر ایک بڑا جشن منعقد کرتا تھا اور سات سیاروں میں سے ہر سیارے کے رنگ کے مطابق روزانہ ایک رنگ کا لباس زیب تن کرتا تھا۔ برہمنوں نے تسخیر آفتاب کا ایک عمل بتا دیا تھا وہ اس کا وظیفہ نصف شب کو اور طلوع آفتاب کے وقت پڑھا کرتا تھا۔ اس نے گائے کا ذبیحہ بند کرا دیا۔ اس کے گوبر کو پاک سمجھنے لگا اور گائے کا گوشت کھانا حرام ہو گیا۔ گاؤ کشی کی سزا میں اچھے اچھے آدمیوں کو قتل کرا دیا گیا۔ طبیبوں نے بھی گاؤ کشی کے خلاف نسخہ آرائی کے جوہر دکھائے اور گاؤ زبانی کی کہ علم طب کی رو سے گائے کا گوشت طرح طرح کی بیماریوں کا باعث ہے اور ہاضمے کو خراب کرتا ہے۔

آتش کدے کا قیام

دربار میں گجرات کے شہر نوساری سے آتش پرستوں کا بھی ایک گروہ دینی خراج لینے کے لیے پہنچ چکا تھا۔ انھوں نے زردشت کے دین کو حق بنا کر پیش کیا اور آگ کی تعظیم کو سب سے بڑی عبادت بتلایا۔ کیانی بادشاہوں کی راہ و روش کے قصے بیان کر کے اکبر کو اپنے معتقدات کی طرف جھکا لیا۔ چنانچہ اکبر نے حکم دیا کہ سلاطین عجم کی طرح جو اپنے آتش کدے کو ہمیشہ دہکتا ہوا رکھتے تھے، ہمارے محل میں بھی شب و روز آگ جلتی رہنی چاہیے۔ کیونکہ آگ بھی خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی اور اس کے انوار کا پرتو ہے۔ اس آتش کدے کا انتظام شیخ ابو الفضل کے سپرد کیا گیا۔

اکبر اپنی جوانی کے زمانے ہی سے ہندوستانی راجاؤں کی لڑکیوں کی صحبت میں ہوم (ہون) کیا کرتا تھا جو ہندوؤں کی آتش پرستی کی ایک پوجا ہے۔

آفتاب اور آگ کی پرستش

حکومت کے پچیسویں سال کے نوروز کے دنوں میں اکبر نے آفتاب اور آگ کے سجدہ کا اعلان کیا۔ مصاحبین بھی چراغ جلنے کے وقت قیام کا اہتمام کرنے لگے۔ سنبلہ کی آٹھویں عید کے دن اکبر ہندوؤں کی طرح پیشانی پر قشقہ (تلک) لگا کر دولت خانے میں آیا اور جواہرات پروئی ہوئی ایک ڈوری برہمنوں سے اپنے ہاتھ پر تبرک کی خاطر بندھوائی اور امراء نے حسب مدارج مروارید اور جواہرات اس دن نذر گزارے اور اس توہم پرستی کی عملاً وقولاً تائید و حمایت کی۔ بادشاہ نے راکھی بندھوانی بھی شروع کردی۔ غرض اسلام کے خلاف دوسرے مذاہب والے جو حکم اور رسم بھی بیان کرتے تھے اکبر اس کو نص قاطع سمجھتا تھا اور امت مسلمہ کے تمام احکام خلاف عقل تھے جن کو عرب کے سر پھروں اور رہزنوں نے وضع کیا تھا اور ان احکام کو ماننے والے سارے مسلمان بادشاہ کی نظر میں حقیر و ذلیل ہو گئے تھے۔ کیا کہا جائے مختصر یہ کہ "یریدون یسطفوو بافواھھم و اللہ متم نورہ و لو کرہ الکافرون" (وہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں، اللہ نے اپنے نور کی تکمیل کردی ہے اگرچہ کافروں کو یہ بات بڑی ناگوار ہے)

بتدریج یہ بے دینی اور بد اعتقادی اس انتہا پر پہنچ گئی کہ احکام شریعت اور اسلام کی تردید و تضحیک کے لیے کسی دلیل اور تاویل کی بھی ضرورت نہیں رہی، جب جی چاہتا کسی بھی حکم کو اعلانیہ ترک کردیا جاتا۔

ابوالفضل کی بے دینی

مجھے یاد ہے کہ ان مباحث کے آغاز میں ایک بار فتح پور کے دیوان خانہ خاص میں شیخ ابو الفضل سے میری[53] گفتگو ہوئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ "مجھے تمام مصنفوں سے ایک شکایت ہے کہ انھوں نے اپنے پیغمبر ﷺ کے واقعات تو نہایت تفصیل سے سن وار لکھے ہیں اور پچھلے پیغمبروں کا حال اس تفصیل سے نہیں لکھا۔ میں نے جواب دیا "نبیوں کے تذکرے میں متعدد "قصص الانبیاء" لکھی گئی ہیں۔ اس نے کہا "نہیں وہ بہت مختصر ہیں

تفصیل سے لکھنے کی ضرورت تھی"۔ میں[59] نے کہا اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ انبیا کے زمانے کو کافی طویل عرصہ گزر گیا تھا اس لیے مفسرین ارباب تاریخ و سیر نے وہی باتیں لکھیں جو ان کے نزدیک تحقیق شدہ تھیں، جن کا ثبوت ان کو نہیں ملا اسے چھوڑ دیا ہوگا۔ اس نے کہا" یہ کوئی جواب نہیں ہوا"۔ پھر اس نے ایک بات چھیڑ دی کہ "تذکرۃ الاولیا" اور "نفحات الانس" اور ان جیسی دوسری کتابوں میں ہر پیشہ اور گروہ کے لوگوں کا ذکر ہے لیکن معلوم نہیں اہل بیت سے کیا قصور ہوا تھا کہ ان کتابوں میں ان کا ہی تذکرہ نہیں ہے۔ کیا یہ بات کچھ کم حیرت انگیز نہیں ہے"۔ میں نے اس کے جواب میں جو کچھ مناسب تھا کہا لیکن سمجھتا کون ہے؟ آخر میں نے اس سے پوچھا کہ ان مشہور مذہبوں میں سے تمہارا میلان کس مذہب کی طرف ہے؟ اس نے کہا "میں تو ابھی چند دن الحاد کی وادی میں سیر و سیاحت کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں"۔ میں نے مذاقاً چھیڑتے ہوئے کہا: "نیک ارادے ہیں، بشرطیکہ تم اپنی بیوی کو طلاق دے دو"۔ جیسا کہ مشہور ہے:

برداشت غل شرع بتائید ایزدی
از گردن زمانہ علی ذکرہ السلام

میری بات پر وہ ہنس پڑا اور بات آئی گئی ہوگئی۔

ابوالفضل کی گستاخی

ابوالفضل کو شاہی حمایت حاصل تھی۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے "یک عنایت قاضی بہ از ہزار گواہ" جسے پیا چاہے وہ سہاگن" والا معاملہ تھا۔ اس لیے وہ ان بد اعتقادیوں کے بارے میں شیخ صدر، قاضی، حکیم الملک اور مخدوم الملک جیسے بوڑھوں کو بڑی جسارت سے چھیڑ چھیڑ کر بحثیں کیا کرتا تھا اور ان کی بے عزتی کرنے میں ذرہ برابر بھی نہیں جھجکتا تھا۔ بادشاہ اس کی لن ترانیوں کو سن سن کر خوش ہوتے تھے۔

بوڑھے علما نے عاجز آ کر ایک مرتبہ آصف خاں میر بخشی کے ذریعے خفیہ طور پر ابوالفضل کو کہلوایا کہ "تم آخر کس وجہ سے ہمارے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑے رہتے ہو؟" اس

نے جواب دیا، بس یہ مثل سمجھو "میں بگین کا نہیں بادشاہ کا نوکر ہوں"۔ غرض اس نے تھوڑے ہی عرصے میں ان عالموں کو اپنی ذہانت، باپ کی سعادت اور بادشاہ کی پشت پناہی اور بخت کی یاوری سے ایک ایک کر کے ذلیل و خوار کر دیا اور کوئی مسلمان عالم سوائے حکیم ابو الفتح اور ملا محمد یزدی کے جو بعض مسائل میں اس سے متفق نہیں تھے، اس کے سامنے فروغ نہ پاسکا اور اہل علم کی ساری بساط الٹ کر رہ گئی۔

دربار سے کنارہ کشی

جب دربار کا یہ رنگ ہوا تو میں نے گوشۂ عزلت اختیار کر لیا اور درباداری سے بڑی حد تک دور ہی رہنے لگا۔ بادشاہ کی نظریں بھی مجھ سے پھر گئی تھیں اور غیریت کا پردہ درمیان میں آگیا تھا، خدا کا شکر ہے کہ میں اپنے اس حال ہی میں خوش رہا ہوں:

دل در تنگ و پو نشد نیکو شد کہ نشد　　جز در تو فرو نشد نیکو شد کہ نشد
گفتی کہ برنجم از نیکو نشد کارت　　دیدی کہ نیکو نشد نیکو شد کہ نشد

میں اپنے آپ کو کسی رعایت کے قابل سمجھتا تھا نہ ان کی خدمت کے لائق:

بیا تا تکلف بہ یک سو نہیم
نہ از تو قیام نہ از ما سلام

کبھی دور ہی سے آستانے پر کورنش بجا لاتا تھا اور اہل محفل کا تماشا دیکھتا رہتا تھا:

دیدم کہ دیدن رخت از دور خوشتر است
صحبت گذاشتم زتماشائیان شدم

میں نے اوپر جتنے حالات بیان کیے ہیں ان کی جزئیات اور تفصیلات سن وار ترتیب سے بیان کرنا ممکن نہیں، اس لیے اتنے ہی پر یہ قصہ ختم کرتا ہوں۔ بہر حال اللہ تعالیٰ ہر حالت میں بندہ کا نگہبان اور محافظ ہے حزم و احتیاط کا تقاضا تو یہ ہے کہ میں ان حالات کو قلمبند نہ کرتا، لیکن خدائے برتر گواہ ہے کہ دین کے درد اور ملت مرحومہ اسلام کی دلسوزی میں میرا قلم رک نہ سکا اور یہ باتیں زبان قلم پر آگئیں۔ اس میں نہ تو مقصود کسی قسم کا طعن و طنز کرنا

ہے نہ اس کے پیچھے حسد و تعصب کا کوئی جذبہ کام کر رہا ہے۔

صرف ہوائی کا عمل

انہی دنوں بادشاہ نے شیخ مبارک سے "صرف ہوائی" کا عمل سیکھنا شروع کیا۔ شیخ مبارک سے ملاقات سے پہلے ایک دن شیخ فیضی نے اکبر سے کہا "ہمارے شیخ کسی قسم کا تکلف نہیں برتتے" بادشاہ نے فوراً جواب دیا "ہاں انھوں نے اپنے سارے تکلفات تمہارے سپرد کر دیے ہیں"۔

اکبر نے شیخ منجھو، میاں تان سین[55] اور دوسرے تمام موسیقاروں کو شیخ مبارک کے پاس بھیجا تا کہ وہ ان میں سے ایک دوسرے پر ترجیح دیں۔ شیخ مبارک نے میاں تان سین سے اس موقع پر کہا تھا۔ ہم نے سنا ہے تم بھی کچھ گا لیتے ہو اور جب اس نے گا کر سنایا تو شیخ نے اس کے گانے کو جانوروں کے چلانے سے تشبیہ دی اور اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔

آبی محل کی تعمیر

اسی سال فتح پور میں ایک حکیم آیا تھا اس نے ایک ایسے گھر کی تجویز پیش کی جس کے چاروں طرف پانی ہو اور غوطہ لگائے بغیر گھر میں داخل ہونا ممکن نہ ہو، خوبی یہ کہ پانی گھر میں کسی طرح سے بھی سرایت نہ کر سکے۔ بادشاہ نے اس تجویز کو منظور کر لیا اور دولت خانے کے صحن میں بیس گز چوڑا، بیس گز لمبا اور تین گز گہرا ایک حوض بنایا گیا۔ اس کے اندر ایک سنگین کمرہ تعمیر ہوا جس کی چھت پر ایک بلند مینارہ تھا۔ اس کمرے کے چاروں طرف پل بنائے گئے لیکن حکیم کا دعویٰ قرابا دین کی طرح غلط ہی ثابت ہوا اور وہ چھپ کر کہیں بھاگ گیا۔ ایسا ہی ایک حوض سترہ سال کے بعد حکیم علی گیلانی نے لاہور میں بنایا تھا اس حوض کی تاریخ "حوض حکیم علی گیلانی" نکالی گئی تھی۔

بادشاہ نے اس نامکمل حوض کو زر سیاہ سے جس کی قیمت میں کروڑ روپیہ ہوتی تھی بھروایا۔ اور وہاں پر موسیقی کی ایک محفل منعقد کی۔ شیخ منجھو ایک خوش آواز قوال تھا، صوفیانہ

وضع قطع میں رہتا تھا اور شیخ ادھن جون پوری کا مرید تھا۔ اس کی تاریخ وفات اس کے نام ہی سے نکلتی ہے۔ اس محفل میں شیخ منجھو نے اپنے فن کا کمال دکھایا۔ بادشاہ نے اس کو بہت داد دی اور بڑے خوش ہوئے۔ محفل میں میاں تان سین اور ہندوستان کے دوسرے بہت سے دھن سرے گوئیے بھی بلائے گئے تھے بادشاہ نے شیخ منجھو کو ان سب پر ترجیح دی اور حکم دیا کہ اس حوض کا سارا سونا شیخ اٹھالے جائے وہ بیچارا اس کو بھلا کس طرح اٹھا سکتا تھا اس لیے اس نے تھوڑے سے سونے کی درخواست کی۔ بادشاہ نے اس کے عوض ایک ہزار روپیہ اسے عطا فرمادیا اور وہ باقی سونا تین سال کی مدت میں جا، بے جا اخراجات میں صرف ہوتا رہا۔

معصوم خان کی آمد

اسی سال میرزا محمد حکیم کا کوکہ معصوم خاں نہایت بہادر نوجوان تھا اور بڑے بڑے کارنامے انجام دے چکا تھا میرزا سے ناراض ہوکر بادشاہ کے پاس آگیا تھا۔ اکبر نے اسے پانصدی کا عہدہ دے کر بہار کی حکومت پر روانہ کردیا۔ معصوم خاں نے وہاں کے مشہور پٹھان سردار کالا پہاڑ سے جنگ کرکے فتح حاصل کی۔ بادشاہ نے اس کارنامے پر فتح پور سے ہزاری کا فرمان اور خاصہ کا گھوڑا اس کے لیے روانہ کیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے خواب میں حضرت علیؓ کو دیکھا تھا کہ انھوں نے اس کی پیٹھ پر اپنا پنجہ مبارک رکھا تھا، اسی برکت سے اس نے کسی جنگ میں بھی پیٹھ نہیں دکھائی اور اس پنجے کا نشان اس کی پیٹھ پر نظر آتا ہے:

"چہ باک از موج بحر آں را کہ باشد نوح کشتیباں"

اسی سال ماہ شوال میں ایک نہایت کمینہ اور ذلیل آدمی ملا طیب کو کیتھل سے بلا کر دربار میں نوازا گیا۔ بادشاہ کی اکثر نوازشیں بس کچھ اسی قسم کی رہتی تھیں۔ ملا طیب کو صوبہ بہار اور حاجی پور کا دیوان مقرر کیا گیا اور رائے پرکھوتم (56) کو جو اسی قبیل کا آدمی تھا بخشی کا عہدہ ملا اور ملا مجدی سرہندی کو جو پہلے سلیم شاہ کے عہد میں پرچہ نویس تھا، امین بنایا گیا اور شمشیر خاں خواجہ سرا کو خالصہ کا مہتمم مقرر کیا گیا۔ وہاں پہنچنے کے بعد ان کمینے لوگوں نے

خوب ہاتھ پیر نکالے۔ ان کو نہ تو خدا کا خوف تھا نہ بادشاہ کا لحاظ تھا وہ من مانی حکومت کرنے لگے اور اس وقت اور موقعے کو غنیمت جان کر ایسی ایسی کاروائیاں کیں کہ سارے لشکری ان کے ہاتھوں تنگ آ گئے اور زبردستی معصوم خاں کو باغی بنا دیا جس کا ذکر ہم آگے کریں گے۔

اسی مہینے مرزا مظفر حسین، راجہ علی خاں کے نذرانوں کو خاندیس سے لا کر حاضر خدمت ہوا۔ اکبر نے کچھ عرصہ بعد میرزا کے قصور معاف کر دیے اور انہی دنوں اس کو اپنا داماد بنا کر اسے عزت و مرتبہ عطا فرمایا۔

اسی سال بادشاہ نے شہباز خاں بخشی کو غازی خاں بدخشی اور شریف خاں اتکہ کے ساتھ رانا کیکا پر فوجی حملے کے لیے مقرر فرمایا۔ رانا کیکا کومبھل میر کے مستحکم قلعے میں محصور ہو گیا تھا بادشاہی فوجوں نے حملہ کر کے قلعے کو فتح کر لیا اور اس کے سارے ملک کو تہ و بالا کر دیا اور رانا راتوں رات قلعے سے بھاگ کر دوسرے پہاڑی علاقے میں چلا گیا۔ اسی سال سلطان خواجہ مکہ معظمہ سے لوٹ کر آیا اور وہاں سے بادشاہ کے لیے عربی نسل کے گھوڑے، حبشی غلام اور دوسرے نفیس تحفے لا کر پیش کیے، اسے صدارت کا عہدہ عطا کیا گیا۔

حاجیوں کے قافلے کی روانگی

986ھ/1578ء میں امیر حجاج کا اعزاز حضرت خواجہ احرار کے پوتے خواجہ محمد یحییٰ کو ملا۔ اکبر نے انکو چار لاکھ روپیہ دیا اور اسی سال شوال کے مہینے میں حاجیوں کے قافلے کو اجمیر سے روانہ کیا گیا۔ شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک کو بھی جن کے آپس کے جھگڑوں کی وجہ سے اکبر اسلاف سے متنفر اور احکام دین سے منحرف ہو گیا تھا، اسی قافلے کے ساتھ حج کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ ان لوگوں نے آئندہ سال حج کا فریضہ ادا کیا۔ ان کے سفر کی تاریخ "ھو عزیز قوم ذلو" نکالی گئی تھی۔

خان جہاں کا انتقال

983ھ/1575ء کے آغاز میں حاکم بنگالہ خاں کے انتقال کی خبر ملی، اس کے بھائی اسمٰعیل قلی

خاں کے نام عنایت آمیز فرمان صادر کیا گیا۔ مظفر خاں جو اس وقت دیوان کے عہدے پر فائز تھا بنگالہ کا حاکم مقرر ہوا۔ رضوی خاں بخشی بنایا گیا اور فتح پور سے حکیم ابوالفتح کو صدر اور رائے پتر داس کو میر ادہم کی شرکت میں دیوان بنا کر روانہ کیا گیا۔

19 ماہ صفر کو چالیس سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک لڑکا عنایت فرمایا۔ اس کا نام میں نے محی الدین رکھا، یہ لڑکا پشاور میں پیدا ہوا تھا۔

تحائف اور نذرانے

بادشاہ نے ملا عشقی کو جسے خاں کا خطاب حاصل تھا اور شاعری میں اس کا ایک دیوان اور مزاحیہ مثنوی بھی ہے، کشمیر میں وکیل بنا کر بھیجا تھا۔ اسی سال وہ قاضی صدرالدین لاہوری کے ساتھ دربار میں واپس آیا۔ اس کے ہمراہ حاکم کشمیر کا ایلچی محمد قاسم نامی بھی آیا تھا۔ یہ لوگ وہاں سے بہت سا زعفران، مشک، عود، شال اور کشمیر و تبت کے دوسرے تحائف بطور پیش کش لے کر آئے۔

اس زمانے میں حکیم الملک گیلانی کے داماد حکیم علی کو جو حکمت و طب اور دوسرے علوم میں بے مثل مہارت رکھتا تھا، عادل خاں دکنی کے قاصدوں کے ہمراہ ایلچی بنا کر روانہ کیا گیا۔

اسی زمانے میں میرزا شاہرخ کا بہنوئی میر نظام بدخشاں سے سفیر بن کر آیا اور بدخشی گھوڑے، قیمتی لعل اور بہت سے اونٹ نذرانے میں پیش کیے۔

اکبر کی خطبہ خوانی

اس زمانے میں اکبر پر دنیاوی اقتدار کے ساتھ دینی سیادت پر بھی قبضہ جمانے کی دھن سوار ہوگئی تھی اور اسے کسی دوسرے کی پیروی و متابعت گراں گزرنے لگی تھی۔ اس نے یہ سن رکھا تھا، حضور اکرم خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین اور بعض دوسرے سلاطین جیسے امیر تیمور صاحبقران، میرزا الغ بیگ گورکانی وغیرہ خود خطبہ پڑھا کرتے تھے، اکبر نے بھی بظاہر اسلاف کی پیروی میں لیکن درحقیقت اپنے حق اجتہاد کو مضبوط کرنے کی غرض سے

یکم جمادی الاول 987ھ/ 1589ء کو فتح پور کی جامع مسجد میں جو بادشاہی محل کے قریب تھی، جمعہ سے پہلے خطبہ پڑھنا چاہا، لیکن جب وہ منبر پر چڑھا تو گھبرا گیا اور لرزنے لگا بڑی مشکل سے شیخ فیضی کے یہ تین شعر وہ بھی ادھورے پڑھ کر اتر آیا۔ یہ شعر بھی اس صورت میں ادا ہوئے کہ دوسرے برابر سے بتاتے جاتے تھے۔ اس خطبے کے بعد حافظ محمد امین کو امامت کرنے کا حکم دیا۔ بادشاہ نے جو شعر پڑھنا چاہے تھے وہ یہ ہیں:

خداوندی کہ مارا خسروی داد — دل دانا و بازوی قوی داد

بعدل و داد مارا رہنمون کرد — بجز عدل از خیال ما برون کرد

بود وصفش زحد فہم برتر — تعالیٰ شانہ اللہ اکبر

بادشاہی عقائد پر عوام کی بے چینی

بادشاہ کی بد اعتقادی کو دیکھ کر لوگوں کی جراتیں بڑھ گئیں اور اسلامی عقائد اور فروعی مسائل کا اعلانیہ مضحکہ اڑنے لگا۔ بد بخت ہندو اور ہندو مزاج مسلمان نبوت کے بارے میں زبان درازیاں کرنے لگے۔ علمائے سوء نے اپنی کتابوں میں نعت کی جگہ تبرا شروع کر دیا۔ توحید کے ذکر کے بعد وہ حسب قاعدہ نعت کے بجائے بادشاہی القاب لکھنے لگے۔ انھیں ہمت نہیں پڑتی تھی کہ مقتدر دروغ بافوں کے مقابلے میں حضور اکرمؐ کا نام بھی لیں۔ ان باتوں پر عوام میں بڑی چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور لوگوں میں بادشاہ اور بادشاہ پرستوں کی بدنامی اور رسوائی عام ہوگئی۔ ملک میں فتنہ و فساد کا دروازہ کھل گیا۔ عوام و خواص میں جو لوگ سفلہ طبیعت اور پست فطرت تھے وہ ان بے ادبیوں کے باوجود خود کو بادشاہ کا مرید کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے اور لالچ یا خوف سے بادشاہ کے مرید ہو جاتے تھے۔ کسی کا بس نہ تھا کہ حق بات زبان پر لائے۔

اسی زمانے میں حاکم بنگالہ مظفر خاں نے پانچ لاکھ روپیہ نقد اور دوسرے قیمتی تحائف، ہاتھی اور کپڑے وغیرہ کافی تعداد میں نذرانے کے لیے دربار میں بھیجے۔ محمد معصوم کابلی کے بھیجے ہوئے 39 ہاتھی بھی خدمت شاہی میں پیش کیے گئے۔

خیرات کا مظاہرہ

اسی مہینے کے دوسرے جمعہ کو چوگان بازی کے میدان میں فقیروں اور مستحقوں کو جمع کیا گیا اور بادشاہ خود وہاں تشریف لے گئے۔ اس وقت احاطے میں تقریباً ایک لاکھ مرد اور عورتیں جمع تھیں۔ سلطان خواجہ صدر اور قلیچ خاں نے ایک ایک کو روپیہ تقسیم کیا۔ وہ دن بھی محشر سے کچھ کم نہ تھا۔ ہجوم کی ریل پیل میں 80 عورتیں اور بچے ہلاک ہو گئے۔ بعض عورتوں کے پاس سے جن کے شوہر بنگال میں مر چکے تھے، اشرفیوں اور روپیوں سے بھری ہوئی تھیلیاں بھی برآمد ہوئیں۔ اس انکشاف سے بادشاہ کا دل فقراء کی طرف سے بھی بیزار ہو گیا اور حکم دیا گیا کہ اس کے بعد تھوڑے سے لوگ حاضر کیے جائیں کچھ عرصے کے بعد خیرات کا یہ سلسلہ بھی بند ہو گیا۔

شاہزادہ سلیم کی اتالیقی

بڑے شاہزادہ کی اتالیقی پر قطب الدین محمد خان ککہ کو مقرر کیا گیا۔ اس تقریب کے لیے ایک بڑی محفل منعقد ہوئی اور قطب الدین نے عمدہ ہاتھی اور اپنے عہدے کے شایان شان نذرانے پیش کر کے رسم و قاعدے کے مطابق شاہزادہ کو کاندھے پر بیٹھا کر سونا اور جواہر کے تھال نچھاور کیے۔

اسی سال ماوراءالنہر سے عبداللہ خاں اوزبک کا ایلچی چاپلوسی کا خط لے کر آیا۔ اکبر نے میرزا فولاد برلاس کو خواجہ خطیب کے ہمراہ جو بخارا کا باشندہ تھا، تحفے اور ہدیے دے کر اوزبک کے ایلچی کے ساتھ بھیجا۔ بادشاہ کے خط کے آخر میں یہ شعر درج کیا گیا تھا:

چو ما دوست باشیم با یکدگر
بود بحر و بر ایمن از شور و شر

اکبر کے حق اجتہاد کے لیے علما کا محضر

بادشاہ کی دینی سیادت کو تسلیم کرانے کے لیے ان دنوں ایک محضر تیار کیا گیا جس میں مجتہد

شرع پر امام عادل کی فضیلت ثابت کی گئی تھی اور امام عادل (حکمران وقت) کو اس بات کا حق دیا گیا تھا کہ وہ اختلافی مسائل میں کسی روایت کو دوسری روایتوں پر ترجیح دے سکتا ہے اور اس کے مطابق تجویز و فیصلہ کر سکتا ہے۔

اس محضر نامے پر مخدوم الملک شیخ عبد النبی صدر الصدور، قاضی جلال الدین ملتانی (قاضی القضاۃ)، صدر جہاں مفتی اعظم، مشہور عالم شیخ مبارک اور غازی خاں بدخشی نے جو معقولات کا بہت بڑا عالم تھا اپنے دستخط کیے تھے اور اس پر ان کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔

اس محضر کا منشا یہ تھا کہ بادشاہ جو بھی تجویز اور حکم دیں خواہ وہ امور مملکت ہوں یا مسائل شرع اس سے انحراف و اختلاف کی کسی شخص کو مجال نہ رہے اور جو ایسا کرے وہ اس محضر کی رو سے خود ہی ملزم بن جائے۔

اس محضر سے متعلق بڑی بحثیں ہونے لگیں۔ ان مباحث کا موضوع یہ تھا کہ اجتہاد اور مجتہد کی اصطلاحوں کا آخر کس پر اطلاق ہوتا ہے؟ اور ایسے امام عادل کو جو امور مملکت میں صاحب تدبر ہو اور بلحاظ مراتب مجتہدین سے بلند مرتبہ ہو اس بات کا اختیار رکھتا ہے یا نہیں کہ وہ مصلحت وقت کے لحاظ سے اختلافی مسائل میں اپنا فیصلہ نافذ کر دے۔

یہ بحث وتمحیص تو ہوتی رہی لیکن عملاً یہی ہوا کہ اس محضر نامے پر بعض نے خوشی سے اور بعض نے جبراً مہریں لگا کر اس کی تصدیق کر دی۔

محضر نامے کا متن

اس تمہید وتشریح کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان جیسا وسیع ملک سلطان جہاں پناہ کے عدل و انصاف تدبر و انتظام سے دارالامن بن چکا ہے اور ہر جگہ کے خواص و عوام خاص طور سے عرب و عجم کے علما و فضلاء یہاں آ کر مقیم ہو چکے ہیں۔ بنا بریں تمام علماء نے بڑے غور وفکر کے بعد اس آیت کریمہ کے پیش نظر کہ "اطیعو الله واطیعو الرسول و اولی الامر منکم" اور اس حدیث صحیح کی روشنی میں کہ "ان احب الناس الی الله یوم القیامة امام عادل من یطیع الامیر فقد اطاعنی و من یعصی الامیر فقد عصانی و غیر ذلك نیز عقلی اور نقلی

دلائل و شواہد کی بنا پر یہ حکم لگایا کہ "سلطان عادل کا مرتبہ اللہ کے پاس مجتہد کے مرتبہ سے بڑھ کر ہے"۔

لہٰذا حضرت سلطان الاسلام امیر المومنین ظل اللہ ابو الفتح جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ، عوام کی سہولت اور مملکت کے انتظامی مصالح کی خاطر اگر دین کے وہ مسائل جو مجتہدین کے نزدیک اختلافی ہوں کسی بھی ایک صورت کو تجویز کر کے اس کے مطابق احکام کا اجرا فرمائیں تو ان کی تجویز و حکم متفق علیہ متصور ہوگا اور اس کی اطاعت اور پیروی تمام رعایا پر لازمی اور قطعی ہوگی۔

جب بھی سلطان عالم پناہ کوئی بھی ایسا قانون اور حکم نافذ فرمائیں جو عوام کے لیے باعث سہولت ہو اور نصوص شرع کے مغائر نہ ہو اس پر عمل درآمد ہر شخص پر لازم و قطعی ہوگا اور اس کی مخالفت عذاب اخروی اور خسران دینی و دنیاوی پر منتج ہوگی۔

یہ سطور حقوق اسلام کے اجرا کی خاطر علمائے دین اور فقہائے مجتہدین کے محضر سے ماہ رجب 987ھ / 1589ء میں ضبط تحریر میں لائی گئی۔ اس محضر کا مسودہ شیخ مبارک نے مرتب کیا تھا دوسرے علما نے کراہتاً اس کی نقلیں کیں۔ شیخ مبارک نے بڑے انشراح قلب کے ساتھ محضر کے ذیل میں یہ فقرہ لکھا کہ "میں اس بات کا دل و جان سے خواہش مند تھا اور سالہا سال سے اس کا منتظر تھا"۔ اس محضر کی صورت میں بادشاہ کو کلی اختیارات مل گئے۔ بس پھر کیا تھا جلد ہی اجتہاد کا دروازہ کھل گیا اور کسی کو کسی قسم کی مخالفت کی مجال نہیں رہی۔ تحلیل و تحریم کا جھگڑا مٹ گیا اور شریعت کے مقابلے میں امام کی رائے کو فوقیت حاصل ہوگئی۔ بادشاہ نے کھلم کھلا اسلام کو تقلید کا نام دے کر پس پشت ڈال دیا۔ شیخ ابوالفضل کا معاملہ سمرقند کے حیرتی شاعر کے مماثل تھا کہ جب اس نے ماوراء النہر کے سرد مزاج لوگوں کے ہاتھوں تکلیفیں اٹھائیں تو ان کی ضد میں عراق کے چگادری مومنوں کے ساتھ اس نے یارانہ کر لیا اور ان کے ساتھ بھٹکتا پھرا۔ ابوالفضل نے بھی اس بے دینی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور منہ دیکھے کی شرم میں آخرت کے انگارے سمیٹ لیے۔

اجمیر کا آخری سفر

اسی سال 16 ماہ رجب کو بادشاہ اجمیر تشریف لے گئے۔ یہ بس اجمیر کا آخری سفر تھا، اس کے بعد سے آج تک کہ چودہ سال گزر گئے۔ عنان شاہی اس طرف پھیری نہیں گئی۔ حسب دستور اجمیر سے پانچ کوس پر پیادہ ہو کر سفر کیا اور مزار مبارک کی زیارت کی۔

ان دنوں لوگ بادشاہ پر پھبتی کستے تھے کہ "کیا خوب خواجہ اجمیریؒ کے ساتھ تو یہ عقیدت اور اس اصل اصول سے جس کے طفیل دنیا کے ہر گوشے میں خواجہ صاحب جیسے ہزاروں کامل ولی پیدا ہوئے یہ انحراف و سرتابی":

پری نہفتہ رخ و دیو در کرشمہ ناز
بسوخت عقل ز حیرت کہ این چہ بوالعجبی است
درین چمن گل بی خار کس نچید آری
چراغ مصطفوی باشرار بولہبی است

بادشاہی کلمہ

مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی ہزار بے وقعت سہی لیکن ان کے ہوتے ہوئے دینی معاملات میں اکبر کی جسارتیں رکی رکی اور سہمی سہمی رہیں۔ ان کے جانے کے بعد گویا پاؤں کی بیڑیاں کٹ گئیں اور اس نے دھڑلے سے عقائد و مسائل میں نئی نئی اختراعات شروع کردیں۔ چنانچہ قرآن کو مخلوق قرار دے دیا، وحی کو امر محال کہا، نبوت و امامت کے بارے میں شکوک پیدا کیے، جن فرشتے اور دوسرے تمام امور غیبی، معجزوں اور کرامتوں کا انکار کردیا۔ قرآن کے تواتر اور اس کے کلام الٰہی ہونے پر بھی اعتراضات وارد کیے، مرنے کے بعد بقائی ارواح اور عذاب و ثواب کو صرف تناسخ پر منحصر کردیا اور اپنے ان خیالات کے لیے مندرجہ ذیل اشعار کو سند بنالیا:

از حقیقت بدست گوری چند
معنی ماند و کہنہ گوری چند

گوہ باکس سخن نمی گوید
بجز قرآن کسی نمی جوید

یا

عید آمد و کارہا نکو خواہد کرد چون روی عروس
ساقی می ناب در سبو خواہد کرد چوں خون خروس
افسار نماز و پوز بند روزہ یک بار دگر
از گردن این خران فرو خواہد کرد افسوس افسوس

بے دینی کی یہ لے یہاں تک بڑھی کہ لوگوں کو حکم دیا گیا کہ وہ بادشاہ کا خاص کلمہ "لا الٰہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ" اعلانیہ پڑھا کریں، لیکن اس خیال سے کہ یہ حکم عام ہو تو ملک میں شاید خلل برپا ہو جائے، اس کلمہ کے پڑھنے کا لزوم صرف اپنی حرم سرا تک ہی محدود کر دیا۔

اکبر کی اس بے دینی کی تاریخ "مقتدای امت" سے نکلتی ہے۔

غیرت مند حق گو امیر

بادشاہ نے جب قطب الدین محمد خاں اور شہباز خاں اور اس پایے کے دوسرے امیروں کو بھی اسلام کی تقلید چھوڑ کر اس نئے دین کو اختیار کرنے کی ترغیب دی تو ان امیروں نے بڑی جرأت سے اس مطالبے کو رد کر دیا۔ قطب الدین محمد خاں نے کہا "شاہان ولایت خلیفہ روم وغیرہ اگر ان باتوں کو سنیں گے تو آخر کیا کہیں گے؟ وہ سب بہرحال اسی اسلام پر ایمان رکھتے ہیں خواہ وہ تقلیدی ہو یا کچھ اور..." اکبر نے اس پر چڑھ کر کہا۔ "تو روم کے فرمانروا کی خاطر ہمارے ساتھ اس درشتی سے بات کر رہا ہے تو اس طرح ان کے پاس اپنا ٹھکانا بنانا چاہتا ہے کہ یہاں سے نکلنا پڑے تو وہاں جا کر اعزاز و مرتبہ حاصل کر لے"۔

شہباز خاں نے بھی بڑی سختی سے مخالفت کی اور جہنمی کتے بیربر کو جو اعلانیہ اسلام پر طعنے کرتا رہتا تھا سب کے سامنے گالی دے کر کہا "اے ملعون کافر، اب تیری بھی زبان نکل آئی کہ ایسی باتیں کرنے لگا، ہم تجھے اس کا مزہ چکھائے بغیر نہیں رہیں گے۔ غرض

دربار میں بڑی بدمزگی پیدا ہوگئی اور اکبر نے غصے میں آ کر شہباز خاں اور دوسرے امراء کو کہا "چپ رہو ورنہ ہم تمہارے منھ پر نجاست بھری جوتیاں مارنے کا حکم دیں گے"۔

علماء اور ائمہ کی بدحالی

انہی دنوں پٹن کا حاکم ترسون محمد خان گجرات سے آ کر حاضر ہوا اور قاضی علی بغدادی کو شیخ عبدالنبی کی جگہ مدد معاش اور آراضیات کی تحقیق و ضبطی کے لیے مقرر کیا گیا۔ وہ ہزاری، پانصدی اور صدی کے مرتبہ رکھنے والے ائمہ کو بادشاہ کے ملاحظے میں پیش کرتا تھا۔ ان کی اکثر زمینیں ضبط کر لی جاتی تھیں۔ کٹ کٹا کر بہت تھوڑی سی زمین ان کے پاس رہ گئی۔ اس طرح بڑے بڑے علماء و ائمہ اور مشاہیر کے خاندانی اعزاز و اعتبار کو گھٹا دیا گیا اور شریفوں کی اولاد مفلسی کی وجہ سے آوارہ ہوگئی، مدرسے اور مسجدیں ویران ہونے لگیں اور اکثر لوگ جلاوطن کر دیے گئے۔

مدارس از علما آن چنان بود خالی
کہ ماہ روزہ زمیخوارہ خانۂ خمار
برند تختۂ لوح ادیب از پئی مزد
کنند مصحف قاری گرو بوجہ قمار

ان معاملات میں حکیم الملک اور شیخ ابوالفضل میں بڑی مخالفت رہتی تھی۔ حکیم اس کا نام بگاڑ کر "فضلہ" کہا کرتا تھا۔ اکبر ابوالفضل کے کافی قریب تھا۔ اس لیے حکیم الملک پر اس نے بڑی سختی کی، آخرکار مکہ معظمہ کی طرف اس کے اخراج کا حکم صادر کر دیا۔

خدمت شاہی پر دوبارہ تقرر

اسی سال ماہ رمضان میں اجمیر کے قیام کے وقت قاضی علی نے مجھے بھی، کہ میں عرصے سے ملازمت سے علیحدہ ہو کر گھر پر بیٹھا تھا، بادشاہ کے سامنے پیش کیا اور بادشاہ کو میری مدد معاش کے سلسلے میں ہزار بیگھ زمین کا وعدہ یاد دلایا۔ بادشاہ نے کہا مجھے بھی خیال ہے کہ "اس کے فرمان میں ایسی کوئی شرط تھی" قاضی علی نے کہا ہاں بشرط خدمت ان کو زمین دی

گئی تھی۔ اکبر نے کہا اس سے پوچھو "کیا کوئی ضعف و عارضہ تھا کہ اس نے ملازمت ترک کر دی"۔ غازی خاں بدخشی نے فی البدیہہ کہا: "قسمت کا ضعف تھا"۔ اس موقعے پر تمام مقربوں نے سابقہ امامت کا حق سمجھ کر، سابقہ اس لیے کہ ان دنوں نماز باجماعت بالکل ہی ختم کر دی گئی تھی، میرے لیے سفارشیں کیں۔ بادشاہ نے جواب دیا۔ ہم کسی کو ملازم رہنے پر مجبور نہیں کرتے، اگر یہ ملازمت کا ارادہ نہیں رکھتا تو اس کی زمین نصف ہو جائے گی"۔ میں نے فوراً ہی اس بات کو قبول کر لیا۔ یہ بات بادشاہ کو بڑی ناگوار گزری اور میری طرف سے رخ پھیر لیا۔ قاضی علی نے مکرر عرض کیا کہ آخر اس کے بارے میں کیا حکم ہوتا ہے، تو بڑے اصرار کے بعد فرمایا "شیخ عبدالنبی، جو اس وقت تک لشکر میں موجود تھا، سے پوچھا جائے کہ وہ ملازمت کی شرط کے بغیر کس قدر زمین کا حقدار ہو سکتا ہے۔" شیخ نے مولانا الہداد امروہی مرحوم کے ذریعے کہلوایا کہ، ملا عبدالقادر عیال دار آدمی ہے اور اس کے ذمے کافی اخراجات ہیں۔ میں حسب الحکم اس لیے آٹھ سو یا سات سو بیگھ زمین تجویز کرتا ہوں"۔ مصاحبوں کا خیال تھا کہ اب ایسی کوئی عرضداشت مناسب نہ ہو گی اور وہ سب مجھے ملازمت اختیار کر لینے پر مجبور کرنے لگے، مجبوراً میں دوبارہ اس ملازمت کے چکر میں پھنس گیا۔ جس سے بہ مشکل چھٹکارا نصیب ہوا تھا۔ یہ سب کچھ اس لیے بھگتنا پڑا کہ میں نے بادشاہ کے بارہا حکم دینے کے باوجود پہلے ہی داغ کی تجویز قبول نہیں کی تھی اور زبان حال وقال سے یہ شعر پڑھ دیا کرتا تھا:

شادم کہ یک سوار ندارم پیادہ ھم
فارغ ز قید شاھم و از شاہزادہ ھم

جزیہ کی معافی

اسی سال بادشاہ نے تمغا اور جزیے کا قانون جس کے ذریعہ کروڑھا روپے کی آمدنی ہوتی تھی معاف کر دیا اور اس کے لیے تاکیداً فرامین صادر کیے گئے۔

اسی سال محمد معصوم خاں ولد معین الدین احمد خاں فرنخودی جو جونپور کی حکومت پر فائز

تھا دربار میں حاضر ہوا اور جونپور کی رخصت پا کر لوٹ گیا۔ ملا محمد یزدی جونپور کا قاضی القضاۃ بنایا گیا۔ دہلی کی حکومت محب علی خاں ولد میر خلیفہ کو عطا ہوئی۔

ملا محمد یزدی کا فتویٰ

ملا محمد یزدی نے جونپور جانے کے بعد بادشاہ کے خلاف بغاوت کا فتویٰ دیا۔ اس کے فتوے پر محمد معصوم کابلی، محمد معصوم خاں فرنخودی، میر معز الملک نیابت خاں، عرب بہادر اور دوسرے امیر تلواریں کھینچ کر بادشاہ سے مقابلہ کے لیے تیار ہو گئے۔ اکثر مقامات پر انھوں نے بڑی سخت لڑائیاں لڑیں۔ اس زمانے میں ائمہ کہا کرتے تھے بادشاہ نے ہماری مدد معاش کی، زمینوں پر ہاتھ ڈالا تو اللہ نے اس کے ملک کو تاڑ لیا۔

علماء کا اخراج اور تبادلے

جب مہتر سعادت جسے پہلے خاں کا خطاب حاصل تھا معصوم خاں جونپوری کے پاس جا کر واپس آیا تو اس نے ملا محمد یزدی کے فتوے اور وہاں کی صورتحال سے متعلق تفصیلات بادشاہ کو بتائیں اکبر نے کسی بہانے سے میر معز الملک اور محمد یزدی کو جونپور سے بلا بھیجا۔ جب یہ لوگ فیروز آباد جو آگرے سے دس کوس پر ہے، پہنچے تو حکم بھیجا گیا کہ سواروں کو ان سے علیحدہ کر کے دونوں کو کشتی میں بٹھا کر جمنا کے راستے گوالیار لے جائیں اس کے پیچھے ہی دوسرا حکم آیا کہ دونوں کو ختم کر دیا جائے۔ ''محافظ دوسری کشتی میں سوار ہو جائیں اور ان کو کسی پرانی کشتی میں بٹھا کر عین دریا میں پہنچنے پر ملاحوں کو حکم دیں کہ ان کی کشتی کو غرق کر دیا جائے۔ چند دن بعد ہی قاضی یعقوب بنگال سے وہاں آئے گا اس کو بھی ان کی طرح ختم کر دیا جائے''۔

اس طرح اکبر نے ان تمام علماء کو جن کے بارے میں اسے اندیشے تھے، ایک ایک کر کے راستے سے ہٹا دیا اور لاہور کے علماء کو جلا وطن کر کے جگہ جگہ منتشر کر دیا۔ ان میں قاضی صدرالدین لاہوری کو جن کا علمی مرتبہ مخدوم الملک سے زیادہ تھا بھروچ، گجرات کی قضاوت پر، عبدالشکور گول دار کو جونپور کی اور ملا محمد معصوم کو بہار کی حکومت پر مقرر کیا۔ شیخ

منور کو مالوہ کی طرف جلاوطن کر کے اس صوبے کی صدارت اس کو عطا کر دی۔ لاہور میں صرف مولانا معین کے پوتے شیخ معین جو مشہور واعظ تھے، رہ گئے۔ بادشاہ نے ان کو کبر سنی کی وجہ سے نظر انداز کر دیا۔ یہ بزرگ 995ھ/1587ء میں فوت ہوئے۔

صاحب زمان کی پیشین گوئی

حاجی ابراہیم سرہندی کا تقرر گجرات کی صدارت پر کیا گیا تھا۔ اس نے ائمہ سے رشوت لے کر کافی روپیہ اور ذخیرہ جمع کر لیا اگر وہ بچارے رشوت دینے سے انکار کرتے تھے تو وہ ان کی مدد معاش کو روک دیتا تھا۔ اس کی حرکتیں بادشاہ کے علم میں بھی آئیں اور یہ بھی پتہ چلا کہ وہ دکن جانے کا ارادہ کیے ہوئے ہے۔ چنانچہ اسے بغاوت کے الزام میں معزول کر دیا اور واپس بلا کر حکیم عین الملک کے سپرد کر دیا۔ شبانہ مجلسوں میں اس کو بھی بلایا جاتا تھا اس نے اسی زمانے میں بزرگان دین کے متعلق جھوٹی سچی باتیں لکھ کر ایک رسالہ بادشاہ کی خدمت میں خوشامد کے طور پر پیش کیا، لیکن اس کی پول بہت جلد کھل گئی۔ اصل میں اس نے ایک کرم خوردہ کتاب جو غیر معروف خط میں شیخ ابن عربی سے منسوب کر کے ایک جعلی عبارت لکھی تھی کہ صاحب زمان بہت سی عورتوں سے نکاح کرے گا، داڑھی منڈا ہوگا اور ایسی ہی چند علامتیں جو اکبر میں پائی جاتی تھیں درج کر دی تھیں۔ یہ رسالہ اکبر کو بہت پسند آیا اور مہربان ہو کر اسے مقربوں میں شامل کر لیا۔

حاجی ابراہیم کی مذکورہ تحریر کے مطابق امان پانی پتی کے بھتیجے ملا ابو سعید کی کتابوں میں سے ایک پرانا رسالہ فراہم کیا گیا جس میں ایک موضوع حدیث درج تھی کہ "ایک صحابی کا لڑکا داڑھی منڈا کر جب حضور اکرم ﷺ کے سامنے آیا تو آپ نے فرمایا اہل جنت کی یہی وضع ہوگی"۔ یہ حدیث بھی اکبر کو بڑے اہتمام سے دکھائی گئی۔

حاجی ابراہیم، شاہ فتح اللہ، شیخ ابو الفضل اور حکیم ابو الفتح کے ساتھ بڑی بے باکی کے ساتھ مباحثے کرتا تھا اور ان کو ترکی بہ ترکی جواب دیتا تھا۔ اس لیے اس کو اکبر نے رنتھمبور کے قلعے میں بھیج دیا وہ اسی جگہ فوت ہوا۔ اس کی لاش قلعے کی فصیل سے نیچے پھینک دی

گئی۔ لاش لمبے کپڑوں میں لپٹی ہوئی تھی، اس لیے یہ مشہور ہوا کہ اس نے خود اپنے آپ کو قلعے سے نیچے گرادیا۔ یہ حادثہ 994ھ/1586ء میں پیش آیا تھا۔

وظائف و مدد معاش میں کمی

اہل علم کے لیے ان کا علم ہی وبال بن گیا تھا۔ آئے دن ان بیچاروں کو طرح طرح کی سرکاری کاروائیوں کا سامنا رہتا تھا۔ بادشاہ نے ممالک محروسہ کے تمام علما اور مشائخین کو فرمان بھیج کر دربار میں بلایا اور خود بہ نفس نفیس انکی مدد معاش، انعام و وظائف کی تحقیق کی۔ سب علما کو درباری آئین کے مطابق تعظیم و تسلیمات بجالانا پڑتا تھا۔ بادشاہ ان عالموں سے خلوت و جلوت میں گفتگو کر کے اپنے حسب مرضی ہر ایک کے لیے مختصر سی زمین مقرر کر دیتا تھا اور جس کسی کے متعلق یہ رپورٹ ہوتی کہ وہ پیری مریدی کا سلسلہ قائم کیے ہوئے ہے یا مجلس سماع منعقد کرتا ہے یا کسی نہ کسی طرح کا اعزاز اسے حاصل ہے۔ اس کے مشغلوں کو دکانداری کا نام دے کر اسے یا تو کسی قلعے میں قید کر دیا جاتا تھا یا بنگال اور بھکر کی طرف جلا وطن کر دیا جاتا تھا۔

علماء کے خلاف یہ کاروائیاں برابر ہوتی رہتی تھیں، بوڑھے اور معمر پیروں اور شیوخ کا حال اور بھی برا تھا۔ صاحب سماع، اہل ذوق صوفیوں کی معاش کے فرامین کی جانچ پڑتال ہندو کارندوں کے ذمے تھی اور ان کا اجرا اس وقت تک نہیں ہوتا تھا جب تک ان پر ہندو افسران کی مہر نہ لگ جاتی۔ اس معاشی بدحالی کی وجہ سے بیچارے صوفی اپنے حال وقال کو فراموش کر بیٹھے اور وطن چھوڑ کر کسی نہ کسی جائے پناہ میں جا چھپے۔ ان کا سارا تصوف دھرا کا دھرا رہ گیا:

چنان قحط سالی شد اندر دمشق
کہ یاران فراموش کردند عشق
چنان آسمان بر زمین شد بخیل
کہ لب تر نکردند زرع و نخیل

کیوں نہ ہو ان ظاہر پرست صوفیوں کی بے روح مجلسیں ان کی بے حسی اور جمود، شرمناک اعمال اور بے جا تکلفات کا یہی خمیازہ ہوتا تھا۔ ان بے فیض صوفیوں میں اکثر اسی لائق تھے کہ اس برے انجام سے دوچار ہوتے:

آن نہ صوفی گری و آزادیست　　بلکہ کیدی گری و قوادیست

دزدی و راہزنی بہتر ازین　　کفن از مردہ کشی بہتر ازین

موضوع کا تقاضا تو یہ ہے کہ میں تاریخی واقعات کو قلمبند کروں لیکن کیا کروں، قلم بے اختیار دوسری طرف بھٹک جاتا ہے بیان کا سلسلہ چھوڑ کر زمانے کی اس نئی چال، اس نئے مذہب اور اس نئی ملت کی طرف رخ پھر جاتا ہے۔ کاش میں اس الجھن سے نجات پا جاتا لیکن آہ مجبوری:

خطابی با فلک کردم کہ از تیغ جفا کشتی　　شہان مجلس آرای و جوان مردان بر کک را

زمام حل و عقد نہادی در کف قومی　　کز روی کرم باشند بر ایشان شرف سگ را

ہمان در گوش جانم گفت فارغ باش خوش منزل

کہ سیلت بر کند ایام ہیودہ روز یک یک را

بنگال میں مظفر خاں کی سختی

اسی سال مظفر خاں بنگال کی وصولی پر گیا۔ اس نے وہاں کے معاملات میں بڑی سختی سے کام لیا اور بنگال میں متعینہ امرا اور دوسرے سرداروں کو سخت ایذائیں دیں۔ اکثر امیروں کی جاگیر ضبط کر کے دربار کے طریقے پر داغ و محلہ اور محاسبے کے پرانے طریقے نافذ کر دیے۔

بابا خاں قاقشال اور خالدی خاں نے جو مملکت کے با اقتدار امیر اور نفس ناطقہ تھے داغ کے قانون سے معافی اور جاگیروں کی بحالی کے لیے بڑی کوشش کی لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ مظفر خاں نے خالدی خاں کو اس الزام میں قید کر دیا کہ اس نے داغ و محلہ کے بغیر ہی جاگیر کی رقمیں وصول کر لی تھیں اور اسے واپس نہیں کیا تھا۔

اتفاق سے انہی دنوں مظفر خاں کے پاس شاہی فرمان آیا کہ مرزا محمد حکیم کا ایک آدمی

روشن بیگ نامی کابلی سے بنگالہ گیا ہوا ہے، اسے گرفتار کر کے سزا دی جائے۔ مظفر خاں نے اسے تلاش کرایا تو وہ قاقشالوں کے پاس سے پکڑا گیا اس نے بر سر دربار بابا خاں سے بڑے سخت لہجے میں پوچھ گچھ کی اور شاہی فرمان دکھا کر روشن بیگ کے قتل کا حکم دیا۔

قاقشالوں کی بغاوت

مظفر خاں کے ان سخت احکام سے سپاہی بڑے خوفزدہ ہو گئے اور سب نے مل کر اپنے سر منڈوا لیے، مغلوں کا بانا چھین لیا اور بغاوت کا اعلان کر دیا۔ شہر گوڑ جسے پہلے لکھنوتی کہا جاتا تھا۔ مظفر خاں کے جمع کیے ہوئے مال و اسباب کو لوٹ لیا۔ اس نے باغی قاقشالوں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے بہت سی کشتیاں تیار کرائیں اور حکیم ابو الفتح اور پتر داس کو گوڑ کی طرف روانہ کیا۔

حکیم ابو الفتح بزم کا یکہ تاز تھا، رزم کا شہسوار نہیں اور پتر داس ایک ہندو دفتری تھا۔ ظاہر ہے یہ لوگ جنگجو قاقشالوں کے مقابلے میں کون سا تیر مار سکتے تھے۔ جب قاقشال ان فوجی کارروائیوں سے دبتے نظر نہ آئے تو مظفر خاں نے ان کے نام ہمدردانہ فرمان بھیج کر پیغام دیا کہ ''تمہاری جاگیریں بحال کر دی جائیں گی۔ تمہارے پاس رضوی خاں اور پتر داس کو اس سخت کہا سنی کے لیے بھیجا جا رہا ہے تاکہ وہ معاملات کو اچھے ڈھنگ سے طے کرا دیں''۔ اس کے بعد ہی مذکورہ بالا دونوں اشخاص کو میر سید رفیع الدین محدث کے لڑکے میر ابو اسحاق کے ساتھ قاقشالوں کے پاس بھیج دیا گیا۔ قاقشالوں نے کسی قسم کی گفتگو سے انکار کر دیا اور ان لوگوں کو قید کر کے لڑنے مرنے پر تیار ہو گئے۔

بہار کے امراء کی بغاوت

اسی دوران ملا طیب اور رائے پر کھوتم بخشی نے معصوم خاں کابلی، عرب بہادر اور بہار کے تمام امیروں کی جاگیروں کو بہ یک قلم ضبط کر لیا۔ اس کارروائی نے ان امیروں کو بغاوت کرنے پر مجبور کر دیا۔ پھر ان کی بغاوت کو کچلنے کے لیے یہ دونوں ندی کو پار کر کے معصوم

خاں کے مقابلے پر پہنچے۔ عرب بہادر نے ان کو غفلت میں رکھ کر اچانک حملہ کر دیا اور رائے پر کھوتم کو قتل کر کے شاہی لشکر کا بہت سا مال لوٹ لیا۔

بہار کے ان باغیوں نے بابا خاں قاقشال سے مراسلت کی اور قاقشالوں کا ساتھ دینے کے لیے کرہی کی طرف پیش قدمی کر دی۔ ان کا راستہ روکنے کے لیے مظفر خاں نے خواجہ شمس الدین محمد خوافی کو جو اب دیوان کل کے عہدے پر مامور ہے، روانہ کیا۔ معصوم خاں نے اسے شکست دے کر بھگا دیا اور قاقشالوں کو ساتھ لے کر دریائے گنگا پار کی اور مظفر خاں کے مقابلے میں صف آرائی کر لی۔

مظفر خاں کا قتل

باغیوں کی مدافعت کے لیے مظفر خاں ٹانڈہ میں جو اس وقت ایک پرانی چار دیواری سے بڑھ کر نہیں تھا، محصور ہو گیا۔ اس وقت وزیر خاں جمیل بیگ نے جو ایک پرانا امیر تھا۔ جان محمد خاں بہبودی کو ساتھ لے کر مظفر خاں پر حملہ کر دیا نیز حکیم ابو الفتح اور خواجہ شمس الدین اور دوسرے سرداروں کو گرفتار کر لیا۔ یہ دونوں اور چتر داس کسی نہ کسی طرح باغیوں کی قید سے نکل بھاگے اور مظفر خاں کی مدد کے لیے اپنے زمینداروں کو حاجی پور میں بھیج دیا۔ انھی معرکوں میں حکیم نور الدین قراری بھی مارا گیا اور باغی قاقشالوں اور معصوم خاں نے مظفر خاں کو قول نامہ دے کر ٹانڈے کے قلعے سے باہر آنے پر مجبور کر دیا پھر اسے گرفتار کر کے اذیتیں دے کر مروا ڈالا۔

بنگال کی خود مختاری

اب باغیوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے تھے مظفر خاں سے چھینا ہوا کافی مال و اسباب ان کے پاس تھا، انھوں نے اچھی خاصی جمعیت فراہم کر لی اور پورے بنگال اور بہار پر قبضہ کر لیا۔ ایک بڑی پیدل اور سوار فوج بنالی۔ میرزا شرف الدین حسین ان دنوں نظر بند تھا۔

17 اسے بادشاہ نے کالپی کے حاکم قاسم علی خاں بقال کے پاس سے بنگال بھجوا دیا تھا۔ باغیوں

نے میرزا کو قید خانے سے نکال کر اپنا سردار بنا لیا۔ بنگال میں ایک خود مختار حکومت قائم ہو جانے سے سارے ملک میں بڑا ہنگامہ برپا ہو گیا۔

راجہ ٹوڈرمل کی فوجی کارروائی

اکبر نے بنگال کی بغاوت کو ختم کرنے کے لیے راجہ ٹوڈرمل، صادق محمد خاں، ترسون محمد خاں اور دوسرے تمام امرا کو فتح پور سے روانہ کیا۔ راجہ کی مدد کے لیے محمد معصوم خاں فرنخودی حاکم جون پور اور اس علاقے کے دوسرے جاگیرداروں کو مقرر کیا۔

ابھی یہ لوگ راستے ہی میں تھے کہ شاہم خالد بدخشی سے جنگ کر کے اسے قتل کر دیا۔ محمد معصوم جونپوری نے تین ہزار مسلح اور تیار سواروں کو راجہ کے ملاحظے میں پیش کیا، لیکن اس کی حرکات و سکنات سے راجہ بھانپ گیا کہ وہ بھی بغاوت کی فکر میں ہے اسی لیے بہ ظاہر اس کے ساتھ اچھی طرح پیش آتا رہا لیکن ساری صورت حال دربار میں لکھ کر بھیج دی۔

شاہی لشکر سے مقابلے کے لیے محمد معصوم خاں کابلی، میرزا اشرف الدین حسین اور قاقشالوں کی فوج تیس ہزار سوار، پانچ سو ہاتھی، بے شمار کشتیاں اور توپ خانہ لے کر مونگیر کے قصبے میں پہنچ گیا۔ راجہ کو اپنے لشکر پر پورا بھروسہ نہ تھا وہ بخوبی سمجھتا تھا کہ یہ سب موقعے کے منتظر ہیں، اس لیے اس نے دشمن سے کھلے میدان میں مقابلہ کرنا مناسب نہ سمجھا اور مونگیر کے قلعے میں قلعہ بند ہو گیا۔ دشمن کی طرف سے ہر روز سخت لڑائی ہوتی تھی اور شاہی لشکر رسد کے نہ ملنے کی وجہ سے نہایت تنگ ہو گیا۔ اسی اثناء میں شہباز خاں کے داماد زین الدین کنبو نے دریا کے راستہ ڈاک چوکی کے ذریعہ ایک لاکھ روپیہ راجہ کے پاس بھجوا دیا جو کچھ دن تک ضرورت میں استعمال ہوتا رہا۔ بادشاہ اسی طرح وقفے وقفے سے کبھی تو دریا خاں آبدار کے ذریعے کبھی سردی کے ہاتھ اور کبھی سیٹھ بھگوان داس خزانچی کے بیٹے کی معرفت رقمیں بھیجتے رہتے تھے۔

ڈاک چوکی پر جو لوگ مقرر تھے ان میں قاضی زادہ عبد الحی خواص ولد قاضی

صدرالدین سنبھلی بھی تھا جو نہایت حسین اور خوبصورت نوجوان تھا، لیکن جتنا خوبصورت تھا اتنا احمق بھی تھا۔ وہ بھی ان خطیبوں میں شامل تھا جو مذہب و ملت کے بارے میں زبان درازیاں کرتے رہتے تھے۔ اس مہم کے دوران وہ بھی عین عالم جوانی میں مارا گیا۔

راجہ کی فوج کے ساتھ شاہ قرلی کا لڑکا ہمایوں قرلی بھی تھا۔ جسے ہمایوں نے قلی خاں کا خطاب دیا تھا۔ وہ نئے بادشاہی دین کے ہنگاموں کو اور اجمیر میں لوگوں کے ابتلا و آزمائش کے ہولناک واقعات کو اپنی آنکھوں سے خود دیکھ چکا تھا اور سخت متنفر تھا۔ مونگیر کے محاصرے کے وقت موقع پا کر وہ اور ترخان دیوانہ شاہی لشکر سے بھاگ کر باغیوں سے جا کر مل گئے۔

باغیوں کی حوصلہ شکنی

مونگیر کا محاصرہ کافی طویل ہو گیا۔ اسی دوران بابا خان قاقشال سخت بیماری میں قریب مرگ ہو گیا اس کے ضعف و بیماری کو دیکھ کر مجنوں خان قاقشال کا لڑکا جباری جو باغیوں کا سرکردہ تھا اور اب وہ دربار شاہی میں خدمت پر مقرر ہے، محاصرہ اٹھا کر لوٹ گیا۔ باغیوں کا لشکر منتشر ہو گیا۔ معصوم خاں کابلی بھی مجبور ہو کر بہار کی طرف بھاگ گیا اور عرب بہادر نے پٹنہ پر قبضہ کرنے اور بادشاہی خزانہ لوٹ لینے کے ارادے سے پٹنہ پر حملہ کر دیا۔ بہادر خاں خاص خیل جو سید عارف کے نام سے مشہور تھا پٹنہ کے قلعے میں بند ہو گیا۔ راجہ ٹوڈرمل نے معصوم خاں فرنخودی کو بہادر خاں کی مدد کے لیے روانہ کیا۔ عرب بہادر ان سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، اس لیے وہ مشہور زمیندار گجپتی کے پاس چلا گیا۔

راجہ ٹوڈرمل، صادق خاں اور دوسرے شاہی امیروں نے معصوم خاں کابلی کی بغاوت کو کچلنے کے لیے بہار کی طرف کوچ کر دیا۔ معصوم خاں نے شاہی لشکر پر اچانک رات میں چھپ کر حملہ کیا اور صادق خاں کے کیمپ پر جا پڑا۔ اس اندھیری رات میں کیمپ کی نگرانی اور قراولی کے لیے ماہ بیگ جو ایک نامی سردار تھا اور الغ خاں حبشی مقرر تھے۔ ماہ بیگ مارا گیا اور الغ خاں جان بچا کر نکل گیا، صادق خاں نے ثابت قدمی کے ساتھ حملہ آوروں

کا مقابلہ کیا۔ معصوم خاں نے بڑی بہادری دکھائی، لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا اور پسپا ہو کر بھاگ گیا۔ اس وسیع علاقے میں ڈاکہ ڈالتے ہوئے عرصے تک سرگرداں رہا، آخر کار اڑیسہ کے زمیندار عیسیٰ خاں کے پاس جا کر پناہ لی جس نے اس زمانے میں ڈھائی سو ہاتھی اور چار لاکھ روپے کے نفیس تحفے، سونا، قیمتی آلات، اگر، پوشاکیں اور بے شمار کپڑے سعید خاں مغول کے ذریعے دربار میں روانہ کیے تھے۔ معصوم خاں ابھی تک اڑیسہ ہی میں ہے۔ باغیوں کے شکست کے بعد صوبہ کرہی تک کا علاقہ دوبارہ شاہی قبضے میں آ گیا۔

مالوہ کے حاکم کا قتل

انہی دنوں شجاعت خاں اور اس کے بیٹے قائم خاں کے قتل کا واقعہ پیش آیا۔ قائم خاں بڑا اچھا موسیقار، حسین و ظریف نوجوان تھا۔ بادشاہ نے دونوں باپ بیٹوں کو سارنگ پور سے دربار میں بلایا تھا۔ یہ دونوں حسب طلب فتح پور کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کے نوکروں نے ان کی بد معاملگی، بد عہدی، بد سلوکی اور ذلت کی وجہ سے، کہ آج کل کے سرداروں کا بس یہی کچھ وطیرہ ہے۔ دونوں کو راستے میں قتل کر دیا اور بھاگ گئے۔ کہتے ہیں ایک دن ایک سائل نے شجاعت خاں اور دوسرے امرا سے جو دربار میں بیٹھے ہوئے تھے کچھ طلب کیا۔ اس نے ان سے کہا "بابا کیا کریں خیرات کی مد ہماری آمدنی میں شامل نہیں کی گئی ہے"۔

شجاعت خاں کی جگہ بادشاہ نے مالوہ پر شریف خاں اتکہ کو مقرر کیا۔ اس کے مکان پر خود بادشاہ کی سواری گئی۔ اتکہ نے زبردست ضیافت و مہمانی کی اور بادشاہ نے اسے مالوہ پر رخصت کیا۔

بنگال پر اعظم خاں کا تقرر

اسی سال خاں اعظم کو جو عرصے سے نظر بند تھا بادشاہ نے آگرہ سے بلا بھیجا اور اس کو نوازش شاہانہ سے سرفراز کر کے پانچ ہزاری کا عہدہ عطا فرمایا، پھر بنگال کی حکومت پر مقرر کر دیا۔

شہباز خاں کو رانا کے علاقے سے بلا کر لشکر اور فوج دے کر خان اعظم کی مدد کے لیے مقرر کیا۔ اس نے حاجی پور کی سرحدوں پر فوجی کارروائی کی اور گھنی کا جنگل کٹوا کر عرب بہادر کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔

اسی سال بادشاہ نے حکیم الملک گیلانی کو اپنے نئے مذہب کا مخالف سمجھ کر مکہ معظمہ روانہ کر دیا۔ اسے بادشاہ نے وہاں کے شریف اور محتاج لوگوں کی امداد کے لیے پانچ لاکھ روپے بطور انعام بھی عطا کیا تھا حکیم آخر عمر تک مکہ ہی میں مقیم رہا:

از سر کوئی تو نمی جنبم
آسمان نیستم زمینم من

اس کو واپس بلانے کے لیے بادشاہ نے متعدد بار فرمان بھیجے تھے، لیکن وہ وہاں سے لوٹ کر نہ آیا اور اپنے رب سے جا ملا۔

مشائخین کی آزمائشیں

اس سال اکبر نے تمام علاقوں کے بڑے بڑے مشائخین کو بلا کر فتح پور میں جمع کیا اور ہر ایک کے ساتھ مجلس منعقد کر کے مختلف باتوں کی تحقیق کرتا رہا۔ ان مشائخین میں سے اکثر محض خوشامدی اور چند بیگھہ زمین کے لالچی تھے۔ بادشاہ کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ ان میں سے کسی کی کوئی خرق عادت کو اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ خرق عادت کے کرتب ان کو کیا آتے وہ تو دشمنوں ہی کے حصے میں لکھے گئے ہیں اور جہاں تک علو اخلاق کا معاملہ تھا کہ اس سے مطلب ترک دنیا، تجرد، توکل، استغنیٰ اور عالی حوصلگی ہے وہ سب ان اوصاف سے ناآشنا تھے۔ بادشاہ نے جب ان میں بجز خوشامد اور چاپلوسی کے کوئی اور جوہر نہیں پایا تو ان سے اور دین حق سے اس کی بدگمانی پہلے سے کہیں زیادہ اور دو چند ہو گئی:

پوشیدہ مرقعہ این خامی چند | بگرفتہ بطامات الف لامی چند
نارفتہ رہ صدق و صفا گامی چند | بدنام کنندہ نکو نامی چند

ان مشائخین میں شیخ عبدالعزیز کے بڑے خلیفہ شیخ جاکیدہ بھی تھے جن کو اکبر نے

عبادت خانے میں ٹھہرایا تھا وہ دکھاوے کے لیے نماز معکوس پڑھا کرتے تھے اور اپنے زہد وعبادت کا بڑا مظاہرہ کرتے تھے۔ اکبر کی کسی حرم کے متعلق یہ کہا کہ اس کو لڑکا ہوگا اس کو بجائے لڑکے کے لڑکی ہوئی۔ ان کی اور بھی قابل اعتراض حرکتیں دیکھنے میں آئیں۔ اسی طرح سید ہاشم فیروز آبادی نے بڑے ٹھاٹھ اپنی مشیخیت کی دکانداری شروع کردی۔ ان لوگوں کی یہ حرکتیں بھی بادشاہ کی بد اعتقادی میں اضافہ کا سبب بن گئیں۔

شیخ سہتی افغان کاسی کو پنجاب سے بلایا گیا تھا وہ حسب الحکم قاصدوں کے ساتھ خانقاہ سے پیدل ہی چلا اور اس کی پالکی اس کے پیچھے خالی ہی لائی گئی وہ فتح پور میں شیخ جمال بختیار کے مکان میں آکر ٹھہرا اور پیغام بھجوایا کہ "میری ملاقات کسی بھی بادشاہ کے لیے مبارک نہیں رہی ہے"۔ اکبر نے اس سے ملاقات نہیں کی اور جلد ہی اسے رخصت کردیا۔

شیخ الہدیہ خیرآبادی بھی جو توکل وفقر میں بڑے نامور تھے، انھوں نے بادشاہ سے کوئی آراضی قبول نہیں کی تھی، دربار میں تشریف لائے۔ ان کا سلسلہ طریقت بھی بڑا وسیع تھا۔ ان کے ساتھ ان کے لڑکے شیخ ابوالفتح بھی آئے تھے۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن سے میں نے سلیم شاہ کے آخری عہد میں اپنے استاد علامہ میاں حاتم سنبھلی کے حسب الحکم "ارشاد قاضی" اور حاشیہ پڑھا تھا اور اب وہ اپنے باپ کے قائم مقام ہیں۔ اپنے علم احوال و معاملات میں نہایت کھرے اور بے لاگ ہیں۔

جب شیخ الہدیہ دربار میں آئے تو اکبر ان کی تعظیم کے لیے کھڑا ہوگیا۔ جب بادشاہ نے حال احوال پوچھا تو انھوں نے اپنے کان کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ میں اونچا سنتا ہوں، بادشاہ نے ان کو مزید زحمت نہیں دی اور جلد ہی رخصت کردیا۔

امامت ونبوت کا دعویٰ

اسی سال دربار کے کینے اور ذلیل علماء نے جو درحقیقت جاہل محض تھے، من گھڑت دلیلیں دے کر بادشاہ کو یہ باور کرایا کہ اس عہد کے صاحب زماں "خود حضور والا" ہیں۔ آپ کا ظہور مسلمانوں اور ہندوؤں کے بہتر فرقوں کے اختلاف کو ختم کرنے کے لیے ہوا ہے۔

شریف نے محمود بسی خانی کے رسالوں سے یہ شہادت بھی نکال دکھائی کہ اس نے صراحتاً کہا ہے کہ "990ھ/1582ء میں باطل کو ختم کرنے والے ایک شخص کا ظہور ہوگا"۔ پھر اس نے بتایا کہ "صاحب دین حق" کے کلمے کے "جمل" کے حساب سے 990 عدد ہوتے ہیں اور اس کے مصداق صرف حضور والا ہی ہیں۔

خواجہ مولانا شیرازی طمہ نجومی مکہ معظمہ کے معززین کی طرف سے ایک رسالہ لے کر آیا جس میں درج تھا کہ حدیث صحیح کے بموجب دنیا کی مدت سات ہزار سال پوری ہو چکی ہے اور اب ظہور مہدی موعود کا وقت آ گیا ہے۔ اس کی مزید دلیل میں خود اس نے بھی ایک رسالہ مرتب کر کے پیش کیا۔ ایسی ہی خرافات شیعوں نے بھی حضرت امیرالمومنین علیؓ سے منسوب کر کے پیش کیں۔ بعض یہ رباعی پڑھ پڑھ کر سناتے تھے جو حکیم ناصر خسرو سے منسوب ہے:

در نہ صد و ہشتاد و نہ از حکم قضا
آیند کواکب از جوانب یکجا
در سال اسد ماہ اسد روز اسد
از پردہ بروں خرامد آں شیر خدا

یہ سب باتیں نبوت کے دعوے کا سبب بنیں اور اکبر نے صراحتاً و لفظاً نہیں مجملاً و معناً نبوت کا دعویٰ کر دیا۔

شاہ منصور کی برطرفی

اس زمانے میں راجہ ٹوڈرمل کا عریضہ پہنچا کہ "میں نے اب تک بڑے تدبر و حسن سلوک سے معصوم خاں فرنخودی کو اپنے ساتھ لگائے رکھا ہے، لیکن خواجہ منصور دیوان اس سے اور ترسون محمد خان سے بقایا کا بڑی سختی سے تقاضا کرتا رہتا ہے اور ان کو بہت ڈراتا دھمکاتا رہتا ہے۔ اس کے رویئے سے ان کے قدم ڈگمگانے لگے ہیں۔ اس نازک وقت میں ایسی باتیں لشکر میں تفرقے کا باعث ہو جاتی ہیں"۔

شاہ منصور کی سخت گیریوں کی اس سے پہلے بھی بارہا خبریں مل چکی تھیں اس لیے بادشاہ نے اس کو بے دخل کر کے معطلاً چند دن کے لیے اسے شاہ قلی خان محرم کی نگرانی میں دے دیا اور اس کی جگہ آصف خاں ہروی کے بھائی وزیر خاں کو دیوان کل بنادیا اس کا مددگار قاضی علی بغدادی جیسے منحوس دل آزار چند قسم کے آدمی کو مقرر فرمایا کہ یہ دونوں مل کر معاملات کو سرانجام دیں۔ اس تدبیر کے کیا کہنے؟

بغیر کان کا آدمی

اس زمانے میں بادشاہ کے پاس ایک ایسے آدمی کو لایا گیا جس کے کان سرے سے تھے ہی نہیں اور نہ سماعت کے لیے کوئی سوراخ تھا، لیکن وہ جو کچھ کہا جائے بخوبی سن لیتا تھا اس کے کانوں کی جگہ بالکل صاف اور سپاٹ تھی۔

گونگے محل کا تجربہ

اسی سال بادشاہ کو ایک اور خبط ہوا کہ چند شیر خوار بچوں کو آبادی سے دور ایک مکان میں رکھا جائے وہ کسی آواز کو سن نہ سکیں اور ان کی نگہداشت کے لیے تربیت یافتہ دایہ مقرر کی جائیں اور ان کو کوئی بات نہ سکھائی جائے تاکہ اس حدیث "**کل مولود علی الفطرۃ**" (ہر پیدا ہونے والا فطرت پر پیدا ہوتا ہے) کی تحقیق ہو جائے اور دیکھیں کہ یہ بچے کس دین اور مذہب کی طرف راغب ہوتے ہیں اور ان کی زبان سے پہلے کون سا کلمہ ادا ہوتا ہے۔ اس عجیب وغریب تجربے کے لیے 20 شیر خوار نومولود بچوں کو روپیہ پیسہ دے کر ان کے والدین سے جدا کیا گیا۔ ایک خالی ویران محل میں ان کو رکھا گیا۔ بادشاہ نے اس محل کا نام "گنگ محل" رکھا۔ تین چار سال بعد معلوم ہوا کہ وہ سب بچے گونگے ہو گئے ہیں۔ محل کی وجہ تسمیہ پوری اتری۔ اکثر معصوم بچے تو اسی گنگ محل سے آغوش لحد میں جا بسے:

مادرم خاک است و من طفل رضیع
میل طفلان نیست بر مادر بدیع

زود باشد کہ رمیدہ ز اضطراب
درکنار مادر افتم مست خواب

اسی سال بادشاہ نے شاہزادہ دانیال کو اس کے استاد شیخ فیضی، شیخ جمال بختیار اور امراء کی ایک جمعیت کے ساتھ اجمیر روانہ کیا اور وہاں کے فقراء کے لیے پچیس ہزار روپیہ بھی بھیجا۔

معصوم خاں کا تبادلہ

راجہ ٹوڈرمل اور دوسرے تمام بادشاہی امراء نے اس سال حاجی پور میں برسات کا موسم گزارا اور معصوم خاں فرنخودی جو لشکر سے سخت ناراض ہو گیا تھا امراء سے اجازت لیے بغیر جونپور چلا گیا اور وہاں جا کر باغی بن بیٹھا۔ بادشاہ نے پیشرو خاں عرف مہتر سعادت داروغۂ فراش خانہ کے ہاتھ اس کی تسلی اور دلاسے کے لیے ایک عنایت آمیز فرمان روانہ کیا اور اسے اودھ کا علاقہ دے کر جونپور پر ترسون محمد خاں کو مقرر کر دیا۔ معصوم خاں نے اس تبادلے پر الٹی سیدھی باتیں کیں پھر اس خیال سے کہ اودھ ایک سرحدی علاقہ ہے جو اس کے لیے نسبتاً بہتر رہے گا وہاں چلا گیا اور جنگ و بغاوت کے منصوبے باندھتا رہا۔

مہتر سعادت نے دربار میں واپس آ کر جونپور وغیرہ کے حالات تفصیل سے سنائے اور اس فتوے کا بھی تذکرہ کیا جو ملا محمد یزدی نے بادشاہ کے خلاف بغاوت کے متعلق دیا تھا۔ دراصل اسی سبب سے ملا محمد یزدی اور میر معز الملک کو دربار میں بلایا گیا تھا۔

نیابت خاں کی بغاوت

اسی زمانے میں ہاشم خاں نیشاپوری کے لڑکے نیابت خاں نے بغاوت کر دی جسے بادشاہ نے پٹنہ کے سفر کے وقت جوسی اور پیاک کی جاگیر عطا کی تھی۔ نیابت خاں نے کنڑہ پر حملہ کر دیا۔ وہاں اس وقت اسماعیل قلی خاں کی جانب سے الیاس خاں نامی ایک پٹھان حاکم تھا۔ اس جنگ میں الیاس خاں مارا گیا اور نیابت خاں نے کنڑہ کے قلعے کا محاصرہ کر کے

بڑی لوٹ مار مچائی۔ بادشاہ نے اس کے مقابلے پر اسماعیل قلی خاں، وزیر خاں، مطلب خاں، شیخ جمال بختیار اور دوسرے امرا کو نامزد کیا اور مسکرے بیربر کو معصوم خاں فرنخودی کو اطمینان و دلاسا دینے کے لیے روانہ کیا۔ وزیر خاں کے رخصت ہونے کے بعد خواجہ شاہ منصور کو قید سے رہائی دے کر دوبارہ دیوانی کے عہدے پر مقرر کر دیا۔

جب نیابت خاں کو شاہی امرا کے حملے کا پتہ چلا تو وہ کڑہ کا محاصرہ چھوڑ کر قصبہ ہوتے ہوئے پٹنہ کی طرف چلا گیا۔ شاہی لشکر نے بھی دریا پار کر کے اس کا تعاقب کیا۔ ان کو قریب دیکھ کر نیابت خاں بھی پلٹ پڑا اور اس نے ان تمام امیروں کے ساتھ تنہا ایسی سخت لڑائی لڑی جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پے در پے حملوں سے اس نے بادشاہی فوج کو زیر و زبر کر دیا۔ معرکۂ کارزار میں شیخ جمال کو گھوڑے سے نیچے گرا دیا، لیکن اسے جلد ہی رہا بھی کر دیا۔ باوجود اس دلاوری کے اسے امرا نے شکست دے دی اور وہ اودھ میں معصوم خاں کے پاس چلا گیا۔ عرب بہادر بھی اس موقعے پر شہباز خاں کے مقابلے میں شکست کھا کر اودھ چلا گیا۔ شہباز خاں عرب بہادر کا تعاقب کرتے ہوئے جونپور اور اس کے بعد اودھ پہنچا۔

معصوم خاں کی بغاوت

اودھ میں معصوم خاں نے کافی ساز و سامان مہیا کر لیا تھا۔ اس کی تیاریاں اتنی تھیں کہ اگر کچھ مبالغے سے کام لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس وقت ایران و توران کے بادشاہوں سے بھی جنگ کر سکتا تھا۔ تمیں چالیس جھنڈے، نشان، نقارے اور دوسرا سارا سامان جنگ پوری طرح تیار تھا۔ اس نے اپنی آراستہ و پیراستہ فوج کے ساتھ شہباز خاں پر حملہ کیا اور ایک ہی حملے میں اسے شکست دے کر بھگا دیا۔ شہباز خاں ایک دن میں 40 کوس راستہ طے کر کے جونپور واپس چلا آیا۔ ترسون محمد خاں شہباز خاں کے میمنے پر مقرر تھا وہ لڑائی کے وقت ایک جنگل میں چھپا ہوا تھا۔

جب شہباز خاں میدان چھوڑ کر بھاگ گیا اور معصوم خاں کی فوج مال غنیمت لوٹنے

میں منتشر ہو گئی اور میدان میں معصوم خاں کے ساتھ مختصر سی جمعیت رہ گئی تو ترسون محمد خاں نے اچانک حملہ کر کے اس کو شکست دے دی۔ جب شہباز خاں کو یہ خبر ملی تو وہ الٹے پاؤں لوٹ کر دوسرے دن ترسون محمد خاں سے آ کر مل گیا پھر دونوں نے مل کر معصوم خاں پر حملہ کر دیا۔

اودھ کے قریب دونوں فوجوں میں سخت لڑائی ہوئی اور معصوم خاں شکست کھا کر بے سروسامانی کی حالت میں بھاگ گیا۔ اس کی ماں، بہن، بیوی، بچے اور سارا مال و اسباب شاہی لشکر کے ہاتھ آ گیا۔ معصوم خاں نے سوالک کی پہاڑی تک پلٹ کر نہیں دیکھا اور بادشاہی علاقے سے نکل گیا۔ یہ واقعہ 988ھ/ 1580ء میں پیش آیا۔

ارغنون باجے کی نمائش

ارغنون باجا جو ایک عجیب و غریب چیز ہے، حاجی حبیب اللہ فرنگستان سے لے کر آیا تھا۔ انہی دنوں اسے لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا۔ یہ باجا ایک قدِ آدم صندوق میں بنا ہوا ہے۔ ایک فرنگی اس میں بیٹھ کر اس کے تار چھیڑتا ہے، اس کے باہر مور کے پانچ پر اور دوسرے تال سُر لگے ہوئے تھے جن کو دو اور آدمی انگلیوں سے بجاتے تھے۔ دیکھنے والے نہایت لطف اندوز ہو رہے تھے اور بجانے والے فرنگیوں کا چہرہ ہر لحظہ سرخ و سپید ہوتا جاتا تھا اور وہ خوب مست ہو ہو کر اسے بجاتے جاتے تھے۔ اس عجوبے کو دیکھ کر اہل محفل حیران رہ گئے۔ اس کی تعریف و توصیف حد بیان سے باہر ہے۔

اکبر نے اس محفل میں لوگوں سے پوچھا "اچھا بتاؤ اس زمانے میں سب سے عقلمند کون ہے؟ بادشاہوں کا نام نہ لیا جائے، کیونکہ وہ اس سے مستثنیٰ ہیں"۔ ہر شخص جس جس پر اعتقاد رکھتا تھا اس کا نام لینے لگا۔ حکیم ہمام نے کہا "میں تو اپنے آپ ہی کو سب سے زیادہ عقلمند سمجھتا ہوں۔ شیخ ابوالفضل نے اپنے باپ کا نام لیا۔

اخلاص کے چار درجے

ان دنوں بادشاہ کے ساتھ اخلاص کے چار درجے قرار دیے گئے تھے۔ ترک مال، ترک جان، ترک ناموس اور ترک دین۔ جو شخص بھی ان چاروں مدارج کو طے کر لیتا اس کا

چہارگانہ اعزاز ہوتا اور جو کسی ایک درجے تک پہنچتا تھا اس کا اعزاز اسی مناسبت سے مقرر ہوتا، ویسے سب کے سب بادشاہ کے مرید سمجھے جاتے۔

مرزا محمد حکیم کا ہندوستان پر حملہ

989ھ/1581ء میں خبر پہنچی کہ مرزا محمد حکیم نے معصوم خاں فرنخودی کے حسب الطلب اپنے ماموں فریدون خاں کے بہکانے سے ہندوستان پر حملہ کردیا۔ اس کا ایک سردار شادماں نامی دریائے نیلاب[57] (اٹک) کو پار کر آیا لیکن مان سنگھ ولد بھگوان داس نے اس پر فوج کشی کی اور اسے قتل کرادیا۔ جب مرزا کو یہ خبر ملی تو وہ دریا پار کر کے سید پور کے علاقے میں آ گیا۔

مرزا حکیم سے مقابلے کے لیے بادشاہ نے فوج کو آٹھ ماہ کی تنخواہیں ادا کیں۔ شاہزادہ دانیال کو سلطان خواجہ صدر اور شیخ ابراہیم چشتی کے ساتھ اپنی نیابت کے لیے دارالخلافہ میں چھوڑا اور خود فتح پور سے پنجاب روانہ ہو گئے۔ فتح پور سے 15 کوس پر سرائے باد میں شہباز خاں کی فتح کی خبر پہنچی۔

مان سنگھ نے جب شادماں کے اسباب کی تلاشی لی تو اس کے بجزدان سے مرزا محمد حکیم کے تین فرمان برآمد ہوئے جو اس نے حکیم الملک گیلانی، شاہ منصور دیوان اور محمد قاسم خاں میر بحر کے نام لکھے تھے۔ اس کے وہ فرمان بادشاہ کے پاس بھیج دیے گئے۔ بادشاہ نے انھیں پڑھ لیا لیکن ان کا راز افشا نہ کیا۔ دہلی میں خبر ملی کہ مرزا لاہور پہنچ چکا ہے اور وہاں وہ مہدی قاسم خاں کے باغ میں ٹھہر گیا ہے اور لاہور کے قلعے میں راجہ بھگوان داس مان سنگھ اور سعید خاں محصور ہو گئے تھے۔

شاہ منصور کی سازش

جب لشکر پانی پت میں پہنچا تو مرزا محمد حکیم کا وزیر ملک ثانی کابلی جس کا خطاب وزیر خاں تھا اس سے ناراض ہو کر لشکر شاہی میں آ گیا اور شاہ منصور کے پاس اس نے قیام کیا اور اس

کے ذریعے خدمت شاہی میں حاضر ہوتا چاہا۔ ان دونوں کے درمیان کوئی سابقہ ربط و ضبط نہ تھا، اس لیے اکبر کو خیال ہوا کہ یہ بھی مرزا کی کوئی چال ہے کہ اس کا وزیر اس نازک وقت میں ساتھ چھوڑ کر شاہ منصور کے پاس آ کر ٹھہرا ہے۔ اس واقعے سے شاہ منصور کے متعلق بادشاہ کی بدگمانی اور زیادہ بڑھ گئی۔ چنانچہ اسے قید کرکے فرامین جاری کر دیے گئے۔ اس نے بہت کچھ قسمیں کھائیں، لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا کیوں کہ یہ بات طے کر دی گئی تھی کہ معاملات میں قسم کو حجت نہیں سمجھا جائے گا۔

جب سواری شاہ آباد پہنچی تو قاضی علی کے بھائی ملک علی نے جو اب لاہور کا کوتوال ہے، تو اس نے دو خط پیش کیے، ایک شاہ منصور کے نام تھا جسے شاہ منصور کے ملازم شرف بیگ نے لکھا تھا، دوسرا گمنام تھا۔ ان خطوط میں پہلے فریدون خاں سے بعد میں مرزا سے ملاقات کا ذکر تھا اور یہ کہ میرزا نے پرگنہ کی معافی عطا کر دی ہے، پرگنہ کا نام شاید درج تھا یا نہیں تھا۔ دونوں خط ایک تھیلی میں رکھے ہوئے تھے۔ ان خطوط سے قیاس کیا گیا کہ شاہ منصور کا ملازم شرف بیگ پرگنہ فیروز پور کا جو لاہور سے 30 کوس پر ہے، شقدار تھا اس نے اپنے مالک کو اطلاع دی کہ میں نے فریدون کے توسط سے میرزا سے ملاقات کی۔ میرزا نے ہر جگہ اپنے عاملوں کو مقرر کر دیا ہے لیکن ہمارے پرگنے کو معافی دے دی ہے۔

ان خطوط سے بادشاہ کی بدگمانی یقین میں بدل گئی۔ اس موقعے پر اکثر بلکہ تمام امیروں نے جو شاہ منصور کے ہاتھوں بڑی اذیتیں اٹھا چکے تھے اور اس کی تباہی کے دل و جان سے خواہاں تھے اس کے قتل پر متفقہ طور سے اصرار کیا، چنانچہ بادشاہ نے دوسرے دن صبح خدمت رائے کو حکم دیا کہ اس کو کچھ کوٹ کی منزل میں گلا کاٹ کر سولی پر چڑھا دیا جائے۔ شاہ منصور نے خلق خدا پر جو ستم ڈھائے تھے وہ خالی نہیں گئے، مظلوموں کی فریاد اس کے گلے کا ہار بن کر رہی:

خوش باش کہ ظالم نبرد رہ بہ سلامت

مرزا عبدالحکیم کا فرار

بادشاہی لشکر سرہند کے راستے سے کلانور اور رہتاس پہنچا اور وہاں سے نیلاب پر جا کر

ڈیرے ڈال دیے۔ مرزا کو یہ خبر ملی تو وہ لاہور کے دریا کو پار کر کے فرار ہو گیا اور کابل تک اپنی باگ نہ کھینچی۔

اسی سال ماہ ربیع الثانی میں بادشاہ نے نیلاب کے کنارے جو سندھ ساگر کے نام سے مشہور ہے، کٹک بنارس، کی طرح ایک قلعہ "کٹک بنارس" تعمیر کرادیا۔ وہاں سے شاہزادہ سلطان مراد کو قلیچ خاں اور دوسرے امرا کے ساتھ کابل پر حملے کے لیے روانہ کیا۔ ان کے آگے سنگھ کو سرداروں کی جمعیت کے ساتھ پشاور کی طرف بھیجا۔

انہی دنوں مرزا عبدالحکیم نے خواجہ ابوالفضل نقشبندی اور محمد علی دیوانہ کو اپنے قصور معاف کرانے کے لیے ایلچی بنا کر بھیجا۔ بادشاہ نے ان لوگوں کے ساتھ حاجی حبیب اللہ کو بھیج کر پیغام دیا کہ اسے معافی اس شرط پر مل سکتی ہے کہ اپنے کیے پر ندامت ظاہر کر کے آئندہ منحرف نہ ہونے کی قسم کھائے اور اپنی بہن کو جو خواجہ حسن کے نکاح میں ہے بارگاہ میں روانہ کر دے۔ مرزا نے حاجی سے کہا کہ بہن کو بھیجنے کے لیے خواجہ حسن راضی نہیں ہے اور وہ اسے لے کر بدخشاں چلا گیا ہے البتہ میں اپنے قصوروں پر پشیمان ہوں:

کردہ ام توبہ و از کردہ پشیمان شدہ ام
کافرم باز نگوئی کہ مسلمان شدہ ام

اکبر کا کابل کے لیے عزم

15 جمادی الثانی کو بادشاہ نے نیلاب کو پار کر کے خواجہ نظام الدین احمد کو حملہ کرتے ہوئے شاہزادہ مراد کے پاس جلال آباد جانے کا حکم دیا اور امرا کو کہلا بھجوایا کہ وہ اپنے مشورے سے اطلاع کریں۔ انھوں نے جواب بھیجا کہ حضور کا حملہ کرتے ہوئے یہاں آنا ہی مناسب ہے۔ نظام الدین احمد اور حاجی حبیب اللہ ایک ساتھ پشاور پہنچے اور اپنے اپنے پیغام خدمت میں پیش کیے۔

نظام الدین احمد نے کہا اگرچہ امرا کہنے کو تو کہہ رہے ہیں کہ اس مہم کے لیے ہم لوگ کافی ہیں لیکن درحقیقت وہ سب فتح کو حضور کی تشریف لانے پر ہی منحصر سمجھتے ہیں۔

اب بادشاہ نے بھی پیش قدمی کا فیصلہ کرلیا اور لشکر میں شاہزادہ سلطان سلیم کو راجہ بھگوان داس اور قاضی علی میر بخشی کے ساتھ چھوڑ کر خود اپنی خاص جمعیت کے ساتھ کوچ کیا اور روزانہ 20 کوس کی مسافت طے کرتے ہوئے شاہزادہ مراد کے لشکر سے 15 کوس پر موضع سرخاب میں پہنچ گیا۔

مرزا محمد حکیم کی شکست

مرزا محمد حکیم نے کابل سے 7 کوس کے فاصلے پر خورد کابل نامی موضع میں اپنے بھتیجے کے ساتھ شاہزادہ مراد کے لشکر پر حملہ کیا اور بڑی بہادری سے جنگ کی لیکن شکست کھا کر بھاگ گیا۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ عبداللہ خاں اوزبک کے پاس بھاگ جائے کہ شاہزادہ مراد کابل میں داخل ہو گیا۔

اس جنگ سے ایک دن پہلے فریدون خاں نے شاہزادہ کے چنداول پر حملہ کر کے بہت سے آدمیوں کو قتل کر دیا تھا۔ جس وقت یہ لوٹ مار ہو رہی تھی، حاجی محمد نام کا ایک احدی بادشاہ کے پاس سے ڈاک چوکی کے سلسلے میں وہاں پہنچا تھا اس نے یہ سارا حال دیکھا اور لوٹ کر سرخاب میں اس واقعے کی بادشاہ کو خبر دی۔ اس خبر سے بادشاہ کو بڑی تشویش ہوئی دوسرے دن جب وہاں سے کوچ ہونے لگا تھا کہ فتح کی خبر پہنچ گئی۔

کابل میں شاہانہ شان و شوکت سے داخلہ

10 رجب کو بادشاہ کی سواری کابل میں داخل ہوئی۔ بادشاہ نے اس شہر کے باغوں کی سیر و تفریح میں ایک ہفتہ بسر کیا۔ بادشاہ نے کابل میں مرزا محمد حکیم کے معتمد آدمیوں سے شاہ منصور کے موسومہ خطوط کے بارے میں بڑی تحقیق و تفتیش کی اور پتہ چلا کہ یہ سب اس کے خلاف ایک سازش تھی جو شہباز خاں کے بھائی کرم اللہ نے بعض امیروں کے ساتھ مل کر کی تھی اور وہ آخری خط بھی اس کے سبب بڑے امیروں کا لکھا ہوا تھا۔ جب حقیقت حال معلوم ہوئی تو بادشاہ کو شاہ منصور کے قتل پر بڑا رنج و افسوس ہوا۔ لیکن اب اس پشیمانی سے کیا حاصل ہوتا؟

بادشاہ نے میرزا کے پاس لطیف خواجہ میر شکار کو بھیج کر اس کو قصوروں کی معافی کی خوش خبری پہنچائی اور اسے اوزبکوں کی پناہ میں جانے سے منع کر دیا۔ مرزا حکیم نے اطاعت اور وفاداری کا عہد و پیمان کیا اور علی محمد اسپ کے ساتھ وہ خدمت شاہی میں حاضر ہو گیا۔ بادشاہ نے کابل اس کے حوالے کر دیا اور وہاں لشکر کو مقرر کر کے حملہ کرتے ہوئے جلال آباد واپس چلے آئے جہاں لشکر کا بڑا کیمپ تھا۔

اکبر کی واپسی

اس موقعے پر محمد قاسم خاں میر بحر کا بھائی خواجگی محمد حسین جو میرزا کا بڑا معتبر امیر تھا، بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے جلال آباد سے کافروں کے علاقے کوہ فتور پر حملہ کرنے کے لیے ایک فوج کو مقرر کیا اور منزل بہ منزل کوچ کرتے ہوئے 12 شعبان کو سندساگر کے کنارے پہنچ گئے۔ وہاں سے ایک ہی دن میں دریا کے پل پر سے سارے لشکر کو پار کرا کے مسلسل کوچ کرتے ہوئے رمضان کی آخری تاریخ کو لاہور آ گئے۔ پنجاب کی حکومت دوبارہ سعید خاں، راجہ بھگوانداس اور مان سنگھ کے سپرد کر دی اور دوآبہ پنجاب کے اماموں کے معاملات کی تحقیق و تصفیہ کے لیے ملا الہداد امروہہ، ملا الہداد سلطان پوری اور ملا شاہ محمد شاہ آبادی اور ملا شیری شاعر کو صدارت کے عہدے پر مقرر کیا۔ ان میں سے پہلے اور چوتھے صدر نے نیکی اور عدل میں شہرت پائی۔ دوسرے اور تیسرے صدر اپنی بدنیتی کی وجہ سے بدنام ہوئے۔ ملا شاہ محمد نے تو شیخ اسحاق کاکول جیسے پاکباز متقی اور پرہیزگار عالم کو پروانہ میں یہ فقرہ لکھ بھیجا تھا۔ "یا قومنا اجیبوا داعی اللہ" دوآبہ ہند میں شیخ فیضی کو صدر مقرر کیا گیا، گنگا پار کے علاقے پر حکیم ابوالفتح کو صدارت ملی اور دارالخلافہ کا صدر میر فتح اللہ کو مقرر کیا گیا۔

جب سواری پانی پت میں پہنچی تو اس جگہ شہباز خاں جس نے بادشاہ کے غائبانے میں گڑھی سے لے کر پنجاب تک سارے ممالک محروسہ کو اپنے طور پر لوگوں کی جاگیروں میں تقسیم کر دیا تھا اور جس کو جی چاہے عہدے عطا کر دیے تھے، بڑے تزک و احتشام کے

ساتھ بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا۔ جب بادشاہ نے اس خود اختیاری اور جرات کے متعلق باز پرس کی تو اس نے جواب دیا کہ اگر میں فوج کی اس قدر دل دہی نہ کرتا تو سب کے سب برگشتہ ہو جاتے۔ اب ملک تمہارا ہے، لشکر تمہارا ہے، جسے چاہو دے دو اور جس سے چاہو منصب اور جاگیر واپس لے لو:

زہر کہ خواہی بستان بہر کہ خواہی بدہ

25 شوال کو بادشاہ سلامت دہلی تشریف لائے، چھوٹے شاہزادوں اور بیگموں نے بادشاہ کا استقبال کیا۔ یہاں سے بادشاہ نے کوچ کیا اور 5 ذی قعدہ کو دار الخلافہ پہنچ گئے۔

چند دن کی مستی

اس سفر میں میں ساتھ نہ جا سکا تھا، مجھے ایک بندۂ خدا سے ایسا تعلق ہو گیا کہ میں پورے ایک سال تک بساور میں ہی رہا اور مجھے اس دوران میں عجیب و غریب اور سخت مصائب برداشت کرنے پڑے۔ پورا سال بادشاہ سے جدا رہنے کے بعد میں فتح پور گیا اور اسی مہینے کی 6 تاریخ کو بارگاہ میں حاضری دی، بادشاہ نے شیخ ابو الفضل سے پوچھا کہ یہ اس سفر میں کیوں ساتھ نہیں تھا؟ اس نے کہا" یہ بھی تمام مفت خور بدمعاشوں میں شامل ہے" میری غیر حاضری کا قصہ بس اسی بات پر ختم ہو گیا۔

جب لشکر کابل کے قریب تھا تو بادشاہ نے صدر جہاں کو حکم دیا تھا کہ جو اہل علم ہمارے لشکر کے ساتھ ہیں اور جو ساتھ نہیں آئے ہیں سب کے ناموں کی فہرست پیش کرو۔ جب میرا نام آیا تو خواجہ نظام الدین (58) مرحوم مصنف تاریخ نظامی نے، جن سے میری دوستی ایک سال سے قائم تھی اور بڑا تعلق خاطر ہو گیا تھا، مجھے مریض لکھوا دیا اور فہرست پیش کرا دی۔ مرحوم نظام الدین تمام احباب کے ساتھ عام طور سے دل سوزی اور ہمدردی سے پیش آتے تھے، مجھ پر تو ان کی خاص مہربانی تھی۔ اس دوران انھوں نے مجھے پے در پے کئی خط بھی لکھے تھے اور تاکید کی تھی کہ چونکہ تم لشکر کے ساتھ آ نہیں سکے ہو اس لیے اب استقبال کے لیے کم از کم لاہور، دہلی یا متھرا جہاں تک بھی ہو سکے آنے کی کوشش 18

کرو، کیونکہ یہ دنیاوی معاملات ہیں اور ان میں احتیاط برتنا ضروری ہے"۔ اس بے چارے نے خیر خواہی سے یہ سب کچھ لکھا، لیکن میں اس عالم میں مست تھا کہ مجھے اس کا ایک ایک لمحہ عمر جاودانی سے اعلیٰ و ارفع معلوم ہو رہا تھا، مصلحت اور نفع و نقصان کی فکر کسے تھی:

تو با خدای خود انداز کار و خوش دل باش
کہ رحم اگر نکند مدعی خدا بکند

اس مستی و کیف کے عالم میں حالت خواب میں بھی کبھی شعر کہتا تھا۔ چنانچہ ایک رات نیند میں میں نے یہ شعر کہا تھا اور بیدار ہونے کے بعد عرصے تک اس کو یاد کر کے میں مضطرب و بے قرار رہا:

آئینہ ما روی ترا عکس پذیر است
گر تو نمائی گنہ از جانب ما نیست

رب العزت کی قسم کہ اس واقعے کو گزرے ہوئے تا دم تحریر 17 سال بیت گئے ہیں ابھی تک اس ذوق و سرمستی کی لذت سے میرا دل سرشار ہے۔ جب بھی میں ان دنوں کو یاد کرتا ہوں زار زار رونے لگتا ہوں، کاش کہ میں اسی عالم میں اس دنیا کے جھگڑوں سے پاک ہو جاتا:

خوش آنکہ دید روی ترا و سپرد جان
آگہ نشد کہ ہجر کدام و وصال چیست

ان دنوں مجھے سررشتہ معرفت ہاتھ آگیا تھا اور میرا دل ایسے فیض سے سرشار تھا کہ اگر میں ساری عمر اس کا ذکر کرتا ہوں اور شکر بجا لاؤں تو بھی اس کا حق ادا نہیں ہو سکتا:

در گوش دلم شد یک زمزمۂ عشق
زان زمزمہ ام زپای تا سرہمہ عشق
حقا کہ بہ عہدہا نیایم بیرون
از عہدۂ حق گزاری یک دمہ عشق

ترہٹ میں بغاوت

بادشاہ جس زمانے میں کابل کی طرف متوجہ تھے، ترہٹ کے علاقے میں بہادر ولد سعید بدخشی نے اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کر دیا تھا۔ اپنا خطاب بہادر شاہ رکھا تھا اور اپنی مہر کے لیے یہ سجع تجویز کیا تھا:

بہادر الدین سلطان است بن اسفید شہ سلطان
پدر سلطان و خود سلطان زہی سلطان بن سلطان

آخر کار وہ اعظم خاں کے سپاہیوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔

معصوم خاں کا قتل

معصوم خاں فرنخودی کوہ سوالک میں حیران و پریشان گھومتا رہا۔ آخر اس نے اعظم خاں کو وسیلہ بنا کر اپنے قصوروں کی معافی کے لیے لکھا۔ بادشاہ نے اس کی دلجوئی کے لیے فرمان بھیج دیا اور وہ فتح پور میں آ کر کورنش بجا لایا۔ چند دن بعد آدھی رات کے وقت وہ دربار سے اپنے گھر سنگھاسن پر سوار ہو کر جا رہا تھا کہ شہر کے دروازے کے باہر ٹھگوں کے گروہ نے اس کو گھیر لیا اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔۔۔

نیابت خاں کا قتل

جس دن معصوم ملازمت شاہی میں حاضر ہوا تھا اسی دن نیابت خاں بھی بیگم بادشاہ کے توسط سے خدمت میں باریاب ہوا تھا۔ بادشاہ نے اس کے چچا شہاب الدین احمد خاں جو مالوہ کا حاکم تھا کی خاطر اس کی جان بخشی کر دی اور کچھ دن کے لیے رنتھنبور کے قلعے میں بھیج دیا۔ وہ اسی قلعے میں قید تھا۔ اسی قید کی حالت میں اس نے ایسی ایسی حرکتیں کیں جو ناقابل بیان ہیں۔ اس نے وہاں بھی دوسرے قیدیوں کو ہموار کر کے فتنہ و فساد مچانے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ اس کی ان حرکتوں سے بادشاہ نے 997ھ میں فرمان بھیج کر اس کا جھگڑا بھی ہمیشہ کے لیے پاک کر دیا۔

انہی دنوں بادشاہ کی سوتیلی والدہ حاجی بیگم جو بڑی نیک، خدا رسیدہ اور فیاض خاتون تھیں اور دہلی میں جنت آشیانی ہمایوں بادشاہ کے روضے کی مجاورت اختیار کر رکھی تھی فوت ہو گئیں۔ ان کے انتقال سے روضے کے مجاوروں اور وہاں کے باشندوں کے معاملات میں بڑی خرابی اور انتشار پیدا ہو گیا۔

عیسائی سے مناظرہ

بادشاہ نے فرنگی راہبوں سے بحث و مناظرے کے لیے شیخ قطب جلیسری کو جو نہایت بدمست مجذوب تھا۔ شیخ جمالی بختیار کے ذریعے بلوایا اور اس مجلس میں اس عہد کے تقریباً تمام دانشوروں اور صاحب اجتہاد عالموں کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ شیخ نے کہا خوب بھڑکتی ہوئی آگ جلائی جائے، اس آگ میں میں اور میرے مقابل حریف داخل ہوں گے۔ جو صحیح سلامت نکل آئے گا وہی حق پر سمجھا جائے گا۔ چنانچہ آگ جلائی گئی اور اس نے فرنگی راہب کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا "چلو آؤ بسم اللہ" فرنگیوں میں اور کسی کو اس آگ میں داخل ہونے کی ہمت نہ پڑی۔ بادشاہ فرنگیوں کو ناکام ہوتا ہوا دیکھنا نہیں چاہتا تھا، اس لیے مارے غیرت کے شیخ قطب کو چند دوسرے فقراء کے ہمراہ بھکر بھجوا دیا۔ یہ لوگ اپنے آخری وقت تک اسی جگہ رہے۔ اس طرح بہت سے فقراء کو مختلف مقامات پر جلاوطن کر دیا۔ اکثر کو تو قندھار بھیج کر ان کے عوض وہاں سے گھوڑے منگوا لیے۔

فقراء کی جلاوطنی

اس زمانے میں فقیروں کی ایک جماعت الہیوں کے نام سے مشہور تھی۔ یہ لوگ پیری مریدی کا سلسلہ چلاتے ہوئے تھے اور طرح طرح کی بیہودہ اور گمراہ کن باتیں کرتے رہتے تھے۔ ان فقیروں کو بھی گرفتار کر کے لایا گیا۔ بادشاہ نے ان سے کہا کہ تم ان بیہودہ عقائد سے توبہ کرو۔ انھوں نے مہمل باتیں کر کے توبہ کرنے سے انکار کر دیا۔ ان فقیروں نے دین اسلام میں روزہ وغیرہ کے نئے نئے نام اختراع کر رکھے تھے۔ بادشاہ نے ان

فقیروں کو بھی بھکر اور قندھار بھیج کر ترکی نسل کے گھوڑے ان کے عوض منگوا لیے۔

شیخ ادھن کے پوتوں کو بھی جو جونپور کے بڑے مشائخ میں سے تھے اہل و عیال کے ساتھ دربار میں بلایا گیا اور ان کو اجمیر بھیج کر وظیفہ مقرر کر دیا۔ ان میں سے دو تین افراد تو انتقال کر گئے اور اس خاندان کے دوسرے لوگ نہایت تنگ دستی کے ساتھ گزر بسر کر رہے ہیں۔

حضرت خواجہ معین الدین کے پوتے شیخ حسین نے حسب دستور تعظیم و تسلیمات بجالانے سے انکار کر دیا تھا اور اخراج کا حکم صادر ہونے کے بعد وہ مکہ معظمہ کو چلے گئے تھے۔ انہی دنوں مکہ سے فتح پور واپس تشریف لائے۔ اس مرتبہ بھی انھوں نے پہلے کی طرح کورنش ادا نہیں کی۔ بادشاہ نے ان کو بھی سرکش جان کر بھکر میں بھجوا دیا۔ 1002ھ میں نظام الدین احمد، شیخ حسین اور شیخ کمال بیابانی وغیرہ کو بھکر سے دربار میں بلایا گیا۔ ان لوگوں نے زمین بوس کی رسم ادا کر دی اس لیے ضمانتیں لے کر ان کو رہا کر دیا گیا۔ لیکن کمال بیابانی کو رنتھمبور کے قلعے میں بھیج دیا اور شیخ حسین کے لیے بھکر ہی میں مدد معاش کا انتظام کرا کے اس جگہ مقرر کر دیا۔

اعظم خاں کی بنگالہ سے آمد

9 محرم 990ھ کو اعظم خاں بنگالہ سے آکر حاضر ہوا۔ ایک رات گفتگو کے دوران بادشاہ نے اس سے کہا ہم مضبوط دلیلوں کی بنا پر عقیدۂ تناسخ کو حق سمجھتے ہیں۔ شیخ ابوالفضل تم کو بھی یہ مسئلہ بخوبی سمجھا دے گا، اعظم خاں نے یہ بات قبول کر لی، بادشاہ نے اسے ان امیروں کے ساتھ جو کابل کی مہم پر نہ جا سکے تھے معصوم کابلی کی بغاوت کو کچلنے کے لیے مقرر کر دیا۔

تخت نشینی کا اٹھائیسواں سال

اسی سال 15 صفر کو نوروز ہوا، اور شاہی تخت نشینی کا اٹھائیسواں سال شروع ہوا۔ جشن نوروز کے لیے دیوان خانۂ خاص اور عام کو بڑے ٹھاٹھ سے سجایا گیا، رنگ برنگے پردے لگائے

گئے، طرح طرح کی قیمتی چیزیں سلیقے سے رکھی گئیں۔ فرنگی پردے اور خوبصورت تصویریں آویزاں ہوئیں، اونچے اونچے سراپردے قائم کیے گئے۔ فتح پور اور آگرہ کے بازاروں میں بھی بڑی دھوم دھام سے آرائش کی گئی اور برابر 18 دن تک نو روز کا شاہانہ جشن منعقد کیا گیا۔ جشن کی محفلوں میں بے شمار ہندی اور فارسی گویئے موسیقار اور اہل طرب مرد اور عورتیں اپنے اپنے ہنر اور کمال دکھاتی تھیں اور ایوان میں ہر روز کوئی ایک بڑا امیر حاضر ہوتا اور بادشاہ کے لیے قیمتی نذرانہ اور تحائف پیش کر کے ہم نشینی کا اعزاز حاصل کرتا۔

دین الٰہی کا نفاذ

ہجرت پر ابھی پورے ہزار سال نہیں ہوئے تھے مگر بادشاہ نے اپنے طور پر یہ طے کر دیا کہ ہجرت سے نہ سہی حضور اکرم ﷺ کی بعثت سے تو پورے ہزار سال ہو چکے ہیں اور اب پیغمبر علیہ السلام کے لائے ہوئے دین کی مدت ختم ہو چکی ہے۔ اس لیے وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم ایک نئے دین کے آغاز کا اعلان کر دیں۔ اس وقت ایسے کسی دعوے اور اعلان کے لیے کوئی رکاوٹ بھی باقی نہیں رہی تھی۔ سب سے بڑی رکاوٹ علما اور مشائخ کی تھی جن کے اثر و اقتدار کا لحاظ کرنا پڑتا تھا۔ ان علما کو دربار سے خارج کیا جا چکا تھا، اسی لیے نہایت اطمینان و جسارت کے ساتھ اکبر نے اسلامی احکام کی منسوخی اور ایک نئے دین کے اصول و قواعد کے نفاذ کا فیصلہ کر کے اس سلسلے میں پہلا حکم یہ صادر کیا کہ اب سے سکے پر "الفی تاریخ" یعنی کہ ہزارواں سال ثبت کیا جائے اور یہ ہزار سن "بعثت" ہجرت سے نہیں بلکہ بعثت سے موسوم کیا جائے۔

دین الٰہی کی بدعتیں

اسی طرح دوسری اور بہت سی نئی نئی اختراعات مصلحت ملکی کے عنوان سے حکماً عمل میں لائی گئیں اور ایسی ایسی بدعتوں کے احکام دیے گئے کہ انھیں دیکھ کر عقل حیران و سر بہ گریباں ہو جاتی تھی۔

ایک حکم تو یہ تھا کہ زمین بوس کے نام سے بادشاہوں کے لیے سجدہ کرنا جائز و لازم ہے۔ دوسرا یہ کہ اگر شراب جسمانی صحت کی خاطر علاج کے طور پر پی لی جائے اور اس کے پینے سے خلل و فساد نہ پیدا ہو تو وہ جائز ہوگی۔ اس کے برخلاف اگر کوئی اتنی پی لے کہ بدمستی کرنے اور شور و غوغا مچانے لگے تو اسے سزا دی جائے گی۔ حسب الحکم دربار کے دروازے پر شراب فروش کی ایک دکان بھی قائم کی گئی جس کی منتظم دربان کی بیوی تھی۔ یہ عورت کسی شراب فروش کی بیٹی تھی، بادشاہ نے خود شراب کا دام مقرر کیا۔ اس دکان سے ہر شخص علاج کے نام سے منشی کے پاس اپنا اور اپنے باپ دادا کا نام لکھوا کر شراب خرید سکتا تھا۔ لوگ فرضی نام لکھوا لکھوا کر شراب مول لے جاتے تھے ان کی تحقیق کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اس طرح شاہی سرپرستی میں نشے کے بازاروں میں متوالوں کے لیے باقاعدہ سرکاری دکانیں کھل گئیں۔ لوگوں کا بیان ہے اس شراب میں سور کے گوشت کا عرق بھی شامل کیا جاتا تھا۔ اس احتیاط و سختی کے باوجود لوگ پی پی کر وہاں شور و غوغا مچانے لگے اور ہر روز جھگڑا و فساد ہونے لگا۔ سپاہی روزانہ بدمستوں کو پکڑ کر سزائیں دیتے تھے، لیکن ان کی مستی اتارے نہیں اترتی تھی۔ بادشاہ سلامت اس دکان کو بند بھی نہیں کرنا چاہتے تھے اور ان ہنگاموں سے عاجز بھی تھے۔

شیطان پورہ

اس زمانہ میں پایہ تخت فتح پور میں سارے ملک سے کھینچ کھینچ کر بہت سی طوائفیں اور فاحشہ عورتیں جمع ہوگئی تھیں۔ ان کی تعداد حساب و شمار سے باہر تھی۔ شاہی حکم سے ان عورتوں کو شہر سے باہر بسایا گیا اور ان کی بستی کا نام "شیطان پورہ" رکھا گیا اور وہاں بھی محافظ داروغہ اور منشی مقرر کیے گئے کہ جو شخص بھی ان عورتوں کے پاس جائے یا ان کو اپنے ساتھ لے جانا چاہے تو وہ باضابطہ اپنا نام و نسب رجسٹر میں درج کرادے۔ اس کارروائی کے بعد ہر شخص کو ان رنڈیوں کے ساتھ زنا کرنے کی اجازت رہتی تھی۔ اس دفتری اندراج کے بغیر کوئی شخص کسی عورت کو رات کے وقت اپنے گھر نہیں لے جاسکتا تھا۔ ان میں سے کنواری لڑکیوں

کے ساتھ پہلی شب باشی کی اجازت صرف نامی گرامی امراء کو ہی حاصل تھی وہ بھی داروغہ کو باقاعدہ اطلاع کر کے اور دربار سے اجازت حاصل کر کے اس امیر کو اس کا موقع دیتا تھا۔ بدمعاشوں نے یہاں بھی فرضی ناموں سے اپنا دھندا بے روک ٹوک شروع کر دیا۔ لوگ بدمست ہو کر جھگڑے فساد کرنے لگے اور عورتوں کی خاطر ایک دوسرے کا خون بہانے لگے۔ قصاص میں پکڑے بھی جاتے تھے اور سزا بھی پاتے تھے لیکن ان کی جگہ دوسرے بڑے فخر و مباہات کے ساتھ یہ جرائم کرنے کے لیے آجاتے تھے:

حسن بی پایانِ او چندان کہ عاشق می کند
زمرۂ دیگر بہ عشق از غیب سر بر می کند

ان فاحشہ عورتوں میں سے جو مشہور اور نامی گرامی عورتیں تھیں ان کو بادشاہ نے پوشیدہ طور پر اپنے پاس بلایا اور ان سے دریافت کیا کہ سب سے پہلے کس شخص نے ان کے کنوارے پن کو توڑا تھا۔ ان عورتوں نے جن امرا کے نام لیے ان کو سخت سزائیں دیں اور کافی عرصے تک قید میں بھیج دیا۔ انہی میں سے ایک نے راجہ بیربر کا بھی جو "مراتب چہارگانہ" میں سب کا پیشرو اور مخلص مرید تھا، نام لیا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس نے اپنی بیٹیوں تک کو نہیں چھوڑا ہے، وہ اس زمانے میں اپنی جاگیر کورہ میں گیا ہوا تھا، جب افشائے راز کی یہ خبر اس کو ملی تو اس نے جوگی بن جانے کا فیصلہ کر لیا، پھر بادشاہ نے عنایت آمیز فرمان لکھ کر اس کو دربار میں بلا لیا۔

گائے کے ذبیحہ پر ممانعت

بادشاہ کو بچپن ہی سے ہندوؤں سے خاصی وابستگی تھی۔ انہی کی صحبت میں گائے کی تعظیم اس کے ذہن نشین ہو گئی تھی، اس لیے گائے کے ذبیحہ کی بھی ممانعت کر دی گئی۔ ہندوستان کے بڑے بڑے راجاؤں کی بہت سی لڑکیاں شاہی حرم میں تھیں، اور وہ بادشاہ کے مزاج پر بہت حاوی تھیں۔ ان کی صحبت کی وجہ سے اکبر گائے کا گوشت، لہسن اور پیاز کھانے اور داڑھی رکھنے سے پرہیز کرتا تھا اور اپنی مجلس میں ہندوؤں کی رسومات کی پابندی کیا کرتا

تھا۔ غرض ان ہندو عورتوں اور اُن کے خاندان والوں کی دلجوئی کی خاطر اکبر نے ان تمام باتوں کو ترک کر دیا جس سے ہندوؤں کے مذہب کو آنچ آتی تھی۔

داڑھی ترشوانے کا رواج

جو لوگ داڑھی منڈواتے تھے بادشاہ ان کو زیادہ پسند کرتا تھا اس وجہ سے داڑھی منڈوانے کا عام رواج ہو گیا۔ داڑھی منڈوانے کے متعلق بڑی عجیب و غریب دلیلیں پیدا کی گئیں کہ داڑھی کا تعلق اصل میں مرد کے خصیوں سے ہے۔ چنانچہ خواجہ سراؤں کی داڑھی نہیں ہوتی کیونکہ ان کے خصیے ناکارہ ہوتے ہیں اس لیے اس کے رکھنے یا نہ رکھنے میں ثواب و عذاب کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔ پچھلے زمانے میں ملامتی فرقے کے عبادت گزار لوگ داڑھی رکھنے کو ایک طرح کی ریاضت سمجھ کر رکھا کرتے تھے ان کی دیکھا دیکھی داڑھی رکھنے کا رواج ہو گیا۔ اب اس زمانے میں ریاضت اور ملامت داڑھی رکھنے میں نہیں بلکہ منڈوانے میں ہے، کیوں کہ اب اگر داڑھی منڈوائی جائے تو نادان فقیہ اور عالم ناراض ہوں گے اور ملامت کریں گے۔ شاہی مفتی بھی اپنی داڑھیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دور کی کوڑی لائے اور فقہ کی کتابوں میں سے ایک مجہول سی روایت نکال لائے جس میں یہ فقرہ تھا "کما یفعلہ بعض القضاۃ" اس فقرہ میں ان بے دین مفتیوں نے تحریف سے کام لیا۔ اصل لفظ "عصات" تھا اس کو "قضات" میں تبدیل کر دیا۔ اب بجائے گناہگاروں کے اس کا مطلب نکلا کہ جس طرح عراق کے بعض قاضیوں کا عمل داڑھی منڈانا تھا۔

زمانے کی نیرنگی دیکھیے کہ جب میں نیا نیا شاہی دربار میں گیا تھا تو اس وقت اتفاق سے میری داڑھی حد شرعی سے کسی قدر کم تھی جب حکیم ابوالفتح نے مجھے دیکھا تو میر ابوالغیث بخاری مرحوم کے سامنے لعنت ملامت کرنے لگا کہ تم جیسے آدمیوں کو داڑھی گھٹانا زیب نہیں دیتا۔ میں نے جواب دیا کہ "یہ حجام کا قصور ہے میرا نہیں"۔ آیندہ ہرگز ایسا نہ کرنا، یہ بات نہایت بدنما اور نازیبا ہے۔ دن ایسے پھرے کہ اس ابوالفتح نے حیدری جوالقی فقیروں بلکہ ہندوؤں سے بھی کہیں زیادہ اپنے رخساروں کا بالکل ہی صفایا کرا دیا اور تو عمر چھ کر۔

طرح چھیل چھبیلا بن کر بال تراشی کی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگا۔

تثلیث پرستی

ہندوؤں کی ان رسومات کے علاوہ دربار میں نصاریٰ کی ناقوس نوازی بھی ہونے لگی اور ان کے تین خداؤں کی تصویروں کی زیارت بھی کی جانے لگی۔ طرح طرح کے لہو ولعب شروع ہوگئے۔ اس زمانہ کی تاریخ نکالی گئی:

"کفر شائع شد"

دین الٰہی کے اقرار نامے

دس بارہ سال کے اندر اندر یہ صورت ہوگئی کہ اکثر گمراہ جیسے مرزا جانی حاکم ٹھٹھہ اور دوسرے بڑے مرتبہ والے امراء نے اپنے ہاتھ سے اس مضمون کے اقرار نامے لکھے کہ میں "فلاں ابن فلاں" اپنی خوشی اور مرضی سے مجازی اور تقلیدی دین اسلام سے جسے میں اپنے باپ دادا سے دیکھتا اور سنتا چلا آیا ہوں، انکار کرتا ہوں اور اب میں دین الٰہی اکبر شاہی میں داخل ہوگیا ہوں اور اخلاص کے مراتب چہارگانہ یعنی ترک مال و جان و ناموس و دین کو قبول کرتا ہوں"۔ یہ اقرار نامے اس نئے دین کے مجتہدین کو سپرد کردیے جاتے تھے اور بادشاہ اقرار کرنے والوں کے ساتھ بڑی مہربانی کا سلوک کیا کرتا تھا۔

کتے اور سور کی پاکی

احکام اسلام کی مخالفت میں سور اور کتے کو پاک قرار دے دیا گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ ان ناپاک جانوروں کو شاہی محل کے نیچے رکھا گیا۔ بادشاہ ہر صبح ان کے دیدار کو عبادت سمجھتا تھا، کیونکہ ہندوؤں نے یہ ذہن نشین کرادیا تھا کہ سور ان 10 مظاہر میں سے ایک مظہر ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے۔ کتے کے متعلق بعض عارفوں کا یہ قول سند تھا کہ کتے میں ایسی 10 عمدہ صفات ہیں اگر ان میں سے ایک صفت کسی آدمی کو مل جائے تو وہ ولی بن

جائے۔ دربار کے بعض مقرب، اور ملک الشعرا فیضی تو اپنے دسترخوان پر چند کتوں کو ساتھ لے کر بیٹھا کرتا تھا اور عراق و ہندستان کے بعض مردود مشاہیر اس کی پیروی کرتے تھے۔ بلکہ بڑے فخر کے ساتھ کتوں کی زبان اپنے منھ میں لے کر پیار کرتے تھے۔

غسل جنابت کی تحریم

نئے دین کی شریعت میں ناپاکی کے غسل کی فرضیت بھی کلی طور پر منسوخ کردی گئی۔ دلیل یہ لائی گئی کہ انسان کی اصل منی کے نطفے سے ہے، جو نیک اور پاک لوگوں کی آفرینش کا سبب ہے۔ اس صورت میں یہ عجیب بات ہے کہ پیشاب اور پاخانے کے اخراج پر تو غسل واجب نہیں ہوتا اور اس پاکیزہ لطیف مادہ کا اخراج غسل کو واجب کردیتا ہے، بلکہ مناسب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے غسل کریں بعد میں جماع۔

آشِ حیات

ایک اور بات پیدا کی گئی کہ موت کے دن مردہ کو ثواب پہنچانے کے لیے کھانا پکوانا نہایت لغو ہے۔ مردہ جمادات میں شامل ہوجاتا ہے، اس کو کس طرح ثواب پہنچ سکتا ہے۔ اس کے بجائے روز ولادت کو جشن کرکے کھانا پکوانا چاہیے۔ اکبر نے ولادت کے کھانے کا نام "آش حیات" رکھا۔

شیر اور جنگلی سور کا گوشت اس بنا پر حلال کردیا کہ اس سے آدمی میں بہادری کی صفت پیدا ہوتی ہے۔

چچا، ماموں، قریبی رشتہ داروں کی لڑکیوں سے نکاح حرام کردیا گیا، کیونکہ ان لڑکیوں کی طرف مرد کی خواہش کمزور رہتی ہے۔ نکاح کے لیے عمر مقرر کی گئی کہ مرد کے لیے 16 سال کی عمر سے اور عورتوں کے لیے 14 سال کی عمر سے پہلے نکاح روا نہیں، کیونکہ چھوٹی عمر کی اولاد کمزور پیدا ہوتی ہے۔

سونے اور ریشم کا جواز

سونا اور ریشم پہننا فرض عین قرار دیا گیا۔ ایک دن میں نے مفتی ممالک محروسہ کو خالص ریشم کا لباس پہنے ہوئے دیکھا، میں نے یہ پوچھا ریشم پہننے کے لیے کوئی روایت نکل آئی ہے کیا؟ اس نے کہا ہاں! جس شہر میں ریشمی لباس عام ہو جائے وہاں ریشم پہننا جائز ہے"۔ میں نے کہا بظاہر تو یہی روایت معلوم ہوتی ہے کہ بادشاہ نے اس کا حکم دے رکھا ہے۔ اس نے کہا، نہیں اس کے علاوہ بھی روایت موجود ہے، واللہ اعلم!

نماز، روزہ اور حج وغیرہ اس سے پہلے ہی متروک ہو چکا تھا، بعض حرام زادوں نے جیسے ملا مبارک کے بیٹے ابوالفضل نے ان عبادتوں کی مذمت اور تمسخر میں کئی ایک رسالے بڑے دلائل کے ساتھ لکھے، بادشاہ کو یہ رسالے بہت پسند آئے، اور اس پر بڑی نوازش فرمائی۔

سن الٰہی کا اجراء

عربی کے سن ہجری کو اکبر نے موقوف کرادیا اور اس کی جگہ تاریخ کو اپنے جلوس کے سن سے شروع کرایا جو 963ھ میں ہوا تھا۔ مہینوں کا تعین عجمی بادشاہوں کے طریقے پر کیا گیا جو نصابی کتابوں میں درج ہے۔

زردشتیوں کے مذہب کی طرح سال میں چودہ عیدیں مقرر کی گئیں۔ مسلمانوں کی عیدوں کی رونق باقی نہ رہی البتہ جمعہ کا التزام باقی رہا وہ صرف اس خیال سے کہ جمعہ کا خطبہ بادشاہ کے نام سے پڑھا جاتا تھا اور اس میں بھی بس بوڑھے لوگ شریک ہوا کرتے تھے۔

نئی تقویم میں سال اور مہینوں کو سن الٰہی اور ماہ الٰہی کہا جانے لگا۔ تنکہ اور مُہر پر تاریخ الٰہی ثبت کرایا گیا، یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ ایک ہزار سال پر دین محمدی کی مدت ختم ہو چکی ہے۔

عربی زبان کی مخالفت

عربی پڑھنا عیب ہوگیا۔ فقہ، حدیث اور تفسیر پڑھنے والے مطعون کیے جانے لگے۔ نجوم، حکمت، طب، ریاضی، شعر، تاریخ اور افسانے کی تحصیل فرض ہوگئی۔ عربی کے خاص حروف جیسے ث، ح، ع، ص، ض، ط، ظ کو لغت سے نکال دیا گیا۔ چنانچہ عبداللہ کو ابداللہ، احدی کو اہدی کہا اور لکھا جاتا تو اکبر بہت خوش ہوتا تھا۔

شاہنامے کے دو شعر جسے فردوسی طوسی نے شاہنامے میں نقل کیا ہے۔ بادشاہ سلامت کو بہت پسند تھے اور ان کو وہ سند بنائے ہوئے تھے شعر یہ ہیں:

زشیر شتر خوردن و سوسمار
عرب را بجائی رسیدہ است کار
کہ ملک عجم راکنند آرزو
تفو باد بر چرخ گردون تفو

بادشاہ کو اساتذہ کا جو شعر بھی اپنے مسلک کے مطابق مل جاتا وہ اسے سند بنالیتا تھا۔

دینی مسائل کا تمسخر

غرض اکبر نے دین کے ہر مسئلے اور ہر عقیدے میں جیسے نبوت، کلام، رویت، تکلیف، تکوین، حشر و نشر خواہ وہ اصول سے متعلق ہو یا فروع سے طرح طرح کے شبہات پیدا کیے اور ہر ایک کا تمسخر و استہزا کیا۔ اگر کوئی شخص جواب دینے یا تنقید کرنے پر آمادہ ہوتا تھا تو اس کو جواب دینے سے روک دیا جاتا تھا اور کسی بات کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ مناظرے میں عموماً ثابت کرنے والے کے مقابلے میں انکار کرنے والے کا پلہ ہی بھاری رہتا ہے۔ خصوصاً جب کہ مقابل کو کسی بات کے جبراً منوانے کے بھی پورے اختیارات حاصل ہوں، بحث میں تو دونوں فریقوں کے مساوی ہونے کی شرط لازمی ہے اور یہاں ذرہ و آفتاب کا معاملہ، کون کس سے بحث کرتا اور بحث کی کس کو ہمت تھی؟ چنانچہ اس

مباحثے کی قربان گاہ پر کتنے ہی خاندان تباہ و برباد ہو گئے۔ یہ تو مباحثہ نہیں بلکہ ''مکابرہ'' ہوتا تھا جس میں دین فروش علماء خوشامد کے لیے طرح طرح کے استدرکات و مشتبہات کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر بطور تحفہ پیش کرتے تھے، جیسا کہ لطیف خواجہ نے جو ماوراء النہر کے بزرگ زادوں میں سے تھا، شمائل ترمذی کی اس حدیث "کانہ جید دمیۃ" (حضور کی گردن تصویر کی گردن کی طرح تھی) کے بارے میں جو سیرت کی کتابوں میں مشہور ہے اور ہجرت کے آغاز میں قریش کے قافلے کو لوٹ لینے کے متعلق، حضور ﷺ کے چودہ نکاح کرنے اور آپ ﷺ کی رحلت کے بعد دوسروں پر آپ ﷺ کی بیبیوں کے حرام ہونے کے سلسلے میں بڑے اعتراض اٹھائے گئے اور اس طرح کی لایعنی بحثیں نکالی گئیں، جن کی تفصیل کے لیے کافی وقت درکار ہے۔

چہل گانہ کی مجلس

بادشاہ نے اپنی رات کی محفل میں چالیس مقربوں کو شرکت کے لیے مخصوص کر دیا۔ ان 40 عقلمندوں کی محفل میں جس کو جو کچھ میں آتا پیش کرتا اور سوال و جواب کا سلسلہ جاری رہتا۔ اگر کوئی کسی علمی مسئلہ کے متعلق سوال اٹھاتا تو اس سے کہا جاتا کہ ایسی باتیں ملاؤں سے پوچھی جائیں اور جو مسائل عقل و حکمت پر مبنی ہوں وہ ہمارے سامنے لائے جائیں۔ ان محفلوں میں جب سیرت کی کتابیں پڑھی جاتیں تو یہ لوگ ایسی ایسی بے ادبانہ باتیں کرتے، خاص طور سے خلفائے راشدین کی خلافت، قضیۂ فدک اور جنگ صفین کے سلسلے میں ان کی زبانیں اس بے باکی سے چلتی تھیں کہ انھیں بیان کرنے سے بھی غیرت آتی ہے۔ خدا ایسی باتیں کسی کو نہ سنوائے۔

شیعوں کو بڑا غلبہ اور اقتدار حاصل ہو گیا تھا اور سنی عاجز و مغلوب ہو گئے تھے۔ جتنے خدا کے نیک بندے تھے وہ خوف زدہ رہنے لگے تھے اور شرپسند عناصر کے لیے میدان بالکل صاف ہو گیا تھا۔ ہر روز کوئی نہ کوئی نیا حکم، ایک نہ ایک نئی ممانعت نکلتی، طرح طرح کے اشکال و اوہام سامنے لائے جاتے۔ بادشاہ اور اس کے حواری اپنے معتقدات و

نظریات کے حق ہونے کے لیے کوئی دلیل اور ثبوت تو کیا لاتے صرف دوسروں کی نفی اور تردید کرتے اور اپنی بات منوانے کی فکر میں رہتے۔ بے دینوں کی بن آئی تھی۔ اچھے لوگ مردود ہو گئے تھے اور مردود مقبول بن گئے تھے۔ جو نزدیک تھے انھیں دھتکار دیا گیا اور جو دور تھے ان کو قریب کر لیا گیا تھا۔

دربار کے اس رنگ کو دیکھ کر سارے ملک میں بڑا شور و غوغا مچا اور بادشاہ کی ان حرکتوں پر لوگ اللہ اکبر کہہ کر کان پکڑنے لگے۔ اس صورتحال کو ملا شیری کے اس قطعہ میں کس عمدگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اس نے یہ قطعہ اسی پُر آشوب زمانہ میں کہا تھا:

تا بزاید ہر زمان کشور بہ انداز آفتی — فتنہ در کوی حوادث کہ خدا خواہد شدن
باعقاب قرض خواہ تیغ در ارباب شرک — بار سر از ذمۂ گردن ادا خواہد شدن
فیلسوف کذب را خواہد گریبان پارہ شد — خرقہ پوش زہد را تقوی روا خواہد شدن
شورش مغز است اگر در خاطر آرد جاہلی — کز خلائق مہر پیغمبر جدا خواہد شدن
خندہ می آید مرا زین بیت بس کز طرفگی — نقل بزم منعم و ورد گدا خواہد شدن

بادشاہ امسال دعویٰ نبوت کردہ است
گر خدا خواہد پس از سال خدا خواہد شدن

جشن نوروز کی محفلیں

جشن نوروز کے موقعے پر اکثر علماء و صلحاء بلکہ قاضی اور مفتی تک جام و مے سے شغل کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے:

عشقت خبر ز عالم بی ہوشی آورد
اہل صلاح را بہ قدح نوشی آورد
یاد تو ای نگار چہ معجون حکمت است
کز ہرچہ خواندہ ایم فراموشی آورد

نئے دین الٰہی کے مجتہد، خاص طور سے ملک الشعراء فیضی تو یہ کہہ کر پیتے کہ "ہم

یہ پیالہ فقیہوں اور عالموں کے اندھے پن کے نام پر پیتے ہیں"۔

نو روز کے آخری دن کا نام جو برج حمل کے انیسویں درجے میں ہوتا تھا "شرف الشرف" رکھا گیا تھا۔ اس روز تمام دنوں سے بڑھ چڑھ کر جشن کا اہتمام ہوتا اور کورنش و تعظیم کے مراسم ادا کیے جاتے۔ امراء کے منصب و جاگیر میں اضافے ہوتے۔ حسب مدارج گھوڑے اور خلعتیں عطا ہوتیں، شاندار ضیافتیں ہوتیں، نذرانے اور تحفے گزارے جاتے۔

اسی نو روز کے موقعے پر بنگالہ سے شاہم خان جلائر اور لاہور سے راجا بھگوان داس حاضر ہوئے۔ اعظم خاں اور دوسرے تمام امرا حاجی پور سے دارالخلافہ میں پہلے سے آئے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے بہار میں باغیوں نے بغاوت کا پرچم بلند کردیا تھا۔ معصوم خاں کابلی کے ایک ملازم خبیثہ بہادر نے ترخان دیوانہ سرخ بدخشی کو ہمراہ لے کر بادشاہی چوکیوں پر حملہ کردیا۔ محمد صادق خان نے محب علی خان کے ہمراہ اس سے مقابلہ کیا اور باغیوں کو شکست دے کر بھگا دیا۔ اس جنگ میں خبیثہ بھی مارا گیا۔

اسی سال گلبدن بیگم اور سلیمہ سلطان بیگم حج سے لوٹ کر آئیں۔ ان کے استقبال کے لیے شاہزادہ سلطان سلیم اجمیر تک گیا اور خواجہ صاحب کے روضے کی زیارت کی، لیکن پہلے کی طرح نذر نیاز کچھ نہیں ہوئی۔

انہی دنوں بہار سے محمد صادق خاں بھی حاضر ہوا۔ بادشاہ نے بہت جلد اسے اعظم خاں کے ہمراہ معصوم کابلی کی بغاوت کو کچلنے کے لیے مقرر کیا۔ صادق خاں کی مدد کے لیے شاہ قلی خاں محرم، شیخ ابراہیم چشتی اور دوسرے امراء کو جو کابل کی مہم پر نہیں جا سکے تھے، مقرر کیا گیا۔

نقش قدم کا استقبال

اسی دوران شاہ ابوتراب اور اعتماد خان جو حجاز کے سفر پر گئے ہوئے تھے، واپس آئے اور اپنے ساتھ ایک بہت بڑا بھاری پتھر لے کر آئے۔ اس پتھر پر ایک نقش قدم بنا ہوا تھا۔ شاہ ابوتراب کا کہنا تھا کہ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے مبارک کا نقش ہے:

بر لوح سر تربت خود نقش تو کندیم
تا روز قیامت سر ما و قدم تست

بادشاہ بھی اس کے لیے چار کوس تک تشریف لے گئے اور حکم دیا کہ امراء باری باری سے پتھر کو اٹھا کر چند قدم تک لے جائیں۔ اس اعزاز کے ساتھ اس متبرک پتھر کو شہر میں پہنچایا گیا۔

مخدوم الملک کا انتقال

19 شعبان کو بڑے شاہزادے کی سالگرہ منائی گئی اور شہزادے کا وزن کیا گیا۔ اسی سال یا آئندہ سال شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک جنہیں ہمیشہ کے لیے جلا وطن کر دیا گیا تھا۔ مرزا محمد حکیم اور دوسرے امراء کی بغاوتوں کی خبر سن کر مکے سے گجرات واپس آ گئے تھے اور اپنی سابقہ شان و شوکت کی آرزو میں وقت گزاری کر رہے تھے۔ 990ھ میں مخدوم الملک کا احمد آباد میں انتقال ہو گیا۔ اس کے مال و اسباب کی تحقیقات کے لیے فتح پور سے قاضی علی کو مقرر کیا گیا۔ اس نے لاہور آ کر چھان بین کی تو مخدوم الملک کے اتنے خزانے اور سونا چاندی برآمد ہوا کہ ان کا شمار ممکن نہ تھا۔ مخدوم الملک کے خاندانی قبرستان سے بھی سونے کی اینٹوں سے بھرے ہوئے کئی ایک صندوق نکلے جو اس نے میت بنا کر دفن کرا رکھے تھے۔ اس کے علاوہ اس نے جو مال لوگوں کے پاس رکھا تھا۔ اس کی مقدار تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ سونے کی ساری اینٹیں اور اس کی تمام کتابیں خزانہ عامرہ میں داخل کر لی گئیں۔ اس کی اولاد مصیبتوں میں گرفتار ہو کر روٹی کو محتاج ہو گئی۔

شیخ عبدالنبی کا عبرتناک انجام

شیخ عبدالنبی بہرحال فتح پور پہنچ گیا اور اکبر کے سامنے اس نے سخت باتیں کیں اور اسے خوب بُرا بھلا کہا۔ اکبر کو بھی غصہ آ گیا۔ اس نے شیخ عبدالنبی کے منہ پر پوری قوت سے ایک گھونسہ مارا۔ اس نے چلا کر کہا "ایک ہی بار چھری مار کر میرا کام تمام کیوں نہیں

کروڑیے؟ اکبر نے اس کو راجہ ٹوڈرمل کے حوالے کر دیا کہ اس سے ستر ہزار روپے کا حساب لیا جائے جو مکہ معظمہ جاتے وقت دیا گیا تھا۔ کروڑیوں نے اس کو کچہری کے حوالات میں طویل عرصے تک قید رکھا۔ آخر ایک رات گلا گھونٹ کر اس کی زندگی کو قید سے رہائی دے دی گئی۔ عبرت کی بات ہے کہ شیخ عبدالنبی جیسا بزرگ آدمی اس کا یہ حشر ہوا کہ قتل کے دوسرے دن مناروں والے میدان میں اس کی لاش ظہر کی نماز تک بے گوروکفن پڑی رہی۔ یہ واقعہ 992ھ/1582ء میں رونما ہوا۔ اس کی تاریخ ''شیخ کشی'' نکالی گئی:

گر چہ الشیخ کالنبی گفتند

کالنبی نیست شیخ است

اسی سال شیخ جلال تھانیسریؒ کا بھی وصال ہوا۔ ان کی تاریخ ''شیخ الاولیاء'' نکالی گئی۔ اسی سال آصف خاں میر بخشی ثانی جس کا اصل نام میرزا غیاث الدین علی تھا، فوت ہو گیا۔ اس کی تاریخ وفات ''خدا یادرش باد'' سے نکلتی ہے۔ اس کا قائم مقام اس کا بھتیجہ میرزا جعفر ہوا جسے بعد میں آصف خاں کا خطاب عطا کیا گیا تھا۔

حاجی ابراہیم سرہندی کا قتل

حاجی ابراہیم سرہندی کو پہلے ہی معزول کر دیا گیا تھا۔ اس کے متعلق بادشاہ کو یہ رپورٹ ملی تھی کہ اس نے کافی مال و متاع جمع کر لیا ہے اور اس کے حرم میں بھی بہت سی عورتیں جمع ہیں اور وہ سرکش ہو کر دکن(59) کی طرف فرار ہو جانے کی فکر میں ہے۔ اسے گرفتار کر کے اسی سال بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ اکبر نے کچھ عرصے تک اسے عین الملک کی نگرانی میں دے دیا تھا بعد میں رنتھنبور کے قلعے میں بھیج کر قتل کرا دیا گیا۔

برہان قاطع کا اعلان

اسی سال شیخ مبارک نے خلوت شاہی میں اکبر کے سامنے بیربر سے کہا کہ ''جس طرح تمہاری مذہبی کتابوں میں تحریفیں ہوئی ہیں ہمارے دین میں بھی بہت سی تحریفات ہو چکی

ہیں، اور اب وہ قابل اعتبار نہیں رہا ہے۔

آخرت فروش گمراہوں نے اسی سال اکبر کو یہ سمجھایا تھا کہ ہجرت کو ہزار سال ہو چکے ہیں، آپ بھی شاہ اسماعیل اول کی طرح برہان قاطع (دین الٰہی کے اجراء) کا اعلان فرمائیں۔ دربار میں مشورے کے بعد طے پایا کہ اس مقصد کو بتدریج پورا کیا جائے اور بغیر کسی تختی کے اپنے دلی ارادوں کو ظاہر کیا جائے۔ بادشاہ ان دنوں حکیم ناصر خسرو کی یہ رباعی بہت پڑھا کرتا تھا:

در نہ صد و نسعین دو قرآن می بینم   وز مہدی و دجال نشان می بینم
یا ملک بدل گردد یا گردد دین   سرّی کہ نہان است عیان می بینم

جس وقت ایک نئے دین کے اجراء کے متعلق دربار میں مشورے ہو رہے تھے اور اکبر پوری شدت سے اس کو جاری کرنے کا خیال ظاہر کر رہا تھا، راجہ بھگونت داس نے کہا: ''چلو ہم یہ قبول کیے لیتے ہیں کہ ہندو بھی برے ہیں اور مسلمان بھی، لیکن بھلا یہ تو بتائیے کہ ان دونوں سے بہتر اور اعلیٰ کون سا فرقہ اور گروہ ہے جس میں ہم شامل ہو جائیں۔'' بھگونت داس کی بات پر اکبر نے قائل ہو کر شدت برتنے کا خیال چھوڑ دیا، لیکن اس کے بعد ہی سے ملت اسلامیہ کے احکام میں تغیر و تبدل کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کی تاریخ ''احداث بدعت'' نکالی گئی۔

قاضی جلال ملتانی پر تہمت

اسی زمانے میں بادشاہ نے قاضی جلال ملتانی پر یہ الزام لگایا کہ انھوں نے جعلی تمسک لکھ کر پانچ لاکھ تنکہ شاہی خزانے سے وصول کر لیا ہے۔ یہ الزام رکھ کر ان کو خواجہ فتح اللہ بخشی کے ساتھ دکن کی طرف جلاوطن کر دیا۔ خیال یہ تھا کہ دکن کے حکام متعصب رافضی ہیں اس لیے وہ قاضی کو سخت اذیتیں دے کر نہایت رسوائی کے ساتھ ہلاک کر دیں گے، مگر معاملہ کچھ برعکس ہی ہوا۔ جب وہ دکن پہنچے تو وہاں ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا کیونکہ ان سے پہلے ہی یہ خبریں وہاں پہنچ چکی تھیں کہ قاضی نے اکبر کی بے دینی کا نہایت ثابت قدمی سے

مقابلہ کیا اور کلمۂ حق کہنے میں بزدلی نہیں دکھائی۔

دکن والوں نے ان کی آمد کو باعث برکت جانا اور مدد معاش کی آراضیات کے علاوہ ان کو وہاں بھی ذمے دارانہ خدمات تفویض کر دیں اور وہ وہاں آخر تک نہایت عزت و احترام سے رہے۔ آخر میں حج پر جانے کی اجازت طلب کی، لیکن دکن کے حکام ان کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اس لیے عرصے تک ان کو اجازت نہ ملی۔ آخر وہ اجازت حاصل کر کے زیارت حرمین کی سعادت سے فیض یاب ہوئے اور وہیں ان کا انتقال بھی ہو گیا۔

قاضی عبدالسمیع ماوراء النہری

قاضی جلال کو ہٹانے کے بعد ان کی جگہ قاضی عبدالسمیع ماوراء النہری میاں کالی کو قاضی بنایا گیا۔ اس شخص کے متعلق کسی شاعر نے یہ شعر کہا تھا:

قاضی ز قبیلہ معزز
ریش چو گل سفید یک گز

یہ نہایت فاسق و فاجر شخص تھا۔ شطرنج پر جوا کھیلتا تھا۔ اعلانیہ شراب پیتا تھا۔ اس کے مذہب میں رشوت نہ صرف جائز بلکہ فرض تھی۔ قرض کے قبالوں پر کھلا سود وضع کر کے اس سے اندراجات کرتا تھا۔ دین اور مذہب کی بادشاہ کو کوئی پرواہ نہ تھی، محض بدنامی سے بچنے کے لیے قاضی کا تقرر کرتا تھا اور اس سے بہتر کوئی دوسرا قاضی ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

اذان اور نماز کی موقوفی

محل میں پانچ وقت جماعت کے ساتھ نماز بھی ہوتی تھی اور اذان بھی دی جاتی تھی، لیکن انہی دنوں جماعت، نماز اور اذان سب موقوف ہو گئے۔ کافروں اور حرم کی کافرزادیوں کی خاطر اکبر کو اب تو احمد، محمد اور مصطفیٰ جیسے نام بھی گراں گزرتے تھے۔ چنانچہ اس نے کچھ دن بعد اپنے بعض مقربوں کے نام جو اس طرز کے تھے تبدیل کرا دیے، جیسے یار محمد اور محمد خان کو بدل کر رحمت خان وغیرہ کر دیا۔ اچھا ہوا کیونکہ ان خبیثوں پر یہ بابرکت نام جچتے

بھی نہیں تھے، سور کی گردن میں قیمتی موتی کہاں زیب دے سکتے ہیں؟

بے دینی کی یہ ساری آگ آگرہ سے اٹھی اور اس نے چھوٹے بڑے ہر ایک کو جلا کر راکھ کر دیا۔ آخر اس کی لپٹوں سے آگ لگانے والے فسادی بھی نہ بچ سکے۔

میر فتح اللہ شیرازی کی حاضری

ماہ ربیع الثانی 990ھ/1582ء میں بادشاہ نے میر فتح اللہ شیرازی کو عادل خان، جو دکن کا حاکم تھا، کے پاس فرمان بھیج کر بلایا۔ جب وہ فتح پور پہنچا تو بادشاہ کے حکم سے خان خاناں اور حکیم ابو الفتح اس کے استقبال کے لیے گئے۔ میر فتح اللہ الٰہیات، ریاضیات، طبیعیات، طلسمات اور دوسرے تمام عقلی اور نقلی علوم میں اپنے عہد کا ماہر فن شخص تھا۔ جب وہ آیا تو بادشاہ نے اسے صدارت کا منصب عطا کیا جو اُن دنوں سیاہ نویسی سے بڑھ کر کچھ نہیں رہا تھا اور صدر کا کام یہ رہ گیا تھا کہ وہ فقراء کو کچھ دینے کے بجائے ان کی زمین ضبط کرتا رہے۔ اس کو دیاور کا پرگنہ داغ ومحلّہ سے مستثنیٰ کر کے بطور جاگیر عطا کیا گیا۔ اس کے تقرر کی وجہ یہ تھی کہ اس کے متعلق یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ میر غیاث الدین منصور شیرازی کا شاگرد ہے اور میر غیاث الدین نماز اور عبادت کا پابند اور قائل نہ تھا، اس لیے بادشاہ کو اس کے متعلق بھی یہ خوش گمانی تھی کہ شاید وہ مذہب اور دین کے معاملے میں ان کی تائید کرے گا، لیکن یہ خوش گمانی نہ رہی، کیوں کہ میر فتح اللہ شیرازی نے باوجود اپنی ساری دنیاداری، امرا پرستی کے مذہب کے معاملہ میں بڑی ثابت قدمی دکھائی، چنانچہ وہ عین دیوان خانۂ خاص میں جہاں کسی کو نماز پڑھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ نہایت اطمینان کے ساتھ امامی مذہب کے مسلک پر نماز پڑھا کرتا تھا۔ بادشاہ کے علم میں اس کی یہ تقلید پرستی تھی لیکن اس کے علم وحکمت، تدبیر ومصلحت کا خیال کر کے بادشاہ نے چشم پوشی سے کام لیا اور اس کی ترقی وخاطر داری میں کوئی کمی نہ کی۔ یہاں تک کہ مظفر خان کی چھوٹی لڑکی سے اس کا نکاح بھی کرا دیا اور اسے وزارت کے عہدے پر راجہ ٹوڈرمل کا شریک کار بنا دیا۔ وہ نہایت جرأت کے ساتھ راجہ کے معاملات میں مداخلت کر کے فرائض وزارت بجالاتا تھا۔ وزارت

کے ساتھ ساتھ وہ امراء کے بچوں کو بھی بڑے شوق سے پڑھاتا رہتا تھا اور ہر روز بادشاہی مصاحبوں کے گھر پر اسی غرض سے ضرور جایا کرتا تھا۔ پہلے تو اس نے حکیم ابو الفتح کے لڑکے کو پھر شیخ ابوالفضل کے لڑکے کو پڑھایا، دوسرے امیروں کے بھی سات سات، آٹھ آٹھ سال تک کے بچوں کو الف، ب پڑھنے اور لکھنے کی کوشش کراتا رہتا تھا۔ ہمیشہ کاندھے پر بندوق اور کمر میں بارود کی پٹی بندھی رہتی تھی اور بادشاہ کے ساتھ جنگل میں قاصدوں کی طرح پیدل جایا کرتا تھا۔ اپنی اس وضع قطع اور اوچھی حرکتوں سے اس نے علم کے رہے سہے وقار کو بھی خاک میں ملا دیا۔ لیکن اس کا کمال یہی تھا کہ وہ اس ذلت، رذالت اور خسیسی کے باوجود مذہب کے معاملے میں بڑا سخت تھا اور کسی سے نہیں ڈرتا تھا۔ اس کی آمد کی تاریخ ''شاہ فتح اللہ امام اولیاء'' سے نکلتی ہے۔

معراج نبوی ﷺ سے انکار

ایک رات اکبر نے شاہ فتح اللہ کی موجودگی میں بیربر سے کہا "اس بات کی عقل اجازت نہیں دیتی کہ ایک شخص اپنے جسمانی بوجھ کو لیے پلک جھپکنے میں آسمان پر جائے اور اللہ تعالیٰ سے 90 ہزار باتیں کر کے اتنی جلد لوٹ آئے کہ ان کا بستر واپسی تک گرم ہی رہے اور لوگ بھی اس دعوے کی تصدیق کرنے لگ جائیں۔ اسی طرح ''شق القمر'' اور دوسرے معجزے بھی خلاف عقل معلوم ہوتے ہیں"۔ پھر اکبر نے اپنا ایک پاؤں اٹھا کر سب کو دکھایا اور کہا ''دوسرا پاؤں نکالے بغیر آخر ہمارا کھڑا رہنا کس طرح ممکن ہے''۔ آخر لوگوں نے یہ کیا داستان بنا رکھی ہے۔ بیربر بدبخت اور دوسرے گمراہوں نے بادشاہ کی خوب ہاں میں ہاں ملائی اور بڑا سراہا۔ اکبر رہ رہ کر شاہ فتح اللہ کو دیکھتا جاتا تھا اور اس ساری گفتگو کی غرض بھی یہ تھی کہ وہ نیا آیا ہوا ہے اس کے خیالات معلوم کریں، لیکن وہ بندۂ خدا سر جھکائے کھڑا رہا، کچھ نہیں بولا۔

ملا احمد ٹھٹھہ کی آمد

انہی دنوں ٹھٹھہ کا ملا احمد متعصب رافضی جو بڑی بے حیائی سے خود کو حکیم بھی کہا کرتا تھا

دکن سے آکر حاضر ہوا۔ اس کے آباؤ اجداد فاروقی سلسلے کے حنفی تھے۔ وہ ناپاک ان بدنصیبوں پر بھی لعنت بھیجتا تھا مگر حضور کا قول ہے کہ جو اپنے باپ کو لعنت کرتا ہے اس کی لعنت اسی پر لوٹ آتی ہے۔ وہ شاہ طہماسپ کے عہد میں عراق میں تبرا کرنے والے شیعہ مومنوں کی صحبت میں پڑ گیا تھا۔ اسی لیے وہ ان کی طرح ہوگیا، لیکن جب شاہ اسماعیل ثانی نے اپنے باپ کے برعکس سنی مسلک اختیار کر لیا اور رافضیوں کو تنگ کرنے لگا تو وہ میرزا مخدوم کے ساتھ جو پکے سنی تھے اور انھوں نے "النواقض فی ذم الروافض" کے نام سے رافضیوں کے خلاف ایک کتاب بھی لکھی ہے جس میں کتاب کی تاریخ تصنیف بھی درج ہے، مکے کو چلا گیا وہاں سے بھٹکتا بھٹکتا دکن پہنچا، وہاں سے ہندوستان کا رخ کیا۔ یہاں سارا میدان خالی پڑا تھا چنانچہ اسے مہمل باتوں کو پھیلانے اور اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے کا کھلا موقع مل گیا مگر کچھ ہی عرصے بعد اسے اپنے کیے کا اچھا بدلہ بھی مل گیا۔

ان دنوں جب کہ وہ شیخ فیضی کی صحبت میں نہیں پہنچا تھا اور اتنا بے باک نہیں ہوا تھا میری اس سے بازار میں ملاقات ہوگئی۔ عراقیوں نے اس کے سامنے میری بڑی تعریف کی تھی۔ پہلی ملاقات میں اس نے مجھے دیکھ کر کہا" رفض کا نور آپ کی پیشانی سے صاف جھلکتا ہے" میں نے فی البدیہہ جواب دیا۔"ہاں جس طرح نور تسنن تمہارے چہرے پر جھلک رہا ہے" جو لوگ وہاں کھڑے تھے بے ساختہ ہنس پڑے اور اس جواب سے بڑے خوش ہوئے۔ اس کا مزید حال آگے بیان کیا جائے گا۔

تاریخ الفی کی تصنیف کا حکم

اسی سال بادشاہ نے حکم دیا کہ چونکہ ہجرت کے ہزار سال ختم ہو چکے ہیں اب تک سب لوگ ہجری تاریخ ہی لکھتے آئے ہیں، اب ایک تاریخ مرتب ہونی چاہیے جس میں آج تک کے تمام بادشاہوں کے واقعات مندرج ہوں، یہ تاریخ دوسری تاریخوں کے غلط واقعات کی تردید و تصحیح کرے۔ اس کا نام "تاریخ الفی" رکھا جائے اس میں سنین کے ساتھ بجائے ہجرت کے رحلت کا لفظ لکھا جائے۔ چنانچہ حضور اکرمؐ کی وفات سے اس زمانہ تک کے

حالات لکھنے کے لیے 7 اشخاص مقرر کیے گئے۔ پہلے سال کے واقعات کے لیے نقیب خاں کو دوسرے سال کے لیے شاہ فتح اللہ کو اور اسی ترتیب سے دوسروں کو مقرر کیا گیا۔ لکھنے والوں میں حکیم ہمام، حکیم علی، حاجی ابراہیم سرہندی جو انہی دنوں گجرات سے آیا ہوا تھا، مرزا نظام الدین احمد اور اس ناچیز⁽⁶⁰⁾ کا نام بھی شامل تھا۔ اسی طرح 35 سال کے واقعات کی ترتیب و تقسیم کی گئی۔

میں نے ساتویں سال کے تذکرے میں خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حالات مرتب کیے تھے۔ ایک رات یہ مسودہ بادشاہ کے ملاحظے میں تھا جب پڑھتے پڑھتے شہر کوفہ کی تعمیر قصر الامارت کے انہدام، حضرت علی کی صاحبزادی ام کلثوم کے نکاح کے قصے، شہر نصیبین کی فتح اور وہاں سے مرغ کی قد و قامت کے بچھوؤں کے نکلنے کے ذکر پر پہنچے تو اکبر نے ان بیانات پر بڑی رد و کد شروع کر دی۔ مرزا جعفر آصف خاں ثالث نے اس موقعے پر اکبر کی غلط تائید کی اور اس کی طرف سے بحث کرنے لگا البتہ شیخ ابو الفضل اور غازی خاں بدخشی نے ان واقعات کی صحیح توجیہات بیان کیں۔ مجھ سے اکبر نے پوچھا "تم نے یہ سب حالات کس طرح لکھ دیے؟" میں نے عرض کیا "میں نے اپنی طرف سے بنا کر تو نہیں لکھا، کتابوں میں جو کچھ دیکھا مرتب کر دیا"۔ اکبر نے اسی وقت شاہی کتب خانہ سے "روضۃ الاحباب" اور سیرت کی دوسری کتابیں منگائیں اور نقیب خاں سے کہا کہ "وہ تحقیق کر کے بتائے کہ یہ صحیح ہے یا غلط ہے"۔ اس نے تمام واقعات کے صحیح ہونے کی تصدیق کی اور خدا کے فضل سے مجھے اس بے جا گرفت وگیر سے چھٹکارا ملا۔

36 سال تک کے حالات لکھے جا چکے تو اکبر نے حکم دیا کہ اب صرف ملا احمد ٹھٹھوی "تاریخ الفی" کے بقیہ حالات لکھے گا۔ یہ تبدیلی حکیم ابو الفتح کی تجویز و سفارش کی وجہ سے عمل میں آئی۔ ملا احمد نہایت متعصب آدمی تھا اس نے اپنے اعتقاد کے مطابق جی میں جو آیا لکھ دیا، جیسے کہ اس تاریخ سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ چنگیز خاں کے دور تک اس نے اس تاریخ کی دو جلدیں پوری کر دیں۔

ملا احمد اپنے مذہب میں نہایت غلو اور تشدد تھا۔ میرزا فولاد برلاس کو بھی اسی کی وجہ

سے نقصان پہنچا تھا، چنانچہ مرزا نے ایک رات اس بہانے سے کہ اسے بادشاہ نے طلب کیا ہے گھر سے باہر بلایا اور لاہور کی ایک گلی میں اسے قتل کر دیا۔ اس کے قصاص میں میرزا فولاد کو بھی سزائے موت دی گئی۔

"تاریخ الفی" کے بقیہ حالات لکھنے کی ذمے داری اب آصف خان کے سپرد کی گئی۔ اس نے یہ واقعات 997ھ/ 1589ء تک پورے کر دیے۔ 1000ھ/ 1592ء میں بادشاہ نے لاہور میں مجھے حکم دیا کہ میں مسودات کا مقابلہ اور تصحیح کروں اور سنین میں جو تقدیم و تاخیر ہوگئی ہے اُسے درست کر دوں۔ ایک سال تک میں "" یہ خدمت انجام دیتا رہا۔ میں نے پہلی دو جلدوں کو مکمل کر دیا۔ تیسری جلد کا کام آصف خان کے حوالے کر دیا۔

مہابھارت کا ترجمہ

اس سال کا اہم واقعہ مہابھارت کے ترجمے کی تکمیل ہے۔ مہابھارت ہندستان کی قدیم اور بڑی کتاب ہے جس میں متعدد قصے، نصیحتیں، مصالح ملکی، اخلاق و آداب، علوم و اعتقادیات، ہندو مذہب اور اس کی عبادتوں کی تفصیل ہے۔ یہ تمام موضوعات ہندستان کے قدیم فرمانروا کوروؤں اور پانڈوؤں کی جنگ کے ضمن میں بیان کیے گئے ہیں بعض کی رائے میں یہ واقعات کم از کم چار ہزار سال پہلے پیش آئے تھے۔ بعض کا قول ہے، مہابھارت پر 80 ہزار سال سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا جو بظاہر آدم علیہ السلام سے بھی پہلے کا دور معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستان کے غیر مسلم اس کتاب کے لکھنے اور پڑھنے کو بڑی عبادت سمجھتے ہیں اور اسے مسلمانوں سے پوشیدہ رکھتے ہیں۔

مہابھارت کے ترجمے کا سبب یہ ہوا کہ بادشاہ نے شاہ نامہ اور امیر حمزہ کے قصہ کو 17 جلدوں میں 15 سال کی مدت میں لکھوایا تھا۔ اس کی تصویروں پر کافی روپیہ بھی خرچ ہوا تھا۔ اسی طرح ابو مسلم کا قصہ جامع الحکایات وغیرہ کو بادشاہ نے متعدد بار پڑھوا کر سنا تھا۔ ان کتابوں کے متعلق اس کا خیال تھا کہ یہ سب حقیقی واقعات نہیں ہیں بلکہ فرضی ہیں اور محض شاعری کی گئی ہے یہ کتابیں چونکہ اچھے وقت میں لکھی گئی تھیں اور لکھنے والوں کی

قسمت اچھی تھی کہ ان کو شہرت عام نصیب ہوگئی۔ اکبر کو خیال آیا کہ ان کتابوں کے مقابلے میں چونکہ اچھے وقت لکھی گئی تھیں اور لکھنے والوں کی قسمت اچھی تھی کہ ان کو شہرت عام نصیب ہوگئی۔ اکبر کو خیال آیا کہ ان کتابوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کی کتابوں کو جنھیں عبادت گزار دانشوروں نے لکھا ہے اور وہ سب کی سب حقیقی اور نص قاطع ہیں، ہندوؤں کی عبادتوں، اعتقاد اور مذہب کا سرچشمہ بھی ہیں، ہندی[62] سے فارسی میں ترجمہ کرا کے کیوں نہ اپنے نام سے منسوب کرایا جائے۔ یہ واقعات فارسی میں اب تک بیان نہیں کیے گئے ہیں، اس لئے دلچسپ اور نئے رہیں گے۔ اس کے علاوہ جس طرح ان کتابوں کے مقدمے میں درج ہے ان کی اشاعت دینی اور دنیاوی سعادت کا موجب اور شان و شوکت کے بقاء، اولاد و اموال کی کثرت کا باعث بھی ہوگی۔

چنانچہ اکبر نے خود بھی ذاتی طور پر وقت دینے کا فیصلہ کیا۔ ہندو اہل علم کو جمع کر کے حکم دیا کہ وہ مہابھارت کی تعبیر و ترجمانی کریں۔ چند راتوں تک اکبر نقیب خاں کی مدد سے اس کے مضامین کو سمجھتا رہا اور اس کے مطالب کو فارسی میں لکھواتا رہا۔ تیسری رات بادشاہ نے مجھے بھی بلایا اور حکم دیا کہ میں نقیب خان کے ساتھ مل کر اس کا ترجمہ کرتا رہوں۔ تین چار مہینے کی مدت میں اس مجموعۂ خرافات کے 18 فنون میں سے جن میں 18 ہزار عالم کا تذکرہ کیا گیا ہے صرف 2 فن لکھے جا سکے۔ نہ معلوم مجھ[63] سے کیا گناہ ہوا تھا کہ اس ترجمے سے پالا پڑا اور طرح طرح کے اعتراضات برداشت کرنے پڑے۔ اس کام میں مجھے سوائے طعن و تعریض کے کچھ نہیں ملا۔ بعد میں اس کے ایک حصے کو ملا شیری اور نقیب خان نے پورا کیا اور ایک حصے کی تنہا سلطان حاجی تھانیسری نے تکمیل کی۔ اس کے بعد شیخ فیضی نے اس کے دو فنون کی نظم و نثر مرتب کی۔ پھر حاجی مذکور نے 2 حصے اور لکھے اور پہلے جو فروگزاشتیں ہوئی تھیں ان کی تصحیح کردی۔ اس طرح اس کتاب کے سو جز مکمل ہوگئے۔ بادشاہ کو اصل اور نقل کی مطابقت پر کچھ ایسا اصرار تھا کہ مکھی کا داغ بھی چھوٹنے نہ پائے۔

سلطان حاجی تھانیسری کو اس محنت و مشقت کا کیا صلہ ملا؟ کچھ عرصے بعد کسی بہانے سے اس کو بھکر کی طرف جلاوطن کردیا گیا۔ اب وہ اپنے شہر میں مقیم ہے۔ مہابھارت کی

تعبیر و ترجمانی کرنے والے اکثر لوگ کورو اور پانڈو سے جاملے ہیں جو باقی رہ گئے ہیں خدا ان کو نجات دے اور توبہ کی توفیق عطا کرے۔ مجھے بھی اللہ تعالیٰ اس بارے میں معافی عطا فرمائے۔

اکبر نے اس ترجمے کا نام "رزم نامہ" رکھا۔ اس کے دو مصور نسخے تیار کرائے اور جب یہ تیار ہو گئے تو امراء کو حکم دیا گیا کہ وہ اس پر ہاتھ رکھ کر برکت حاصل کریں۔ ابو الفضل جس نے اس سے پہلے "آیۃ الکرسی" کی تفسیر لکھی تھی اس کفر نامے پر اس نے دو جز کا خطبہ لکھا۔

اس سال کے واقعات میں نے ایک خاص وجہ سے نہایت اجمال و اختصار کے ساتھ لکھے ہیں، اس لیے اگر واقعات کی ترتیب اور سنین کی تقدیم و تاخیر ہو گئی ہو تو قارئین اسے نظر انداز فرمادیں۔

تخت نشینی کا اٹھائیسواں سال

25 صفر 991ھ/1583ء کو نو روز ہوا اور جلوس اکبری کے اٹھائیسویں سال کا آغاز ہوا۔ حسب دستور سابق نمائشی دکان کی آرائش امراء میں تقسیم کر دی گئی اور جشن کی تقریبات منائی گئیں۔ شاہ فتح اللہ نے اپنی دکان کی بڑی اچھی آرائش کی تھی۔ اس میں وزن اٹھانے اور ایسے دوسرے آلات کی نمائش کی گئی تھی۔

اس سال بھی چند نئے احکام اختراع کیے گئے۔ اتوار کے دن نو روز کے اٹھارہویں دن اور اکبر کی ولادت کے مہینے آبان[64] کے تمام دنوں میں تمام حدود ممالک محروسہ میں جانوروں کے ذبیحے کی ممانعت کر دی گئی۔ یہ حکم بھی محض ہندوؤں کی خاطر نافذ کیا گیا تھا۔ جو شخص بھی ان دنوں ذبیحہ کرتا اسے جرمانے کی سزا دی جاتی تھی اور اس کا گھر بار تباہ کر دیا جاتا تھا۔ خود اکبر نے گوشت خوری سے اتنا پرہیز کیا کہ سال بھر میں چھ مہینے بلکہ اس سے بھی کم گوشت کھایا کرتا تھا۔ اس کا ارادہ یہ ہے کہ مطلقاً گوشت کھانا ترک کر دے۔

اکبر نے ہر روز چار مرتبہ صبح، دوپہر، شام اور نصف شب کو آفتاب کی پرستش شروع

کردی اور آفتاب کے ایک ہزار ایک ہندی ناموں کا وظیفہ پڑھنے لگا۔ یہ وظیفہ بڑے خشوع و خضوع سے دو پہر میں پڑھا جاتا تھا۔ اس وظیفے کے وقت دونوں کان پکڑ کر گھوما کرتا تھا اور کانوں پر دونوں ہاتھ تو۔ کی طرح مارتا تھا۔ اس دوران وہ طرح طرح کی اور بہت سی حرکتیں کرتا رہتا تھا۔

نوبت اور نقارہ ایک مرتبہ تو نصف رات کو اور ایک بار طلوع کے وقت بجانے کا حکم دیا گیا۔ مسجدیں اور خانقاہیں ہندوؤں کے فراش خانے اور چوکی خانے بن گئے اور وہاں بجائے جماعت کے جماع ہونے لگا اور "حی علی" کی جگہ "یلللا تللا" ہونے لگی۔ جو قبرستان شہر میں تھے ان کو مسمار کر دینے کا حکم دیا گیا۔

اس جشن کے موقعے پر اکبر نے اپنی والدہ کو ایک لاکھ روپیہ نقد، چند ہاتھی، پوشاکیں، سونے کے برتن اور جڑاؤ زیور وغیرہ دیے۔ اس طرح اپنی پھوپھی گلبدن بیگم اور دوسری تمام بیگمات کو بھی انعامات دیے گئے اور عام حکم دیا گیا کہ ہر خاص و عام نذرانے پیش کرے۔

ٹانڈہ پر قبضہ

اسی سال اعظم خان اور دوسرے امراء نے ٹانڈہ پر قبضہ کر لیا۔ خالدی خان جباری، میرزا بیگ قاقشال، معصوم خاں کا ساتھ چھوڑ کر اعظم خاں کے پاس چلے آئے اور معصوم خاں بعض زمینداروں کی پناہ میں چلا گیا۔ بنگال کا سارا علاقہ سرکاری حدود میں آ گیا۔

بادشاہ نے دکن کے حکام کی تالیف قلب کے لیے اس سال گجرات کی حکومت اعتماد خاں کو تفویض کر دی۔ شاہ ابو تراب کو وہاں کا امین، خواجہ نظام الدین احمد کو میر بخشی، بادشاہ کے استاد مولانا عبد القادر کے بھائی ابو القاسم تبریزی کو دیوان کے عہدے پر مامور کیا گیا۔

گجرات کی جاگیروں پر امراء کی بڑی تعداد کو مقرر کیا گیا جن میں محمد حسین، میر ابو المظفر ولد اشرف خان، میر ہاشم، میر صالح داغی اور سید ابو اسحاق وغیرہ شامل تھے۔

شہباز خاں کو بادشاہ نے اس کی چند گستاخیوں کی وجہ سے قید کر دیا تھا۔ اس نے جو

سرکاری رقم موقع بے موقع صرف کی تھی اس کے حساب کتاب کا کام راجہ ٹوڈرمل کے سپرد کر دیا تھا۔ اس سال ابو الفضل کی سفارش پر اسے معاف کر کے راجہ کے چنگل سے رہائی عطا کی اور 17 ربیع الثانی کو اسے بنگالہ پر مقرر کر کے رخصت کر دیا کہ وہاں جا کر تمام سرکار بنگالہ کو بادشاہی جاگیرداروں میں تقسیم کر دے اور عیسیٰ کے صوبے سے معصوم کابلی کو باہر کر دے۔

شیخ فرید بخاری کی سفارت

اسی اثناء میں خبر ملی کہ خان اعظم نے شیخ فرید بخاری کو مصالحت کے لیے اڑیسہ کے حاکم قتلو افغان لوحانی کے پاس بھیجا تھا، قتلو نے شیخ فرید کی بزرگی کا خیال کر کے ان کا استقبال کیا۔ جب مجلس منعقد ہوئی تو بہادر کورقہ نے جو بنگالہ کا زمیندار اور قتلو کا بڑا فوجی افسر تھا، شیخ سے نہایت بے ادبی کے ساتھ ملاقات کی اور برابری سے بات کرنے لگا۔ شیخ نے اسے ایک زمیندار سمجھ کر کوئی اہمیت نہ دی۔ اس کے رویے پر شاہو ولد شیخ راجو بخاری سرہندی نے بھی بگڑ کر سخت طرز عمل اختیار کیا اور دوسرے بخاریوں نے بھی بڑی بے اعتدالی دکھائی۔ جس وقت شیخ فرید وہاں سے لوٹ رہے تھے اور قتلو شیخ کی خدمت میں تھا، بہادر نے لڑنے کا ارادہ کر کے ان کا راستہ روک لیا۔ اس جھڑپ میں شاہو اپنے ساتھیوں سمیت مارا گیا، شیخ فرید سلامتی کے ساتھ بچ کر نکل آئے۔

برہان الملک کی آمد

حاکم دکن مرتضیٰ نظام الملک کا بھائی برہان الملک وہاں سے بھاگ کر مالوہ میں قطب الدین خاں کے پاس آ گیا تھا۔ اس سال رجب کے مہینے میں وہ حسب الحکم دارالخلافہ آیا اور باریاب ہوا۔ اس کی آمد سے قبل ایک آوارہ نامعلوم شخص دربار میں آیا تھا اور اس نے خود کو برہان الملک ظاہر کیا تھا۔ اسے بادشاہ نے اودھ میں جاگیر عطا کر دی تھی، جب بھید کھل گیا تو وہ بھاگ کر جوگیوں کے پاس چھپ گیا تھا مگر ایک ہفتہ بعد وہ پکڑا گیا۔ اسے

قید خانے بھیج دیا گیا۔ بعد میں معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کا کیا حشر ہوا؟

جوگیوں سے بادشاہ کی عقیدت

انہی دنوں بادشاہ نے شہر سے باہر ہند و اور مسلمان فقیروں کو کھانا کھلانے کے لیے دو سرائیں تعمیر کرائیں۔ ایک کا نام خیر پورہ، دوسرے کا دھرم پورہ رکھا گیا۔ ان کے انتظام پر شیخ ابو الفضل کے چند آدمی متعین تھے جو بادشاہی خرچ پر فقراء کو کھانا کھلاتے تھے۔ جوگیوں کی ٹولیاں بھی بہت آتی رہتی تھیں ان کے لیے ایک الگ سرائے بنوا کر اس کا نام جوگی پورہ رکھا گیا۔ اکبر راتوں میں اپنے چند خاص آدمیوں کے ساتھ ان جوگیوں کی صحبت میں جایا کرتا تھا اور ان سے مختلف جاہلانہ معلومات، اعتقادات، مراقبے، مشغلے، آسن، کیمیا، سیمیا اور ایمیا جیسے عجیب و غریب علوم سیکھا کرتا تھا۔ اس نے کیمیا کے ذریعے خود سونا بھی بنایا اور اسے لوگوں کو دکھایا۔ جوگی ہر سال ایک مقررہ رات میں جسے وہ شیورات کہتے تھے ہر طرف آ کر جمع ہوتے تھے۔ اس رات اکبر بڑے بڑے جوگیوں کے ساتھ کھانا کھاتا تھا اور ان سے لمبی چوڑی عمر کی بشارت حاصل کرتا تھا۔ کچھ ان کی دعاؤں اور بعض دوسرے قرینوں سے اکبر کو اپنی لمبی عمر کا پورا یقین ہو گیا تھا۔ بعض حکیموں نے بھی اس کی تائید کی اور کہا کہ عمر کی کمی کا تعلق دور قمری سے تھا اب جب کہ دور زحل شروع ہو چکا ہے جس میں ساری باتیں برعکس ہوں گی اور عمریں بھی طویل ہو جائیں گی، چنانچہ پچھلے لوگ ہزار ہزار سال کی عمر کے ہوتے تھے اور ہندی کتابوں میں آدمیوں کی عمر دس دس ہزار لکھی گئی ہے۔ اب بھی تبت کے پہاڑوں میں لاماؤں کی عمر جو چینیوں کے پیشوا اور زاہد و عابد ہوتے ہیں دو سو سال بلکہ اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے اس لمبی عمر کی خاطر اکبر نے بھی ان جوگیوں کی طرح معاشرت اور کھانے پینے میں کمی کر دی۔ خاص طور سے گوشت ترک کر دیا اور اپنی تالو کے بال منڈوا ڈالے صرف اطراف کے بال رہنے دیے۔ وہم یہ تھا کہ کاملوں کی روح سر کے درمیان جو جسم کا دسواں منفذ ہے، نکلتی ہے اور اس وقت گرج کی طرح کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہ آواز سعادت اور نجات کی علامت ہے۔ تاریخ کی رو سے یہ اس

بات کی نشانی ہے کہ روح کسی صاحب شوکت مقتدر بادشاہ کے بدن میں حلول کر گئی ہے۔

مہابلی اکبر کے درشن

بادشاہ نے اپنے مسلک کا نام "توحید الٰہی" رکھا اور اپنے خاص گروہ کے مریدوں کو جوگیوں کی اصطلاح میں "چیلہ" کا نام دیا۔ عام لوگ جن میں زیادہ تر رذیل اور مکار شامل تھے چونکہ بارگاہ شاہی میں نہیں جا سکتے تھے اس لیے وہ ہر صبح کو سورج پوجا کے وقت جھروکے کے سامنے جا کر کھڑے ہو جاتے تھے اور جب تک بادشاہ کا دیدار نہیں کر لیتے ان پر مسواک اور کھانا پینا حرام رہتا تھا۔ بادشاہ کے تقدس کا رفتہ رفتہ یہ رنگ جما کہ ہر رات ہندو، مسلمان، عورتیں اور مرد، تندرست اور بیمار اپنی حاجتیں پوری کرانے نیاز مندانہ حضور میں حاضر ہوتے تھے۔ اس وقت ہر ایک کو حاضری کو عام اجازت ہوتی تھی۔ لوگوں کا بہت بڑا ہجوم جمع ہو جاتا تھا اور جیسے ہی بادشاہ آفتاب کے ایک ہزار نام کا ورد کر کے پردے کے پیچھے سے نمودار ہوتا، یہ لوگ سجدے میں گر پڑتے۔

اکبر پرمیشور کا اوتار

مکار اور چالاک برہمنوں نے خود اکبر کے ایک ہزار ایک نام ترتیب دے دے کر رام اور کشن کی طرح آپ بھی ایک اوتار ہیں اور پرمیشور نے آپ کی صورت میں داخل کیا ہے، اکبر نے یہ بھی باور کرلیا۔ پنڈت ہندستان کے قدیم علما کے ہندی دوہے نقل کر کے پیش کرتے رہتے تھے۔ ان کا مضمون یہ ہوتا تھا کہ ہندستان میں ایک بڑا بادشاہ پیدا ہوگا جو برہمنوں کا محافظ ہوگا، گائے کی حفاظت کرے گا اور ساری دنیا پر عدل و انصاف سے حکومت کرے گا۔ یہ ساری خرافات پرانے کاغذوں پر لکھ لکھ کر پیش کی جاتی تھیں۔ اکبر ان تمام باتوں پر اعتقاد لے آتا تھا۔ مختلف فرقوں میں سے جن کے سچے اعتقاد کا اکبر کو یقین ہو جاتا تھا ان کو وہ "احدی" کہا کرتا تھا اور یہ گمان تھا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو وقت پڑنے پر آگ اور خون کے سمندر میں بے جھجک داخل ہو جائیں گے۔

اسی سال اکبر نے فتح پور کے دیوان خانہ خاص میں حنفیوں کے مسئلے کے مطابق ''دہ وردہ'' اور شافعیوں اور شیعوں کے ''قلتین'' کے مطابق پانی بھروا کر وزن کرایا۔ حوض کا پانی ان دونوں سے زیادہ نکلا۔ بادشاہ نے سنیوں اور شیعوں کے دو علیحدہ گروپ بنانے کا حکم دیا، جتنے ہندستانی تھے وہ سنیوں کے کیمپ میں ہو گئے اور جتنے عراقی تھے وہ شیعوں کی طرف چلے گئے۔ ایسے بہت سے جزوی واقعات پیش آتے رہتے تھے۔ میں ان کو نظر انداز کر کے اصل مضمون کو شروع کرتا ہوں۔

گجرات کی بغاوت

جب اعتماد خاں اپنے حسب مدعا گجرات کی حکومت پر مامور ہو کر سروہی پہنچا تو اس نے اس مقام کو سرتال سے علیحدہ کر کے رانا کے بھائی جگمال کے سپرد کر دیا اور متعینہ امرا کو ساتھ لے کر 12 شعبان کو احمد آباد پہنچ گیا۔

شہاب الدین احمد خاں احمد آباد کا مستقل حاکم تھا اور گجرات کے سارے فتنہ وفساد کی اس نے بڑی خوبی سے روک تھام کر رکھی تھی وہ اپنے گھر سے نکل کر عثمان پورہ کے محلے میں جا کر ٹھہر گیا۔ اس کے ملازم سردار جو اس تبدیلی پر سخت ناراض تھے دوسرے مہم پسندوں کے ساتھ کاٹھیا واڑ کی طرف چلے گئے جہاں محمود گجراتی کا لڑکا مظفر شاہ دربار اکبری سے بھاگ کر اپنے ننھیال کے رشتے داروں کی پناہ میں اپنے دن کاٹ رہا تھا۔ بغاوت پسندوں نے وہاں جا کر اسے حصول بادشاہت پر آمادہ کر کے اپنے ساتھ ملا لیا۔ اعتماد خاں نے شہاب الدین احمد خاں سے بہت اصرار کیا کہ وہ اپنی جماعت کو دلاسا اور تسلی دے کر واپس بلا لے لیکن اس نے قبول نہ کیا اور کہا یہ لوگ ایک عرصۂ دراز سے اس دن کے منتظر تھے اور میرے قتل کے درپے ہو گئے تھے۔ اب ان کا معاملہ میرے قابو سے باہر ہے، اب تم یہاں کے حاکم ہو، تم جانو اور یہاں کے لوگ! یہ کہہ کر وہ احمد آباد سے 20 کوس پر قصبۂ کری میں چلا گیا۔

مظفر شاہ کی بغاوت

اعتماد خاں اور نظام الدین احمد کے ایک دو آدمی باغیوں کے پاس گئے اور انھیں بہت تسلی اور دلاسا دیا، لیکن کوئی اثر نہ ہوا۔ 27 شعبان کو مظفر کاٹھیاواڑیوں اور کھمبیڑے کا لشکر لے کر احمد آباد سے 12 کوس پر دولقہ کے مقام پر آپہنچا۔ اسی وقت اعتماد خاں اور نظام الدین احمد شہر چھوڑ کر شہاب الدین احمد خاں کو واپس لانے کے لیے کڑی کی طرف کوچ کر گئے اور اس کو اطمینان دلایا کہ بدستور سابق قدیم پرگنے اس کی جاگیر میں رہیں گے اس کے علاوہ اسے 2 لاکھ روپیہ نقد بھی دیا جائے گا۔ ان لوگوں نے جانے سے پہلے احمد آباد کو شیر خاں ولد اعتماد خاں اور میر محمد معصوم بھکری کی تحویل میں دے دیا تھا کہ ہم کڑی سے واپس آکر فوج کا ساز و سامان درست کریں گے۔

مظفر شاہ نے دوسرے دن پیش قدمی کی۔ احمد آباد سے 3 کوس پر سرکھیج کے مجاوروں نے گجرات کے بادشاہوں کے مزاروں کا نقشہ تیار کر کے شگون کے لیے اس کے سر پر سایہ کیا اور اسے سلطنت کی مبارک باد دی۔ اس کے لیے تو یہ مژدۂ غیب تھا۔ غرض وہ اسی دن دھاوا مار کر شہر میں داخل ہوگیا۔

شاہی امراء کی ابتری

انھی دنوں امیر کڑی سے راتوں رات یلغار کرتے ہوئے صبح کے وقت عثمان پورہ پہنچے۔ ان کے استقبال کے لیے مظفر اپنی فوج کو آراستہ کر کے آگے بڑھا اور احمد آباد کے ریگستانی ساحل پر مقابلے کے لیے صف آرائی کرلی۔ وہ تو میدان میں پیچ کر دم خم دکھا رہا تھا اور یہاں یہ 2 بوڑھے امیر باغیوں میں تفرقہ پیدا کرنے، بھاگے ہوئے ملازموں کو تسلی دے کر واپس بلا لانے، قرض لینے، دستاویز و تمسک لکھنے اور نامہ و پیام کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ غرض ان کے روکے بغاوت کا یہ سیلاب رک نہ سکا اور جب پانی سے سر سے گزر گیا تو وہ دونوں بغیر لڑے ہی وہاں سے فرار ہوکر نہروالہ کے شہر پٹن میں جو احمد آباد سے 45 کوس پر ہے ایک ہی دن میں جا پہنچے۔ ان کے لشکر کا سارا ساز و سامان باغیوں نے لوٹ

لیا اور لشکریوں کے اہل وعیال اسیر ہو گئے۔ نظام الدین احمد کا لڑکا محمد شریف سارا مال و اسباب لٹوا کر محافظ سپاہیوں کے ہمراہ بہ مشکل باپ سے آکر ملا۔

شیر خاں فولادی کی واپسی

ان بھاگے ہوئے امیروں نے فتح پور سے مدد کے لئے آنے والے امراء کے ساتھ پٹن کے قلعے کی مرمت کی اور اس میں قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ مظفر نے اپنے معمولی سپاہیوں کو بھی بڑے بڑے خطاب عطا کیے اور جاگیروں کا امیدوار بنا کر ان کے عہدے بڑھا دیے، خدا کی قدرت کہ ملازمت شاہی میں اسے تیس روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا تھا، اب وہ تیس ہزار سپاہیوں کا مالک بن گیا۔ اس نے شیر خاں فولادی کو جو پہلے پٹن کا حاکم تھا اور اب سورت میں نہایت تنگدستی سے گزر بسر کر رہا تھا، بلا بھیجا اور 4 ہزار سوار دے کر اسے پٹن پر حملے کے لیے رخصت کیا۔

پٹن کے سرداروں نے شہباز خاں کے بھائی زین الدین کنبو کو قطب الدین محمد خاں کے پاس بھیجا کہ وہ اس طرف سے اور پٹن والے اُس طرف سے احمد آباد پر حملہ کریں اور مظفر کو گھیر لیں۔ مظفر نے اس کارروائی سے پہلے ہی آگے بڑھ کر ایک بڑے لشکر کے ساتھ بڑودہ میں قطب الدین محمد خاں پر حملہ کر دیا اور سخت جنگ کر کے اسے شکست دی۔ قطب الدین محمد خان بھاگ کر بڑودہ کے قلعے میں محصور ہو گیا۔ اس کے لشکر کے سردار اور ملازم سارے مظفر سے جا کر مل گئے۔

اس واقعہ سے پہلے ہی شیر خاں 5000 سوار لے کر پٹن سے 15 کوس پر قصبہ میانہ کے علاقے میں پہنچ گیا اور شہاب الدین احمد خاں بڑے تذبذب کے بعد جالور کی طرف بھاگ گئے۔ پٹن میں صرف نظام الدین احمد رہ گئے۔ ان کے ساتھ جو سردار تھے ان سب کی جمعیت 2000 سواروں سے زائد نہیں تھی۔ فریقین میں گھمسان کی جنگ ہوئی، آخر نظام الدین احمد کو فتح نصیب ہوئی اور شیر خاں شکست کھا کر احمد آباد بھاگ گیا۔ نظام الدین احمد نے بڑے اصرار سے کہا کہ اس کا تعاقب کرتے ہوئے اس وقت احمد آباد پر حملہ کر دیا

چاہیے، لیکن امراء نے قبول نہ کیا، حالانکہ ان کا مشورہ بالکل درست تھا کیوں کہ لشکریوں کو اس وقت تک قطب الدین محمد خان کی شکست کی خبر نہیں ملی تھی۔ اس جنگ میں امراء کے ہاتھ کافی مال غنیمت آیا۔ یہ لوگ کرتی جا کر ٹھہر گئے اور 12 دن تک وہاں لشکر کا انتظار کرتے رہے جو مال غنیمت لے کر پٹن گیا ہوا تھا۔

بڑودہ پر باغیوں کا قبضہ

اسی اثنا میں خبر ملی کہ مظفر نے بڑودہ کے قلعے کی پرانی دیوار کو توپ اندازی کر کے گرا دیا ہے اور قطب الدین محمد خاں نے زین الدین کو پناہ کا قول نامہ لینے کے لیے مظفر کے پاس بھیج دیا ہے۔ مظفر نے زین الدین کو تو اسی وقت قتل کرا دیا اور خواجہ محمد صالح، سابقہ صدر کو جو اعتماد خاں کے ساتھ مقرر کر آئے تھے ان کی بزرگی کا لحاظ کر کے حج پر جانے کی اجازت دے دی۔ قطب الدین محمد خاں امان پا کر جب قلعے سے باہر آیا اور بڑی عاجزی کے ساتھ تسلیمات بجالایا تو مظفر نے ملاقات کے وقت اس کی بڑی تعظیم کی اور استقبال کر کے اسے مسند پر بٹھالیا، وہ اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ لیکن راج سپیلہ کے زمیندار نواری کے بہکانے سے آخر کار اسے قتل کرا دیا۔

پروارے سے مظفر نے بھڑوچ پر حملہ کیا اور اس قلعے کو بھی قطب الدین محمد خاں کی بیوی اور دوسرے رشتے داروں سے صلح کر کے چھین لیا۔ وہاں مظفر کو کھمبایت کا 14 لاکھ روپیہ جو عماد الدین کروڑی لے آیا تھا اور دوسرا بہت سا ساز و سامان مل گیا۔ قطب الدین خاں کا 10 کروڑ سے زائد روپیہ بھی اس کے قبضے میں آ گیا اور اس نے ایک بڑی فوج اکٹھی کر لی۔ حیرت کی بات ہے کہ قطب الدین خاں کا لڑکا نورنگ خاں اور دوسرے تمام مالوہ کے امیر قریب ہی ندربار اور سلطان پور میں تھے۔ نورنگ خاں نے آگے بڑھ کر اپنے ماں باپ کی کوئی خبر نہ لی۔ اس فتح سے مظفر کی دھاک بیٹھ گئی اور مغل، پٹھان اور گجراتی بے شمار اس کے لشکر میں جا کر شامل ہو گئے۔

مرزا خان کی کاروائی

جب نظام الدین کو اس کی خبر ملی تو وہ تمام سرداروں کو لے کر پٹن میں مذکورہ دونوں امیروں سے آ کر ملے۔ یہ سب لوگ پٹن میں مرزا خان ولد بیرم خاں خانخاناں کا انتظار کرنے لگے جو دربار سے دوسرے امراء کے ساتھ جالور کے راستے پٹن آرہا تھا۔ مرزا خاں نے آنے کے بعد پٹن میں ایک دن پڑاؤ کیا اور آگے بڑھ کر سرکنج میں کیمپ لگا دیا۔ مظفر بھی بڑودہ سے لوٹ کر آیا اور بھڑوچ پر اپنے سالے نصیر کو اور چرکس رومی کو جو پہلے شاہی لشکر میں تھا مقرر کر دیا اور شاہ بھیکن کے مزار کے علاقے میں پہنچ کر اپنی چھاؤنی قائم کر دی۔ دوسرے دن دونوں فوجوں میں بڑا سخت مقابلہ ہوا۔ مظفر شکست کھا کر محمود آباد چلا گیا اور یہ لڑائی سید ہاشم بارہہ، خضر آقا وکیل اور مرزا خان نے جیت لی۔ اس جنگ میں بہت سے لوگ زخمی ہوئے۔ دشمن کے جو لوگ ہلاک ہوئے ان کا کوئی شمار نہیں تھا۔

میرزا خان نے فتح پور سے پہلے منت مانی تھی کہ اگر فتح نصیب ہو جائے تو میں اپنا سارا مال و متاع اس کے شکرانے میں خیرات کر دوںگا۔ چنانچہ اس نے اپنا عہد پورا کرنے کے لیے ملازمین کو ہاتھی، گھوڑے، پوشاکیں اور سارے مال و اسباب کی قیمت مقرر کرنے کا حکم دیا تاکہ یہ رقم مساکین کو تقسیم کر دی جائے۔ بددیانت ملازمین نے ہر چیز کی اس طرح گھٹا گھٹا کر قیمت لگائی کہ محتاجوں کو چوتھائی بلکہ دسواں حصہ تک نہ مل سکا، بلکہ اچھی خاصی رقم ان بدبختوں نے اپنی عیاشیوں میں اڑا دی۔

میرزا خاں کے اکثر ملازم قلیچی تھے، جیسے دولت خاں افغان لودی، ملا محمودی اور دوسرے امراء۔ ان لوگوں نے عرض کیا کہ ہم آپ کے ملازم بنے ہیں کوئی قصور تو نہیں کیا؟ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم بادشاہی ملازمین کے سامنے اس طرح دبے دبے اور حقیر رہیں اور وہ مجلسوں میں ہم پر ہمیشہ اپنی برتری جتلاتے رہیں۔ تسلیم و تعظیم اور دوسرے درباری مراسم میں ان کو بھی ہمارے مساوی درجہ دیا جانا چاہیے۔ یہ بغیر سرپاؤں کی بات کرتے ہیں جو مرزا خان کو بری معلوم ہوئیں اور اس نے اپنے امراء اور سرداروں میں سے ہر ایک کے لیے بھاری پوشاکیں اور گھوڑے تیار کرائے اور تمام امرا کی فہرست تیار کر کے ایک بڑا

جشن منعقد کیا اور لباس خانے میں بیٹھ کر اجلاس کی تیاری کرنے لگا۔ نظام الدین احمد کی بہن کسی وقت بیرم خان خان خانان کے نکاح میں رہی تھیں۔ اس سابقہ رشتے کی بناء پر اس نے نظام الدین احمد کو بلا کر اس بارے میں مشورہ کیا۔ انھوں نے نصیحت کی کہ "یہ کم عقل اور کوتاہ اندیش تم کو بہکا رہے ہیں اگر بادشاہ کے کانوں تک یہ بات پہنچ گئی تو وہ کیا خیال کریں گے۔ جہاں تک تسلیمات و کورنش کا معاملہ ہے، بھلا سوچو تو کہ شہاب الدین خاں مرتبے کے لحاظ سے پنج ہزار سواروں کا منصب دار تھا تمہاری تسلیمات بجالائے تو کیا زیب دے گا؟ خود پاینده خاں مغول بھی اس بات سے صاف انکار کردے گا اور ممکن ہے وہ کسی جہالت کا ثبوت دیں اور خواہ مخواہ بدمزگی پیدا ہو جائے۔" مرزا خان کو یہ رائے پسند آ گئی اور اس نے اپنا یہ ارادہ ترک کر دیا۔

مظفر شاہ کی شکست اور اس کا فرار ہونا

اس فتح کے تین دن بعد قلیج خان اور مالوہ کے دوسرے امیر احمد آباد پہنچ گئے۔ وہاں معلوم ہوا کہ مظفر محمود آباد[65] سے جو دریائے مہندری کے کنارے ہے کھمبایت چلا گیا ہے اور بھاگی ہوئی فوج کے 2 ہزار سوار اس کے پاس جمع ہو گئے ہیں۔ میرزا خاں امراء کے ساتھ اس کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ مظفر بڑودہ اور پھر وہاں سے راج پپلہ اور نادوت کی طرف نکل گیا۔ میرزا خاں نے بڑودہ پہنچ کر کھمبایت پر ایک فوج روانہ کی جس نے مظفر کے سردار دولت نامی شخص کو شکست دے کر کھمبایت پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد مرزا خان نے نادوت کی طرف پیش قدمی کی اور قلیج خاں اور دوسرے امیروں کو وسطی پہاڑی پر جہاں مظفر پناہ گزیں تھا حملہ کرنے کے لیے مامور کیا۔ یہ ساری لڑائیاں نظام الدین احمد کی بدولت جیتی گئیں۔ شاہی فوج سازو سامان سے لدی رہتی تھی اس کے لیے تیزی سے نقل و حرکت کرنا دشوار رہتا تھا۔ نظام الدین احمد نے امراء کے حوصلے بڑھائے اور خود بھی اپنے عہدے سے بڑھ کر کارگزاری دکھائی۔ ان کی کوشش واستقامت تھی کہ مظفر کے ساتھ لشکر نے سرنج کی پہلی سخت لڑائی جیت لی تھی اور اب مظفر ادھر ادھر مارا مارا پھرتا تھا۔

میرزا خاں احمد آباد کو لوٹ آیا اور مالوہ کے لشکر کو اس نے بھڑوچ کے قلعے کے محاصرے پر مقرر کر دیا۔ بھڑوچ پر مظفر کی طرف سے چرکس رومی حاکم تھا 7 ماہ بعد وہ مارا گیا اور مظفر کا سالا نصیر فرار ہو گیا۔

اکبر کی الہ آباد روانگی

اسی سال مرزا خاں اور مالوہ کے لشکر کو گجرات پر مقرر کرنے کے بعد بادشاہ نے بذریعہ کشتی الہ آباد کی سیر کا ارادہ کیا۔ الہ آباد قدیم شہر پیاگ[66] کی جگہ نیا آباد کیا گیا تھا۔ یہ شہر ہندوؤں کی قدیم پرستش گاہ ہے۔ وہاں بادشاہ نے قلعے کی بنیادیں بھی رکھوائی ہیں۔ جس دن بادشاہ رخصت ہونے والے تھے، مکہ معظمہ سے شیخ سلیم چشتی کے صاحبزادے شیخ بدرالدین کے انتقال کی خبر پہنچی کہ انھوں نے 7 دن کا روزہ رکھا ہوا تھا اور تیز دھوپ میں ننگے پیر طواف کر رہے تھے جس سے پیروں میں آبلے پڑ گئے اور حب محرقہ میں مبتلا ہو گئے اور عین عید قربان کے دن 990 ھ میں اللہ کے راستے میں جان دے دی۔ بادشاہ نے شیخ کی خانقاہ کے خادم حاجی حسین کے ذریعے ان کی وفات کی اطلاع بھجوائی جس سے ان کے خاندان میں واویلا مچ گیا۔ اس خاندان کے یہ آخری بزرگ تھے۔ ان پر رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

راجہ رام چند کی اطاعت

الہ آباد پہنچنے کے بعد بادشاہ نے وہاں 4 مہینے تک قیام فرمایا۔ یہاں سے زین خاں کوکہ اور بیربر کو جو پہلے رام چند بیتہ کا ملازم تھا، ایلچی بنا کر چوراگڑھ روانہ کیا۔ رام چند نے اطاعت قبول کر لی اور زین خاں کو بڑی خاطر داری کے ساتھ روک لیا، پھر اس کے ہمراہ فتح پور میں آ کر اس نے دربار شاہی میں حاضری دی اور 120 قیمتی لعل و جواہر جن کی قیمت 50 ہزار روپے ہوتی تھی نذرانے میں دیے۔ اپنے بیٹے بابو کو خدمت شاہی میں چھوڑ کر کچھ عرصے بعد وطن لوٹنے کی اجازت حاصل کی۔ واپسی کے چند دن بعد ہی وہ فوت ہو گیا۔

رام چند نہایت خوش اخلاق اور فیاض راجہ تھا۔ اس کی مثال ملنی مشکل ہے اس کی بخششوں کا یہ عالم تھا کہ ایک کروڑ کا سونا ایک ہی دن میں میاں تان سین کلاونت کو عطا کر دیا۔ ہم ذکر کر آئے ہیں کہ اس نے ابراہیم سور کو بادشاہی کا کتنا کچھ سازو سامان تیار کر کے دیا تھا۔ میاں تان سین تو اس کے پاس سے واپس ہونا نہیں چاہتا تھا۔ آخر جلال خاں قورچی بڑے وعدے وعید کر کے اسے اپنے ساتھ واپس لایا۔

انہی دنوں میں حاجی پور سے اعظم خاں حملہ کرتے ہوئے الہ آباد پہنچا، لیکن اپنے لشکر کو لانے کے لیے بہت جلد واپس چلا گیا۔ امرائے شاہی نے الہ آباد میں شاندار عمارتوں کی تعمیر کا بندوبست کیا اور یہ طے پا گیا کہ آیندہ اس شہر کو پایہ تخت بنایا جائے، نیا سکہ جاری کیا جائے اور اس کے لیے شریف سرمدی چوکی نویس نے سکے کا یہ شعر نکالا تھا:

ہمیشہ چون زر خورشید و ماہ رائج باد
بشرق و غرب جہان سکۂ الہ آباد

کسی دل جلے نے شریف سرمدی کے متعلق یہ شعر کہا تھا:

دو چوکی نویسندہ ہر دو کثیف
یکی ناتفیس و دگر نا شریف

انہی دنوں ملا الہداد امروہہ اور ملا شیری جو دو آبہ پنجاب کی صدارت کے عہدے پر مامور تھے، الہ آباد آکر دربار میں حاضر ہوئے۔ ملا شیری نے بادشاہ کی خوشامد میں "ہزار شعاع" کے عنوان سے آفتاب کی تعریف و توصیف میں ایک نظم پیش کی جو ہزار قطعات پر مشتمل تھی یہ بادشاہ کو بہت پسند آئی۔

بادشاہ کی فتح پور واپسی

اسی سال ماہ ذی الحجہ میں گجرات کی بغاوت کے تدارک کے لیے الہ آباد سے فتح پور واپسی ہوئی۔ اٹاوہ کے علاقے میں میرزا خاں کی فتح کی خبر پہنچ گئی۔ بادشاہ دار الخلافہ کو ماہ صفر 992ھ میں لوٹ کر آئے اور گجرات کے امیروں کے نام خوشنودی کے فرمان جاری کیے

گئے۔ میرزا خاں کو خان خاناں کا خطاب، گھوڑا، خلعت، مرصع خنجر، سرداری کے لوازمات اور سب سے بڑا 5 ہزاری کا منصب عطا کیا گیا۔ نظام الدین احمد نے اس مہم میں نمایاں کارنامے انجام دیے تھے اس لیے ان کو بھی گھوڑا، خلعت اور منصب میں ترقی دی گئی۔ دوسرے امراء کے منصبوں میں بھی دس بیس اور دس تیس کا حسب مدارج اضافہ کیا گیا۔

رامائن کے ترجمہ کا حکم

اسی زمانے میں بادشاہ نے مجھے[67] "رامائن" کے ترجمے کا حکم دیا، جو تصنیف کے لحاظ سے مہابھارت سے پہلے کی کتاب ہے۔ اس میں 25 ہزار اشلوک ہیں۔ ہر اشلوک 65 حروف کا ایک طویل فقرہ ہے۔ رامائن میں اودھ کے راجہ رام چندر جسے عام طور پر رام کہا جاتا ہے انہی کی داستان ہے۔ ہندو ان کو خدا کا اوتار سمجھتے ہیں کہ اللہ نے رام کی شکل میں حلول کیا تھا۔ اس داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ لنکا کے جزیرے پر راون نامی 10 سروں والا ایک دیو حکومت کرتا تھا وہ رام کی بیوی سیتا کو اغوا کر کے لنکا لے گیا۔ رام نے اپنے بھائی لچھمن کے ساتھ اس جزیرے کا رخ کیا۔ بے شمار بندروں اور ریچھوں کا لشکر تیار کیا اور سمندر پر 4 کوس لمبا پل بندھوایا۔ بعض بندروں کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ وہ اس فاصلے کو ایک چھلانگ میں طے کر گئے اور بعض ایسے بندر تھے کہ سمندر پر چلتے ہوئے وہاں پہنچے۔ غرض ایسی بہت سی باتیں اس میں درج ہیں۔ بہرحال رام چندر ایک بندر پر سوار ہو کر اس پل پر سے گزرا اور ایک ہفتے تک جنگ کر کے راون کو اس کے اہل و عیال کے ساتھ قتل کر دیا اور لنکا کو راون کے بھائی کے حوالے کر کے اپنے شہر واپس آ گئے۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ رام نے سارے ہندستان پر 10 ہزار سال تک حکومت کرنے کے بعد وفات پائی۔ ہندوؤں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ دنیا کافی قدیم ہے، ہمیشہ سے ہے اور کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا ہے جب انسان اس دنیا میں نہ رہا ہو۔ ظاہر ہے کہ رامائن کے یہ واقعات صحیح نہیں، محض افسانہ اور خیالی داستانیں ہیں جیسے شاہنامہ اور امیر حمزہ کی داستانیں جو درندوں اور جنوں کے اقتدار کے زمانے میں گزرا تھا۔

جنس کی تبدیلی کا واقعہ

ان دنوں ایک عجیب اور دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ فتح پور کے دیوان خانے میں ایک خاکروب کی بیوی پیش کی گئی کہ یہ مرد بن گئی ہے۔ رامائن کا ایک ترجمان بھی دفتر کتاب سے اٹھ کر اسے دیکھنے گیا اور واپس آ کر اس نے بیان کیا کہ وہاں ایک عورت تھی جس نے شرم سے چہرہ چھپا رکھا تھا اور بات نہیں کر رہی تھی۔ حکیموں نے اس کی تائید و تصدیق میں دلائل پیش کیے اور بتلایا کہ ایسے واقعات بہت پیش آتے رہے ہیں۔ اسی سال ملا عالم کابلی جو نہایت شیریں گفتار عالم، خوش بیان اور باغ و بہار آدمی تھے، وفات پا گئے۔ ان کی تصنیف "فواتح الولایت" ہے ان کی تاریخ وفات "اشعث طباع" نکالی گئی۔

اکبر کی حکومت کا انتیسواں سال

اس سال 8 ربیع الاول 992 ھ کو حملہ آفتاب واقع ہوا اور نوروز جلالی کے دن جلوس شاہی اور نوروز سلطانی کا انتیسواں سال شروع ہو گیا۔ جشن نوروز بڑی دھوم دھام سے منایا گیا، دکانوں، مکانوں کی آرائش کی گئی، طرح طرح کی محفلیں منعقد ہوئیں، سامری کے گوسالے کی طرح کانسے کی گائے کا ایک ناقوس بنا کر بجایا گیا۔ غبارے جو فرنگیوں کی ایجاد ہیں اور جو کپڑے سے گیند کی شکل کے بنائے جاتے ہیں، چھوڑے گئے۔ اس مرتبہ دس دس آدمیوں کی ٹکڑی شاہی خدمت میں حاضر ہوئی تھی۔ یہ لوگ اکبر کی مریدی اختیار کر کے نئے دین میں داخل ہوتے تھے۔ شجرے کے بجائے اکبر اپنی تصویر اخلاص اور رشد و ہدایت کی علامت کے طور پر عطا کرتا تھا۔ اکبر نے پگڑی پر جواہرات سے جڑا ایک سرپیچ باندھ رکھا تھا۔ فرامین میں سرنامے کے لیے "اللہ اکبر" کا کلمہ تجویز کیا گیا۔ اس سال جوا اور سود حلال کر دیے گئے، اس طرح اور دوسری ممنوعات بھی جائز قرار دے دی گئیں۔ اکبر نے دربار میں ایک جوا خانہ بھی بنوایا، جواریوں کو شاہی خزانے سے سود پر روپیہ قرض دیا جاتا تھا اس طرح بادشاہ کی دولت میں اضافے کی ایک صورت نکل آئی۔ 14 سال سے کم عمر لڑکی اور 16 سال سے کم عمر لڑکے کی شادی کی ممانعت کر دی گئی۔ حضور اکرم ﷺ اور حضرت

عائشہؓ کے جن کا کم عمری میں عقد ہوا تھا زفاف کے قصے وغیرہ سے اکبر نے صریحاً انکار کر دیا۔ پیغمبران اکرام سے خدا کی جناب میں جو لغزشیں ہوئیں مثلاً داؤد علیہ السلام اور اوریہ کا قصہ وغیرہ وہ سب اس مطلقاً انکار کے لیے اچھا خاصا بہانہ بن گئیں۔ اکبر جسے اپنا معتقد نہیں پاتا تھا اسے لائق قتل، مردود اور نابکار سمجھتا تھا۔ ایسے شخص کو فقیہ۔ اور دشمن سلطنت کا نام دیا جاتا تھا۔ لیکن جیسا کہ قاعدہ ہے ہر شخص کو وہی کاٹنا پڑتا ہے جو کچھ اس نے بویا ہوتا ہے۔ دوسرے مردود و نابکار کیا ہوتے خود حضرت سلامت سارے زمانے میں گمراہ اور کفر کے نام سے مشہور ہو گئے اور ان کے مرشد و مجتہد ابو الفضل کو "ابو جہل" کا لقب ملا۔ غرض دنیاوی سلطنت اب دین الٰہی کے زیر تسلط آ گئی اور اکبر اپنے دین کے معاملات کو امور سلطنت سے بھی زیادہ اہمیت دینے لگا۔ عزت و ناموس کی بربادی کے لیے نو روز کی دکانوں اور مینا بازار کو کبھی کبھی مردوں سے خالی کرا دیا جاتا تھا اور بیگمات، اہل حرم اور خاص و عام پردہ نشین عورتوں کو سیر و تفریح کے لیے بلایا جاتا تھا۔ اس میلے میں بادشاہ لوگوں کو روپیہ پیسہ انعام دیتے تھے باہر سے آنے والی عورتوں کے قضیے بھی طے کیے جاتے تھے اور لڑکیوں کے نکاح بھی کرائے جاتے تھے۔ بادشاہ نے نکاح کی قید کو بھی ختم کرا دینے کی بڑی کوشش کی، لیکن ہندو اس کے لیے راضی نہیں تھے اس لیے کچھ نہ کر سکا۔ اس زمانے میں ہندوؤں کا بڑا زور تھا، آدھا ملک ان کے قبضے میں تھا وہ فوج میں بھی 50 فی صد تھے۔ مغل اور ہندستانی امراء سے وہ کہیں زیادہ مقتدر اور با اختیار تھے، اس لیے نکاح کے معاملے میں ان کے سامنے اکبر کی کچھ نہ چلی۔ رہ گئیں دوسری قومیں تو ان کی کوئی حیثیت نہ رہی تھی۔ ان میں نہ غیرت تھی نہ اتفاق، اس لیے بادشاہ نے جس طرح چاہا انکو نچا کر رکھ دیا۔

انہی دنوں حسب وعدہ اعظم خاں حاجی پور سے یلغار کرتے ہوئے حاضر ہوا۔ مرزا سلیمان کو معظم سے لوٹ کر بدخشاں پر قبضہ کر چکا تھا۔ اس نے اور میرزا شاہرخ نے اوزبکوں سے جنگ کی اور شکست کھائی اور اب دونوں ہندستان میں پناہ لینے کے لیے آ رہے ہیں

ذی قعدہ کے اوائل میں نیلاب سے مان سنگھ کا عریضہ پہنچا کہ میرزا شاہرخ نیلاب کے کنارے آچکا ہے۔ اس نے میرزا کا استقبال کیا اور 6 ہزار روپیہ نقد، بہت سے کپڑے اور پانچ ہاتھی میرزا کی خدمت میں پیش کیے۔ بادشاہ کو اس کی خدمت گزاری بہت پسند آئی۔

شاہی امراء کا انتقال

اس سال چند امیروں کا انتقال ہوگیا۔ محمد باقی خاں جو ادہم خاں کا بھائی تھا، اس نے اپنی جاگیر گڑہ کٹنگہ میں وفات پائی۔ غازی خاں بدخشی کو الہ آباد سے اودھ کی طرف بھیجا گیا تھا وہ اسی جگہ فوت ہوگیا۔ غازی خاں آخر عمر میں اس قدر کمزور ہوگیا تھا کہ چلنے پھرنے سے معذور تھا۔ اسے قالین پر بٹھا کر اجلاس میں لایا جاتا تھا۔ کسی نے اس پوچھا آپ کا کیا حال ہے؟ تو اس نے جواب دیا" الحمد للہ حرص وطمع کے بل پر زندہ ہوں اور اپنے تمام لاؤ لشکر پر حکمران ہوں"۔ نوکروں پر برہم ہوکر یہ دعا کرتا تھا کہ" خدا کرے تو بھی ہزاری منصب ہو جائے تا کہ تجھے میری قدر معلوم ہو"۔

ایک رات قلیچ خاں کے گھر پر بہت سے لوگ افطار کی دعوت میں جمع تھے، غازی خاں سورۂ "انا فتحنا" کی تفسیر بیان کر رہا تھا میں نے کوئی اعتراض کیا۔ اس نے کچھ توجیہہ کر کے درشتی سے جواب دیا، میں نے کہا، ظاہر تو یہی ہو رہا ہے۔ اس پر وہ بہت برافروختہ ہوگیا، آخر آصف خاں نے بیچ بچاؤ کر کے صلح کرادی۔

جس دن الہ آباد سے کوچ ہوا تھا، راستے میں کافی دور تک میں اور غازی خاں علمی مذاکرہ اور مشائخین کے اقوال بیان کرتے رہے تھے۔ پھر ہم نے ایک دوسرے کو وداع کیا۔ غازی خاں سے بس یہ میری آخری ملاقات تھی۔

اسی سال سلطان خواجہ بھی فوت ہوگیا وہ اکبر کے مریدان خاص میں شامل تھا۔ اس کو ایک خاص وضع کی قبر میں دفن کرایا گیا تھا جس میں ایک جالی لگائی گئی تھی کہ ہر صبح کو سورج کی روشنی اس کے چہرے پر پڑتی رہے، کیوں کہ سورج گناہوں کو پاک کرنے والا ہے،

کہتے ہیں کے منہ کو آگ سے جھلسایا بھی گیا تھا۔

ملا احمد ٹھٹھہ بھی مرگیا۔ اس کی تاریخ ''سلطان الخوارج'' ہے جس میں ایک عدد کی کمی ہے۔

مرزا شاہرخ کی آمد

993ھ/1585ء کے آغاز میں جبکہ تیسویں سال جلوس کا اختتام تھا، میرزا شاہرخ اور راجہ بھگوان داس فتح پور کے قریب پہنچ گئے۔ اکبر نے شاہزادہ دانیال کو شیخ ابراہیم چشتی اور دوسرے امراء کے ساتھ استقبال کے لیے بھیجا یہ لوگ اسے بارگاہ میں لے کر آئے۔ بادشاہ نے مرزا کو ایک لاکھ روپیہ نقد، فراش خانے کا سامان، تین عراقی گھوڑے، پانچ ہاتھی، چند اونٹ، خچر اور ملازم عطا فرمائے۔

شاہزادہ سلیم کی شادی

انہی دنوں بادشاہ نے اپنے مقررہ طریقے پر شاہزادہ سلیم کو 16 سال کی عمر میں راجہ بھگونت داس کی لڑکی سے بیاہ دیا۔ خود بادشاہ سلامت کی سواری اس کے گھر پر گئی اور عقد قاضیوں اور شرفاء کی محفل میں منعقد ہوا۔ 2 کروڑ تنکہ مہر باندھا گیا اور ہندوؤں کی تمام رسمیں جیسے آگ جلانا وغیرہ انجام دی گئیں دلہن کے گھر سے دولت خانہ شاہی تک دلہن کی پالکی پر سے بادشاہ نے سونا نچھاور کرایا۔

راجہ بھگونت داس نے چند گھوڑے اور قسم قسم کے جڑاؤ سونے کے زیور، جواہرات، سونے چاندی کے برتن، طرح طرح کے بے حد وشمار کپڑے جہیز میں دیے شاہی امراء کو بھی اس نے ہر ایک کے حسب حال عراقی، ترکی اور عربی گھوڑے سنہری زین کس کر بطور ہدیہ پیش کیے۔

اکبر کی حکومت کا تیسواں سال

جمعرات کے دن 19 ربیع الاول 993ھ/1585ء کو بہار کے موسم کا آغاز ہوا۔ نوروز سلطانی

کے دن آ گئے۔ میرزا نظام الدین احمد نے جو سن وار ترتیب سے تاریخ لکھی ہے، اس نوروز کے متعلق لکھا ہے کہ "جلوس کا تیسواں سال شروع ہو گیا۔ حالانکہ جلوس کے دوسرے قرن کا آغاز 25 ربیع الاول 994ھ/1586ء میں بمقام اٹک بنارس میں ہوا تھا، اس صورت میں یہ تیسواں جلوس کس طرح ہو سکتا ہے۔ یہاں میرزا سے بھول ہوگئی۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایام کبیسہ کی وجہ سے قمری کے ہر تین سال پر ایک مہینے کا فرق پڑ جاتا ہے اور ہر قرن پر شمسی اور قمری سنین میں ایک سال کا فرق ہو جاتا ہے۔ میرے پاس چونکہ تقویم نہیں ہے، اس لیے میں نے مجبوراً میرزا ہی کی پیروی کی ہے۔ اس کی ذمے داری میرزا پر ہی ہے۔ دوسری بات یہ کہ ان دنوں میرزا گجرات میں تھے، شاہی لشکر میں نہیں تھے۔

غرض یہ کہ پرانے رواج کے تحت نوروز کا جشن خوب دھوم دھام کے ساتھ منایا گیا۔ ہر روز بڑی بڑی ضیافتیں ہوئیں۔ مینا بازار یعنی کہ نوروز کی دکانیں جو امراء لگایا کرتے تھے، ہر دکان دار نے بھاری بھاری نذرانے، سب طرح کے کھانے، عطر اور اہل طرب کے انعامات کا خرچ شاہی خزانے سے ادا کیا گیا۔ حسب الحکم پنج ہزاری سے لے کر احدی تک ہر چھوٹے بڑے نے پیش کش اور نذرانے خدمت میں پیش کیے۔ مجھ (68) حقیر نے بھی کہ میری حیثیت ذرۂ ناچیز سے بڑھ کر نہ تھی، لیکن ہزار بیگھہ زمین کی وجہ سے ہزاری سمجھا جاتا تھا یوسف علیہ السلام کو خریدنے والی بڑھیا کی طرح 40 روپے کی نذر دی جسے بادشاہ نے قبول فرمایا۔

اس جشن میں بڑے شاہزادے کو بارہ ہزاری کا منصب ملا۔ ان سب کو فراش خانہ، علم و سراپردہ اور نقارے وغیرہ بھی عطا ہوئے۔

دکن پر حملے کی تیاریاں

اس سال کے شروع میں دکن میں متعینہ امیر میر مرتضیٰ اور خداوند خاں نے برار کے علاقے سے نظام الملک کے پایۂ تخت احمد نگر پر حملہ کیا تھا۔ انھیں نظام الملک کے وزیر صلابت خاں نے شکست دے دی تھی، وہ وہاں سے بھاگ کر برہانپور میں راجہ علی خان کے پاس

چلے گئے تھے۔ راجہ علی خان نے ان کے سارے ہاتھی، گھوڑے چھین لیے تھے، ان میں سے 150 ہاتھی اس نے اپنے لڑکے ابراہیم خاں کے ساتھ دربار میں بھجوا دیے تھے۔ جشن نوروز کے موقعے پر خود راجہ خاں بقیہ گھوڑے لے کر دربار میں آیا اور اکبر کو دکن پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ اس کی فرمائش پر بادشاہ نے شاہ فتح اللہ کو جسے بعد میں میر فتح اللہ کا نام دیا گیا، عضد اللہ کا خطاب عطا فرمایا اور 5 ہزار روپیہ، گھوڑا اور خلعت عطا کی اور ہندستان کا صدر کل بنا کر دکن کی مہم پر مقرر فرمایا۔ اس کے ساتھ خان اعظم، شہاب الدین احمد خاں اور دوسرے امراء بھی مقرر کیے گئے اس کے تقرر سے صدارت کا عہدہ اپنے پورے عروج پر پہنچ گیا۔ آخر یہ معاملہ اس حد تک پہنچا کہ شاہ فتح اللہ کو اس اقتدار کے باوجود کسی امام کو 5 بیگھہ زمین بھی دینے کا اختیار نہیں رہا تھا۔ البتہ وہ ساری کی ساری زمینیں واپس لے کر بحث ضرور کرتا رہتا تھا۔ مدد معاش کی جتنی زمینیں واپس لے لی گئی تھیں وہ ساری کی ساری تباہ ہو گئیں۔ نہ ائمہ اس سے مستفید ہو سکے نہ رعایا۔ اماموں اور معاش داروں پر جو مظالم ہوئے وہ ان تمام صدور کے نامۂ اعمال میں باقی رہیں گے جن کے اب نام تک باقی نہیں رہے ہیں۔

ماہ رجب 993ھ/1585ء میں کابل سے خبر آئی کہ مرزا سلیمان اوزبکوں سے شکست کھا کر بدخشاں سے میرزا محمد حکیم کے پاس کابل آ گیا ہے اور اسالو نامی ایک موضع کی جاگیر پر صبر شکر کر کے بیٹھ رہا تھا، پھر اس نے قبائل کو اکٹھا کر کے بدخشاں کی سرحد پر اوزبکوں سے مقابلہ کیا اور انھیں شکست دی، بہت سے اوزبک اس لڑائی میں مارے گئے۔ جو قیدی بن کر آئے ان کو میرزا نے خلعت و انعام دے کر رہا کر دیا اور اپنا ملک دوبارہ حاصل کر لیا۔

گجرات میں دوبارہ بغاوت

ماہ شعبان میں حسب الحکم شاہی، خان خاناں گجرات سے فتح پور آیا ہوا تھا۔ اس کے گجرات سے نکلتے ہی مظفر نے دوبارہ بغاوت کا پرچم بلند کر دیا۔ مظفر کو جونا گڑھ کے حاکم جام امین

خاں غوری سے بڑی شکایات تھیں اس کے ہاتھوں اس نے منہ کی کھائی تھی، اس لیے اس بار اس نے بڑھ کر جوناگڑھ کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ قلیچ خاں تو احمد آباد میں حفاظت و ناکہ بندی کے لیے ٹھہرا رہا اور مظفر کے بغاوت کو کچلنے کے لیے نظام الدین احمد گجرات کے امیروں کو ساتھ لے کر مقابلے پر پہنچے۔ مظفر شاہی لشکر سے مقابلے کی تاب نہ لا کر دریائے رن کو پار کر کے کچھ میں چلا گیا۔ یہ دریا سمندر سے 10 کوس اور 30 کوس کے فاصلے سے جیسلمیر کے ریگستان میں داخل ہوتا ہے اور اسی ریگزار میں کہیں غائب ہو جاتا ہے۔

اسی زمانے میں نظام الدین احمد نے گجرات سے میرے نام خط بھیجا تھا کہ "خان خاناں نے یہاں سے جاتے ہوئے وعدہ کیا ہے کہ اس بار وہ بادشاہ سے اجازت لے کر تم کو اور ملا الہداد کو اپنے ساتھ لیتا آئے گا۔ مناسب یہ ہے کہ تم حسب مراتب خان خاناں سے مل لو اور دربار سے رخصت لے کر یہاں آ جاؤ۔ گجرات کی سیر نہایت دلچسپ رہے گی"۔

اس خط کے بموجب میں خان خاناں سے ملنا چاہتا تھا لیکن کوئی موقع نہ ملا، صرف ایک بار جب کہ میں[70] دولت خانہ شاہی سے متعلقہ کتب خانے میں جہاں ترجمے کے کام پر میں مامور تھا، جا رہا تھا تو خان خاناں سے سر راہ ملاقات ہو گئی تھی۔ اس کے بعد ہی وہ بہت جلد گجرات کی جانب لوٹ گیا، پھر کابل کے قضیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھے گجرات جانے کے لیے رخصت لینے کا موقع نہ ملا اور وہ ارادہ جسے میں نے اپنی نجات اور بہتری کا وسیلہ بھی رکھا تھا پورا نہ ہو سکا۔

خان خاناں فتح پور سے رخصت ہو کر جب سروہی سے 10 کوس پر پہنچا تو اس نے سروہی اور جالور پر قبضہ کر لینے کا ارادہ کر لیا۔ نظام الدین احمد بھی وہاں پہنچ گئے۔ سید قاسم بارہہ بھی اپنی ساری جمعیت کو لے کر استقبال کے لیے آ گیا۔ خان خاناں کی فوجی کاروائی کی خبر سن کر سروہی کا راجہ بھاری پیش کش لے کر خدمت میں حاضر ہوا۔ غزنین خاں جالوری بھی اس مرتبہ ملاقات کے لیے لشکر میں حاضر ہو گیا تھا لیکن جس وقت خان خاناں

دربار کے ارادے سے کوچ کر رہا تھا تو اس سے کوئی خطا سرزد ہو گئی تھی اور اب اس کے باغی ہو جانے کا اندیشہ تھا اس لیے خان خاناں نے اسے قید کر دیا اور اپنے ساتھ احمد آباد لے کر چلا گیا۔ جالور کی جاگیر اس سے لے کر اپنی فوج کو وہاں متقرر کر دیا۔

عشق کا انجام

سید محمود بارہہ کے پوتے سید جمال الدین کو جو چند سال پہلے شاہی طرب خانے کی ایک حسین طوائف تھی اور جس کا نام یمین تھا اور اب تو وہ چڑیل سے کم نہیں معلوم ہوتی ہے، عشق ہو گیا۔ اس عشق بازی کا بھانڈا پھوٹا تو وہ ڈر کر دربار سے پہاڑی علاقے میں جا چھپا اور وہاں اس نے اپنی ایک ٹولی بنائی اور وہ سرکاری علاقے میں لوٹ مار کرتا رہتا تھا۔ بعد میں وہ پہاڑی سے اپنے چچا سید قاسم کے پاس جا کر پناہ گزیں ہو گیا۔ خان خاناں نے حسب فرمان اس کو سید قاسم کی جاگیر پٹن سے بلوا کر قید کر لیا، پھر اس کو اور غزنین خاں کو لاہور بھیج دیا گیا۔ غزنین خاں کی شادی میاں محمد وفا خزانچی مرحوم کی لڑکی سے ہوئی تھی بادشاہ نے اس کے سالے میاں فتح اللہ شربتی کا لحاظ کر کے اس معاف کر دیا اور وہ دوبارہ ملازمت شاہی سے وابستہ ہو گیا، لیکن سید جمال الدین عتاب سے نہ بچ سکا، اسے پھانسی پر چڑھا کر تیروں سے چھلنی چھلنی کر دیا گیا۔ عشق بازی کا روگ آخر اس کی جان لے کر ہی ٹلا۔

پیر روشن کی لوٹ مار

اٹک بنارس سے راجہ مان سنگھ اور خواجہ شمس الدین کا عریضہ پہنچا کہ کابل میں مرزا محمد حکیم سخت بیمار اور فراش ہے۔ پشاور سے فریدوں ایک قافلہ لے کر کابل کی طرف گیا تھا، جب وہ کوتل خیبر پہنچا تو وہاں اس کا مقابلہ روشن طحہ کے لڑکے سے ہو گیا۔ روشن طحہ اس علاقے میں عقل مند آدمی کے طور پر جانا جاتا تھا۔ اب تو وہ روشن نہیں بلکہ پیر تاریک کے نام سے مشہور ہے۔ فریدوں خیبر پر شکست کھا کر پشاور واپس چلا آیا۔ اتفاق سے جب وہ پشاور پہنچا تو وہاں کے

قلعے میں آگ لگ گئی اور سوداگروں کا ایک ہزار اونٹوں کا لدا ہوا مال جل گیا۔

اسی اثنا میں یہ خبر بھی ملی کہ عبداللہ خاں اوزبک نے دوبارہ ایک بڑی فوج بھیج کر بدخشاں پر قبضہ کر لیا ہے اور مرزا سلیمان کو وہاں سے بے دخل کر کے اس کے سارے مال و اسباب پر قابض ہو گیا ہے۔ میرزا سلیمان اس کے مقابلے کی تاب نہ لا کر دوبارہ کابل لوٹ آیا ہے۔

مرزا محمد حکیم کا انتقال

اس کے ساتھ کابل سے ایک اور خبر آئی کہ میرزا محمد حکیم (71) کثرت شراب نوشی سے طرح طرح کے امراض میں گرفتار تھا، چنانچہ رعشے کے عارضے میں 12 شعبان 993ھ/1585ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔

بادشاہ کا کابل کا ارادہ

میرزا محمد حکیم کے انتقال کی خبر تیسری ماہ رمضان المبارک کی ملی تھی، بادشاہ کو کابل اور غزنی کی حفاظت کی بڑی فکر ہوئی۔ پہلے خیال تھا کہ یہ علاقہ میرزا محمد کے لڑکوں کے سپرد کر دیا جائے۔ لیکن امراء نے عرض کیا کہ مرزا کے لڑکے ابھی چھوٹے ہیں۔ وہ وہاں کا نظم و نسق سنبھال نہیں سکیں گے۔ اس لیے بادشاہ نے خود وہاں جانے کا عزم کیا۔ خان خاناں کے نام گجرات جلد پہنچ جانے کا فرمان صادر کیا گیا۔ خان اعظم اور شہاب الدین احمد خاں دکن کی مہم کے لیے نامزد کیے جا چکے تھے۔ عضد اللہ کو حکم دیا گیا کہ وہ دکن کی مہم انتظامات کے لئے مالوہ اور رائے سین میں ان امراء کے پاس چلا جائے۔ ان انتظامات کے بعد بادشاہ نے پنجاب کی طرف کوچ کر دیا۔ شوال کا چاند دہلی میں دیکھا گیا۔ پانی پت پہنچے تو وہاں سے میر ابوالغیث بخاری کو لکھنؤ کے نواح میں جاگیر دے کر رخصت کر دیا۔ اس ماہ کی 19 تاریخ کو ستلج کے کنارے کیمپ لگایا گیا۔

انہی دنوں شیخ جمال بختیار اور شیخ الاسلام کا پوتا خواجہ اسماعیل جو نہایت حسین اور

خوبرو شخص تھا مگر عیاشی کی کثرت کی وجہ سے بیمار تھا۔ ایک ہفتے کے فرق سے یہ دونوں انتقال کر گئے۔ ایک کی وفات لدھیانہ میں ہوئی اور دوسرے کی تھانیسر میں۔ خواجہ اسماعیل کی وفات کی تاریخ ہے:

"رفت زیبا گل زباغ جہان"

سیالکوٹ سے 3 کوس کی مسافت پر ملا الہداد امروہہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے سینے پر ایک داغ پڑ گیا تھا اور اسکی تپش دل تک پہنچ گئی تھی۔ اسے حکیم حسن نے ایک مسہل دیا تھا، اسی دن وہ فوت ہو گیا۔ بڑا اچھا دوست تھا جو بچھڑ گیا۔

لاہور کے علاقے میں جب قیام ہوا تو صادق خان کو بھکر کی حکومت پر مقرر کیا گیا تھا۔ 13 ذیقعدہ کو لشکر چناب کے کنارے پہنچ گیا۔ میر ابوالغیث اور شیخ محمد بخاری کا مصاحب شیخ عبدالرحیم لکھنوی خان زمان کے زوال کے بعد دربار میں آ گیا تھا اور امارت کے منصب پر فائز تھا۔ اسے بادشاہ نے پہاڑی علاقے میں پرگنہ پٹھان کی جاگیر عطا کی تھی۔ ان دنوں جنون کے عارضے میں مبتلا تھا۔ چناب کے قیام کے دوران اس نے حکیم ابوالفتح کے خیمے میں اپنے آپ خنجر مار لیا۔ اکبر نے اپنے ہاتھ سے اس کی مرہم پٹی کی اور اسے سیالکوٹ میں بہ حفاظت رکھنے کا حکم دیا۔ کچھ عرصے بعد وہ صحت یاب ہو گیا، لیکن دیوانگی اسی طرح باقی رہی۔ اسی ماہ کی 27 تاریخ کو بہت دریا کو پار کیا اور اسی جگہ محمد علی خزانچی جو کابل میں مقرر تھا خدمت میں حاضر ہوا اور اطلاع دی کہ میرزا محمد حکیم کی وفات کے بعد اس کے لڑکے فریدوں خاں، کیقباد اور افراسیاب جو کم عمری کے سبب سلطنت کی اہلیت نہیں رکھتے تھے، امراء کے ساتھ مان سنگھ کے پاس پہنچا دیے گئے تھے۔ مان سنگھ نے اپنے لڑکے کو خواجہ شمس الدین خوافی کے ہمراہ کابل میں چھوڑ دیا ہے اور میرزا کے تمام آدمیوں کو تسلی و اطمینان دے کر اپنے ساتھ بارگاہ میں لے آیا ہے۔

5 ذی الحجہ کو قصبہ پنڈی (۲۲) میں جو اٹک بنارس اور رہتاس کے درمیان ہے، قیام ہوا۔ یہاں مان سنگھ میرزا کے لڑکوں اور ملازمین کو اپنے ہمراہ لے کر حاضر ہو گیا۔ بادشاہ ان سب کے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آئے اور لائق حال امداد اور خرچ عطا کیا۔

اٹک بنارس کے علاقے سے شاہرخ میرزا راجہ بھگونت داس اور شاہ قلی خاں محرم کو پانچ ہزار سواروں کے ساتھ کشمیر فتح کرنے کے لیے رخصت کیا گیا۔ اسی دن اسماعیل قلی خاں اور رائے سنگھ درباری کو بلوچوں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے زین خانہ کوکہ کو ایک منظم فوج دے کر سواد اور بجوڑ کے پٹھانوں پر فوجی کارروائی کے لیے روانہ کیا گیا۔

روشنیہ قبیلہ پر فوجی کارروائی

یکم محرم 994ھ/1586ء کو اٹک بنارس میں چھاؤنی لگائی گئی۔ 25 سال پہلے ایک ہندوستانی سپاہی پٹھان قبیلوں میں چلا گیا تھا۔ اس نے وہاں پیر روشنائی کے نام سے بہت سے احمق پٹھانوں کو اپنا مرید بنا لیا تھا اور پٹھانوں میں الحاد و بے دینی پھیلاتا رہا تھا۔ ایک کتاب بھی "خیر البیان" کے نام سے لکھی تھی، جس میں مفسدانہ عقائد درج کر رکھے تھے، بعد میں انہی پٹھانوں میں اس کا انتقال ہو گیا تھا اس کا ایک لڑکا جلالہ نامی تھا جو چودہ سال کی عمر 989ھ/1571ء میں جب کہ بادشاہ سلامت کابل سے لوٹ رہے تھے، شاہی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور بادشاہ نے اس کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کیا تھا، لیکن اپنی موروثی بدقسمتی کے سبب وہ شاہی لشکر سے بھاگ گیا اور پھر پٹھانوں کے قبیلے میں شامل ہو کر ایک گروہ اکٹھا کر لیا اور لوٹ مار کرنے لگا۔ اس کے چھاپوں سے ہندوستان اور کابل کا راستہ بالکل بند ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں پٹھانوں کے اس روشنائی فرقے نے کافی زور باندھ رکھا تھا۔ اس کی بغاوت کو کچلنے کے لیے بادشاہ نے کابل مان سنگھ کی جاگیر میں دے دیا تا کہ وہ ان سرکشوں سے بخوبی نپٹ سکے۔

اس سال کے ماہ صفر میں سعید خاں کھوکر، بیربر، شیخ فیضی اور فتح اللہ شرقی اور دوسرے چند امراء کو زین خاں کی مدد کے لیے روانہ کیا گیا۔ چند دن بعد ہی حکیم ابوالفتح اور امراء کی ایک جماعت کو پہلی کمک کے پیچھے ہی رخصت کیا گیا۔ یہ فوجیں زین خاں سے جا کر مل گئیں اور ان سبھی نے مل کر پٹھانوں پر سخت حملے کیے۔ ان کے علاقے پامال کر کے مردوں، عورتوں اور بچوں کی ایک بڑی تعداد کو قیدی بنا لیا۔

بیربر کی ہلاکت

ایک رات کسی شخص نے بیربر کو آ کر اطلاع دی کہ "پٹھان آج رات حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، اگر تم اس تنگ گھاٹی کو جو تین چار کوس سے زیادہ نہیں ہے، جلد طے کر کے نکل جاؤ تو خطرے سے باہر ہو جاؤ گے"۔ اس وقت شام ہونے ہی والی تھی، بیربر نے اپنی خود سری اور خود پسندی کی وجہ سے زین خاں سے کوئی مشورہ نہ کیا اور بے وقت وہاں سے کوچ کر دیا۔ سارا لشکر اس کے پیچھے چل پڑا۔ جب شام کو وہ ایک گھاٹی میں داخل ہو رہے تھے، تو پٹھانوں نے آس پاس کی پہاڑیوں سے پتھروں اور تیروں کی بارش کر دی اس اندھیری گھاٹی میں راستے کی تنگی اور غاروں کی کثرت کی وجہ سے سارا لشکر پراگندہ ہو گیا کسی کو کسی کی خبر نہیں رہی اور پٹھانوں نے انھیں گھیر گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس حادثے میں 8 ہزار سے زیادہ آدمی مارے گئے۔ بیربر جو جان بچانے کے لیے بھاگا بھاگا پھر رہا تھا، قتل کر دیا گیا۔ اس ہولناک رات کو بہت سے بادشاہی امیر اور سردار جیسے حسن خان بنی، خواجہ عرب بخشی، خان جہاں اور ملا شیری جیسے شاعر مارے گئے۔ پٹھانوں نے جنھیں قید کر لیا ان کا شمار اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اس واقعہ کی تاریخ "از خواجہ عرب حیف" سے نکلتی ہے۔ اس میں ایک عدد کم پڑتا ہے۔

اس شکست کے بعد حکیم ابو الفتح اور زین خاں پہنچے۔ ان لوگوں نے بیربر جیسے مصاحب کو مخالفت کی بنا پر ہلاک کروا دیا تھا اور ان کی یہ منافقت ثابت ہو چکی تھی اس لیے کچھ دن تک یہ لوگ عتاب میں رہے اور کورنش سے محروم کر دیے گئے، بعد میں پھر ان کے منصب بحال ہو گئے بلکہ اس سے بڑے مدارج تک ترقی پائی۔

بیربر کا ماتم

اکبر کو کسی امیر کے مرنے کا اتنا رنج نہیں تھا، جتنا بیربر کی موت کا۔ نہایت حسرت سے کہتا تھا "افسوس اس کی لاش اس گھاٹی سے نہیں لائی جا سکی کہ اسے چتا تو نصیب ہو جاتی۔ پھر یہ کہہ کر خود تسلی دیتا کہ وہ تمام پابندیوں سے آزاد مجرد شخص تھا، اسے پاک کرنے کے لیے

نیر اعظم کی تمازت کافی، ویسے بھی اسے پاکی کی ضرورت نہ تھی"۔

روشنائی قبیلہ کی شکست

پٹھانوں کی اٹک کی طرف پیش قدمی کی خبر گرم تھی، اس لیے بادشاہ نے دوسرے دن شاہزادہ سلطان مراد اور راجہ ٹوڈرمل کو سندھ ندی پار کر کے باغی پٹھانوں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے مقرر کیا۔ بعد میں شاہزادے کو واپس بلا لیا۔ صرف راجہ کو یہ مہم سپرد کر دی گئی۔ اس نے اس پہاڑی علاقے میں کئی قلعے بنوائے۔

مان سنگھ روشنائی قبیلہ پر مقرر تھا۔ اس نے ان کے بہت سے آدمیوں کو ہلاک اور قید کر لیا۔ اس دوران عبد اللہ خان کا ایلچی میر قریش اس کا خط لے کر وہاں پہنچا۔ اس کے ساتھ ہی بلخ کا حاکم نظر اوزبک بھی عبد اللہ خان سے بگڑ کر اپنے تین بچوں کے ساتھ پہنچ گیا۔ بادشاہ نے ان لوگوں کو لانے کے لیے شیخ فرید بخشی کو احدیوں کے ایک دستے کے ساتھ روانہ کیا۔ انھوں نے پہنچ کر آنے والوں کا کوتل خیبر پار کرا دیا۔ روشنائی قبیلے کے آدمیوں نے ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی لیکن شکست کھا کر بھاگ گئے۔

اکبر کے دورِ حکومت کا اکتیسواں سال

25 ربیع الاول 994ھ/1586ء کو نوروز آ پہنچا اور تخت نشینی کا اکتیسواں سال[73] شروع ہو گیا۔ اس مرتبہ نوروز کا جشن اٹک کے بادشاہی دیوان خانے میں منایا گیا۔ میر قریش کو کورنش کی اجازت ملی۔ مان سنگھ بھی اس جشن میں شرکت کے لیے حاضر ہوا۔ شیخ فیضی نے مبارک بادی کا قصیدہ کہا جس کا مطلع ہے:

فرخندہ باد یا رب بر مملکت ستانی

از مبدۂ خلافت آغاز قرن ثانی

واضح رہے کہ یہاں تخت نشینی کے پہلے سال کے تعین میں غلط فہمی پیدا ہوتی ہے، اس کی طرف پہلے بھی ہم اشارہ کر آئے ہیں۔ میرزا کے صاحبزادے محمد شریف نے اپنے باپ

کی وفات کے بعد "تاریخ نظامی" کے سنوں کی تنقیح کی ہے۔ اختلاف سنین کو رفع کرنے کے لیے اسے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

حاکم کشمیر سے صلح

میرزا شاہرخ راجا بھگوان داس اور شاہ قلی خاں محرم کشمیر میں کوتل پھولباس تک پہنچ چکے تھے۔ جب انھیں زین خاں کی شکست کی خبر ملی تو انھوں نے کشمیر کے حاکم یوسف خاں سے اس شرط پر کہ کشمیر کے زعفران زار کی سالانہ پیداوار اور سکۂ خالصہ اکبر شاہی سے منسوب رہے گا صلح کر لی اور وہاں اپنے کارندے مقرر کر کے سارا علاقہ حسب سابق یوسف خاں کو عطا کر دیا۔ یوسف خاں دربار شاہی میں حاضری کا بہت زیادہ خواہشمند تھا اس لیے یہ سب امیر اسے ہمراہ لے کر بارگاہ شاہی میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے اس صلح کو پسند نہ فرمایا اس لیے ان امیروں کو بڑی ہی شرمندگی ہوئی اور وہ منہ چھپائے بیٹھے رہے آخر نو روز کے دن سب کو بلا کر کورنش کی اجازت ملی۔

انہی دنوں عبد اللہ خاں اوزبک کا ایلچی اور مذکورہ سردار نظر بی اپنے بچوں کے ساتھ حاضر ہوا۔ نظر بی کو 4 لاکھ تنکہ جو عراق کے 500 تومان کے برابر ہے، عطا کیا گیا۔

اکبر کی لاہور واپسی

24 ربیع الثانی 994ھ/1556ء کو بادشاہ نے اٹک سے لاہور واپسی کا ارادہ کیا۔ دریائے بہت کے کنارے پٹھانوں کے مقابلے پر مان سنگھ کے بجائے اسماعیل قلی خاں کو اور کابل پر مان سنگھ کو مقرر کیا گیا۔ اسماعیل قلی خاں کی مدد کے لیے سید حامد بخاری کو راستے کی حفاظت و انتظام کے لیے پشاور میں مقرر کیا گیا۔ 17 جمادی الثانی کو لاہور میں آنے کی خوشی میں اجلاس ہوا۔ اسی وقت عرب بہادر کا سر جو بہرائچ میں حکیم ابو الفتح سے جنگ میں مارا گیا تھا، ملاحظہ شاہی میں پیش کیا گیا۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ عرب بہادر طبعی موت مرا تھا۔ حکیم نے مردہ کا سر کٹوا کر بھجوا دیا تھا۔

شہزادہ سلیم کا عقد اور راجہ بھگوان داس کی خودکشی

19 رجب کو رائے سنگھ بھتہ کی لڑکی سے شہزادہ سلطان سلیم کا عقد کیا گیا تھا۔ شعبان کے اوائل میں محمد قاسم خاں میر بحر اور فتح خاں فیل بان فوجدار اور امراء کی ایک جماعت کشمیر کو فتح کرنے کے لیے مقرر کی گئی۔ اس سے پہلے یوسف خاں کشمیری کو جو راجہ بھگوان داس کے قول و قرار پر چلا آیا تھا۔ اکبر نے قید کر کے قتل کرا دینے کا ارادہ کر لیا۔ بادشاہ کے یہ تیور دیکھ کر راجہ بھگوان داس نے اپنے قول و قرار کی حمیت و غیرت میں آ اپنے آپ کو جمدھر مار لیا۔

یعقوب کشمیری کی بغاوت

یوسف خاں کا لڑکا یعقوب شاہی دربار کے مصاحبوں میں شامل تھا اور مظفر گجراتی کی طرح اس کا بھی 39، 40 روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر تھا۔ وہ کسی طرح بھاگ کر کشمیر واپس چلا گیا۔ چونکہ متعصب شیعہ تھا اس لیے وہاں کے سنی قاضی کو اپنے ہاتھ سے شہید کر دیا اور اپنے باپ کے امیروں اور افسروں کو ہموار کر کے کشمیر کی حکمرانی ہاتھ میں لے لی، کیوں کہ وہ یہ سمجھے ہوئے تھا کہ اس کا باپ قتل کرا دیا گیا ہے۔ جب بادشاہی فوج کوتل کنٹرل میں پہنچی تو یعقوب اس کے مقابلے پر ایک بھاری لشکر لے کر آیا اور پہاڑ کی گھاٹیوں کو اچھی طرح مستحکم کر کے لڑائی کے لیے کمر بستہ ہو گیا۔

یعقوب ایک اوباش طبیعت آدمی تھا اور اپنے آدمیوں سے بدسلوکی کرتا رہتا تھا اس لیے اس کے ملازموں کی ایک جماعت ساتھ چھوڑ کر محمد قاسم خاں سے آ کر مل گئی اور کچھ لوگوں نے کشمیر کے حاکم نشین شہر سری نگر میں اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ یعقوب نے پہلے گھر کے فتنے کا سد باب ضروری سمجھا اور وہاں سے لوٹ کر شہر کی طرف کوچ کر دیا۔ اس کے پیچھے شاہی فوجیں بغیر کسی رکاوٹ کے کشمیر میں داخل ہو گئیں اور سارا کشمیر شاہی قبضے میں آ گیا۔ یعقوب مقابلے کی تاب نہ لا کر فرار ہو گیا اور پہاڑی علاقے میں جا کر پناہ لے لی۔

یوسف اور یعقوب کا انجام

یعقوب نے دوبارہ لاؤ لشکر جمع کر کے قاسم خاں سے جنگ کی، لیکن اس مرتبہ بھی اسے شکست ہوئی۔ ایک مرتبہ اس نے شب خون بھی مارا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا، اس جنگ میں میرزادہ طے خاں مارا گیا۔ بادشاہی فوجوں نے یعقوب کو تنگ گھاٹیوں میں چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ گرفتاری کے ڈر سے اس نے ہتھیار ڈال دیے اور نہایت عاجزی کے ساتھ قاسم خاں کے پاس حاضر ہوا اور اس کے ہمراہ خدمت شاہی میں حاضر ہوا۔ بعد میں بادشاہ نے اسے بہار میں مان سنگھ کے پاس جہاں اس کا باپ یوسف بھی قید میں تھا، بھیج دیا۔ دونوں باپ بیٹے عرصے تک قید میں رہے پھر مالیخولیا کے عارضے میں دونوں کا انتقال ہوگیا۔

19 رمضان کو بادشاہ نے میر قریش ایلچی کو حکیم ابو الفتح کے بھائی حکیم ہمام اور میر صدر جہاں مفتی ساکن بھائی کے ہمراہ قنوج سے عبد اللہ خاں کے باپ سکندر خاں کی عزاداری کے لیے ماوراء النہر کی طرف روانہ کیا۔ محمد علی خزانچی کے ہاتھ اس کے لیے ڈیڑھ لاکھ روپے ہندستان کے لیے تحائف وغیرہ بھی بھیجے۔

روشنائی قبیلے کی فوجی کاروائی

انھی دنوں روشنائی قبیلے کے پٹھانوں نے 20 ہزار پیدل فوج اور پانچ ہزار سواروں کی جمعیت لے کر سید حامد بخاری جو گجرات کے سلاطین کے عہد کا ایک بہت بڑا امیر تھا، حملہ کر دیا۔ اس نے اپنی تھوڑی بہت جمعیت کے ساتھ پشاور میں ان سے مقابلہ کیا اور مارا گیا۔ اس حادثے پر روشنائی قبیلہ کی بغاوت کو کچلنے کے لیے دربار سے زین خان کوکہ، شاہ قلی خاں محرم اور شیخ فرید بخشی کو روانہ کیا گیا۔ مان سنگھ بھی کابل سے ایک بڑا لشکر لے کر آیا اور خیبر درہ پر پٹھانوں سے سخت جنگ کر کے اس نے روشنائی قبیلے کو شکست دی اور وہیں ٹھہرا رہا۔ پٹھانوں نے دوسرے دن واپس آ کر پھر حملہ کیا اور چو طرفہ لڑائی لڑنے لگے، اس وقت مان سنگھ کا بھائی مادھو سنگھ جو اوھند کے تھانے پر اسماعیل قلی خاں کے ساتھ متعین

تھا، مدد کے لیے آ پہنچا۔ اس تازہ کمک کے آجانے کی وجہ سے پٹھان میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے اور ان کے تقریباً 2 ہزار آدمی مارے گئے۔

انہی دنوں بدخشاں میں میرزا سلیمان اوزبکوں سے برابر لڑتا رہا، کبھی ان کو شکست دی اور کبھی ان سے شکست کھائی، آخر عاجز ہو کر وہ کابل اور وہاں سے خیبر میں آ کر مان سنگھ سے ملا اور وہاں سے ہندستان کے لیے روانہ ہو گیا۔ مرزا سلیمان ماہ ربیع الاول 995ھ/1587ء کو لاہور میں شاہی بارگاہ میں حاضر ہوا۔

محمد زماں میرزا کا کارنامہ

شاہرخ میرزا کا لڑکا محمد زمان میرزا 12 سال کا تھا۔ جب اوزبکوں کے مقابلے میں اس کے باپ کو شکست ہوئی تو وہ گرفتار ہو گیا تھا۔ عبد اللہ خاں نے اسے پیرو مرشد خواجہ کلاں بیگ نقشبندی جو خواجہ احرار کے پوتے تھے، کے سپرد کر دیا تھا کہ اسے بھی دوسرے قیدیوں کے ساتھ قتل کرا دیں۔ خواجہ صاحب نے اس لڑکے کے عوض ایک دوسرے واجب القتل قیدی کو قتل کرا کے اسے رہا کر دیا اور وہاں سے رخصت کر دیا۔ جس زمانے میں سلیمان میرزا دربار میں پہنچا تو وہ ماوراء النہر کے فقیروں کی ایک ٹولی کے ساتھ بھیس بدلے ہوئے شاہی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے اسے ایک ہزار اشرفی انعام عطا کیا۔ پھر وہ ہندستان سے حج کے لیے چلا گیا۔ وہاں سے دوبارہ اس نے بدخشاں کا رخ کیا اور ایک اچھی خاصی فوج فراہم کر کے اوزبکوں سے مردانہ وار کئی ایک لڑائیاں لڑیں اور انھیں شکست دے کر وہاں کے سارے پہاڑی علاقے پر قبضہ کر لیا اور دشمنوں کو اپنے موروثی ملک سے نکال دیا۔ اس وقت بادشاہ نے لاہور سے 2 ہزار اشرفی اور بہت سی بندوقیں، تیر اور کمان سوغات میں میر طوفان اجدی کے ذریعہ اس کے پاس بھجوائے تھے۔ چند سال تک وہ اوزبکوں سے برابر مقابلے کرتا رہا، آخر شکست کھا کر کابل چلا آیا۔ اس کا کیا انجام ہوا؟ یہ ہم ان شاء اللہ آگے بیان کریں گے۔

اکبر تخت نشینی کا بتیسواں سال

11 ربیع الثانی 995ھ/1586ء کو نو روز ہوا اور جلوس شاہی کا بتیسواں اور بقول میرزا نظام الدین تینتیسواں سال شروع ہو گیا۔

نو روز کی تقریبات حسب سابق منائی گئیں اور از سر نو ضابطہ بندی عمل میں آئی۔ ایک قانون یہ نافذ کیا گیا کہ لوگ ایک سے زیادہ نکاح نہ کریں بجز اس کے کہ عورت بانجھ نکلے، کیوں کہ خدا بھی ایک ہے اس لیے بیوی بھی ایک ہی ہونی چاہیے۔ جب عورت کی عمر کافی ہو جائے اور اس کو حیض آنا بند ہو جائے تو وہ شادی نہ کرے، اگر بیوہ عورتیں شادی کرنا چاہیں تو انھیں کوئی نہ روکے۔ کم عمر ہندو لڑکی کو جس نے نکاح کے باوجود شوہر کا لطف نہ لیا ہو حق نہ کیا جائے، بلکہ کسی ایسے ہندو سے جس کی عورت مر چکی ہو اس کا نکاح کر دیا جائے۔

جب بادشاہی مرید ایک دوسرے سے ملیں تو سلام کے بجائے ایک "اللہ اکبر" کہے اور دوسرا "جل جلالہ" کہہ کر جواب دے۔ ہندی مہینوں کا حساب 28 تاریخ سے لگایا جائے نہ کہ 13 تاریخ سے جسے راجا بکرماجیت نے رواج دیا تھا۔ ہندوؤں کے مشہور تہوار اسی حساب سے منائے جائیں، لیکن یہ تاریخ رائج نہ ہو سکی، اگر چہ اس سلسلے میں فتح پور سے اور 990ھ/1582ء میں گجرات اور بنگالہ سے فرامین صادر کیے جاتے رہے تھے۔

کم حیثیت لوگوں کو شہروں میں تحصیل علم سے روکنے کا حکم بھی نافذ ہوا، کیوں کہ بادشاہ کے خیال میں یہی لوگ پڑھ لکھ کر فتنہ و فساد بپا کیا کرتے ہیں۔

ایک نیا ضابطہ بنا کہ ہندوؤں کے معاملات کا فیصلہ مسلمانوں کا قاضی نہیں کرے گا بلکہ وہ اس غرض کے لیے کسی دانا برہمن کے پاس رجوع کریں گے۔ اگر حلف اٹھانے کی ضرورت پیش آئے تو گرم گرم لوہا انکار کرنے والے کے ہاتھ پر رکھا جائے اگر ہاتھ جل جائے تو وہ جھوٹا ہوگا ورنہ سچا، یا یہ کہ وہ جلتے ہوئے تیل میں اپنا ہاتھ ڈال دے یا یہ کہ جتنی دیر میں ایک تیر پھینکا جائے اور اسے اٹھا کر واپس لایا جائے وہ شخص پانی میں غوطہ لگائے اور اس عرصہ میں سر باہر نہ نکالے اگر وہ اس سے پہلے ہی سر نکال لے تو مدعا علیہ کو مدعی کا

حق دے دیا جائے، ایک اور حکم دیا گیا کہ مردہ کو دفناتے وقت اس کا سر شرق کی طرف اور پیر مغرب کی طرف رکھے جائیں، سونے کے لیے بھی یہی طریقہ اختیار کیا جائے۔

اسی سال بادشاہ نے جلال روشنائی کی بغاوت کو کچلنے کے لیے عبد المطلب خاں کو ایک فوج دے کر بنگش کی طرف بھیجا۔ اس نے جلال کو دوسرے پٹھان سرداروں سمیت شکست دی اور بہت سے آدمیوں کو قتل کرادیا۔ زین خاں کے لشکر کے جتنے آدمی پٹھانوں کی قید میں تھے ان کے عوض دو گنے، چوگنے مرد اور عورتوں کو گرفتار کرلیا گیا۔

سلطان خسرو کی پیدائش

995ھ/1587ء میں شہزادہ سلطان سلیم کے یہاں راجہ بھگوان داس کی لڑکی سے سلطان خسرو کی پیدائش ہوئی۔ بادشاہ نے اس خوشی میں بڑا جشن منعقد کیا۔

بیربر کے زندہ ہونے کی افواہ

اسی سال ہندوؤں نے بیربر کے زندہ ہونے کی خبر اڑادی۔ ان لوگوں نے جب بادشاہ کو بیربر کی جدائی میں بہت زیادہ رنجیدہ اور مضطرب دیکھا تو یہ شہرت کی کہ لوگ اس کو شمالی پہاڑی میں جوگیوں اور سنیاسیوں کے ساتھ دیکھ کر آئے ہیں۔ بادشاہ سلامت نے بھی یقین کرلیا کہ وہ چونکہ دنیا سے بیزار اور مجرد تھا۔ کوئی تعجب نہیں کہ اس نے سنیاس لے لیا ہو اور یوسف زئی پٹھانوں کے واقعہ کی شرمندگی کی وجہ سے یہاں آنا نہ چاہتا ہو۔ لوگ لاہور میں اس کے متعلق عجیب عجیب کہانیاں بیان کرتے تھے۔ بعد میں بادشاہ نے ایک احدی کو تحقیق حال کے لیے نگرکوٹ بھیجا۔ آخر معلوم ہوا کہ یہ سب خبریں بے بنیاد ہیں۔

کچھ عرصے بعد اس کی جاگیر کالنجر کے حکام نے دربار میں عریضہ بھجوایا کہ وہ کالنجر پہنچا ہوا ہے، یہاں کے ایک حجام نے تیل ملتے وقت جسم کی علامتیں دیکھ کر پہچان لیا اور وہ اسی حجام کے پاس چھپا ہوا ہے۔ بادشاہ نے اس کو بلوانے کے لیے فرمان صادر کیا۔ وہاں کے کروڑی نے دراصل ایک مسافر کو بیربر کا دھوکہ دینے کے لیے پکڑ رکھا تھا، راز کھل

جانے کے اندیشے سے اس نے اس غریب کو مروا ڈالا اور یہ لکھ بھیجا کہ بیرم آیا ہوا تھا لیکن وہ فوت ہو گیا۔ اس نے اس حجام کو بھی دربار میں نہیں بھجوایا۔ اس خبر پر بادشاہ نے دوبارہ بیرم کا ماتم کیا وہاں کے کروڑی اور دوسروں کو پکڑ کر بلوایا اور ان کو کچھ عرصے کے لیے قید میں ڈال دیا کہ آخر تم لوگوں نے پہلے ہی ہم کو اس کی آمد سے آگاہ کیوں نہ کیا؟ اس جرمانے میں کروڑی سے بادشاہ نے کافی روپیہ بھی وصول کر لیا۔

اسی سال صادق خاں نے ٹھٹھہ پر فوج کشی کر کے قلعہ سیوان کا محاصرہ کر لیا۔ وہاں کے حاکم میرزا جانی بیگ نے جو محمد باقی ترخان کا پوتا تھا اپنے بزرگوں کے دستور کے مطابق دربار شاہی میں ایلچیوں کے ساتھ بہت سے نفیس تحائف اور نذرانے بھجوائے۔ بادشاہ نے 25 ذی قعدہ 995ھ/1587ء کو ان ایلچیوں کے ہمراہ حکیم عین الملک کو میرزا جان کے پاس روانہ کیا اور وہ علاقہ اس کے لیے بحال کر کے صادق کے نام فرمان صادر کیا کہ وہ اس سے کوئی تعرض نہ کرے۔

اوائل ربیع الثانی میں زین خان کوکہ کو کابل کی حکومت پر مقرر کر کے مان سنگھ کو وہاں سے طلب کر لیا گیا۔ اسی مہینے کے آخر میں خان خاناں، مرزا خاں، عضد اللہ، علامت الملک اور شاہ فتح اللہ شیرازی کو ہمراہ لے کر حملہ کرتے ہوئے گجرات سے لاہور آیا اور 27 رجب کو ٹھٹھہ سے صادق خاں حاضر ہوا۔

گجرات کے حالات کا اعادہ

گجرات میں مظفر اور خان خاناں کے درمیان جو حالات پیش آئے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ مظفر دوسری شکست کے بعد ناڈوت سے چانپانیر کے راستے سورت کی طرف بھاگ گیا تھا اور قلعہ بھڑوچ سے 15 کوس پر کونڈل کے مقام پر رکا رہا۔ 3 ہزار سواروں کی فوج اس نے جمع کر لی اور امین خاں غوری جو سورت کا حاکم تھا، ایک لاکھ محمودی سکہ اور مرصع خنجر رشوت دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ اسی قدر رقم اس نے جام کو بھی دی جو عرصے سے احمد آباد کی فتح کے خواب دیکھ رہا تھا۔ امین خاں تجربہ کار آدمی تھا اس نے اسے یہ جھانسا دیا کہ تم ستر

سال جام کے پاس چلو اور اسے لے کر آگے بڑھو، میں بھی بس تمہارے پیچھے آتا ہوں۔ جام نے بھی اس کے ساتھ چال چلی اور لشکر کی تیاری کا بہانہ کر کے پیچھے رہ گیا۔ مظفر احمد آباد سے 60 کوس پر ایک موضع میں امین خاں غوری اور جام کا انتظار کرنے لگا۔ خان خاناں کو جب خبر ملی تو اس نے نہایت تیز رفتاری سے کوچ کیا اور اپنی فوجیں لے کر اس کے سر پر آپہنچا۔ مظفر جب امین خان اور جام کی مدد سے مایوس ہو گیا تو ناچار حیران و سراسیمہ پہاڑی کی طرف بھاگ گیا اور سورت کے ایک شہر دوار کا میں جا کر پناہ لی۔ جام نے اپنے وکیل کو اور امین خاں نے اپنے لڑکے کو شاہ ابو تراب کے وسیلے سے خان خاناں کے پاس بھیجا اور جام کے آدمی خان خاناں کو کوہستان میں لے کر گئے۔ وہاں اسے کافی مال غنیمت ہاتھ آیا۔

مظفر ایک ہزار مغل اور کاٹھیاواڑی سواروں کے ساتھ جو اس کے ننھیال کے رشتے دار ہوتے ہیں گجرات جا کر آنتیہ نامی ایک مقام پر پناہ گزیں ہو گیا۔ یہ جگہ دریائے سابرمتی کے کنارے ہے اور کٹے پھٹے کراروں پر واقع ہے۔ یہ سرکش کولیوں کی جائے پناہ ہے۔ خان خاناں نے دور اندیشی سے کام لے کر پہلے ہی اس خطرناک مقام پر اپنے امراء کو مقرر کر رکھا تھا جب مظفر وہاں آیا تو ان امیروں نے سید قاسم بارہہ کی سرداری میں اس پر حملہ کر دیا، ایک سخت جنگ کے بعد مظفر کو شکست ہوئی اور اس کے ہاتھی اور چتر آفتابی، آفتاب پرستوں کے ہاتھ آگئے۔ اس کے رشتے دار مارے گئے اور وہ سورت کے علاقے کاٹھیاواڑ کو بھاگ گیا۔

خان خاناں جب بڑودہ واپس ہوا تو اس نے جام پر فوج سے حملہ کر دیا۔ جام نے بھی 8 ہزار سوار جمع کر لیے تھے۔ کہتے ہیں جام کے 2 ہزار آدمیوں نے کھانا نہ کھانے کی قسم کھائی تھی اور جان دینے کا حلف اٹھایا تھا۔ جب جام اپنی جمعیت کو لے کر مقابلے پر آیا اور دونوں فوجوں میں 8 کوس کا فاصلہ رہ گیا تو جام نے گھبرا کر اطاعت قبول کر لی اور اپنے لڑکے کو 3 ہاتھی، 18 بچھی گھوڑے جو عربی گھوڑے کے مشابہ ہوتے ہیں اور دوسرے تحائف دے کر خان خاناں کی خدمت میں بھیجا۔ اس موقعے پر خان خاناں حسب الحکم پہلی

مرتبہ گجرات سے فتح پور پہنچا تھا۔

اس کی غیر موجودگی میں مظفر نے کاٹھیوں اور دوسرے زمینداروں کی مدد لے کر قلعہ جوناگڑھ کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت قلیج خاں کے حسب ہدایت نظام الدین احمد اور سید قاسم بارہہ نے احمد آباد سے سورت کی طرف کوچ کیا، مظفر ان سے مقابلے کی تاب نہ لاکر گجرات بھاگ گیا۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

دکن پر حملہ اور پسپائی

جب خان خاناں سروہی اور جالور کے راستے احمد آباد پہنچ گیا تو بادشاہ نے دکن پر حملے کے لیے عضد الدولہ کو میر مرتضیٰ اور خداوند خاں حاکم برار، اعظم خاں اور شہاب الدین احمد خاں اور مالوہ کے تمام امراء کے ساتھ مامور کیا اور اس علاقے کے تمام جاگیرداروں کے نام فرمان صادر ہوا کہ اعظم خاں کی سرداری میں پہلے تو برار کا علاقہ دکن والوں کے ہاتھ سے چھین لیا جائے بعد میں سب مل کر احمد نگر پر حملہ کر دیں، چنانچہ یہ فوجیں حسب الحکم روانہ ہوئیں اور دکن کی سرحد پر بمقام ہندیہ کیمپ لگا دیا، لیکن یہاں ان امیروں میں پھوٹ پڑ گئی۔ اعظم خاں کو شہاب الدین خان سے پرانی دشمنی تھی کیوں کہ اس کا باپ شہاب الدین احمد خاں کی فتنہ پردازی کی وجہ سے مارا گیا تھا اس لیے وہ اس کو اور عضد الدولہ کو مجلسوں میں تنگ کیا کرتا تھا اور حق استادی کے باوجود اس کا مذاق اڑاتا تھا۔ اس کے اس طرز عمل سے شہاب الدین خاں رنجیدہ ہو کر اپنی جاگیر رائے سین کو لوٹ گیا۔ اعظم خاں نے اس پر حملہ کر دیا۔ خواجہ فتح اللہ بخشی اور دوسرے فوو لشتے سردار اس فتنے کو خوب ہوا دے رہے تھے لیکن عضد الدولہ نے دوڑ دھوپ کر کے اس قضیے کو رفع دفع کرا دیا۔

شاہی لشکر کے اسی باہمی نفاق کی وجہ اسیر اور برہان پور کے حاکم راجہ علی خاں کو اچھا موقع مل گیا اور وہ دکنی لشکر کو اپنے ساتھ لے کر مقابلے پر آ گیا۔ شاہی لشکر مقابلے کے لیے تیار نہیں تھا، اس لیے عضد الدولہ راجہ علی خاں کے پاس گیا اور بڑی کوشش کی کہ وہ مقابلے کا ارادہ ترک کر دے لیکن راجہ علی خاں واپس جانے پر کسی طرح راضی نہ ہوا۔ یہ

صورت حال دیکھ کر عضد الدولہ وہاں سے نکل کر گجرات آ گیا اور خان خاناں کو دکن پر حملہ کرنے کی ترغیب دینے لگا۔

راجہ علی خاں کے مقابلے میں اعظم خاں تنہا رہ گیا تھا۔ اس لیے وہ مقابلے کی تاب نہ لاکر برار کی طرف بھاگ گیا۔ وہاں بھی اس کے قدم تک نہ سکے۔ وہاں سے وہ ایلچ پور چلا گیا اور اس کو بُری طرح لوٹا۔ دکنی فوجیں اس کے تعاقب میں لگی ہوئی تھیں اس لیے وہ ایلچ پور سے بندر بار چلا گیا اور وہاں سے لشکر کے چند آدمیوں کے ساتھ اپنے بہنوئی خان خانان سے مدد لینے کے لیے احمد آباد پہنچا۔

خان خانان نے اس کا استقبال کیا۔ ان کی ملاقات محمود آباد میں نظام الدین احمد کے گھر پر ہوئی۔ اعظم خاں اپنی بہن سے ملنے کے لیے خان خاناں کے ساتھ احمد آباد چلا گیا۔ نظام الدین احمد کو اس علاقے میں متعینہ امیروں کے ساتھ بڑودہ کی طرف بھیجا گیا اور ان کے پیچھے یہ دونوں سردار بھی احمد آباد سے روانہ ہوگئے۔ اعظم خان تیز رفتاری سے کوچ کرتا ہوا بندر بار اپنے لشکر میں پہنچ گیا اور خان خاناں بھڑوچ جا پہنچا۔ اس کے بعد اعظم خاں نے اس کو لکھا کہ بارش کا موسم آچکا ہے۔ اس لیے دکن کی مہم کو اس سال ملتوی کر دینا چاہیے۔ چنانچہ خان خاناں بھڑوچ سے احمد آباد کو لوٹ گیا اور اعظم خاں ندر بار مالوہ چلا گیا اور راجہ علی خاں دکنی فوجوں کو لے کر اپنے وطن واپس ہوگیا۔

اس واقعہ کے 5 ماہ بعد اٹک بنارس میں جسے اٹک کٹک بھی کہتے ہیں خان خاناں کی عرضی پہنچی کہ حضور والا بدخشاں پر فوجی کارروائی کا مصمم ارادہ کیے ہوئے ہیں، میری خواہش ہے کہ میں بھی اس سفر میں ہمرکاب رہوں۔ جب اٹک سے لاہور لشکر پہنچ گیا تو اس کے نام فرمان گیا کہ قلیچ خاں اور نظام الدین احمد تو گجرات میں رہیں اور خان خاناں بارگاہ میں حاضر ہو جائے۔ خانخاناں کے دوبارہ لاہور حاضر ہونے اور عضد الدولہ کو ساتھ لانے کا یہی سبب تھا۔

خان خاناں کی غیر حاضری میں گجرات میں نظام الدین احمد نے بڑے شاندار کارنامے انجام دیے جس کا ذکر انھوں نے تفصیل سے تاریخ نظامی میں بھی کیا ہے۔

میر ابو الغیث بخاری کی وفات

اسی سال میر ابو الغیث بخاری جن کی تعریف حد سے زیادہ ہے، لکھنؤ میں قولنج کے مرض میں انتقال فرما گئے۔ ان کی میت دہلی لاکر خاندانی مقبرے میں دفن کی گئی۔ ان کی تاریخ وفات ''میر ستردہ میر'' سے نکلتی ہے۔ میں[۷۹] نے ان کی شان میں حسب ذیل مرثیہ کہا تھا:

بگورستان او روزی عبوری کردم از عبرت   جہانی دیدم از آسودگان یکسر بہ میدانش
ازین سو رفتہ انبوہی وز آنسو نامدہ یک کس   کہ از وی حال پرسم یا نشان باشد از ایشانش
دران شہر خموشان از زبان دانان سن جمی   زشارستان گیتی رفتہ و گردیدہ مہمانش
ازان جملہ امیری پاک طینت بوترابی آئین   ابو الغیث آنکہ گردون غوث خواند قطب گیہانش
زہی شائستہ سیرت سیدی فرخندہ طلعت ہم   کہ خلق مصطفیٰ بودی عیان در روئی خندانش
بخارائی کہ دہلی قبۃ الاسلام بود از وی   چہ شد آن قبہ و آن اسلام و یا رب کو مسلمانش
چو درویش سپاہی بود خاک پالش ار یابم   کشم در چشم بخت خویش چون کحل صفاہانش
بیالیش ز قندیل دل خود سوختم شمعی   اگرچہ مشعل ربانی آمد نور ایمانش

بساط مرقد او ساختم نمناک از اشکی
اگرچہ ابر رحمت مشت از باران غفرانش

عربی علوم پر پابندی

اسی سال حکم نافذ ہوا کہ لوگ علوم عربیہ کو پڑھنا ترک کردیں اور نجوم، حساب، طب اور فلسفے کے علاوہ کچھ اور پڑھانہ جائے۔ اس حکم کی تاریخ خود ''کساد فضل'' سے نکلتی ہے۔

اسی سال ماہ شعبان میں مان سنگھ دربار میں حاضر ہوا۔ خبر پہنچی کہ عبد اللہ خاں نے ہرات کو فتح کرلیا ہے اور وہاں کے حاکم علی قلی خاں کو بے شمار ترکموں اور ہرات کے باشندگان کے ساتھ قتل کردیا ہے اس کی تاریخ ''شکست ہری'' سے نکالی گئی۔

مان سنگھ کا بیباکانہ جواب

محرم 996ھ/1588ء میں مان سنگھ کو بہار، حاجی پور اور پٹنہ[75] علاقہ پر مقرر کیا گیا۔ عاشورہ کی رات مان سنگھ اور خان خاناں کو خلوت میں بادشاہ نے بلا کر دوستانہ انداز میں گفتگو کی اور اپنے دین کی ترغیب دینے کے لیے ان سے بطور آزمائش کچھ باتیں کیں۔ مان سنگھ نے بے جھجک جواب دیا اگر حضور کی مریدی سے مراد جاں نثاری ہے تو ہم تو اپنی جانیں ہتھیلی پر لیے ہوئے خدمت میں حاضر ہیں، کسی اور طرح ہم کو آزمانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اگر اس کے علاوہ کچھ اور منشاء ہے اور اس کا تعلق دین اور مذہب سے ہے تو میں اعتقاداً ہندو ہوں، اگر حکم ہو تو مسلمان بن جاؤں۔ ان دو کے علاوہ میں کوئی اور تیسرا راستہ نہیں جانتا کہ وہ کون سا ہے؟ اس کے جواب پر اکبر نے اس معاملے کو اسی جگہ ختم کر دیا اور مان سنگھ بنگالہ کی جانب رخصت ہو گیا۔

تقرر اور تبادلے

انہی دنوں بادشاہ نے کشمیر کی حکومت پر میرزا یوسف خاں رضوی مشہدی کا تقرر کیا اور محمد قاسم خاں کو وہاں سے واپس بلا لیا۔

12 صفر 996ھ/1588ء کو محمد صادق خاں کو یوسف زئی قبیلے کی بغاوت کو کچلنے کے لیے بجور کی طرف رخصت کیا اور سیالکوٹ وغیرہ جو مان سنگھ کی جاگیر میں تھا اسے عطا کر دیا۔ اسماعیل قلی خاں کو بجور سے بلا کر گجرات میں قلیج خاں کی جگہ متعین کیا اور قلیج خاں کو دربار میں بلا لیا گیا۔

ملا احمد کا قتل اور قصاص

اسی مہینے میرزا فولاد بیگ برلاس نے آدھی رات کے وقت ملا احمد رافضی کو جو اعلانیہ صحابہ پر تبرا کرتا تھا کسی بہانے گھر سے باہر بلوایا اور اسے قتل کر دیا۔ اس کے قتل کی تاریخ "زہی خنجر فولاد" سے نکلتی ہے۔ ایک دوسری تاریخ "خوک سقری" ہے۔ میں[76] نے خود اس کتے

کو نزع کے وقت دیکھا تھا۔ خدا پناہ میں رکھے اس کی شکل بالکل سور جیسی ہو گئی تھی۔ یہ صرف میں نے نہیں بلکہ دوسروں نے بھی اسی طرح دیکھا تھا۔ اس کے قصاص میں مرزا فولاد کو ہاتھی کے پیچھے سے بندھوا کر لاہور میں گھسیٹا گیا اور وہ شہید ہو گیا۔ اکبر نے حکیم ابو الفتح کو بھیج کر اس سے پوچھا تھا کہ "تو نے مذہبی تعصب کی وجہ سے ملا احمد کو قتل کیا ہے"؟ اس نے جواب دیا "اگر تعصب ہوتا تو اس کے بجائے میں اس سے کسی اور بڑے کو قتل کرتا"۔ حکیم نے یہی جملہ جا کر بادشاہ کو سنایا۔ اکبر نے کہا "یہ تو بڑا حرام زادہ ہے اس کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہیے"۔ اس لیے اس کو موت کی سزا دی گئی، ویسے بادشاہ اس کی بہادری اور اہل حرم کی سفارش کی وجہ سے اس کو معاف ہی کر دینا چاہتے تھے۔ قاتل کو موت کی سزا مل گئی، لیکن مقتول کاری زخم کھا کر ابھی زندہ تھا، اپنے قاتل کی موت کے تین چار دن بعد وہ فوت ہوا۔ شیعوں نے اپنے مسلک کے دستور کی بنا پر اس کی مقعد میں ایک میخ ٹھونک کر دریا میں اسے غوطہ دیا۔ دفن کرنے کے بعد ابو الفضل اور فیضی نے اس کی قبر پر محافظوں کا پہرہ لگا دیا، اس کے باوجود لاہور والوں نے اس وقت جب کہ بادشاہ کشمیر کی سیر کے لیے گئے ہوئے تھے اس کی قبر کھدوائی اور اس کی ناپاک لاش کو جلا دیا۔

حکومت کا چونتیسواں سال جلوس

22 ربیع الاول الثانی 996ھ/1556ء کو نوروز منایا گیا اور جلوس کے 33 ویں یا 34 ویں سال کا آغاز ہوا۔ دربار عام میں جس کے 114 ایوان ہیں، بڑے نفیس کپڑے اور مصور پردے لگائے گئے، بڑی آرائش و زیبائش عمل میں آئی۔ اس سال بھی بہت سے خلاف شرع احکام نافذ کیے گئے۔ اس سال کی تاریخ "شیوع معصیت" سے نکلتی ہے۔

ٹوڈرمل پر قاتلانہ حملہ

انہی دنوں قلیج خاں گجرات سے آکر حاضر ہوا اور بہت سے نذرانے پیش کیے۔ بادشاہ نے اسے حکم دیا کہ وہ ٹوڈرمل کے ساتھ شاہی دفتر میں ملکی اور مالی معاملات سرانجام دے۔ ان

دنوں ٹوڈرمل نہایت خوفزدہ اور بدحواس ہو گیا تھا کیونکہ ایک رات اس کے کسی دشمن نے جو گھات میں لگا ہوا تھا اس پر تلوار سے حملہ کیا تھا۔ اس حملہ سے راجہ زخمی ہو گیا تھا، لیکن زندگی تھی اس لیے بچ گیا۔

کمایوں کے راجہ کی دربار شاہی میں آمد

اسی سال کمایوں کا راجہ بادشاہ اکبر سے ملنے کے لیے سوالک کی پہاڑی سے آیا۔ اس سے پہلے وہ یا اس کے آباؤ اجداد میں سے کوئی کسی بادشاہ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے تھے۔ اس نے لاہور میں حاضری کا شرف حاصل کیا اور قسم قسم کے تحائف اور نذرانے پیش کیے۔ ان میں کچھ تو گائے کی عجیب عجیب دمیں تھیں اور ایک مشکی ہرن بھی تھا لیکن وہ گرمی کی وجہ سے راستہ ہی میں مر گیا تھا۔ میں[78] نے بھی اس مردہ ہرن کو دیکھا، بالکل لومڑی جیسا تھا۔ اس کے دو چھوٹے دانت باہر نکلے ہوئے تھے اور سینگوں کی جگہ کچھ ابھار سا تھا۔ اس کا نچلا دھڑ لپٹا ہوا تھا، اس لیے اس کا پورا جسم دکھائی نہیں دیا۔ وہ لوگ کہتے تھے کہ ان کے وطن میں پردار آدمی بھی ہوتے ہیں جو اڑتے ہیں اور آم کا ایک ایسا درخت بھی وہاں ہوتا ہے، جو سال بھر پھل دیتا ہے۔

انہی دنوں حکیم عین الملک بھی میرزا جان کے سفیروں کے ساتھ حاضر ہوا۔ طرح طرح کے نذرانے پیش کیے اور بادشاہ کی ہمدردی سے فیض یاب ہوا۔

رامائن کا ترجمہ

ماہ جمادی الاول 999ھ/1591ء میں میں[79] نے رامائن کا ترجمہ مکمل کر کے پیش کیا یہ ترجمہ میں نے 4 سال میں ختم کیا تھا اور اس کے 2 نسخے مرتب کر دیے تھے۔ ترجمہ کے آخر میں میں نے یہ شعر لکھا تھا:

ما قصہ نوشتیم بہ سلطان کہ رساند
جان سوختہ کردیم بہ جاناں کہ رساند

بادشاہ کو یہ شعر بہت پسند آیا اور پوچھا "یہ کتنے جز میں مکمل ہوا؟" میں نے عرض کیا پہلی بار اختصار کے ساتھ تقریباً 70 جز میں اور دوسری مرتبہ تفصیل کے ساتھ 120 جز میں۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ جس طرح مصنفوں کا دستور ہے اس کا دیباچہ لکھ دو"۔ دیباچے کی اتنی ضرورت نہ تھی پھر نعت کے بغیر اس کا خطبہ لکھنا پڑتا، اس لیے میں نے دیباچے کے معاملے کو ٹال دیا۔ اپنے اس سیاہ نامہ سے جو میرے نامۂ اعمال کی طرح داغدار ہے، خدا کی پناہ چاہتا ہوں لیکن "نقل کفر کفر نیست"۔ پھر بھی مجھے ڈر ہے کہ یہ کتاب جو میں نے کراہتاً بادشاہ کے حکم سے مجبور ہو کر لکھی ہے میرے لیے لعنت بن جائے گی۔ اللہ ہی مجھے معاف کرے اور پناہ میں رکھے۔

مکار قلندر کا فریب

انہی دنوں شیخ کمال بیابانی نامی ایک قلندر کو دریائے راوی کے کنارے سے لوگ لے کر آئے کہ یہ عجب باکمال آدمی ہے کہ ساتھیوں سے باتیں کرتے کرتے پلک جھپکتے میں دریا کے دوسرے کنارے پر چلا جاتا ہے اور وہاں سے پکار کر کہتا ہے کہ اے فلاں اب تم اپنے گھر چلے جاؤ۔ بادشاہ اس کو خلوت میں دریا کے کنارے لے گئے اور اس سے کہا کہ "ہم ایسی چیزوں کے بڑے مشتاق ہیں، اگر تم یہ کرامت ہم کو دکھلا دو تو ہمارا ملک و مال سب تمہارا ہوگا اور ہم تمہارے مرید بن جائیں گے"۔ وہ جواب میں نہ تو کچھ بولا اور نہ ہی کوئی حرکت کی۔ اسے گم سم دیکھ کر بادشاہ نے کہا "ہم تجھے ہاتھ پیر باندھ کر قلعے پر سے دریا میں پھینک دیں گے اگر پانی سے صحیح سلامت نکل آیا تو کیا کہنے ورنہ تو اپنے آپ جہنم رسید ہو جائے گا"۔ اب تو وہ بڑا سٹپٹایا اور اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا کہ میں یہ سارا ڈھونگ پیٹ کی دوزخ بھرنے کے لیے کرتا ہوں۔ اس نے یہ تدبیر کر رکھی تھی کہ اپنے لڑکے کو جو اس کا ہم شکل تھا دریا کے کنارے پر کھڑا کر دیتا تھا اور مغرب کے وقت کسی نہ کسی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے مقررہ مقام پر پہنچتا اور وضو کے بہانے وہاں کسی پہاڑ کی کھوہ میں چھپ جاتا۔ اس وقت اس کا بیٹا دوسرے کنارے سے اس کے ساتھی

کا نام لے کر آواز دیتا تھا کہ "بس اب تم اپنے گھر لوٹ جاؤ"۔ بادشاہ نے اس کو بھکر میں بھیج دیا، وہاں بھی اس نے اپنی کرامتوں کا بڑا ڈھونگ کھڑا کر دیا۔ خانخاناں اور اس کا نائب دولت خاں بھی اس کے چکر میں آ گئے۔ اس نے ان کو طرح طرح کے کرتب دکھائے اور ایک مرتبہ جمعہ کی رات کو بازی گروں کی طرح اپنے جسم کے عضو عضو کو الگ الگ کر کے دکھایا اور ان کرامتوں سے دولت خان افغان کو جو خان خاناں کا نفس ناطقہ اور وکیل کل تھا، اپنا معتقد اور مرید بنا لیا۔ خان خاناں نے بھی اس کی عقیدت میں دھوکا کھایا۔ اس چال باز نے ایک سونے کی گیند اپنے شیخ کے نام پر حاصل کر کے کہا کہ خضر علیہ السلام نے تمہارے نام دعا اور سلام کہلوایا ہے، پھر وہ اس گیند کو دریا میں لے کر گیا اور چھل اور مکاری سے خان خاناں کے سامنے اس کے بجائے کانسے کی ایک گیند دریائے سندھ میں ڈال دی اور سونے کی گیند اڑا لے گیا۔

رامائن کے ترجمے کا صلہ

انہی دنوں بادشاہ کو خیال آیا کہ رامائن کے ترجمے کا کچھ صلہ مجھے [80] دیا جائے، چنانچہ ایک دن شاہ فتح اللہ نے عضد الدولہ سے مخاطب ہو کر کہا کہ "فی الحال یہ شال عبدالقادر کو دے دو، گھوڑا اور خرچ بھی اسے عنایت کیا جائے گا۔" بادشاہ نے شاہ فتح اللہ کو بساور کی جاگیر عطا کر دی اور وہاں کے اماموں کی آراضیات کے متعلق فرمایا کہ یہ سب تم کو بخش دی گئیں۔ پھر میرا نام لے کر کہا: "یہ نوجوان بدایوں کا رہنے والا ہے۔ اس کی مدد معاش کو ہم کسی قصور کے بغیر دیدہ و دانستہ بساور سے منتقل کر کے بدایوں میں مقرر کیے دیتے ہیں"۔ شاہ فتح اللہ نے ایک ہزار روپے کی تھیلی حضور میں پیش کی کہ میرے کارندوں نے یہ رقم اماموں کی معاش سے بچا کر بھیجی ہے حالانکہ یہ رقم اس کے شقدار نے پرگنہ بساور کے ائمہ کی بیوہ عورتوں اور یتیموں پر ظلم و ستم کر کے وصول کی تھی۔ جب رقم پیش کی گئی تو بادشاہ نے خوش ہو کر اس سے کہا "یہ تمہاری ہے، ہم تمہیں بخشتے ہیں"۔ اس معاملے کو 3 مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ شاہ فتح اللہ اس دنیا سے خالی ہاتھ رخصت ہو گیا۔

جب میری(81) مدد معاش کے متعلق نیا فرمان تیار ہو گیا تو میں ایک سال کی رخصت لے کر پہلے بیاور اور پھر وہاں سے بدایوں گیا۔ وہاں سے میرا ارادہ مرزا نظام الدین احمد سے ملنے اور سیر و تفریح کے لیے گجرات جانے کا تھا، لیکن کچھ ایسے موانعات پیش آئے کہ جا نہ سکا۔

کشمیر کے امراء کی وفات

اسی سن جلوس میں سید عبد اللہ خاں چوگان بیگی اور میرزادہ علی خاں جو صاحب اعتبار امیر تھے، کشمیر میں فوت ہو گئے۔ سید عبد اللہ خاں نے 12 ماہ ربیع الاول کو حضور اکرم ﷺ کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے کھانا پکوایا اور فقیروں کو کھلایا اور گناہوں سے توبہ واستغفار کی۔ اسی دن وہ میرزا یوسف خاں کے ساتھ شکار پر گیا۔ شکار میں اسے بخار ہو گیا اور اسی میں جان دے دی۔ اس سے لگ بھگ ایک سال پہلے میرزادہ علی خاں اُسی رات کو جس رات یعقوب نے محمد قاسم خاں پر شب خون مارا تھا، لڑائی میں ہلاک ہو گیا تھا۔

کشمیر کی جانب اکبر کی روانگی

22 جمادی الثانی 997ھ 1589ء کو بادشاہ سلامت کشمیر کی سیر کے لیے، جسے بادشاہ نے "باغ خاصہ" کا نام دیا ہوا تھا کابل سے تشریف لے گئے۔ اہل حرم کو شاہزادہ سلطان مراد کے ساتھ بھنبیر میں جہاں سے کشمیر کا پہاڑی راستہ شروع ہوتا تھا، چھوڑ دیا اور خود بطور یلغار آگے روانہ ہو گئے۔ اس حسین خطے کی سیر و تفریح میں کچھ عرصہ صرف کیا پھر شاہزادے کے نام فرمان آیا کہ وہ محل والوں کو رہتاس لے جا کر وہاں ہماری آمد کا انتظار کرے۔

شاہ فتح اللہ شیرازی کی وفات

انہی دنوں متبحر میں علامۂ عصر شاہ فتح اللہ شیرازی تپ محرقہ میں مبتلا ہو گیا۔ خود بھی حاذق طبیب تھا اس لیے اس نے بطور علاج ہریسہ کھانا شروع کر دیا۔ حکیم علی نے ہریسہ کھانے سے اسے بہت روکا بھی لیکن وہ نہ مانا۔ آخر کار موت اس کا گریبان پکڑ کر عالم بقا کی

طرف کھینچ لے گئی۔ شاہ فتح اللہ کو تخت سلیمان میں، جو کشمیر کے ایک شہر سے متصل ہوا پہاڑ ہے، سید عبد اللہ خاں چوگان بیگ کی قبر کے پاس دفن کیا گیا۔ ملک الشعراء شیخ فیضی نے اس کے مرثیے میں ایک ترکیب بند کہا تھا جس کے چند شعر مندرجہ ذیل ہیں:

درہنگام آن آمد کہ عالم از نظام افتد — جہانعقل را در نیم روز علم تمام افتد

ہمہ گنجینۂ اقبال در دست لیام افتد — مبہ خونابۂ ادبار در کاس کرام افتد

حقیقت گم کند سررشتۂ تحقیق مقصد را — معانی از بیان ماند روابط از کلام افتد

زبان جہل جہد بی محابا در سخن رانی — مطالب تا درست آید دلائل نا تمام افتد

دل مستکملان دہر در نقص ابد ماند — چو تا را، میوۂ تر شاخ تاگہ نیم خام افتد

گرامی امہات فضل را فرزند روحانی — ابو الآبائی معنی شاہ فتح اللہ شیرازی

دو صد بونصر رفت و بوعلی تا او پدید آید — بسی دارد قضا ورتہ کان زن گوشہ پرازی

گہی با محمل مشائیاں گردد مین گرد؟ — گہی با موکب اشراقیان کرد فلک تازی

مباہات از وجود کامل او بود دوران را — بدوران جلال الدین محمد اکبر غازی

شہنشاہ جہان را از وفاتش دیدہ پرنم شد
سکندر اشک حسرت ریخت کا فلاطون زعالم شد

حکیم ابوالفتح کا انتقال

27 رمضان المبارک کو بادشاہ کابل کی سیر کے لیے تشریف لے گئے۔ پکھلی کے راستے سے قلعہ اٹک کی طرف روانہ ہوئے۔ اسی موقع پر حکیم ابوالفتح بھی دھتوڑ کے مقام پر فوت ہو گیا جسے حسن ابدال میں دفن کیا گیا۔ اس کی تاریخ وفات "خدا ئیش سزاوحاذ" سے نکلتی ہے۔

جب اٹک کے سامنے خیمہ شاہی لگا ہوا تھا، شاہزادہ اہل محل کو لے کر حاضر خدمت ہوا۔ اسی منزل سے شہباز خاں کو یوسف زئی قبیلے کے بقیہ پٹھانوں پر حملے کے لیے مامور کیا گیا۔

22 ذی قعدہ 997ھ/1589ء کو بادشاہ کی سواری کابل پہنچی۔ اس موقع پر حکیم ہمام اور صدر جہاں عبداللہ خاں ازبک کے پاس سے لوٹ کر آئے اور عبداللہ خان کے دوستانہ خطوط پیش کیے۔

ٹوڈرمل اور بھگوان داس کا انتقال

998ھ/1589ء میں راجہ ٹوڈرمل اور بھگوان داس امیر الامراء جو لاہور میں ٹھہرے ہوئے تھے، فوت ہو گئے۔ ان کی تاریخ ہے "بگفتا ٹوڈرو بھگوان مردند" کسی نے ایک تاریخ اور کہی ہے:

ٹوڈرمل آنکہ ظلمش گرفتہ بود عالم	چون رفت سوی دوزخ خلقی شدند خرم
تاریخ رفتنش را از پیر عقل جستم	خوش گفت پیر دانا "وی رفت در جہنم"

کابل اور گجرات کے لیے تقرر

20 محرم 998ھ/1589ء کو کابل کی حکومت محمد قاسم خاں میر بحر کو عطا کر کے بادشاہ نے ہندوستان کی طرف رُخ کیا۔

گجرات پر اعظم خاں کی تقرری کا فرمان جاری کیا گیا اور اسے مالوہ سے وہاں تبدیل کر دیا گیا۔ نظام الدین احمد کو دربار میں طلب کیا گیا۔ خان خاناں کو گجرات کے بجائے جونپور دیا گیا۔ مالوہ میں شہاب خاں کی تعیناتی ہوئی۔ اعظم خاں نے شہاب خاں کی مخالفت میں مالوہ کو ویران کر کے وہاں دھول اڑا دی۔

خداوند خاں دکنی کا انتقال

اسی سال خداوند خان دکنی رافضی جس کا نکاح بادشاہ کے حکم سے شیخ ابوالفضل کی بہن سے ہوا تھا اور گجرات میں کری کا قصبہ اسے جاگیر میں ملا تھا، فوت ہو گیا۔ اس کی وفات کی تاریخ ہے۔ "خداوند دکنی مردہ"۔

اکبر کے حکومت کا پینتیسواں سال

14 جمادی الاول 998ھ/1589ء کو 35 ویں سال جلوس کا آغاز ہوا۔ بادشاہ نے لاہور کے دیوان خانے کو آراستہ کرنے کا حکم پہلے ہی بھیج دیا تھا۔ نوروز کے دوسرے دن لاہور میں بادشاہ حاضر ہوئے۔ تیسرے دن نظام الدین احمد شترسواروں کی جمعیت کے ہمراہ ایک سوکوس کا فاصلہ صرف 12 دن میں طے کر کے خدمت میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ جس ضرورت میں یہ شتر سوار آئے ہیں اسی طرح سیدھے ڈیوڑھی میں چلے آئیں۔ اس قافلے کی آمد بھی اچھا خاصا تماشا بن گئی۔ نظام الدین احمد پر بڑی شاہانہ نوازشیں ہوئیں۔ بادشاہ نے بھگوان داس کی وفات پر مان سنگھ کو راجا کا خطاب عطا کیا اور تعزیت کے لیے اس کے نام فرمان صادر ہوا جس میں بڑی عنایتوں کا اظہار کیا گیا تھا۔ فرمان کے ساتھ خلعت خاصہ اور گھوڑا بھی بھیجا گیا۔ شرف آفتاب کے دن میں بھی بدایوں سے آکر بارگاہ میں حاضر ہوا اور 7 سال بعد میرزا نظام الدین احمد سے ملاقات ہوئی۔

اعظم خاں کی فتوحات

اسی سال اعظم خاں نے گجرات سے سورت اور جوناگڑھ پر حملہ کیا۔ وہاں کا حاکم جام ستر سال اور دولت خاں ولد امین خاں غوری جو اپنے باپ کا جانشین بنا تھا اور اپنے لاؤ لشکر پر اسے بڑا گھمنڈ ہو گیا تھا۔ اعظم خاں کی فوج کشی پر یہ دونوں بیس ہزار کا لشکر لے کر مقابلے پر آئے اور فریقین میں بڑی سخت جنگ ہوئی۔ اعظم خان نے اپنی فوج کو 7 دستوں میں تقسیم کر کے بڑی بہادری سے جنگ کی۔ بادشاہی میمنہ کا سردار خواجہ رفیع بدخشی جو بڑا بہادر نوجوان تھا اور محمد حسین شیخ جو امرائے قدیم میں سے تھا اس معرکے میں شہید ہو گئے۔ ہراول کی فوج میں ابوتراب کا بھتیجا شرف الدین بھی مارا گیا۔ مخالفوں کے 4 ہزار آدمی مارے گئے۔ جام کا لڑکا بھی قتل ہو گیا۔ اعظم خاں کو بڑی شاندار شان فتح حاصل ہوئی۔ یہ فتح اتوار کے دن 6 شوال 998ھ/1589ء کو ہوئی۔ شیخ فیضی نے "فتوحات عزیزی" سے اس کی تاریخ نکالی۔

دو بزرگوں کا انتقال

اسی سال صاحب تصانیف بزرگ شیخ وجیہہ الدین کا احمد آباد میں انتقال ہو گیا۔ ان کی تاریخ ان کے نام "شیخ وجیہہ الدین" سے نکلتی ہے۔

اسی سال شیخ عبد العزیز دہلوی کے خلیفہ جالندہ بھی قصبہ سیہند میں فوت ہو گئے۔ ان کے ایک مرید نے "حقیقت فقر" سے ان کی تاریخ نکالی

سندھ اور بلوچستان پر حملہ

بادشاہ نے خان خاناں کا جون پور سے بھی تبادلہ کر دیا اس کو ملتان اور بھکر کی حکومت عطا کر کے سندھ اور بلوچستان کی تسخیر اور میرزا جان کی بغاوت کو کچلنے کے لیے مقرر کر دیا۔ خان خاناں کو اس مہم پر چند بڑے بڑے امراء جیسے شاہ بیگ خاں، سید بہاؤ الدین بخاری اور میر محمد معصوم بھکری وغیرہ کے ساتھ 999ھ/1590ء میں رخصت کیا گیا۔ ان کے ساتھ 100 ہاتھی بھی بھیجے گئے، شیخ فیضی نے "قصد ٹھٹھہ" سے اس روانگی کی تاریخ نکالی۔

شہاب الدین احمد خان کی وفات

اسی سال مالوہ سے شہاب الدین احمد خاں کی وفات کی خبر پہنچی" شہاب خانم" اور "ذمیم الاوصاف" اس کی تاریخ وفات ہے۔

تاریخ کشمیر کی ترتیب و تدوین

اسی سال مجھے(82) حکم دیا گیا کہ کشمیر کی تاریخ جس کو ملا شاہ محمد شاہ آبادی نے جو بڑا عالم و فاضل شخص ہے حسب الحکم فارسی میں ترجمہ کیا تھا سادہ اور آسان عبارت میں لکھوں۔ میں(83) نے اس کا انتخاب 2 مہینے میں مرتب کر دیا، اس کے آخر میں یہ شعر لکھا:

در عرض یک دو ماہ بہ تقریب حکم شاہ
این نامہ شد چو خط پری پیکران سیاہ

یہ نسخہ شاہی کتب خانے میں داخل کر دیا گیا بادشاہ کے سامنے جز جز اس کو پڑھا جاتا ہے۔

شیخ ابراہیم چشتی کا انتقال

اسی سال شیخ ابراہیم چشتی نے فتح پور میں انتقال کیا، وہ اپنے پیچھے کافی دولت چھوڑ گیا تھا۔ اس کی چھوڑی ہوئی دولت میں سے 25 کروڑ نقد روپے، ہاتھی، گھوڑے اور دوسرا سامان شاہی خزانے میں داخل ہو گیا۔ وہ نہایت کنجوس اور بخیل مشہور تھا اس لیے اس کی تاریخ ''ذمیم الاوصاف'' اور ''شیخ لئیم'' نکالی گئی۔

عرفی شیرازی کا انتقال

لاہور کے چند امراء بھی اسی سال فوت ہوئے جن میں سے تجبری ترک تو بواسیر کے مرض میں اور شیخ احمد ہاتھی کے حادثے میں فوت ہوئے۔ اسی سال مشہور شاعر ملا عرفی شیرازی نے بھی انتقال کیا۔ مرتے وقت اس نے یہ رباعی کہی تھی:

عرفی دم نزع است وہمان مستی تو　　آخر بچہ مایہ بار بربستی تو
فرداست کہ دوست نقد فردوس بکف　　جو یای متاع است وتہی دستی تو

عرفی متقدمین اور متاخرین تمام اساتذہ کلام کے بارے میں بڑی بے ادبانہ باتیں کیا کرتا تھا اس لیے اس نے یہ تاریخ پائی:

''گفت عرفی جوانہ مرگ شدی''

اس کی ایک دوسری تاریخ ہے ''دشمن خدا''

معجم البلدان کا فارسی ترجمہ

اسی زمانے میں حکیم ہمام نے ایک کتاب ''معجم البلدان'' کی جس کی ضخامت 200 جز پر مشتمل تھی، بڑی تعریف کی اور اس کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کرنے کی تجویز پیش کی کہ

اس کتاب میں بڑی عجیب و غریب حکائتیں اور مفید مضامین ہیں۔ بادشاہ نے دس بارہ عراقی اور ہندوستانی آدمیوں کو جمع کر کے اس کتاب کے اجزاء تقسیم کردیے۔ میرے حصے میں بھی 10 جز آئے۔ ان کا ترجمہ میں نے ایک مہینے میں کردیا اور سب سے پہلے اسے پیش کیا اور اس خدمت کو وسیلہ بنا کر بدایوں جانے کے لیے رخصت کی درخواست کی جو منظور کر لی گئی۔

اکبر کی حکومت کا چھتیسواں سال جلوس

24 جمادی الاول 999ھ/1590ء نوروز کا جشن حسب دستور منعقد کیا گیا اور جلوس کا 36 واں سال شروع ہوا۔ اس سال گائے، بھینس، گھوڑے اور اونٹ کا گوشت حرام کردیا گیا۔ ایک اور حکم ستی کے متعلق تھا کہ جو عورت برضا و رغبت اپنے شوہر کے ساتھ چتا پر جلنا چاہے اس کو نہ روکیں، لیکن کسی عورت کو زبردستی شوہر کے ساتھ نہ جلایا جائے۔ 12 سال سے پہلے بچوں کی ختنہ نہ کی جائے 12 سال بعد اگر لڑکا چاہے تو ختنہ کرائے نہیں تو نہ کی جائے۔ ایسے شخص کے ساتھ جس کا پیشہ جانوروں کو ذبح کرنے کا ہو، اگر کوئی کھانا کھالے تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے اگر اس کے گھر والے اس کے ساتھ کھانا کھائیں تو ان کی صرف انگلیاں کاٹی جائیں۔

تبت کی سفارت

اس سال حاجی میرزا بیگ خود تبت سے واپس آیا اور اپنے ساتھ وہاں کے حاکم علی رائے کی لڑکی کو لیتا آیا، بادشاہ نے اس لڑکی کا نکاح بڑے شاہزادے کے ساتھ کردیا۔ تبت میں دوسری مرتبہ ملا طالب اصفہانی ایلچی بن کر گیا تھا۔ اس کے اور حاجی میرزا کے بیانات سے وہاں کے جو حالات اور رسوم وعقائد سے متعلق معلومات ملی ہیں وہ ایک رسالہ کی صورت میں مرتب ہو چکی ہیں۔ اکبر نامہ میں بھی حالات درج ہیں، کیوں کہ اس میں ہندستان، کابل، تبت اور کشمیر کے حالات تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔

مرزا نظام الدین احمد کو پرگنہ شمس آباد کی جاگیر عطا کی گئی تھی۔ اس سال شعبان کے آخر میں ان کو جاگیر پر روانہ کر دیا گیا۔ ان کا خالہ زاد بھائی شمس آباد کے حملے میں شہید ہو گیا، اس کا نام محمد جعفر تھا یہ نہایت سعادت مند اور بہادر نوجوان تھا اس کی تاریخ شہادت ہے:

چو منشور شہادت یافت جعفر از در داور
بود تاریخ سال او شہید پاک شد جعفر

سجدے سے انکار

اس مرتبہ مجھے[84] 5 مہینے کی رخصت ملی۔ مرزا نظام الدین نے سفارشاً عرض کیا کہ عبد القادر کی والدہ کا انتقال ہو گیا ہے، بھائیوں اور عزیزوں کو تسلی اور دلاسا دینے کے لیے وہ جانا چاہتا ہے اور رخصت کا طلب گار ہے تو بادشاہ نے بڑی خفگی کے ساتھ یہ رخصت عطا کی صدر جہاں نے اس موقعے پر دہرا دہرا کر کہا کہ "بادشاہ کو سجدہ کرو" لیکن میں[85] نے سجدہ نہیں کیا بادشاہ نے صرف اتنا کہا "چھوڑو" سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے ناراض ہو کر مجھے سفر خرچ کے لیے کچھ نہیں دیا۔ بہر حال میں مرزا کے ساتھ شمس آباد چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر بیمار ہو گیا۔ پھر وہاں سے بدایوں آ گیا۔ مرزا لاہور کو چلے گئے۔

شاہی فرمان

شاہی کتب خانے سے "نامہ خرد افزا" کا نسخہ گم ہو گیا تھا۔ سلیمہ سلطان بیگم نے اس سلسلے میں مجھے[86] چند مرتبہ یاد فرمایا۔ میرے پاس بدایوں میں کئی قاصد پوچھ گچھ کے لیے پہنچے لیکن میں کچھ ایسی الجھنوں میں گرفتار تھا کہ نہ جا سکا۔ آخر بادشاہ نے حکم دے دیا کہ اس کی مدد معاش موقوف کر دی جائے اور اسے زبردستی بدایوں سے لایا جائے۔ اس موقعے پر مرزا نظام الدین احمد نے دوستی کا بڑا حق ادا کیا۔ شیخ ابو الفضل نے بھی بادشاہ سے ہر بار یہی کہا کہ کوئی نہ کوئی مشکل ضرور درپیش ہو گی، اس لیے وہ نہیں آ سکا اور وہاں رہ گیا۔

سفیروں کی دکن روانگی

اس سال شوال کے مہینے میں دربار کے 4 خاص مقربوں کو دکن حاکموں کے پاس سفارت پر بھیجا گیا۔ شیخ فیضی کو اسیر و برہان پور کے حاکم راجہ علی خاں کے پاس بھیجا گیا۔ امین الدین کا پہلے نام محمد امین تھا اس نے خود اپنا نام بدلنے کی درخواست کی کیوں کہ اس میں لفظ محمد آتا تھا اور وہ بادشاہ کو پسند نہیں تھا۔ اس کو امین الدین کا نام دیا گیا۔ امین الدین کو احمد نگر بھیجا گیا۔ احمد نگر میں اس وقت برہان الملک حاکم تھا جو دربار سے مدد لے کر وہاں کی سلطنت پر قابض ہوا تھا اور اب خود مختاری کا دعویٰ کرنے لگا تھا۔ بیجاپور کے حاکم عادل خاں کے پاس صادق خاں کے سابق ملازم میر محمد امین کو رخصت کیا گیا۔ گولکنڈہ کے حاکم قطب الملک کے پاس سفارت کے لیے میر منیر کو نامزد کیا گیا۔ حکم یہ ہوا تھا کہ شیخ فیضی راجہ علی خاں کی سفارت سے فارغ ہو کر برہان الملک کے پاس چلا جائے، جب وہ احمد نگر پہنچا تو اس کے اور امین الدین کے درمیان بڑی دوستانہ محفلیں رہیں، لیکن آخر میں یہ دوستی مخالفت میں تبدیل ہو گئی۔

اکبر کی علالت

اسی سال اکبر کی طبیعت کچھ علیل ہو گئی۔ پیٹ کا درد ہوتا تھا جس سے نہایت بے چینی کی حالت رہتی تھی۔ اکبر کو بڑے شاہزادے جہانگیر کی طرف سے بدگمانی ہو گئی کہ شاید اس نے زہر دے دیا ہو۔ بار بار اس سے یہ کہتا تھا "بابا شیخو جیتے رہو یہ سلطنت تو ساری تمہارے ہی لیے تھی پھر تم نے ایسی حرکت کیوں کی؟" بادشاہ کو حکیم ہمام پر بھی، جو اُن دنوں شاہی معتمد تھا، کچھ نہ کچھ کھلا دینے کا شبہ ہوا۔ بڑے شاہزادے نے اپنے چند معتمد آدمیوں کو شاہزادہ مراد کی نگرانی پر مقرر کر دیا تھا۔ تھوڑے ہی دن بعد بادشاہ صحت مند ہو گئے۔ اس وقت حرم کی عورتوں اور شاہزادہ مراد نے اس نگرانی کا قضیہ چھیڑ لیا۔ اس معاملے کو یکسو کرنے کے لیے بادشاہ نے 20 ذی الحجہ کو شاہزادہ سلطان مراد کو جسے وہ "پہاڑی" کہہ کر پکارتے تھے، مالوہ اور اس سے متعلق علاقے سپرد کر دیے۔ شاہزادوں کو علم، نوبت، نقارہ،

پرچم، نشان اور بادشاہی کا دوسرا ساز و سامان جو شاہزادوں کے لیے مخصوص تھا جیسے چار پارچہ شاہانہ اور خلعت مرحمت فرمائی۔ اسماعیل قلی خان کو اس کا نائب بنایا گیا اور دوسرے چند بڑے بڑے امراء کو بھی اس کی ملازمت میں مقرر کر کے رخصت فرمایا تاکہ دونوں شاہزادوں میں ایک بڑی مسافت حائل رہے اور آئے دن کے ان کے جھگڑوں سے نجات مل جائے۔

شاہزادہ مراد کی فوج کشی

شاہزادہ مراد ملک کو آگے بڑھانے کے شوق میں مالوہ کی طرف چلا گیا اور بہت سے لوگ شاہزادہ مراد کی قدر و منزلت کو دیکھ کر اس کے پاس جمع ہو گئے۔ اس نے آگرہ، قنوج اور گوالیار سے بے شمار فوج جمع کر لی اور لشکر لے کر روند چھہ کے زمیندار مدھوکر ناہی پر حملہ کر دیا۔ یہ زمیندار اپنے کثیر لاؤ لشکر کی وجہ سے ہندستان کے راجاؤں میں بڑا درجہ رکھتا تھا اور اس علاقے میں اس نے شورش برپا کر رکھی تھی۔ شاہزادے کے لشکر سے اس کا مقابلہ نرور کے علاقے میں ہوا اور وہ شکست کھا کر بھاگ گیا۔ وہاں کے جنگلوں اور پہاڑوں میں چھپ کر چھاپے مارنے لگا۔ اس کے آدمیوں نے شاہزادے کے بہت سے لشکریوں کو قتل کر دیا، اس کے چھاپوں سے لشکر میں بڑا انتشار پھیل گیا اور وہ اس علاقے میں نہایت پریشان اور خستہ حال ادھر اُدھر کوچ کرتا رہا۔ حسن اتفاق سے انہی دنوں مدھوکر طبعی موت مر گیا اور اس کا لڑکا نہایت عمدہ نذرانے لے کر شاہزادے سے ملنے کے لیے حاضر ہو گیا۔ شاہزادہ مراد نے اسے یار محمد ولد صادق خاں کے ہمراہ شاہی خدمت میں لاہور کو روانہ کر دیا اور اجین شہر کو اپنا مستقر بنا کر قیام کیا۔ شہزادہ مراد کا اپنے آدمیوں کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں تھا۔ لین دین، نشست و برخاست، تسلیم و تعظیم میں باپ کی دیکھا دیکھی بڑے غرور و تکبر سے پیش آتا تھا، اس کے رویے سے لوگ ناراض ہو گئے اور اجازت لے کر یا بغیر اجازت کے ہی اس کا ساتھ چھوڑ کر واپس آ گئے۔

جونا گڑھ کی فتح

انہی دنوں جونا گڑھ کے حاکم دولت خاں ولد امین خاں غوری جو جام کی لڑائی میں زخمی ہوگیا تھا، مرگیا اور اعظم خاں نے اس قلعے کی تسخیر کے لیے حملہ کردیا۔ امین خان کے وزیروں نے دولت خاں کی سرداری میں کچھ دن تک تو اعظم خاں کی مدافعت کی۔ آخر جان کی امان طلب کر کے قلعے کی کنجی اسی سال 5 ذی قعدہ کو اس کے حوالے کردی۔

ٹھٹھہ کی فتح

26 محرم/1000ھ/ 1591ء کو اکبر کی حکومت کے چھتیسویں سال، خان خاناں نے جانی بیگ سے ایک رات اور ایک دن مسلسل جنگ کی۔ دونوں طرف سے بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا گیا۔ خان خاناں 2 مہینے تک اس کا محاصرہ کیے پڑا رہا۔ اس دوران بادشاہ نے خان خاناں کی مدد کے لیے ایک مرتبہ ڈیڑھ لاکھ روپیہ اور دوسری دفعہ ایک لاکھ روپیہ، ایک لاکھ من غلہ، سو بڑی توپیں، توپچیوں کی ایک بڑی جمعیت کے ساتھ دریا کے راستے بھجوائیں۔ رائے سنگھ کو جو 4 ہزاری امیر ہے مدد کے لیے جیسلمیر کے راستے سے روانہ کیا۔ جانی بیگ نے جان توڑ کر مقابلہ کیا اور کئی ایک سخت لڑائیوں کے بعد آخر کار عاجز آگیا۔ مصالحت کرلی اور اپنی لڑکی خان خاناں کے لڑکے سے بیاہ دی، وہ کشمیر کی فتح کے بعد خان خاناں کے ساتھ ملازمت میں داخل ہوا۔

اکبر کی حکومت کا سینتیسواں سال

5 جمادی الثانی 1000ھ/ 1591ء کو نوروز منعقد ہوا اور اکبر کی سلطنت کا سینتیسواں سال شروع ہوا۔ اس سال درباریوں نے بڑے اہتمام سے اپنی داڑھیاں منڈوائیں، اس لیے ان کی تاریخ ہوئی "بگفتہ ریشہا بر باد دادہ مفسدی چند"۔

کرنسی کا نیا قانون

اس سال بھی کئی ایک نئے قوانین کا اجرا ہوا۔ ایک حکم دیا گیا کہ پچھلے بادشاہوں کے

جتنے بھی سکے ہیں روپیہ، اشرفیاں وغیرہ سب گلا کر سونے چاندی کے بھاؤ فروخت کر دیے جائیں۔ پہلے سکوں کا نام ونشان تک نہ رہے اور بادشاہی سکے، روپے اشرفی وغیرہ خواہ وہ نئے ہوں یا پرانے ان کا چلن ایک شرح پر رہے اور سنین کا فرق ان کے چلن پر اثر انداز نہ ہو۔ اس قانون کے نفاذ کے لیے قلیچ خان کو مقرر کیا گیا۔ وہ ہر روز صرافوں کو بلا کر ان سے مچلکے لیتا تھا اور جرمانے لگائے جاتے تھے اس نے بڑی سختی سے کام لیا اور چند ایک کو قتل تک کرا دیا۔ اس کے باوجود صراف جعل اور دھوکے سے باز نہ آتے تھے۔ بادشاہ نے کرنسی کے سلسلے میں بڑے تاکیدی فرمان ہر جگہ بھجوائے، لیکن ان کا کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر خواجہ شمس الدین خوافی دیوان کل کی کوششوں سے اس حکم کا نفاذ ہو سکا۔

جلالہ تاریکی پر حملہ

یوم شرف آفتاب کو جب سورج انیسویں درجہ حمل میں ہوتا ہے، جعفر بیگ آصف خان بخشی کو جلالہ تاریکی کے تعاقب پر مقرر کیا گیا۔ جلالہ اس وقت وہ عبد اللہ خاں کے پاس سے لوٹ کر کابل کی طرف آرہا تھا۔ اس کی مدد کے لیے کابل کے حاکم محمد قاسم خاں کو مقرر کیا گیا۔ نظام الدین احمد کو "بخشی کل" کا عہدہ عطا ہوا۔ آخر شعبان میں زین خاں کوکہ کو بھی آصف خاں کی مدد اور تاریکیوں (روشنائی قبیلے) کے مکمل استیصال اور سواد اور بجوڑ کے علاقے کو آباد کرنے کے لیے نامزد کیا گیا۔

اس سال وسط شوال میں حافظ سلطان رخنہ ہروی کا انتقال ہو گیا۔ یہ نہایت ممتیز شخص تھا، خاص طور سے سرہند میں اس کی بنائی ہوئی عمارتیں اور باغ ایسے خوش منظر اور عالی شان ہیں کہ ہندوستان میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ اس کی تاریخ وفات اصول تعمیہ پر نکالی گئی:

رخنہ در باغ شد و آب نماند

فیضی سرہندی نے دو تاریخیں کہی ہیں، ایک: "باغ بی آب شد"

دوسری:

چو او در گوشہ باغ است مدفون
بجو تاریخ او از گوشہ باغ

ایک اور تاریخ ہے: ''یا حافظ''

یادگار گل کا کشمیر پر قبضہ

یوسف خان رضوی کشمیر میں اپنے بھتیجے یادگار گل کو نائب بنا کر 24 شوال کو خدمت میں حاضر ہوگیا۔ اس کے آنے کے بعد بادشاہ سلامت نے لاہور کے نظم ونسق پر قلیج خاں کا تقرر کیا اور عین موسم باراں میں جب کہ برسات اپنے شباب پر تھی راوی ندی کو پار کیا۔ لشکر کو بڑے شاہزادے کے ہمراہ کر کے خود شکار کھیلتے ہوئے چناب ندی پر پہنچے۔

چناب کے قیام میں یہ خبریں ملیں کہ یادگار گل نے کشمیر کے بادشاہی تحصیلدار حسین بیگ نے شیخ عمری بدخشی سے جنگ کر کے اسے شکست دے دی ہے۔ کشمیر کا سرکاری قاضی علی بغدادی اماموں کا بڑا دشمن تھا اور کشمیر کی دیوانی کے عہدے پر فائز تھا اور حساب کتاب میں الجھنیں پیدا کر کے رعیت کو تنگ کر رکھا تھا۔ یادگار گل نے اس کے کان کاٹ کر اسے وہاں سے نکال دیا۔ اس واقعہ کی تاریخ ہے:

چون کہ قاضی علی بغدادی حسرت یادگار با خود برد
خامۂ منشی قضا بنوشت سال تاریخ او کہ موذی مرد

یادگار گل کی تخت نشینی

اس کامیابی کے بعد یادگار گل نے وہاں کے قدیم امراء کی مدد سے شاہی تاج سر پر رکھا۔ کشمیر میں یہ رسم ہے کہ تخت نشینی کے وقت امراء نئے بادشاہ کے اطراف ننگی تلواریں لیے کھڑے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں جب یادگار خطبہ پڑھنے کھڑا ہوا تو خوف سے لرزنے لگا اور کافی دیر تک بدحواس رہا۔ ایک اور اتفاق یہ پیش آیا کہ جس دن اس کے مہر کے لیے سچ

تجویز کیا گیا تو اس نے اپنے سامنے نگینہ کھدوایا۔ اس وقت نگینے کا ایک ریزہ اڑ کر اس کی آنکھ میں پڑ گیا اور وہ دیر تک اس تکلیف میں مبتلا رہا۔ اس بدشگونیوں کی وجہ سے لوگوں کو یہ خیال ہو گیا کہ اس کی سلطنت زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہے گی۔

حسین بیگ شیخ عمری نے یادگار گل سے شکست کھائی وہ کشمیر کے درّوں سے اپنی جان بچا کر لے آیا اور راجوری میں جو کشمیر کے راستے پر ہے، شاہی حکم کا انتظار کرنے لگا۔

یادگار نے کشمیر میں اپنی بادشاہت قائم کر لی۔ لوگوں کو جاگیریں دیں، خطابات عطا کیے اور میرزا یوسف خاں کے خزانے، طویلے اور اسلحہ خانے پر قبضہ کر لیا۔ یوسف خاں کے اہل و عیال سے سارا روپیہ، زیور اور اناج وغیرہ چھین کر خچروں پر سوار کرا دیا اور ان کو یوسف خاں کے بیٹے کے ہمراہ کشمیر سے باہر نکال دیا۔

یادگار گل کی شکست اور قتل

اس واقعے پر بادشاہ نے سارا الزام یوسف خان کے سر رکھا اور اسے کچھ دن تک شیخ ابو الفضل کے پاس قید میں ڈلوا دیا، نیز شیخ فرید بخش کو شیخ عبدالرحیم لکھنوی اور دوسرے چند امراء کے ساتھ آگے کوچ کرنے کا حکم دے کر خود چناب پر شاہزادے کی آمد کا انتظار کرتے رہے۔ ابھی بادشاہ نے وہاں سے کوچ نہیں کیا تھا کہ خبر ملی کہ شاہی امراء کے مقابلے کے لیے یادگار کشمیر سے نکل کر ہیراپور نامی درے پر مورچہ جمائے تھا اور رات کے وقت وہ اپنے سراپردہ میں عیش و عشرت میں مشغول تھا۔ مرزا یوسف خان کے بعض نوکروں نے پٹھانوں کے ایک دستے کو ساتھ لے کر آدھی رات کو شب خون مارا اور یادگار خان کو قتل کر دیا۔ 3 دن کے بعد اس کا سر بھی شاہی بارگاہ میں پہنچ گیا۔ حساب لگانے پر معلوم ہوا کہ اس کی تخت نشینی کے چالیسویں دن ہی اس کا سر کٹ کر دربار میں پہنچ گیا۔ اس کے سر کو عبرت کے لیے لاہور کے قلعے کے کنگورے پر لٹکا دیا گیا۔

جامع رشیدی کے ترجمے کا حق

اسی سال ماہ ذی الحجہ کو حسب الحکم میں (87) بدایوں سے لشکر میں حاضر ہو گیا۔ کشمیر کے قیام

میں حکیم ہمام نے عرض کیا کہ عبدالقادر کورنش بجا لانا چاہتا ہے۔ بادشاہ نے پوچھا وہ وعدہ کے خلاف کتنے عرصے تک غیر حاضر رہا۔ حکیم نے جواب دیا: "پانچ مہینے!" بادشاہ نے پوچھا: "غیر حاضری کا کیا سبب تھا؟" لوگوں نے کہا، وہ بیمار ہو گیا تھا، تصدیق کے لئے بدایوں کے اکابرین کا محضر اور حکیم عین الملک کا عریضہ بھی پیش کیا گیا۔ جب بادشاہ نے یہ سارے کاغذات پڑھ لئے تو فرمایا: "بیماری 5 مہینے تک نہیں رہتی" اور مجھے کورنش کی اجازت نہیں دی۔ میں [88] نہایت شرمندہ، رنجیدہ اور غمزدہ شاہزادہ دانیال کے لشکر میں جسے رہتاس میں مقرر کیا گیا تھا ٹھہرا رہا اور حضور اکرم ﷺ پر درود بھیج کر اور قصیدہ پڑھ کے اور خدا سے گڑگڑا کر دعائیں مانگیں جو آخرکار بفضل ایزدی قبول ہوئیں اور میرے پہنچنے کے 5 ماہ بعد جب لشکر کشمیر سے لاہور پہنچا تو بادشاہ نے مجھ پر توجہ اور عنایت فرمائی اور ایک کتاب جامع رشیدی کے ترجمے کے لیے جو کافی ضخیم ہے، خلوت شاہی میں میر نظام الدین احمد کے ساتھ میرا نام بھی میرے غائبانے میں تجویز فرمایا اور مجھے حاضری کا حکم دیا گیا۔ اس طرح کشمیر کی واپسی کے بعد اسی سال 17 ربیع الآخر کو کورنش کی اجازت دی گئی۔ میں نے حاضر ہو کر ایک اشرفی نذر دی۔ بادشاہ نے بڑی مہربانی کا اظہار کیا اور وہ خفگی بآسانی رضامندی میں بدل گئی۔

بادشاہ نے ابوالفضل علامی کے مشورے سے مجھے جامع رشیدی کے انتخاب کا حکم دیا۔ میں نے اس انتخاب میں عباسی' مصری' اموی خلفاء کے شجرے کو جس کا سلسلہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور پھر ان سے درجہ بدرجہ تمام نبیوں اور آدم علیہ السلام تک جا کر ختم ہوتا ہے' عربی سے فارسی میں ترجمہ کر کے شاہی خدمت میں پیش کی۔ بادشاہ نے خوش ہو کر اس انتخاب کو خزانہ عامرہ میں داخل کرا دیا۔

کشمیر کی سیر

6 محرم 1001ھ/1592ء کو شہنشاہ کشمیر پہنچ گئے اور 28 دن تک اس "باغ خاصہ" کی سیر میں

مصروف رہے۔ وہاں کی حکومت دوبارہ میرزا یوسف خان کے حوالے کر دی، 6 صفر 1001ھ/1592ء کو وہاں سے لوٹ گئے اور کشتی کے ذریعہ کشمیر کی سرحد پر پکھلی کے راستے سے بارہ مولہ جا پہنچے۔ راستہ میں ''زین ملکا'' نامی تالاب کی بھی سیر کی۔ یہ تالاب دو شرقی اور مغربی پہاڑیوں کے درمیان ہے۔ اس کا دور 30 کوس کا ہے اور بہت گہرا ہے ''دریائے بہت'' اسی جھیل کے درمیان سے ہو کر گزرتا ہے۔

سلطان زین العابدین نے، جس کا ذکر تاریخ کشمیر کے ضمن میں کیا گیا ہے، اس تالاب میں تقریباً ایک جریب پتھر ڈلوا کر ایک بڑا پشتہ بنوایا اور اس پر ایسی عالی شان، خوش منظر نگین عمارتیں تعمیر کرائیں کہ انکی مثال ہندوستان کے کسی شہر میں بھی نہیں ملتی۔

لرزنے والا درخت

لشکر والے کشمیر میں ایک نہایت انوکھی چیز دیکھ کر آئے تھے، یہ موضع خان پور میں ایک لرزنے والا درخت ہے جس کا تنہ تو دو ہاتھ موٹا اور اسکی بلندی ایک گز سے زیادہ ہوگی۔ اس کی شاخیں بید مجنون کی ڈالیوں کی طرح جھکی ہوئی ہیں۔ اگر کوئی بچہ اس کی شاخ کو پکڑ کر ہلا دے تو پورا درخت حرکت میں آجاتا ہے اور لرزنے لگتا ہے۔

کشمیر کے بعض عجائبات کا تذکرہ شاہ فتح اللہ شیرازی مرحوم نے اپنے ایک رسالے میں بھی کیا تھا جو علامی شیخ ابوالفضل کی تصنیف اکبر نامہ میں شامل کر دیا گیا ہے۔

پشاور میں شاہانہ داخلہ

یکم ربیع الاول کو رہتاس میں قیام ہوا اور اسی ماہ کی 15 تاریخ کو پشاور کی طرف مراجعت ہوئی۔ 6 ربیع الثانی کو بادشاہ شہر پشاور میں داخل ہوئے۔

انہی دنوں خبر آئی کہ بہادر کودرہ نے جس کا کچھ حال ہم پہلے بیان کر آئے ہیں اڑیسہ کے حاکم قتلو خان کے انتقال کے بعد سکت سنگھ ولد مان سنگھ نے اس پر فوجی حملہ کر دیا۔ وہ مقابلہ کی تاب نہ لا کر جنگلوں اور پہاڑوں میں جا چھپا اور سمندر کے کنارے

تک بنگال کا سارا علاقہ بادشاہی قبضہ میں آگیا۔

اکبر کی حکومت کا اڑتیسواں سال

اتوار 17 جمادی الثانی 1001ھ/1592ء جب سورج برج حوت سے برج حمل میں منتقل ہوا تو جشن نوروز منعقد کیا گیا اور جلوس شاہانہ کا 38 واں سال شروع ہوگیا اور چند نئے قوانین اجرا کیے گئے۔ 24 جمادی الثانی کو خانخاناں اور میرزا جان شاہی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور خسروانہ ہمدردی سے نوازے گئے۔ ان امیروں کو بھی جو اس مہم میں خان خاناں کے ہمراہ گئے تھے حسب مراتب منصبوں اور جاگیروں میں ترقی ملی۔ ملتان پہلے میرزا جانی کی جاگیر میں دیا گیا بعد میں اسے ٹھٹھہ اور میرزا رستم کو ملتان کا علاقہ سپرد ہوا، جس کا ہم آگے ذکر کریں گے۔

مظفر گجراتی کی خودکشی

اس وقت خبر پہنچی کہ جب خان اعظم نے سورت پر قبضہ کرلیا تو وہاں سے مظفر گجراتی بھاگ کر کچھ کے ایک زمیندار کنکار کے پاس چلا گیا۔ خان اعظم اس کے تعاقب میں کنکار جا پہنچا۔ زمیندار اپنی عزت و آبرو بچانے کے لیے خان اعظم کی خدمت میں حاضر ہوگیا اور مظفر کو غفلت کی حالت میں قید کر کے خان اعظم کے پاس بھجوا دیا۔ مظفر نے راستے میں قضائے حاجت کا بہانہ کیا اور ایک استرے سے جو اس کے بازو بند میں چھپا ہوا تھا اپنا گلا کاٹ لیا۔ اس کا سر خان اعظم کے پاس پہنچایا گیا۔ خان اعظم نے اُسے ملاحظہ شاہی کے لیے لاہور بھیج دیا۔

انہی دنوں 120 ہاتھی جو اڑیسہ کی فتح میں راجہ مان سنگھ کے ہاتھ آئے تھے بنگال سے لائے گئے۔ اکبر نے یہ ضابطہ بنایا تھا کہ امرائے سرحد ہمیشہ وقتے وقتے سے دربار میں حاضر ہوتے رہیں۔ اس سال خان اعظم کی طلبی کا فرمان صادر کیا گیا جو 6 سال سے دربار میں نہیں آیا تھا، اس نے جونا گڑھ کو فتح کیا تھا۔ بادشاہ نے اس سے جونا گڑھ لے کر راجہ

رائے سنگھ کے حوالے کر دیا۔

خان اعظم کی حجاز روانگی

آخری مرتبہ جب خان اعظم بنگالہ سے فتح پور میں آکر باریاب ہوا تو اس نے مذہبی معاملات میں اکبر سے بہت بحث کی تھی اور بادشاہ کے سامنے ابوالفضل اور بیربر سے سخت گفتگو کی تھی اس لیے وہ حاضری میں تامل کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور وجہ یہ تھی کہ اس نے جام کی لڑائی میں اپنی منت کے مطابق داڑھی بھی رکھ لی تھی۔ اکبر نے اس کے نام جو فرمان بھیجا تھا اس میں طنزاً یہ بھی لکھا تھا کہ تیری "داڑھی اتنی بوجھل ہے کہ تجھے آنے نہیں دیتی ہے" اس کے جواب میں خان اعظم نے ایک طویل اور نہایت سخت عریضہ روانہ کیا۔ یہ جواب بادشاہ کے دل میں کھٹک گیا۔ منافقوں نے بھی اس کے خلاف بڑی لگائی بجھائی کی۔ دربار کا یہ رنگ دیکھ کر خان اعظم اسی سال یکم رجب کو اپنے اہل وعیال کے ہمراہ تمام مال وخزانہ لے کر ایک جہاز میں جو ناگڑھ سے بندر دیو کو چلا گیا اور حجاز چلے جانے کا ارادہ کرلیا۔ اس کی روانگی کی تاریخ ایک عددی کمی سے یہ کہی گئی ہے:

بجای راستان شد خان اعظم دلی در زعم شاہنشاہ کج رفت
چو پرسیدم زدل تاریخ این سال گفتا میرزا کوکہ بہ حج رفت

اس کا یہ جرأت مندانہ اقدام بلاشبہ ابن ادہم کے ترک سلطنت کے مشابہ تھا۔

امرائے گجرات کے تبادلے

بادشاہ کو جب خان اعظم کے چلے جانے کی خبر ملی تو مالوہ میں شاہزادہ مراد کے پاس فرمان گیا کہ اسے گجرات کی حکومت سپرد کی جاتی ہے۔ اس کی وکالت کے لیے اسماعیل قلی خان کے بجائے محمد صادق خان کو مقرر کیا گیا۔ سورت اور بھڑوچ کا علاقہ بھی قلیچ خاں سے لے کر صادق خان کی جاگیر میں دے دیا گیا۔

زین خاں کوکہ اور آصف خان نے جو سواد اور بجوڑ کے پٹھانوں اور جلالہ تاریکی

(روشنائی) کی بغاوت پر مقرر کیے گئے تھے، حملہ کر کے بہت سے پٹھانوں کو قتل کر دیا اور اس کے بھائی وحدت علی کو اس کے اہل قبیلہ کے ساتھ جو تقریباً 14 ہزار آدمی تھے، قید کر لیا اور اسی سال دربار میں بھجوا دیا۔

29 ذی قعدہ کو مالوہ کی حکومت شاہرخ میرزا کو سپرد کی گئی۔ شہباز خاں کنبو 3 سال سے قید میں تھا، اس سے 7 لاکھ روپیہ نقد لے کر کانگڑہ کے قلعے سے بلا کر رہا کر دیا۔ اسے شاہرخ میرزا کی وکالت اور مالوہ کے نظم و نسق پر مقرر کیا گیا۔

شیخ مبارک کی وفات

17 ذی قعدہ 1001ھ/1592ء کو شیخ مبارک دانشمند کا انتقال ہو گیا، اس کے لڑکوں نے تعزیت میں اپنے سر کے بال، داڑھی، مونچھیں اور ابرو منڈوا دیے۔ ان کی تاریخ وفات ملک الشعراء فیضی نے "فخر الکمل" اور میں(89) نے "شیخ کامل" نکالی۔

میرزا رستم کی آمد

8 محرم 1002ھ/1593ء کو میرزا رستم بن سلطان حسین میرزا، بہرام میرزا بن شاہ اسماعیل صفوی جو ملک داور اور اس کے نواحی علاقے کا حاکم تھا اور قندھار و گرمسیر پر اس کے بڑے بھائی میرزا مظفر حسین کی حکمرانی تھی۔ اپنے بھائی سے ناراض ہو کر اپنے تمام اہل و عیال کے ساتھ ہندستان آ گیا اور بادشاہ کے پاس حاضر ہوا۔ اس کے استقبال کے لیے بادشاہ نے حکیم عین الملک کو بھیجا تھا اور اس کے لیے سراپردہ، قالین اور فراش خانہ کا دوسرا ساز و سامان، مرصع کر پٹہ اور خنجر بھی روانہ کیا۔ جب وہ لاہور سے 4 کوس پر پہنچا تو حسب الحکم خان خاناں زین خان کوکہ اور دوسرے تمام اکابر امراء پیشوائی کے لیے روانہ ہوئے۔ حاضری کے وقت اس کو ایک کروڑ تنکہ نقد انعام دیا گیا اور 5 ہزاری امراء میں اس کو داخل کیا گیا اور ملتان اس کی جاگیر میں دیا گیا۔

دکن کی مہم پر دانیال اور خانخاناں کا تقرر

ملک الشعراء شیخ فیضی کچھ دن پہلے دکن سے آ چکا تھا اس کی آمد کے 4 مہینے بعد دکن کے

حکام کے ایلچی دربار میں آئے۔ چونکہ برہان الملک نے خاطر خواہ پیش کش نہیں بھیجی تھی۔ اکبر نے 21 محرم کو شاہزادہ دانیال کو دکن کی مہم پر مقرر کیا۔ خانخاناں اور رائے سنگھ اس کے وکیل مقرر ہوئے اور دوسرے بہت سے امراء ہمراہی کے لیے نامزد کیے گئے۔ اس مہم پر روانگی سے پہلے بادشاہ نے شہزادہ دانیال کا خانخاناں کی بیٹی سے نکاح کرا دیا۔ اس خوشی میں ایک شاندار جشن منعقد ہوا۔ شاہزادے کو اس قدر نقد روپیہ اور مال واسباب جہیز میں ملا کہ ایک لشکر کا پورا سامان اس سے ہو سکتا تھا۔ شادی کے بعد اکبر نے دانیال کو تمام شاہی لوازمات اور شان وشوکت کا سامان عطا کر کے اس مہم پر رخصت کر دیا۔ خود بھی اس کے پیچھے شکار کے ارادے سے سلطان پور کی ندی تک جو لاہور سے 25 کوس پر ہے، گیا۔ وہاں پہنچنے کے بعد بادشاہ کی رائے بدل گئی اور شاہزادے کو واپسی کا حکم دے کر خان خاناں کو بھی جو سرہند تک پہنچ چکا تھا، مشورے کے لیے بلوایا اور اس کو لشکر کا مستقل سردار بنا کر اور مہم کے ضروری انتظامات کر کے دوبارہ لشکر کو رخصت کر دیا اور خود وہاں سے لاہور لوٹ آیا۔

جمعہ کے دن 18 جمادی الثانی 1002ھ/ 1593ء کو میاں شیخ داؤد نے انتقال فرمایا۔ ان کی تاریخ "جان پاک شیخ داؤد" نکالی گئی۔

میں[90] یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہاں تک جتنے واقعات بیان کیے گئے ہیں، ان میں سے اکثر کا ماخذ "طبقات اکبر شاہی" ہے جس کا نام میں نے تاریخ کی رو سے "نظامی" رکھا ہے۔ یہ نام اس کے مصنف نے بھی پسند کیا تھا اور اسے اپنی کتاب کے ساتھ درج کیا تھا۔ اس کے بعد 2 سال کے واقعات میں مجملاً بیان کرونگا۔

اکبر کی حکومت کا انتالیسواں سال اور کوتوالی کے انتظامات

منگل کے دن 28 جمادی الثانی 1002ھ/ 1593ء نوروز منعقد ہوا اور سلطان کی تخت نشینی کا انتالیسواں سال شروع ہو گیا۔ حسب سابق 18 دن تک بڑے عیش وطرب کے ہنگامے گرم

رہے اور نئے نئے قوانین کا اجرا ہوا۔ کوتوالوں کو حکم دیا گیا کہ ہر شہر کا کوتوال اپنے شہر کے تمام محلوں اور گھروں کے حالات سے باخبر رہے اور میر محلہ سے اس بات کا مچلکہ لکھوا لے کہ جو شخص تاجر یا سپاہی یا کوئی اور پیشہ ور ان کے محلے میں آکر ٹھہرے وہ ان کے حالات سے باخبر رہے گا۔ کسی مفسد یا چور کو اپنے محلہ میں رہنے نہیں دے گا۔ جس آدمی کا خرچ اس کی آمدنی سے زیادہ دکھائی دے اس کی تحقیقات کر کے کوتوال کو باخبر کر دے گا، کیوں کہ اس کی فضول خرچیاں ناجائز آمدنی ہی کے سبب ہو سکتی ہیں۔ محلے میں خوشی اور غمی کی جو تقریبات ہوں، خصوصاً نکاح، ولادت اور قتل وغیرہ کے واقعات سے محلے والے کوتوال کو لازماً آگاہ کر دیا کریں۔ کوتوال ایک معتبر آدمی ہمیشہ ہر محلہ، گلی بازار اور پانی کی گزرگاہ پر مقرر رکھے اور لوگوں کی اچھائی برائی کو اپنی نظر میں رکھے۔ راستوں کی ایسی ناکہ بندی کی جائے کہ بھاگا ہوا کوئی شخص یا بھولا بھٹکا آدمی بچ کر نہ جا سکے۔ کوئی سوداگر بغیر اجازت گھوڑے نہ لے جائے اور سوداگر ہندستان سے غلاموں کو لے کر نہ جا سکیں۔

لین دین کے قاعدے

سونے چاندی اور کپڑوں کا دام بھی مقرر کیا گیا کہ ان کا لین دین سرکاری شرح پر ہو اور منافع پر مقرر ٹیکس سرکاری خزانے میں داخل کیا جائے۔ مُردوں کے مال پر ایک داروغہ مقرر کیا جائے تاکہ تحقیقات کے بعد اگر اس کے ذمے کچھ سرکاری بقایا ہو یا مرنے والا کروڑی، علمدار یا فوطے دار ہو تو اس کا مال ضبط کر لیا جائے ورنہ اس کے وارثوں کو دے دیا جائے۔ جب تک بیت المال کے داروغہ کی اجازت نہ مل جائے، مُردوں کو دفن نہ کیا جائے۔

آفتاب کی تعظیم کے لیے قبرستان کا دروازہ شہر کی مشرقی جانب رکھا جائے۔ اگر کوئی "درشنی مرید" مر جائے تو خواہ مرد ہو یا عورت کچا اناج اور چند پکی اینٹیں اس کی گردن پر باندھ کر دریا میں بہا دیں، جہاں پانی نہ ہو وہاں اس کی میت جلا دی جائے یا چینیوں کی طرح کسی درخت پر اسے باندھ دیں۔

شادی کے قانون

نکاح سے پہلے دولھا اور دلہن کو کوتوالی میں لا کر جب تک کوتوال کے گماشتوں سے ان کی عمروں کی تحقیق نہ کر لی جائے اس وقت تک ان کا نکاح نہ کیا جائے۔

مندرجہ بالا قوانین سے عوام کو جو فائدہ یا نقصان ہوا وہ ہوا، لیکن ان کے نفاذ سے کوتوالی کے ملازمین اور تمام بدمعاشوں کی خوب بن آئی اور انھوں نے رشوت میں اپنے ہاتھ خوب رنگے۔

ایک حکم یہ دیا گیا کہ جو عورت اپنے شوہر سے 12 سال بڑی ہو شوہر اس سے صحبت نہ کرے۔ جو نوجوان عورت شہر کی گلیوں اور بازاروں میں بے پردہ گھومتی نظر آئے یا ایسی مکار عورت جو شوہر سے لڑتی جھگڑتی رہتی ہو، فاحشہ عورتوں کے محلے میں بھجوا دی جائے۔

بھوک اور اضطرار کی حالت میں ماں باپ کو اس کا اختیار ہے کہ وہ اپنے بچوں کو فروخت کر دیں اور جب ان کی تنگی ختم ہو جائے تو وہ روپیہ دے کر اپنے بچوں کو چھڑا لیں۔

تبدیلی مذہب کی آزادی

وہ ہندو جو بچپن میں یا جبراً مسلمان بنا لیے گئے ہوں، انھیں اختیار ہوگا کہ اگر چاہیں تو دوبارہ اپنے آبائی مذہب کو اختیار کر لیں۔ مذہب تبدیل کرنے پر کوئی پابندی نہ لگائی جائے۔ جو شخص جس مذہب کو چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ اگر کوئی ہندو عورت کسی مسلمان پر فریفتہ ہو کر مسلمان ہو جائے تو اسے زبردستی اس کے آدمیوں کے سپرد کر دیا جائے۔

بت خانہ، گرجا اور آتش کدہ کسی بھی عبادت گاہ کی تعمیر میں غیر مسلمانوں پر کوئی پابندی نہ لگائی جائے۔

ملکی قوانین کی تفصیلات

یہ چند احکام تھے جن کا تعلق مذہبی معاملات سے تھا ان کو مختصراً لکھ دیا گیا۔ ان کی تفصیل طرح سارے قوانین جو ملکی اور مالی امور سے

قو تحریے

متعلق ہیں جیسے بیوتات، دار الضرب، فوج، رعیت، سوداگری، چوکی، واقعہ نویسی، کروڑی، داغ و محل، ہاتھیوں کی لڑائی، ہرن، چیتا، مرغ، بکری، کتے اور سور کی لڑائی۔ اسی طرح اصطبل کے ضوابط، کھانے پینے، سونے اٹھنے کے اوقات کا تعین غرض چھوٹے بڑے سارے معاملات سے متعلق جو قاعدے، ضابطے بنائے گئے انھیں بیان کرنے کے لیے بھی ایک عمر اور ایک دفتر چاہیے۔ یہ تفصیلات "اکبر نامہ" کے دوسرے دفتر آئین اکبری میں جسے علامی شیخ ابو الفضل نے ایک ضخیم جلد میں تصنیف کیا ہے، دیکھی جاسکتی ہیں۔

تاریخ الفی کی تصحیح و ترتیب

تاریخ الفی کے تین دفتروں میں سے دو دفتر تو ملا احمد ٹھٹھہ رافضی نے اور تیسرا دفتر آصف خان نے لکھا تھا۔ ان تینوں دفتروں کی تصحیح اور مقابلے کا کام میرے[92] سپرد کیا گیا تھا، میں نے یہ کام ملا مصطفیٰ کاتب لاہوری کی مدد سے جو بڑا اچھا مددگار تھا اور احدیوں میں ملازم ہے، انجام دیا اور اس کے پہلے دفتر کو مکمل کر کے اس نوروز کے جشن میں شرف آفتاب کے دن ملاحظہ شاہی میں پیش کیا۔ بادشاہ نے اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور فرمایا کہ اس نے انتہائی تعصب کے ساتھ لکھا ہے اس لیے اس کے دوسرے دفتر کی بھی تصحیح کردو۔ میں[93] نے ایک سال میں اس کا مقابلہ اور تصحیح بھی کردی، لیکن اس خوف سے کہ مبادا مجھ پر بھی تعصب کا الزام آجائے میں نے اس کے اصل مضمون میں زیادہ تبدیلی نہیں کی، بس سنین وغیرہ کی ترتیب درست کردی اور اس کو اسی حال میں رہنے دیا تاکہ میرے ساتھ کوئی نئی پرخاش پیدا نہ ہوجائے۔

فیضی کی غیر منقوط تفسیر

انہی دنوں ملک الشعراء شیخ فیضی نے قرآن کی ایک تفسیر "سواطع الالہام" کے نام سے لکھی، جس کی ضخامت 75 جز کی تھی اور اول سے آخر تک غیر منقوط تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نے 99 غیر منقوط فقروں سے اس کی تاریخ بھی نکالی اور اس کے چند جز اشاعت کے لیے

عراق بھجوائے۔ اس سال فیضی اس کی تصحیح و مقابلے میں مصروف ہے۔ اس نظر ثانی کی تاریخ ''اسرار ثانی'' سے نکلتی ہے۔ اکثر عالموں نے اس کی تفسیر پر تقریظیں لکھی ہیں۔ شیخ یعقوب کشمیری نے عربی زبان میں تقریظ لکھی۔ میاں امان اللہ سرہندی نے اس کی تاریخ نکالی۔ ''وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتَابٍ مُّبِیْن'' میر محمد حیدر معمائی نے تسمیہ کو چھوڑ کر پورے سورۂ اخلاص سے اس کی تاریخ نکالی، میں[94] نے ''من احسن التفاسیر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم علم القرآن'' سے تاریخ نکالی۔ ایک تقریظ بھی میں نے اس پر لکھی جس کا ذکر مناسب مقام پر آئے گا۔ میں[95] نے لاہور کی شکارگاہ میں جو 30 تاریخی فقرے نکالے تھے ان میں سے چند یہ ہیں۔ ''الحمد للہ لحصل المرام اکرم سواطع الالہام'' ''اللھم المحرر وحدہ لاطراء س الکلام''۔ ''حدود اسرار کلام اللہ المرسل در رالسرز''۔ ''سمو السرو الدرز علو''۔ وغیرہ۔

ماہ صفر 1002ھ/ 1593ء میں خواجہ ابراہیم حسین احدی جو میرے[96] خاص آدمیوں میں سے تھا، فوت ہوگیا۔ اس نے ''خواجہ ابراہیم حسین'' تاریخ پائی۔

اس سال میں نے توفیق خداوندی سے کلام پاک کی روشن اور صاف خط نسخ میں نہایت صاف کتابت کی اور اسے پورا کرکے یہاں شیخ حسین والی کے روضے کے لیے وقف کرا دیا۔

محمد قاسم خاں میر بحر کا قتل

اسی سال 17 ذی قعدہ کو محمد قاسم خاں میر بحر اور میرزا محمد زمان جو شاہرخ میرزا کا لڑکا تھا، کابل میں مارے گئے۔ محمد زمان میرزا حج سے واپسی کے بعد بدخشاں آیا۔ بدخشاں والے اوزبکوں کے ظلم وستم سے تنگ آچکے تھے انھوں نے اسی کو اپنا سردار بنا لیا اور ہندستان کی مدد کے بل پر بڑی بہادری سے اوزبکوں پر حملہ کردیا۔ بعد میں اوزبک ایک بڑی فوج لے کر محمد زمان میرزا کے مقابلے پر آئے وہ اپنی قوت سے چند سال تک برابر اوزبکوں سے لڑتا رہا اور آخر کار شکست کھا کر بھاگا اور چودہ پندرہ ہزار سواروں کے ساتھ ہندستان پر حملہ

کرنے کے ارادے سے کابل کے علاقے میں پہنچا۔ یہاں پہنچنے کے بعد اسے لوگوں نے بہکایا تو کابل کے لیے اس کی نیت ڈانواڈول ہوگئی۔ اس کے ارادے کو بھانپ کر کابل کے حاکم نے جو اس وقت محمد قاسم خان تھا۔ اس نے اس کو گرفتار کر لیا، مگر وہ اس کے ساتھ نہایت تعظیم و تکریم کے ساتھ پیش آیا اور اسے گھوڑا، خرچ اور خلعت دے کر 150 سواروں کو اس کی ہمراہی کے لیے مقرر کر دیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ میرزا کو لاہور بھجوا دے۔ اسی اثناء میں محمد قاسم خان کے بعض بدخشی اور کابلی ملازموں نے میرزا سے سازباز کی اور دوپہر کو سرکاری حویلی کا دروازہ توڑ کر زبردستی اندر داخل ہوگئے اور خواب گاہ میں جا کر محمد قاسم خان کو تہہ و تیغ کر ڈالا۔

محمد ہاشم ولد محمد قاسم خاں اس وقت قلعے سے باہر تھا، اس نے توپچیوں اور محافظ دستے کی ایک جمعیت لے کر میرزا محمد زمان کا محاصرہ کر لیا اور ایک دن ایک رات مسلسل جنگ کر کے میرزا کو قتل کر دیا اور اس کا سر دربار میں بھجوا دیا۔

اس واقعے کے بعد بادشاہ نے محمد قلیج خاں کو جو کچھ عرصے تک جملۃ الملک رہ چکا تھا، کابل کی صوبت پر مقرر کر کے روانہ کر دیا۔ دیوان مطلق کے عہدے پر تمام ملکی اور مالی معاملات سرانجام دینے کے لیے خواجہ شمس الدین محمد خوافی کا تقرر عمل میں آیا۔ انہی دنوں آصف خاں بخشی کو کشمیر کے انتظامی معاملات اور فوجی مہمات کی تحقیق و انتظام کے لیے روانہ کیا گیا۔

میں[۱۴۳] بعض ناشائستہ عادتوں میں مبتلا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس سال مجھے توبہ کی توفیق عطا کی اور میں نے اپنی بداعمالیوں کی سچے دل سے توبہ و استغفار کی۔ اس توبہ کی تاریخ لفظ "استقامت" سے حاصل ہوئی۔ میری توبہ پر ملک الشعراء فیضی نے یہ شعر کہا:

لقد تاب شیخی عن الحوبہ
تاریخہ سابق التوبہ

غرض یہ کہ:

رفت از سرم اندیشہ می و معشوق
بشد زخاطرم آواز بربط و طنبور

محرم 1003ھ/1593ء کے شروع میں شیخ فرید بخاری کو جو ان دنوں آصف خان کے ساتھ نائب بخشی کے عہدے پر مقرر تھا، حکم دیا گیا کہ وہ شمالی پہاڑی پر فوجی حملہ کر کے وہاں کے باغی راجاؤں کو اطاعت پر مجبور کرے اور وہاں کی زمین کی جمعدانی کر کے عمدہ پیش کش لے کر آئے۔

سفر کے شروع میں بادشاہ نے راوی ندی کو پار کیا اور اس علاقے میں 25 دن تک سیر و شکار میں مصروف رہا۔

نل دمن داستان کی تصنیف

انہی دنوں بادشاہ نے ملک الشعراء فیضی کو "پنج گنج" تصنیف کرنے کا حکم دیا۔ اس نے تقریباً 5 ماہ کی مدت میں ہندستان کی مشہور عشقیہ داستان "نل و دمن" کو 4 ہزار سے کچھ 200 کم اشعار میں مرتب کر کے شاہی خدمت میں چند اشرفیوں کے نذرانے کے ساتھ پیش کیا۔ یہ کتاب بادشاہ کو نہایت پسند آئی۔ اس کی کتابت اور مصوری ہونے کا حکم دیا گیا اور نقیب خاں کو پڑھ کر سنانے پر مقرر کیا گیا۔ اس کتاب کا مطلع ہے:

ای درنگ و پوئی تو آغاز
عنقای نظر بلند پرواز

واقعتاً یہ ایک ایسی مثنوی ہے کہ ان 300 سال میں امیر خسرو کے بعد شاید ہی کسی نے ہندستان میں ایسی مثنوی لکھی ہو۔

مرزا نظام الدین احمد کا انتقال

میرزا نظام الدین کی قلیچ خاں کے ساتھ ہمیشہ ان بن رہتی تھی۔ آہستہ آہستہ میرزا کا بادشاہ کے مزاج میں بڑا دخل ہوگیا۔ اس نے مفوضہ فرائض بھی نہایت دیانت داری، محنت اور خلوص سے سرانجام دیے۔ اس کی حسن کارگزاری کا یہ اثر ہوا کہ بادشاہ نے قلیچ خاں اور دوسرے مقربین کو تو مختلف مقامات پر تقرر کر کے دربار سے علیحدہ کر دیا لیکن نظام الدین

احمد پر بادشاہ کی عنایات پہلے سے کہیں زیادہ مبذول رہیں۔ بادشاہ نے اس گوہر قابل کی صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا، لیکن تقدیر کے فیصلے انسانی ارادوں کے پابند نہیں ہوتے۔ نظام الدین احمد اپنی ترقی اور اقتدار کے اس دور عروج میں تپ محرقہ میں مبتلا ہو گئے۔ اس وقت انکی عمر 45 سال تھی۔ اس مرض میں وہ دیکھتے ہی دیکھتے ہم تمام دوستوں کو آبدیدہ چھوڑ کر عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گئے۔ ان کے حسن اخلاق نے سب کو ہی گرویدہ بنا رکھا تھا، لیکن خاص طور سے میرا ان کا تعلق نہایت بے غرضانہ اور مخلصانہ تھا۔ انکی موت کا مجھے[98] بے حد صدمہ ہوا۔ اشک بہانے اور صبر کرنے کے اور کیا چارہ تھا؟ میں[99] نے اس صدمے کے بعد فیصلہ کر لیا کہ کسی کی محبت کا دم بھرنا اس دنیا میں بے فائدہ ہے۔ ان جیسے دوستوں سے تو گوشۂ عزلت ہی زیادہ بہتر ہے۔

نظام الدین احمد کی وفات 3 صفر 1003ھ/1594ء میں ہوئی۔ ان کی میت لشکر سے لاہور میں لائی گئی اور ان کے اپنے باغ میں تدفین عمل میں آئی۔ ان کے جنازے پر خاص کیا؟ عام کیا؟ سبھی زار زار رو رہے تھے۔ لوگ ان کے حسن اخلاق اور حسن سلوک کے قصے یاد کر کے بڑی حسرت کا اظہار کر رہے تھے۔ ان کی وفات کی تاریخ کے لیے یہ قطعہ موزوں ہو گیا:

رفت میرزا نظام الدین احمد — سوی عقبیٰ چست وزدنیا رفت
جوہر او زبس کہ عالی بود — در جوار ملک تعالیٰ رفت
قادری یافت سال تاریخش
گوہر بی بہا ز دنیا رفت

انہی دنوں بادشاہ نے شیخ فرید کو جس کو بخشی گری کی تقریباً تمام ذمہ داریاں سپرد ہو چکی تھیں اور وہ پہاڑوں میں سوالک کے علاقے پر حملہ کرنے گیا ہوا تھا، واپس بلا لیا اور اس کی جگہ قاضی حسین قزوینی کا تقرر کر دیا گیا۔

اعظم خان کی واپسی اور بے راہ روی

انہی دنوں اعظم خاں جو مکہ گیا ہوا تھا وہاں کے امراء کے ہاتھوں تنگ آ کر حج سے ہندستان واپس آ گیا۔ اب جو وہ لوٹ کر آیا تو اس کی شان بے نیازی جاتی رہی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی ساری پسندیدہ خصوصیات کو خیر باد کہہ دیا اور بادشاہی مریدوں میں داخل ہو کر تعظیم و تسلیم کے تمام مقررہ لوازمات کی اطاعت کی۔ بادشاہی سجدہ بھی کیا۔ اس تبدیلی کے بعد دربار شاہی میں اس کا چراغ جلنے لگا اور محفلوں، گفتگو گویا ہر جگہ اور ہر موقعے پر وہ پیش پیش نظر آنے لگا۔ بادشاہ نے اسے غازی پور اور حاجی پور کا صوبہ جاگیر میں عطا فرمایا اور وہ ابوالفضل کے پاس بیٹھ کر نئے مذہب کے احکام سیکھنے لگا۔

اکبر کی حکومت کا چالیسواں سال

اس سال 9 رجب 1003ھ/1594ء کو نوروز منعقد ہوا اور شاہی حکومت کا چالیسواں سال شروع ہوا۔ نوروز کے جشن کی ساری تیاریاں حسب معمول سرانجام پائیں۔

مہابھارت کی ایک حکایت

نوروز سے دو دن پہلے بادشاہ نے مجھے[100] دیوان خانہ خاص و عام کے جھروکے میں بلوایا اور براہ راست مجھے کچھ کہنے کے بجائے ابوالفضل کو مخاطب کر کے فرمایا: "ہم فلاں کو (اشارہ میری طرف تھا) صوفی مشرب نوجوان سمجھتے تھے، لیکن اس نے اپنے آپ کو ایسا متعصب فقیہ ظاہر کیا ہے کہ کوئی تلوار ایسے تعصب کی رگ کو کاٹ نہیں سکتی"۔ شیخ ابوالفضل نے پوچھا۔ "صاحب! اس نے کس کتاب میں ایسا کچھ لکھ دیا کہ آپ اس کے متعلق یہ ارشاد فرماتے ہیں"۔ اکبر نے فرمایا: "اسی رزم نامہ یعنی مہابھارت میں کل رات ہم نے اس کی تحریر پر نقیب خاں کو بھی گواہ بنایا ہے"۔ شیخ نے کہا "اس سے غلطی ہو گئی"۔ اس وقت مجبوراً آگے بڑھ کر کہنا پڑا: "کمترین تو بس ایک مترجم ہے اس سے زیادہ نہیں، جو کچھ ہندی کے عالموں نے ترجمانی کی تھی میں نے اس کا اسی طرح ترجمہ کر دیا۔ اگر اپنی طرف

سے میں نے کچھ بڑھا یا ہو تو یقیناً قصوروار ہوں"۔ شیخ نے بھی اس بات کی تائید کی اور بادشاہ سلامت خاموش ہو گئے۔

اس اعتراض کا سبب یہ تھا کہ رزم نامہ میں، میں نے ایک حکایت نقل کی تھی جس کا مضمون یہ تھا کہ "ایک پنڈت نے عالم نزع میں حاضرین کو نصیحت کی کہ انسان کو چاہیے کہ وہ غفلت و جہالت ترک کر کے سب سے پہلے اس صانع حقیقی کو پہچانے اور علم و حکمت کا راستہ اختیار کرے اور بے علم بے عمل پر جس کا کوئی نتیجہ نہیں [illegible] بھروسا نہ رکھے۔ حسن عمل کو اختیار کرے تا بحد امکان جھگڑوں سے بچتا رہے اور اس کا یقین کامل رکھے کہ ہر فعل کی باز پرس ہو کر رہے گی۔ اس موقعے پر میں نے یہ مصرع لکھ دیا تھا۔

ہر عمل اجری و ہر کردہ جزائی دارد

ہندو مذہب میں جزائے اعمال کا تصور

بس یہ عبارت اور یہ مصرع تھا جو کھٹک گیا اور اکبر نے اس کو منکر نکیر کے سوال و جواب، حشر و نشر اور آخرت کے حساب و میزان پر محمول کیا۔ یہ بات چونکہ اس کے عقیدہ تناسخ کے خلاف تھی جس کے سوا وہ کسی اور چیز کو خاطر میں نہیں لاتا تھا اس نے مجھ پر ملا پن اور تعصب پرستی کا الزام لگا دیا۔ یہ بات خوب چھڑی اور اچھا موقع نکل آیا۔ چنانچہ میں نے شاہی مقربان کو بخوبی سمجھایا کہ ہندستان کے تمام لوگ نیکی اور بدی کے اچھے اور برے انجام کے قائل ہیں اور ان کا اعتقاد یہ ہے کہ جب کوئی شخص مرجاتا ہے تو ایک محرر جو بندوں کے نامہ اعمال کو زندگی بھر لکھتا رہتا ہے روحوں کو قبض کرنے والے فرشتے کے سامنے جس کا نام بادشاہ عدل ہے، لے جاتا ہے اور وہ نیکی اور بدی کے اندراجات دیکھ کر اور ان کی کمی و زیادتی کا مقابلہ کر کے حکم کرتا ہے کہ یہ شخص ممیز (نیک) ہے پھر اس نیک روح سے کہا جاتا ہے کہ ہم پہلے تو تجھے جنت میں لے جائیں گے تا کہ تو وہاں اپنی نیکیوں کے برابر لذتوں سے لطف اندوز ہو جائے بعد میں تجھے دوزخ میں ڈالا جائے گا تا کہ تیرے گناہوں کی تلافی ہو جائے۔ اگر تو چاہے تو پہلے تجھے دوزخ میں پھر بعد میں جنت

میں لے جایا جائے۔ جب وہ دوزخ و جنت کی اس مدت کو پورا کر لیتا ہے تو پھر اسے دنیا میں جانے کا حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے اعمال کے مطابق کسی جسم میں حلول کر کے زندگی کی چند گردشوں میں گھومتا رہے، یہاں تک کہ اسے نجات مطلق مل جائے اور وہ دنیا میں آنے اور جانے کی اس زحمت سے چھٹکارہ پالے۔ میری اس توضیح و تقریر پر وہ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

اجمیر کی تولیت کی تجویز

شرف آفتاب کے دن اکبر نے کسی کے کہے بغیر اپنے آپ صدر جہاں کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر فلاں[101] کو ہم حضرت خواجہ اجمیری کے روضے کی تولیت دے دیں تو کیسا رہے گا؟ کیوں کہ اس روضۂ منورہ کا کوئی متولی نہیں ہے۔ صدر جہاں نے کہا یہ بہت اچھی تجویز ہے۔ میں[102] بھی دل سے چاہتا تھا کہ درباری الجھنوں سے کسی طرح نجات مل جائے، اس غرض کے لیے میں نے دو تین مہینے تک دربار میں بڑی کوششیں بھی کیں اور دو تین عرضیاں بھی لکھ کر پیش کیں، لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔

اس سال آخر ماہ رمضان میں صدر جہاں نے شاہی بارگاہ میں عرض کیا کہ فلاں[103] کی رخصت کے بارے میں کیا حکم ہوتا ہے؟ بادشاہ نے فرمایا: ''یہاں بہت سے کام نکلتے رہتے ہیں اور ہم اسے کوئی نہ کوئی خدمت سپرد کرتے رہتے ہیں۔ اس کی جگہ کسی اور کام کے آدمی کو مہیا کرلو تو دیکھا جائے گا''۔ بہر حال خدا کی مصلحت نہیں تھی رخصتی نہ ملی اور میں صبر کر کے بیٹھ رہا۔

انہی دنوں ایک دن میرے سامنے اکبر نے شیخ ابوالفضل سے فرمایا: ''فلاں[104] اجمیر کی خدمت کو بہ حسن و خوبی انجام دے گا، لیکن ہم اس سے جب کسی کتاب کا ترجمہ کراتے ہیں تو وہ نہایت اچھی طرح سے ہمارے خاطر خواہ ترجمہ کر دیتا ہے، اس لیے ہم اسے جدا نہیں کرنا چاہتے''۔ شیخ ابوالفضل اور دوسروں نے اس بات کی تائید کی۔

بحرالاسمار کی تصنیف

اسی سال بادشاہ نے مجھے حکم دیا کہ سلطان زین العابدین کشمیری نے ہندی کی مشہور کتاب "بحرالاسمار" کے نام سے ترجمہ کرایا تھا اور اس کا ایک حصہ باقی رہ گیا تھا اس کا ترجمہ کرکے تکمیل کرو۔ میں نے اس کام کو شروع کر دیا اور اس کتاب کی آخری جلد کو جس کی ضخامت ۶۰ جزو کی تھی ۵ مہینے میں پورا کر دیا۔ اسی اثنا میں بادشاہ سلامت نے خواب گاہ خاص میں مجھے اپنے تخت کے قریب بلوایا اور صبح تک ہر باب کی باتیں کرتے رہے۔ پھر حکم دیا "کہ بحرالاسمار کی پہلی جلد جسے سلطان زین العابدین نے ترجمہ کرایا تھا پرانی اور غیر معروف فارسی میں ہے اس کو بھی تم مروجہ زبان میں تحریر کردو اور اپنے اس ترجمہ کیے ہوئے مسودے کو حفاظت سے رکھے رہو"۔ میں نے زمین بوس ہوکر بسر و چشم اس خدمت کو قبول کر لیا اور اس کام کو شروع کر دیا۔ بادشاہ نے نہایت لطف و کرم کے ساتھ 10 ہزار تنکہ اور گھوڑا انعام میں عطا فرمایا۔ میں نے کہا انشاء اللہ یہ کتاب اگلے دو تین ماہ کے اندر بحسن و خوبی مرتب ہو جائے گی تب کہیں جاکر مجھے وطن جانے کی رخصت مل سکے گی۔

دکن کی مہم پر شاہزادہ مراد اور خان خاناں کا تقرر

اسی سال ہندیہ سے حکیم عین الملک اور شہباز خان کے عریضے پہنچے کہ برہان الملک کو اس کی بدسلوکی سے ناراض ہوکر امراء نے قتل کرا دیا اور ایک 12 سالہ لڑکے کو اس کا ولی عہد بنا کر تخت نشین کر دیا ہے۔ بادشاہ نے ایک فرمان شہزادہ مراد کے اور دوسرا خان خاناں کے نام لکھ کر بھیجا کہ دونوں جلد از جلد کوچ کرکے تسخیر دکن کے لیے سرحدوں پر پہنچ جائیں۔

شاہ بیگ خان کی فوجی کارروائی اور فتح

اسی سال ماہ ذی الحج میں شاہ بیگ خان کابلی قندھار کو چلا گیا اور میرزا مظفر حسین حاکم قندھار بیگ محمد شکار کے ہمراہ دربار میں حاضر ہوا۔ بھاری نذرانوں کے ساتھ قیمتی جواہر بھی پیش کیا۔ بادشاہ نے اس پر عنایت فرمائی شاہ بیگ خان نے داور میں جاکر

اوزبکوں کی ایک بڑی فوج کو شکست دی ان کے اکثر سرداروں کو قتل کردیا اور بقیہ امیروں کو خلعتیں دے کر رہا کردیا۔ اوزبکوں کی ایک جمعیت بھاگ کر قلعے میں بند ہو گئی تھی۔ شاہ بیگ خان نے توپ خانے کے ساتھ قلعے پر حملہ کیا اور اس پر قبضہ کر کے آگے کوچ کردیا۔ گرمسیر کے سارے علاقے پر اس نے بخوبی قابو پالیا۔

بادشاہ نے میرزا رستم کو صوبہ پتھوڑ عطا کیا اور سنبھل کا علاقہ ابو الفضل سے لے کر میرزا قندھاری کو جاگیر میں دے دیا۔ ملتان کو جو میرزا رستم کے مظالم سے تباہ ہو گیا تھا خالصہ میں شامل کرلیا۔ انہی دنوں سعید خان مغل بنگالہ سے حاضر ہوا اور اپنے ساتھ عیسیٰ خان زمیندار کے دیے ہوئے نفیس تحفے، روپیہ اور ہاتھی بطور پیشکش لے کر آیا۔

شیخ یعقوب کشمیری کی وفات

اسی سال شیخ یعقوب کشمیری صوفی جو دربار سے رخصت کر اپنے وطن گیا ہوا تھا، فوت ہو گیا:

یاران ہمہ رفتند و رہ کعبہ گرفتند — ماست قدم بر در خمار بما ندیم

از نکتہ مقصود نشد فہم حدیثی — لادین ولا دنیا بی کار بما ندیم

حکیم عین الملک کا انتقال

حکیم عین الملک راجہ علی خان کے پاس سفیر بن کر گیا تھا، وہاں سے اپنی جاگیر ہندیہ میں لوٹ کر آیا اور 5 مہینے کی بیماری کے بعد 27 ذی الحج 1003ھ/1594ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔ اللہ کی شان ہے کہ تمام دوست اور رفیق ایک ایک کر کے اس دنیا سے اٹھتے جارہے ہیں اور ہم اسی سیاہ دلی اور پریشان حالی کے ساتھ آخرت سے غافل ہیں اور اپنی عزیز عمر کو بیہودہ مشاغل میں گنوا رہے ہیں۔

حکیم حسن گیلانی کا انتقال

3 ماہ محرم 1004ھ/1595ء کو حکیم حسن گیلانی کا بھی انتقال ہو گیا۔ حکیم حسن نہایت درویش

مزاج، مہربان اور صاحبِ اخلاق تھے۔

انہی دنوں محمود شیخ محمد کا لڑکا شیخ موسیٰ گیلانی جو اُچ کے سجادہ نشین شیخ عبدالقادر کا چھوٹا بھائی ہے شاہی ملازمت میں داخل ہوا۔ بادشاہ نے اسے پانصدی کا منصب عطا کیا۔

مفتی صدر جہاں دینِ الٰہی کا مرید

انہی دنوں مفتی ممالک محروسہ صدر جہاں کو ہزاری منصب عطا ہوا اور وہ اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ مریدانِ خاص میں شامل ہو گیا۔ ہزاری کا منصب اسی مریدی کا محنتانہ تھا۔ مرید ہونے سے پہلے اس نے پوچھا "ریش (داڑھی) کے متعلق کیا ارشاد ہے؟" بادشاہ نے کہا [illegible] بادشاہی [illegible] سے [illegible] داڑھی منڈوانی ہے [illegible] "[illegible]" سمجھے ہوئے ہیں۔ آج کل وہ سب [illegible] میں [illegible] ہیں۔ [illegible] آفتاب [illegible] سے [illegible] حلت عظیمہ وصیہ [illegible] ہیں۔ [illegible] شیخ زادہ [illegible] صوفی احمد مطلب مسند صدارت [illegible] جو خود کو حضرت غوث الثقلین کی [illegible] سے بتاتا ہے، مرید بنائے گئے۔ ان سب لوگوں نے "مرتبہ [illegible]" قبول کر لیا اور ایک صدی سے پانصدی تک کا منصب حاصل کر لیا۔ [illegible] سے [illegible] ان کی تاریخ "[illegible]" سے نکلتی ہے۔

"[illegible] کا حال بھی ایسا ہی تھا کہ "ایک ہندو مسلمان ہو گیا، اس خوشی میں لوگوں نے اسے ایک [illegible] پوشاک اوڑھا دی۔ سرخ دوشالہ اوڑھ کر اس نے اپنے لوگوں کی طرف [illegible] سے دیکھا۔ ان لوگوں نے کہا: "احمق یہ کپڑا تو کل پرانا ہو کر پھٹ جائے گا، [illegible] لعنت [illegible] لیے تیری گردن کا ہار بن جائے گی"۔

صوفی احمد مطلب

یہ صوفی احمد [illegible] شخص ہے جو اپنے آپ کو شیخ احمد عسکری مصری کا مرید، بلکہ خلیفہ کامل بتا کر

کہا کرتا تھا کہ: ''میں اس مرشد زمان کے اشارے سے دیار ہند میں آیا ہوں۔ میرے مرشد نے بارہا مجھ سے فرمایا تھا کہ ہندستان کے بادشاہ سے لغزش ہوگئی ہے تو وہاں جا کر اس کی مدد کرے گا اور اسے ہلاکت سے بچائے گا''۔ اب یہ معاملہ ہی برعکس ہوگیا کہ شکار ہی خود شکار کے پھندے میں پھنس گیا۔

لاف زن جولاہہ می گفت من بس ماہرم — شاید ارسا زند فردا بہر جورم علہ باف
آن شنید مستی کہ بادی جولہ دیگر چہ گفت — کای برادر چند لاف اول بیاف آنگہ بلاف

گوسالہ بناری کا معاشقہ

گوسالہ بناری نے شیخ ابوالفضل کے پاس بڑی رسائی پیدا کرلی اور مکاری و چاپلوسی سے کام لے کر بنارس کا کروڑی بن گیا۔ وہاں اس نے خوب کھیل کھیلے اور بنارس کی ایک طوائف سے عشق بازی شروع کردی۔ ملا احمد صوفی مذکور بھی اسی طوائف پر عاشق تھا، بناری نے احمد کو کافی روپیہ دے کر درمیان سے ہٹا دیا اور اپنا ایک نگراں اس طوائف کے دروازے پر مقرر کر دیا۔ طوائفوں کے داروغہ نے یہ سارا حال بادشاہ کے پاس لکھ بھیجا۔ بادشاہ نے ایک محفل تو روزی میں احمد سغلی اور ملا شاہ محمد کی دوصدی جاگیر جو پہاڑ کے دامن میں تھی اور اس پر دونوں کا مشترکہ قبضہ تھا۔ چھین لی اور بناری کو بنارس سے بلالیا۔

ملک الشعراء فیضی کا انتقال

ملک الشعراء شیخ فیضی کئی بیماریوں جیسے ضیق النفس، استسقاء، ورم، خونی قے وغیرہ میں مبتلا ہوگیا تھا، 6 مہینے تک وہ مرض کی سختیاں برداشت کرتا رہا، آخر 10 صفر 1004ھ/1595ء کو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر وہ اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ فیضی کو کتوں کے ساتھ بڑی انسیت تھی اور رات دن ان کتوں میں گھرا رہتا تھا۔ لوگوں کا بیان ہے کہ سکرات کے وقت اس کے منہ سے کتے کی آواز نکل رہی تھی۔ فیضی اسلام کا قطعی منکر اور بے دینی کا منصب حامی تھا، چنانچہ مرنے سے پہلے تک وہ ایک عالم شریعت سے بیہودہ اور کافرانہ باتیں کرتا رہا۔ اس

کی تاریخ وفات ہے:

"دی فلسفی وشیعی وطبیعی و دہری"

ایک دوسری تاریخ ہے" قاعدۂ الحاد شکست"۔ ایک شناسا نے یہ تاریخ کہی:

دیدی کہ فلک چہ مایہ نیرنگی کرد
مرغ دلم از قفس شب آہنگی کرد
آن سینہ کہ عالمی درو می گنجید
تا نیم دمی بر آورد تنگی کرد

نزع کے وقت بادشاہ سلامت آدھی رات کو اس کے پاس تشریف لے گئے اور اس کا سر اپنے ہاتھوں سے تھام کر آوازیں دیں کہ: "شیخ جیو، ہم حکیم علی کو ساتھ لائے ہیں، تم آخر بات کیوں نہیں کرتے ہو؟" وہ اپنے ہوش وحواس کھو چکا تھا کوئی جواب نہ دیا۔ جب دوبارہ بادشاہ نے آواز دی تو اپنی پگڑی زمین پر گرا دی آخر بادشاہ شیخ ابو الفضل کو تسلی اور دلاسہ دے کر لوٹ گئے۔ اسی وقت خبر ملی کہ وہ جاں نثار رخصت ہوگیا۔

حکیم ہمام کی وفات

فیضی کے انتقال سے چند دن بعد ہی 6 ربیع الاول 1004ھ / 1595ء کو حکیم ہمام بھی اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ 7 ربیع الاول کو کمالائی صدر کا انتقال ہوا۔ ان دونوں کا مال و اسباب اسی وقت ضبط کرلیا گیا اور وہ دونوں کفن کے کپڑے تک کو محتاج ہوگئے۔

خاتمہ

یہ دور اکبر بادشاہ کے دور حکومت کے واقعات جو میں نے بیان کیے ہیں وہ ماہ صفر 1004ھ / 1595ء یعنی اکبر بادشاہ کے دور حکومت کے چالیس سالہ دور حکومت پر مبنی ہیں۔ میں نے اپنی جانکاری اور اپنے طور پر یہ سارے حالات ٹھیک طور پر بیان کردیے ہیں۔ بعض سنین کے اندراج میں جو تقدیم و تاخیر، تحریف اور تغیر ہوگیا ہے، اس کا میں ذمے دار

نہیں ہوں بلکہ اس کی ساری ذمے داری اس ماخذ یعنی تاریخ نظامی پر ہے جس سے میں نے یہ منتخب مرتب کی ہے۔ اگر جیتا رہا اور توفیق و اطمینان حاصل ہوا تو انشاء اللہ آنے والے حالات کا بھی میں انتخاب کر جاؤں گا ورنہ جس شخص کو بھی میسر ہو وہ ان حالات کی ترتیب و تسوید کا فرض انجام دے کہ اللہ کی سنت اسی طرح جاری رہی ہے:

مراد ما نصیحت بود گفتیم
حوالت با خدا کردیم و رفتیم

☆☆☆

حواشی

جلوسِ اکبری: جہانگیر نے اپنی توزک میں لکھا ہے: "میرے والد نے چودہ برس کی عمر میں تخت سلطنت پر جلوس کیا تھا۔ بیرم خان نے اس صوبے کے امیروں کو جمع کر کے نیک ساعت میں مضافات لاہور، پرگنہ کلانور میں تخت سلطنت پر بٹھایا تھا"۔ یہ غلطی شاید کاتب سے سرزد ہوئی ہے کیونکہ ہمایوں 7 ربیع الاول کو بالاخانے سے گرا تھا اور 15 ربیع الاول کو اس کی وفات ہوئی۔ اس صورت میں دوسری ربیع الاول کو اکبر کس طرح تخت پر بیٹھ سکتا ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ یہ غلطی طبقات اکبری، مطبوعہ نولکشور، ص 242 میں بھی ہے جہاں دوم ربیع الاول تحریر ہے۔ نظام الدین ہروی نے دوسری جگہ تخت نشینی کے جشن کی تاریخ 2 ربیع الثانی لکھی ہے، اس لیے ایک خیال یہ ہے کہ یہی تاریخ صحیح ہوگی۔ مآثر رحیمی کے مصنف نے "دوپہر کا وقت جمعہ کا دن 7 ربیع الثانی 963ھ لکھا ہے (ص 645) دوسرے بیانات سے مآثر رحیمی کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے، اس لیے اکبر کی تاریخ جلوس 2 ربیع الاول کے بجائے 7 ربیع الثانی یا زیادہ سے زیادہ 2 ربیع الثانی قرین قیاس ہے۔

میر عبداللطیف قزوینی۔ یہ اعاظم سادات حسنی سیفی میں سے تھے والد کا نام قاضی میر یحییٰ تھا۔ میر علاء الدولہ صاحب تذکرہ ان کا بھائی ہے۔ قزوینی شاہ طہماسپ صفوی کے مخالف تھے اس لیے بادشاہ نے ان پر سختی کی اور وہ بھاگ کر گیلان کے پہاڑوں میں چلے گئے۔ جب ہمایوں ایران پہنچا تو ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ 963ھ/1555ء میں ہندوستان آ کر اکبر سے متعلق ہو گئے۔ 5 رجب 981ھ/1573ء کو فتح پور سیکری میں انتقال کیا۔ قلعہ اجمیر میں سید حسین جنگ

سلطان کی درگاہ میں ان کی قبر ہے۔ بحوالہ (مآثر الامراء، ذخیرۃ الخوانین)

بیرم خان کے زوال میں ماہم انگہ، شہاب الدین احمد خان کے علاوہ حمیدہ بانو بیگم کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔

منتخب اللباب، جلد سوم، ص 83 میں لکھا ہے کہ پیر محمد خان دکن کا رہنے والا تھا وہ وہاں پر چار سال کسی جرم میں قید کی سزا کاٹ کر بیرم خان کے پاس چلا گیا تھا۔ بیرم خان نے سب سے پہلے اسے اپنے کتب خانہ کا داروغہ مقرر کیا تھا۔

بیرم خان کی شکست کے نتیجہ کے متعلق مورخوں میں اختلاف ہے۔ اکبری اور جہانگیری دور کے مصنفوں نے بیرم خان کی شکست ہی لکھی ہے، لیکن خافی خان نے لکھا ہے، ان مورخوں نے محض بادشاہ کی رعایت سے اصل واقعہ پر پردہ ڈال دیا ہے ورنہ حقیقت میں شکست خان اعظم شمس الدین انگہ کو ہوئی تھی اور بیرم خان مظفر و منصور ہوا تھا۔ (منتخب اللباب، جلد سوم، ص 149، چاپ کلکتہ)

میں نے جس نسخہ کو ترجمہ کے لیے انتخاب کیا ہے اس کے اصلی متن میں "پیچالی" لکھا ہے جب کہ صحیح لفظ "پھیالی" ہے۔

اکبر نے بوڑھے بیرم خان کے سامنے تین صورتیں رکھی تھی۔

(i) حکومت کی تمنا ہو تو چندیری اور کالپی عطا کر دیا جاتا ہے۔

(ii) مصاحبت منظور ہو سابقہ اعزاز و احترام کے ساتھ ہمارے ہمراہ رہو۔

(iii) حج کا ارادہ ہو تو سفر کا بندوبست کر دیا جائے۔

بیرم خاں نے تیسری صورت قبول کی۔

محمد بیرم خاں ترکمان۔ بیرم خاں کے آباو اجداد کا تعلق ایران کے "قراقو ینلو" نامی ایک ترکمان قبیلے سے تھا اس قبیلے کا ایک سردار علی شکر بیگ ترکمان تیموری خاندان سے وابستہ تھا۔ علی شکر کی اولاد میں شیر علی بیگ ترکمان گزرا ہے۔ یہ مرزا سلطان حسین حاکم ہرات سے لڑتے ہوئے مارا گیا، اس کا بڑا لڑکا یار علی بیگ قندوز کی فتح کے بعد بابر کی ملازمت میں آ گیا۔ بابر نے اسے غزنی کا حاکم مقرر کیا۔ اس کے مرنے پر اس کا لڑکا سیف علی بیگ حاکم ہوا۔ یہی سیف علی بیگ بیرم خان کا باپ تھا۔ بیرم خان بدخشاں میں پیدا ہوا۔ باپ کے مرنے پر بلخ میں جا کر تعلیم حاصل کرتا رہا، جب وہ 16 سال کا ہوا تو ہمایوں کی ملازمت اختیار کر لی، تیموری خاندان سے اس کا ننھیالی

رشتہ بھی تھا۔ (بحوالہ اکبر نامہ مولف ابوالفضل، جلد دوم، ص ۸) بیرم علم کا قدر دان، فن موسیقی کا رسیا، خلیق، منکسار اور منکسر المزاج تھا۔ ترکی اور فارسی دونوں زبانوں پر انھیں عبور حاصل تھا اور انھوں نے دونوں زبانوں میں شعر کہے ہیں۔ بیرم خان نہایت صاحب ذوق اور سخن شناس تھا، اکثر اساتذہ کے کلام پر اس نے تنقید و اصلاح کی ہے اس کے ساتھ ہی وہ نہایت شگفتہ مزاج اور ظریف الطبع بھی تھا۔ میدان جنگ میں ایک ماہر جرنیل بہادر سپاہی تھا تو مسند وزارت پر مدبر سیاست داں اور منتظم حاکم تھا۔ اس کی سخاوت اور فیاضی کا بھی دور دور تک شہرہ تھا۔ اکبر نے 965ھ / 1557ء میں جالندھر میں سلطان بیگم کو بیرم خان کے عقد میں دیا تھا۔ سلیمہ ہمایوں کی بھانجی تھی۔ (بحوالہ توزک جہانگیری، ص 114، جہانگیر نامہ کشوری، ص 66، مآثر الامراء، جلد اول، ص 376) بیرم کی وفات پر اکبر بادشاہ نے اس سے شادی کر لی تھی۔ (بحوالہ مآثر الامراء، جلد دوم، ص 377، منتخب اللباب، جلد دوم، ص 151، جہانگیر نامہ، ص 66)۔

ان عورتوں میں جو باز بہادر کے حرم میں تھیں روپ متی بھی شامل تھی۔ اکبر جب خود تحقیقات کے لیے پہنچا تو اسے دو قیدی عورتوں کی فریاد پہنچی کہ ادہم خاں نے ان کی آبرو ریزی کی ہے۔ اس نے ان عورتوں کو کیمپ میں بلا لیا، لیکن ماہم انگہ نے اپنے بیٹے کے جرم کو چھپانے کے لیے ان مظلوم عورتوں کو قتل کرا دیا۔

جب اکبر ادہم خاں کی تحقیقات کے لیے چلا تو ماہم انگہ نے ایک قاصد کو اس کی خبر دینے کے لیے بھیجا تھا، لیکن اکبر اس سے پہلے سارنگ پور پہنچ گیا۔ ماہم انگہ بھی دوسرے دن وہاں پہنچ گئی اور مال غنیمت پر قبضہ کر کے ادہم خاں کے معاملہ کو دبا دیا۔

ادہم خاں کی ہلاکت: دوسری تاریخوں کی روشنی میں یہ حوالے ملتے ہیں کہ ادہم خاں کو خود اکبر نے گھونسہ مار کر نیچے گرا دیا تھا اور خود ہی جا کر ماہم انگہ کو اس حادثہ کی اطلاع دی۔ "ماہم ہم نے تیرے لڑکے کو قتل کرا دیا ہے"۔ جب وہ مری ہے تو اکبر نے اپنی دایہ کے جنازہ کو کندھا دیا تھا۔ دونوں ماں بیٹے اکبر آباد میں ایک ہی جگہ دفن ہیں۔

ماہم انگہ: تاریخ کی دوسری کتابوں میں ماہم انگہ کی جگہ پر ماہم اناغہ بھی لکھا ہے۔ ماہم انگہ ہمایوں کے ایک وفادار ملازم ندیم خاں کی بیوی تھی یہ وہ عورت ہے جس نے اکبر کی تربیت اور پرورش کی تھی اور اکبر کے ساتھ بیٹوں کی طرح محبت کرتی تھی۔ ادہم خاں اسی کا لڑکا تھا۔ بایزید لکھتا ہے: "اس کی ذات میں کوئی خوبی نہیں تھی نہ عقلمند اور نہ ہی ہوشیار تھی۔ اکبر کی دایہ ہونے کی

وجہ سے اس کو اقتدار مل گیا تھا۔ حمیدہ بانو بیگم، اکبر کی حقیقی ماں سے اس کے تعلقات کشیدہ تھے۔ ابتدائی عہد میں ماہم انگہ صحیح معنوں میں سلطنت کی وزیر اعظم بنی ہوئی تھی، اس کے اشارہ پر بیرم خاں کے مقابلے میں منعم خاں کو آگے لایا گیا تھا۔ اکبر نے عرصہ تک ماہم کے اثر و اقتدار میں بسر کیے۔ جب اس کی عمر 19 سال کی ہوئی تو اس نے اسے اور اس کے بیٹے کو اقتدار سے بے دخل کر دیا۔ ایرانی مورخ انگہ کے لیے اچھے خیال نہیں رکھتا مگر ابو الفضل نے اسے پاک بازی کا گنبد لکھا ہے۔

1۔ جوجک بیگم: ان کا پورا نام ماہ جوجک بیگم تھا۔ کہتے ہیں یہ کوئی خاندانی عورت نہ تھی۔ جب 1546ء میں حمیدہ بانو بیگم قندھار سے کابل چلی گئی، ہمایوں نے اس سے نکاح کر لیا تھا۔ جب اس کے بطن سے ہمایوں کا دوسرا لڑکا مرزا محمد حکیم پیدا ہوا تو اسے ہمایوں نے بیگم کا خطاب عطا کر دیا تھا۔ حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہایت ہوشیار اور بہادر عورت تھی۔ اس نے جس طرح کابل پر قبضہ رکھا اور بڑے بڑے امیروں پر قابو پایا یہ اس کی صلاحیتوں کا ثبوت ہے۔

1۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی: یہ شیخ محمد بن عارف چشتی کے مرید تھے۔ ان کی ایک کتاب 'انوار العیون' ہے۔ صاحب معارج الولایت نے ان کو ولی "مادرزاد" لکھا ہے۔ ان کے پوتے عبدالنبی نے اپنے باپ کے رسالہ "اباحت سماع" سے اختلاف کر کے سماع کے خلاف بڑا مدلل رسالہ لکھا تھا۔ یہ وہ عبدالنبی ہے جس کو اکبر نے صدر الصدور بنایا تھا۔ عبدالنبی کو آخر میں اکبر نے ناراض ہو کر قید کر دیا، جس میں وہ 992ھ / 1574ء میں فوت ہو گیا۔ شیخ عبدالقدوس کی وفات 945ھ / 1538ء میں ہوئی تھی۔ گنگوہ کے مقام پر آپ کا مزار مبارک ہے۔

۔ ہاتھی کا شکار: ہاتھی کے شکار کے مختلف طریقے تھے۔ ایک طریقہ "کھیدہ" کہلاتا تھا۔ اس میں سوار اور پیادہ ہو کر شکار کھیلتے تھے۔ یہ شکار عموماً گرمی کے موسم میں کیا جاتا تھا۔ ڈھول اور نقارہ بجا کر ہاتھی کو بدحواس کر دیا جاتا تھا اور اسے اس قدر دوڑایا جاتا تھا کہ وہ تھک جاتا تھا اور کسی درخت کے سایہ میں سستانے کے لیے کھڑا ہو جاتا۔ شکاری موٹے رسی سے اس کی گردن اور پاؤں کو درخت سے باندھ دیتے، پھر پالتو ہاتھی کے ذریعے اسے مانوس کیا جاتا۔ ایک اور طریقہ "چور کھیدہ" تھا۔ پالتو ہاتھی کو جنگلی ہاتھیوں کی چراگاہ میں چھوڑ دیا جاتا تھا اور مہاوت اس پر اس طرح لیٹ جاتا تھا کہ دکھائی نہ دے۔ جب ہاتھیوں کے غول میں داخل ہوتا تو مہاوت کسی ہاتھی پر کمند پھینک کر اسے بس میں کر لیتا اور اپنے ہاتھی سمیت نکال لاتا۔ ایک اور طریقہ "گاڈ" "بار" اور بہت سارے

ہم سے طے پائے ہی تھے۔

آگرہ کا قلعہ: قلعے کی عمارت لال پتھر کی ہے جس نے چاروں طرف محیط ہے۔ فصیل ستر فٹ بلند ہے۔ قلعے میں ۵۰۰ عمارتیں تھیں۔ قلعے میں شاہی محل، دیوان عام، دیوان خاص، شیش محل، مثمن برج، مچھی بھون، خاص محل، انگوری باغ، موتی مسجد، عمارتیں ہیں۔ ان میں شاہ جہاں کی بنائی ہوئی موتی مسجد نہایت خوبصورت ہے۔ یہ مسجد 1038ھ تا 1048ھ میں تعمیر ہوئی تھی۔ [illegible] نے لکھا ہے "یہ مسجد دنیا کے تمام مسجدوں میں سب سے زیادہ حسین ہے۔ جہانگیر نے تزک میں لکھا ہے "یہاں پرانا قلعہ تھا میرے باپ نے میری پیدائش سے پہلے اس کو گرا کر نیا قلعہ لال پتھر سے بنوایا۔ سیاحت میں ایسا قلعہ دیکھنے میں نہیں آتا۔ یہ قلعہ پندرہ سولہ سال میں مکمل ہوا۔ اس میں چار دروازے اور دو کھڑکیاں ہیں۔ اس کی تعمیر میں 35 لاکھ روپے جو ایران کے مروجہ ایک سو پندرہ تومان اور توران کے ایک کروڑ پانچ لاکھ "خانی" کے مساوی ہے خرچ ہوا ہے۔

بنگال پر شیر شاہ کے وقت سے پٹھانوں کی حکمرانی چلی آرہی تھی۔ یہ بادشاہ برائے نام دہلی کے ماتحت تھے۔ عادل شاہ کے زمانہ میں کرانی افغانوں میں سے چند امیر اور سردار دربار سے ناراض ہو کر بنگال چلے گئے اور وہاں خود مختار حکومت بنالی۔ ان کا سردار تاج خاں تھا۔ سلیمان کرانی اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس نے کٹک، بنارس، جگناتھ، کامروپ اور اڑیسہ تک کے علاقے فتح کیے۔ اس کی زندگی تک اکبر نے بنگال کا رخ نہیں کیا۔ یہ نہایت بہادر منتظم اور دیندار حکمراں تھا۔ ڈیڑھ سو عالم اور مشائخ اس کی صحبت میں رہتے تھے۔ وہ تفسیر، حدیث، نماز، روزہ کا شائق اور اوقات کا پابند تھا۔ اس کے بعد پٹھانوں میں خانہ جنگی اور سازشیں شروع ہو گئیں اور بنگال سے مغلوں کا اثر و رسوخ جاتا رہا۔

میر مرتضیٰ شریفی: یہ حضرت علامہ میر شریف جرجان کے خاندان سے تھے۔

فریدون خاں: مرزا حکیم کا ماموں تھا۔

قلعہ بھکر: ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے: قدیم زمانہ میں قلعہ بھکر کا نام "منصورہ" تھا۔ ابوالفضل کی تائید مشہور مورخ "ابوالفدا" بھی کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے: "منصورہ" وہ شہر ہے جو دریائے سندھ کی ایک شاخ سے جزیرہ کی مانند گھرا ہوا ہے۔ یہ اشارہ غالباً اسی مقام کی طرف ہے جہاں پانچ ندیاں دریائے سندھ سے مل کر بہتی تھیں۔ اس زمانہ میں ملتان سے منصورہ کا فاصلہ بارہ منزل سمجھا جاتا تھا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ شہر بھکر کو ایک مالدار عرب عمر بن حفص نے بسایا تھا اور

خلیفۂ وقت ابو جعفر منصور بن عباس کے نام پر منصورہ نام رکھا تھا۔ مذکورہ قلعہ میں ایک مقام پر "مقیاس الماء" یا "پیمانۂ آب" بنا ہوا ہے۔ یہ بھی غالباً عرب فاتحین کا نصب کردہ ہے۔ اس سے دریا کے اتار چڑھاؤ کی روزانہ کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ دریائے نیل میں بھی اسی طرح کا "مقیاس الماء" یا "پیمانۂ آب" لگا ہوا ہے جس کا ذکر ناصر خسرو (چوتھی صدی ہجری) اور ابن بطوطہ (ساتویں صدی ہجری) جیسے سیاحوں نے اپنے سفر ناموں میں کیا ہے۔

2۔ رانا اودے سنگھ کا تعلق میواڑ کے راجہ خاندان سے ہے۔ یہ راجہ اپنا سلسلہ انوشیروان سے ملاتے ہیں۔ جہانگیر نے اپنے تزک میں 8 جلوس کے حالات میں رانا امر سنگھ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "رانا ہندوستان کے معتبر راجاؤں میں سے ہے۔ اس ملک کے تمام رائے راجا اس کے آباء اجداد کی سرداری کو تسلیم کرتے تھے۔ ایک مدت سے سلطنت اس کے خاندان کے ہاتھ میں چلی آرہی ہے۔ پہلے یہ عرصہ تک مشرقی علاقے کے حکمراں رہے۔ پھر دکن کی طرف رخ کیا اور وہاں کی اکثر ریاستیں فتح کرلیں۔ اور راجہ کی جگہ راول کا لقب اختیار کرلیا۔ پھر میوات کی پہاڑیوں میں داخل ہوئے اور پھر چتوڑ کے قلعہ کو فتح کرلیا۔ اس وقت سے آج تک میرے جلوس کا آٹھواں سال ہے، 1271 سال ہوتے ہیں۔ اس 1010 سال کے عرصے میں اس خاندان کے 26 فرمانروا راول کے لقب سے مشہور ہوئے اور راول سے رانا امر سنگھ تک کہ اب رانا ہے۔ 460 سال میں 26 رانا فرمانروا ہوئے"۔ (جلوس 8، تزک جہانگیری)

اس خاندان کا مشہور راجہ سنگرام، رانا سانگا تھا۔ مارواڑ، جودھپور، اجمیر سے لے کر رام پور اور الور تک کے راجہ اس کے باج گزار تھے۔ اس کی حکومت بیانہ سے دریائے سندھ، مالوہ سے میواڑ تک پھیلا ہوا تھا۔ بابر نے اپنی تزک میں یوں لکھا ہے: "جب میں کابل میں تھا تو رانا نے دوستی کے خطوط لکھے اور یہ کہلوایا کہ آپ دلی پر حملہ کریں میں آگرہ پر حملہ کروں گا۔ لیکن جب میں نے ابراہیم کو شکست دی اور آگرہ بھی فتح کرلیا تو اس نے میری بات تک نہ پوچھی بلکہ کچھ ہی دن بعد کندآباد کا محاصرہ کرلیا"۔

رانا سانگا کے بعد اس کے جانشین کمزور نکلے۔ یہاں تک کہ اکبر نے اودے سنگھ کو شکست دے کر بھگا دیا۔ اودے سنگھ نے بھیل قبیلہ میں پناہ لی اور دشوار گھاٹیوں میں ایک شہر اودے پور آباد کیا۔ وہاں گھاٹیوں میں بند باندھ کر ایک جھیل بھی بنائی جو اب بھی اودے ساگر کے نام سے مشہور ہے۔ 42 سال بعد جب وہ مرا تو اس کا بیٹا پرتاپ جانشین ہوا۔ یہ نسبتاً باپ کے زیادہ جری ا ر

حکم راجہ تھا۔

22۔ چترانگ نامی ایک راجہ نے اس قلعہ کو تعمیر کرایا تھا۔ اس کے نام پر یہ چتراکوٹ کہلایا۔ آخر بگڑ کر چتوڑ ہو گیا۔ راجپوتوں کی مشہور ریاست اودے پور کا یہ سولہویں صدی عیسوی تک پایہ تخت رہا۔ اس قلعہ کی شہرت اس لیے بھی ہے کہ یہاں کے راجپوتوں نے اپنی آزادی قائم رکھنے کے لیے بڑی خونریز لڑائیاں اس جگہ لڑی تھیں۔ مسلمان حکمرانوں میں سب سے پہلے علاء الدین خلجی نے اس کو فتح کیا تھا۔ خلجی کے بعد سلطان محمد تغلق نے اور ایک مرتبہ بہادر شاہ والی گجرات نے اس قلعہ کو فتح کیا تھا۔ آخر میں اکبر نے اس پر قبضہ کر کے راجپوتوں کی کمر توڑ دی۔ اکبر کے وقت یہاں کا حکمراں رانا اودے سنگھ تھا۔

23۔ یہ خاتون راجہ بہارا مل کی بیٹی تھی جو راجہ مان سنگھ کی پھوپھی ہے اور یہی جہانگیر کی ماں ہے۔

24۔ اس وقت اکبر کی عمر 27-28 سال کی تھی شیخ محمد بخاری اور حکیم عین الملک کے کہنے پر اکبر شیخ سلیم کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے دعا کرائی تھی۔

25۔ اس عمارت کا نام رنگ محل تھا۔ اسے اکبر نے شیخ سلیم کے مکان سے متصل مستورات کی قیام گاہ کے لیے بنوایا تھا۔ اسی محل میں شہزادہ سلیم پیدا ہوا تھا۔ بدایونی نے اس کی پیدائش شیخ کے اصل مکان میں بتائی ہے لیکن اکبر نامہ اور مآثر الامرا میں وضاحت سے اس محل کا ذکر کیا گیا ہے۔

26۔ سیکری کے پہاڑ کا نام کوہ اربلی ہے۔ اس کی ایک شاخ کے دامن میں فتح پور آباد ہے۔ سیکری کی آبادی شیخ سلیم اور ان کے مریدوں کے مکانوں سے شروع ہوئی تھی۔ جس غار میں وہ ریاضت کرتے تھے وہ مسجد سنگ تراش میں اب بھی موجود ہے۔ پہلے اس کا نام فتح آباد رکھا گیا تھا۔ اسی جگہ رانا سانگا کو بابر نے شکست دی تھی۔ اسی فتح کی یاد میں یہ نام تجویز ہوا تھا۔ بعد میں یہ شہر فتح پور کے نام سے مشہور ہو گیا۔ جہانگیر اپنی توزک میں یوں لکھتا ہے "شہر 14-15 برس کی مدت میں آباد ہوا"۔ لیکن وہ اس نام کی وجہ تسمیہ گجرات کی فتح لکھتا ہے۔

27۔ شیخ سلیم چشتی بابا فرید گنج شکر کی اولاد میں سے ہیں۔ والد کا نام شیخ بہاؤ الدین تھا۔ آپ کے پردادا شیخ سلیمان دہلی سے لدھیانہ میں آ کر رہنے لگے۔ ان کے انتقال کے بعد 14 سال کی عمر میں آپ اپنے بھائی شیخ موسیٰ سے اجازت لے کر سرہند گئے اور وہاں شیخ مجد الدین سے علم حاصل کیا، وہاں سے عالم اسلام کی سیاحت اور حج کے ارادہ سے روانہ ہوئے۔ تیس سال تک عرب، ایران اور مصر کے اکثر شہروں کی سیاحت کی۔ اس عرصہ میں 14 حج کیے۔ بصرہ میں خواجہ ابراہیم

عرب سے خرقہ حاصل کیا اور شیخ الہند کے نام سے مشہور ہوئے۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد سرہند کے قریب بیدالی میں ڈھائی سال قیام کیا پھر 1533ء میں سیکری تشریف لائے۔ 1554ء میں بحری راستہ سے دوسرا حج کیا اور آٹھ سال حرمین شریفین میں مقیم رہے۔ 1563ء میں ہندوستان واپس آئے۔ شیر شاہ اور سلیم شاہ کے عہد میں آپ کا بڑا اعزاز تھا۔ آپ نے 1563ء میں فتح پور میں خانقاہ تعمیر کرائی۔ یہی خانقاہ شہر فتح پور کی آبادی کا باعث ہوئی۔ آپ کا انتقال جمعرات، 29/رمضان، 979ھ/1571ء کو ہوا۔

28۔ شیخ کے مکان میں شمالی دالان کا نام مجلس دالان تھا۔ یہ انکی نشست گاہ تھی۔ اسی دالان کی چھت پر ایک چھوٹا کمرہ منذف نام کا ہے یہ شیخ کی چلہ گاہ تھی۔ کہتے ہیں اسی میں سلیم پیدا ہوا، دوسرے بیان کے مطابق مکان سے قریب اکبر نے ایک محل تعمیر کرایا تھا۔ اس میں سلیم اور دانیال دونوں پیدا ہوئے۔ (بحوالہ مآثر الامراء، جلد دوم، ص 570، اکبرنامہ، ص 267)

29۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے کہ "یہ حسینی حسنی سادات ہیں۔ باپ کا نام غیاث الدین حسن تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد چودہ سال کی عمر میں ہرون میں جو نیشاپور کے علاقے میں ہے، خواجہ عثمان چشتی کی خدمت میں پہنچے اور خرقہ خلافت حاصل کیا۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے بھی فیض اٹھایا۔ جس سال معز الدین سام نے دہلی کو فتح کیا تھا وہ ہندوستان آئے۔ گوشہ نشینی کی خاطر اجمیر پہنچے اور وہاں دین کا چراغ جلایا۔ ہفتہ کے دن 6 رجب 633ھ/1235ء میں آپ کا وصال ہوا۔

جہانگیر نے اپنی توزک میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے متعلق یوں لکھا ہے: "آپ کا مولد شریف سیستان ہے۔ پہلے بخارا گئے اور علوم ظاہری کی تحصیل کی پھر خراسان آئے پھر قصبہ حرون (ہارون) میں شیخ عثمان ہارونیؒ کے مرید ہوئے اور ان کے حکم سے ہمیشہ وہ سفر میں رہتے تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت ابراہیم ادھمؒ سے ملتا ہے۔ خواجہ قطب الدین اندجانیؒ آپ کے مرید تھے۔ ان کے مرید شیخ فریدالدین شکر گنج ہیں اور ان کے مرید شیخ نظام الدین اولیاءؒ ہیں"۔

30۔ شاہ مدار: ان کا لقب بدیع الدین تھا۔ یہ شیخ محمد طیفوری بسطامی کے مرید تھے۔ ہمیشہ خلوت میں رہتے تھے۔ ہر پیر کو ملاقات کی اجازت تھی۔ جب لوگ جمع ہو جاتے تو وہ کوئی نہ کوئی داستان سناتے۔ اس داستان میں ہر شخص کو اپنی مراد اور سوال کا جواب مل جاتا۔ انہی سے "سلسلہ مداریہ" کے لوگ منسوب رہے ہیں۔ ان کا مزار مکن پور میں ہے۔ ان بزرگ کا زمانہ شیر شاہ کے بعد کا

[illegible] (173 [illegible])

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] 1407 [illegible] 810 [illegible]

[illegible]

[illegible] پٹھانوں کے خلاف [illegible]

[illegible] 1585 میں ہوئی۔ اکبر نامہ اور اقبال نامہ جہانگیری میں اس [illegible]

[illegible] جو خدمت شاہی میں رہتا تھا اور 1011ھ [illegible]

[illegible] 1602 [illegible] خدمت میں آ گیا۔ شہزادہ دانیال اسے [illegible] کہہ کر [illegible]

اس کے بڑے بیٹے کا نام لال تھا۔ 1010ھ 1601ء میں ملازمت چھوڑ کر گنگا کے کنارے وہ سادھو بن گیا۔ لوگوں میں بیربر اور ملا دو پیازہ کے لطیفے بڑے مشہور ہیں مگر میرے خیال میں سب فرضی ہیں۔

36۔ طوطی نامہ: اس کے سنسکرت ماخذ کا نام شک تپتی یعنی طوطے کی ستر کہانیاں ہے۔ اس کا مولف ایک برہمن چنتامنی بھٹ ہے جس نے پوران بھدر کے پنچ تنتر سے عورتوں کی بدچلنی کی کہانیاں لے کر کسی پرانی شک تپتی کی مدد سے یہ کتاب لکھی۔

37۔ سنگھاسن بتیسی: یہ سنسکرت کی قدیم داستان ہے اس کا ہیرو راجا بکرماجیت ہے جس کے نام سے ہندوؤں کا بکری سن منسوب ہے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں بکرماجیت کے تخت پر راجہ بھوج نے مداخلت کی تھی۔ جب بھوج نے بکرماجیت کا سنگھاسن جو 32 پتلیوں کے سروں پر کھڑا ہوا تھا ایک کھنڈر سے نکالا اور اس پر جلوس کرنا چاہا تو ایک پتلی کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس نے ایک داستان سنائی اس طرح پوری 32 پتلیاں 32 داستانیں سناتی ہیں۔ جو سب کی سب راجہ بکرماجیت سے متعلق ہیں۔ انہی داستانوں کا مجموعہ یہ کتاب ہے اور اس کتاب کا سنسکرت میں نام "وکرم چرتر" اور سنہاسن وترشی" ہے اور اس کے مصنف کے متعلق کافی اختلاف ہے۔

38۔ خواجہ امینا: ان کا پورا نام خواجہ امین الدین ترقی تھا۔ تربت خراسان کے رہنے والے تھے۔ ہمایوں کے ایران کے سفر میں خدمت میں حاضر ہوئے۔ بیرم خاں کے معتقد خاص تھے، خواجہ جہان کا خطاب اکبر نے انھیں عطا کیا تھا۔

39۔ منتخب التواریخ کے تصنیف کے وقت تک۔

40۔ صاحب تصنیف یعنی ملا عبدالقادر بدایونی۔

41۔ صاحب تصنیف یعنی ملا عبدالقادر بدایونی۔

42۔ اکبر کے زمانے میں سب سے پہلے کل ممالک محروسہ کی پیائش کرائی گئی۔ البتہ علاؤالدین خلجی کے زمانے میں بندوبست اور مالگذاری کا ایک ضابطہ حاصل ضرور مرتب ہوا تھا۔ ناپنے کے لیے جو جریب استعمال ہوتی تھی وہ پہلے رسی کی تھی۔ اس کے بعد بانس میں لوہے کے حلقے ڈال کر جریب بنائی گئی۔ پہلے لمبائی 50 گز کا تھا اس کے بجائے 60 گز کا طول مقرر کیا گیا۔ کروڑیوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے مالگذاری کا یہ بندوبست ناکام رہا، لوگ اس قدر اس سے تنگ تھے کہ گھر گھر اس پیائش اور کروڑیوں کا رونا تھا۔

43۔ آئین داغ: یہ ترکوں کی قدیم رسم ہے۔ پہلے صرف بادشاہ کی ملکیت کے اظہار کے لیے گھوڑوں پر نشان لگا دیا جاتا تھا۔ بہار کے موسم میں داغ کا جشن منعقد ہوتا تھا، بعد کے وقتوں میں یہ فوج میں بھرتی کا قانون بن گیا۔ ہندوستان میں علاؤ الدین خلجی نے گھوڑوں کی حاضری اور شمار کے لیے داغ کا قانون سب سے پہلے رائج کیا۔ فیروز شاہ تغلق نے جاگیرداری کا طریقہ اختیار کیا اور داغ موقوف ہو گیا۔ شیر شاہ نے دوبارہ آئین داغ کو نافذ کیا۔ اس کے بعد اکبر نے ہی اس کو تازہ کیا۔

44۔ مجھ سے مراد صاحب تصنیف یعنی ملا عبد القادر بدایونی ہیں۔

45۔ صاحب تصنیف یعنی ملا عبد القادر بدایونی۔

46۔ صاحب تصنیف یعنی ملا عبد القادر بدایونی۔

47۔ جزیہ: اکبر سے پہلے بھی غیر مسلموں سے جزیہ لینے کا قاعدہ تھا جو کبھی کبھی موقوف بھی ہو جاتا تھا۔ جزیہ کی معافی کا سن 987ھ ہے۔ اکبر کا ہندوؤں سے وہ معاملہ نہیں تھا جو پہلے سلاطین کا رہا تھا وہ انھیں اپنائے رکھنے کی پالیسی پر کاربند تھا۔ چنانچہ جلوس کے پہلے سال ہی اس نے جزیہ معاف کر دینا چاہا تھا۔ 9 سنہ جلوس میں دوبارہ جب یہ معاملہ سامنے آیا تو علما کی مخالفت کی وجہ سے اس پر پوری طرح عمل نہ کیا جا سکا۔ لیکن عملاً اکثر مقامات پر جزیہ موقوف ہو گیا۔ 983ھ میں اکبر نے دوبارہ جزیہ لگانے کا حکم دیا۔ لیکن جلد ہی منسوخ کر دیا گیا۔ آخر 25 سنہ جلوس 988ھ میں اکبر نے مستقلاً جزیہ کے معافی کا حکم جاری کیا تھا۔

48۔ اہل فرنگ سب سے پہلے اکبر کے دربار میں 979ھ/ 1571ء میں حاضر ہوئے تھے۔ اس وقت ابراہیم حسین مرزا نے بغاوت کر کے سورت پر قبضہ کر لیا تھا۔ اکبر نے جب اس کا محاصرہ کر لیا تو اس نے اپنی مدد کے لیے اہل فرنگ کو بلایا تھا۔ یہ اس کی مدد کو آئے تھے اندر ہی اندر قلعہ پر قبضہ کر لینے کے منصوبے تھے۔ لیکن جب شاہی فوجوں کو فتح ہوئی تو یہ مکار تحفے تحائف لے کر سفیروں کے بھیس میں بادشاہ کے پاس حاضر ہوئے اور خلعت و انعام لے کر رخصت ہو گئے۔ پھر اکبر نے کئی سال بعد خود حاجی حبیب اللہ کاشی کو گوا بھیجا تاکہ وہ یورپ کے تحفے فرنگیوں سے لے کر آئے۔ کاشی یورپ کا ساز و سامان اور اہل ہنر و کمال کی ایک جماعت کو لے کر دربار میں واپس آیا۔

49۔ کورنش: بادشاہوں کے دربار میں سلام کے مختلف طریقے تھے۔ کہیں سینہ پر ہاتھ باندھنے، کہیں سر جھکانے، کہیں دو زانو ہو کر بیٹھنے کا رواج تھا۔ اکبر کے دربار میں سلام کا طریقہ یہ تھا کہ حاضر

ہونے والا ادب سے آ کر سامنے بیٹھے سیدھے ہاتھ کی مٹھی بند کر کے ہاتھ کو پیچھے کر کے زمین پر ٹیکے اور پھر آہستہ سے سیدھا اٹھ کر کھڑا ہو جائے اور سیدھا ہاتھ سر پر رکھ کر اتنا جھکے کہ دہرا ہو جائے، پھر داہنی طرف کو جھوک دیتا ہوا سیدھا ہو جائے۔ اسی کو ''کورنش'' اور تسلیم کہا جاتا تھا۔ اکبر نے یہ طریقہ خود اپنے ایک واقعہ سے اخذ کیا تھا۔ بچپن میں ہمایوں نے ایک مرتبہ اس کے سر پر تاج رکھ دیا۔ اتالیقوں کے اشارے پر اکبر نے سلام کرنا چاہا، چونکہ تاج بڑا تھا اس لیے اسے سنبھالتے ہوئے جھک کر اور سیدھا ہو کر آداب بجالایا۔ اس وقت سہارے کے لیے مٹھی زمین پر بھی ٹکائی۔ ہمایوں کو اس کی یہ ادا پسند آئی اور اس نے حکم دیا کہ کورنش و تسلیم اسی طرح ہوا کرے۔ اکبر نے اس طرح کورنش کا باقاعدہ آئین مقرر کر دیا۔ بعد میں سجدۂ تعظیمی کا حکم دے دیا گیا۔ جہانگیر کے زمانہ میں بھی سجدہ ہوتا رہا۔ جہانگیر نے مجدد الف ثانی کو سجدہ اور کورنش نہ کرنے پر ہی قلعہ میں قید کرا دیا تھا۔ شاہ جہاں نے سب سے پہلا حکم اسی سجدہ کی موقوفی کا دیا۔ شاہ جہاں کے دسویں سال میں کورنش بھی بند ہو گئی۔ صرف شرعی سلام دربار کا سلام مقرر کیا گیا۔

50۔ کتاب الاحادیث: یہ ملا عبدالقادر بدایونی کی مرتبہ ہے۔ انھوں نے یہ کتاب شاہی ملازمت سے پہلے 976ھ/ 1568ء میں اپنے شوق سے لکھی تھی۔

51۔ متن میں پرکھوتم آیا ہے۔ جب کہ ہندو حضرات میں پرشوتم نام معمول ہے۔

52۔ شیخ زماں: بدایونی نے شیخ زماں لکھا ہے۔ اصل نام عبدالملک لقب امان اللہ تھا، شیخ امان پانی پتی کے نام سے مشہور تھے۔

53۔ 'میری'' مؤلف منتخب التواریخ ملا عبدالقادر بدایونی سے مراد ہے۔

54۔ 'میری' یعنی میں سے مراد 'ملا عبدالقادر بدایونی' ہے۔

55۔ تان سین: تان سین کا اصلی نام تانا بینا یا تونا سانا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کی پیدائش اٹلی کی تھی۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پرورش کشمیر میں ہوئی۔ شاید وہ کشمیر ہی میں پیدا ہوا ہو۔ 1567ء میں وہ کشمیر سے لاہور آیا۔ وہاں سے 18 سال کی عمر میں دہلی چلا گیا۔ یہاں ایک بزرگ ملا سلامت کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا اور ان کے ساتھ وہ یکم رمضان 1569ء کو پشاور بھاگ گیا۔ لیکن سرکاری آدمی دونوں کو دہلی پکڑ لائے۔ تان سین کے گانے کی دہلی میں بڑی شہرت تھی۔ اس کو یہاں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ملا سلامت کے مرنے کے بعد وہ دہلی سے آگرہ چلا گیا پھر وہ یہاں چھ ماہ ٹھہر کر بہار اور بنگال چلا گیا اور وہاں وہ داؤد شاہ کے دربار میں ملازم ہو گیا۔ داؤد شاہ

کی شکست کے بعد وہ آگرہ واپس آیا اور کچھ دن رک کر دربار میں حاضر ہوا۔ خان جہاں کے یہاں نو بچے مختلف بیویوں سے ہوئے۔ ان میں سے تین بیٹے تو ملازم ہو گئے اور ایک نے اپنے باپ سے بغاوت کی۔ خان جہاں کا انتقال ۱۵۹۲ء میں ہوا۔ اس کی قبر آگرہ میں تھی جو ۱۸۵۷ء میں تباہ ہو گئی۔

۷۰۔ [illegible] متن میں [illegible] آیا ہے جب کہ ۱۹۸۰ء میں [illegible] ہوا ہے۔

۷۱۔ [illegible] متن میں [illegible] لکھے ہیں۔

۷۲۔ خواجہ نظام الدین احمد: خواجہ نظام الدین احمد ہروی اکبر کے مشہور مورخ تھے۔ ان کے والد خواجہ مقیم ہروی بابر بادشاہ کے دیوان تھے۔ ہمایوں نے بھی ان کو [illegible] بعد میں عسکری کے ساتھ [illegible] تھے۔ ان کے خواجہ نظام الدین احمد کو [illegible] میں [illegible] کا عہدہ ملا تھا۔ ان کی مشہور تصنیف تاریخ سے موسوم ہے یعنی "طبقات اکبری" ہے جو [illegible] سے شروع ہو کر اکبر کے جلوس کے ۳۸ویں سال کے واقعات پر مشتمل ہے۔ آپ نے اکبر کے حکم سے شروع کتاب "تاریخ الفی" میں ملا [illegible]، حکیم ہمام، فتح اللہ شیرازی، ملا احمد اور آصف خان کے ساتھ شریک رہے تھے۔ ملا عبدالقادر نے اپنی اس تصنیف میں "طبقات اکبری" کو ہی "تاریخ نظامی" کے نام سے لکھا ہے۔

۷۳۔ [illegible] متن میں [illegible] لکھا گیا ہے اس میں [illegible] آیا ہے جب کہ [illegible] زیادہ مناسب ہے۔

۷۴۔ ہمارے سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ یعنی ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

۷۵۔ ہمیں سے مراد صاحب تصنیف یعنی ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

۷۶۔ [illegible] یہ تصنیف سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کی گئی تھی۔

۷۷۔ مجھ سے مراد صاحب تصنیف یعنی ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

۷۸۔ آبان: [illegible] میں رائج پارسی مہینہ کا نام ہے جو سال کا چوتھا مہینہ ہے۔

۷۹۔ محمود آباد: متن میں محمود آباد آیا ہے شاید کاتب سے غلطی ہوئی ہے۔ اصل میں یہ محمود آباد ہے۔

۸۰۔ پالک: [illegible] کا نام [illegible] ہے جس کو فارسی میں پالک لکھا جاتا ہے۔

۸۱۔ مجھ سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ یعنی ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

۸۲۔ یہاں مجھ سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ یعنی ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

69۔ میرے نام سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

70۔ میں سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

71۔ مرزا محمد حکیم اکبر کا سوتیلا بھائی تھا جو ماہ چوچک بیگم کے بطن سے تھا جو شاہی خاندان کی عورت تو نہیں تھی البتہ کنیزوں کا درجہ تھا۔ ہمایوں نے اس سے نکاح کرلیا تھا۔

72۔ پنڈی: اب اسے راول پنڈی کہتے ہیں اور پاکستان میں واقع ہے۔

73۔ تاریخ نظامی کی روشنی میں یہ اکبر کے تخت نشینی کا 32واں سال تھا۔

74۔ میں سے مراد صاحب تصنیف ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

75۔ بہار، حاجی پور، پٹنہ مغل دور حکومت میں الگ الگ صوبے تھے۔ انگریزوں کے عہد میں مارچ 1922ء میں بہار صوبہ بنا جس میں یہ تینوں صوبے ایک ہوگئے۔

76۔ میں: صاحب تصنیف یعنی ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

77۔ میں سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

78۔ میں، سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ یعنی ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

79۔ میں، سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ یعنی ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

80۔ مجھے یعنی ملا عبدالقادر بدایونی کو۔

81۔ میری، صاحب تصنیف منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

82۔ مجھے، صاحب تصنیف منتخب التواریخ یعنی ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

83۔ میں، سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ یعنی ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

84۔ مجھے سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ ہے جس کے مؤلف ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

85۔ میں سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ یعنی ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

86۔ مجھے ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے جو صاحب تصنیف منتخب التواریخ ہیں۔

87۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

88۔ میں سے مراد صاحب تصنیف ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

89۔ میں سے مراد ملا عبدالقادر ہیں۔

90۔ میں سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

91۔ میری سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

92۔ یہ سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہے۔

93۔ میں سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہے۔

94۔ میں سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہے۔

95۔ میں سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہے۔

96۔ میرے سے مفہوم ملا عبدالقادر بدایونی ہے۔

97۔ میں سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہے۔

98۔ مجھے سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہے۔

99۔ میں سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہے۔

100۔ مجھے سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہے۔

102۔ میں سے مراد عبدالقادر بدایونی ہے۔

101۔103۔104۔ کہیں جگہ فلاں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

منتخب التواریخ

جلد سوم

فہرست

عہد اکبری کے مشائخین کرام

عہد اکبری کے علماء

عہد اکبری کے حکما

عہد اکبری کے شعرا

عہد اکبری کے مشائخین کرام

نظام الدین احمد مؤلف ''تاریخ نظامی'' نے اپنی تاریخ کے آخر میں شاہی دربار سے منسلک امراء کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ میری نگاہ میں ان امیروں میں سے اکثر زندہ، گمراہ اور بد عمل ہیں کیونکہ:

من وفائی ندیدم زکسان
گر تو دیدی دعائی من برسان

(میں نے کسی سے بھی کوئی وفا نہیں دیکھی اگر تو نے کوئی وفا دیکھی ہو تو میری دعا ان تک پہنچا دے)

ان امراء کی گمراہیوں کی وجہ سے میں نے اپنے قلم کو ان کے فضول تذکروں میں الجھنے نہیں دیا، بلکہ یہ صفحات اس عہد کے بعض مشائخین کرام کے تذکرے سے شروع ہوتے ہیں۔ دور اکبری کے بزرگوں میں سے اکثر رحلت فرما چکے ہیں۔ ان میں سے جو مشہور شخصیتیں ہیں ان کے حالات تحریر کیے جاتے ہیں۔

میاں حاتم سنبھلی

میاں حاتم سنبھلی بہت بڑے عالم تھے۔ مدتوں علوم کا فیض ان کی ذات سے جاری رہا۔ صوری اور معنوی کمالات ان کی شخصیت میں جمع تھے۔ ابھی وہ تحصیل علم میں مشغول تھے کہ

ان پر "حال" غالب آگیا اور قیل و قال کو ترک کرکے اپنے استاد شیخ عزیز اللہ دانشمند طلنبیؒ جو اپنے عہد کے عالم ربانی اور ولی کامل تھے، ان کے مرید ہو گئے۔ شیخ علاؤالدین چشتیؒ دہلوی کی خدمت میں بھی سلوک کے طریقے سیکھے۔ ان دونوں بزرگوں سے تربیت و تعلیم اور مرید کرنے کی اجازت حاصل کی۔ جذب کی ابتدائی کیفیت میں میاں صاحب سنبھل اور امروہہ کے جنگلوں میں دس سال تک ننگے سر ننگے پیر گھومتے رہے۔ اس ساری مدت میں نہ بستر سے پیٹھ لگی، نہ سر کو تکیہ میسر ہوا۔ ذوق سماع ان کی طبیعت پر غالب تھا۔ جب بھی بات کرتے یا مسکراتے تو "اللہ" کا کلمہ برابر زبان پر ہوتا۔ آخر جذب و کیفیت کا یہ عالم ہوا کہ راگ سننے کی تاب نہ رہی، راگ پڑھتے ہی بے خودی کے عالم میں کہیں سے کہیں جا پہنچتے۔

960ھ/1552ء میں جب کہ میری عمر صرف 12 سال تھی، میں اپنے والد ماجد کے ساتھ سنبھل میں ان کی خدمت میں گیا۔ ان کی خانقاہ میں "قصیدہ بردہ" کا درس ختم کر کے رخصت ہونے کی اجازت طلب کی۔ انھوں نے تبرکاً "حنفی" فقہ کی کتاب "کنز" کے چند سبق پڑھائے اور مجھے اپنے خاص مریدوں میں داخل کر لیا۔

میرے والد سے فرمایا کہ ہم نے تمہارے لڑکے کو اپنے استاد شیخ عزیز اللہ کی طرف سے کلاہ اور شجرہ دیا ہے تاکہ اسے علوم ظاہری کا فائدہ بھی پہنچے۔ شیخ ممدوح نے 969ھ/1561ء میں رحلت فرمائی۔ ان کی تاریخ رحلت "درویش دانش مند" سے نکلتی ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ میرے والد کا بھی اسی سال انتقال ہوا۔ یہ ان کی حسن عقیدت کا ثمرہ تھا۔

شیخ جلال الدین تھانیسریؒ

شیخ عبد القدوس گنگوہی کے خلیفہ ہیں۔ علوم ظاہر و باطن دونوں پر ان کی گہری نظر تھی۔ کافی عرصے تک دینی علوم کی نشر و اشاعت میں مشغول رہے۔ آخر میں علوم رسمی کو ترک کر دیا۔ جلوت چھوڑ کر خلوت میں جا بسے۔ ان کے اکثر اوقات قرآن پاک کے ختم، نوافل، دعا اور درود ہی میں صرف ہوتے تھے۔ 193 سال کی عمر کو پہنچے تو نہایت کمزور اور ضعیف ہو گئے،

[illegible]

[illegible]

[illegible] قوت نہیں رہی تھی۔ ہر وقت [illegible] فتوری میں پڑے رہتے تھے لیکن [illegible] قوت [illegible] بحال [illegible] ان کی آواز کان میں پہنچی [illegible] کے بغیر [illegible] بیٹھے [illegible] اٹھی تو [illegible] خود طہارت اور وضو کر کے نماز [illegible] نماز سے فارغ ہوتے ہی [illegible] ہو گئے۔

مجھے [illegible] ان کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ پہلی بار تو میں [illegible] 1581ء میں [illegible] تھا وہ قنوج کے اماموں کی سفارش اور [illegible] لائے ہوئے تھے۔ دوسری مرتبہ 981ھ 1573ء میں یہ [illegible] حسین خان الغ میرزا کا تعاقب کرتے ہوئے [illegible] حسین خان کے ساتھ کی تھی۔ اس وقت مجھے ان کی [illegible]

شیخ [illegible] نے 989ھ 1581ء میں رحلت فرمائی۔

شیخ محمد غوث گوالیاری

شیخ محمد غوث [illegible] شیخ [illegible] حمید کے مرید ہیں۔ شطاری سلسلے میں ان کا [illegible] سے ملتا ہے۔

[illegible] پہاڑی دامن میں مقیم رہے۔ [illegible] ان کا [illegible] میں انھوں نے بڑی سخت ریاضتیں کیں۔ [illegible] تصنیف کی [illegible] کی اجازت ان کو اپنے بڑے بھائی

شیخ بہلولؒ سے جو بڑے صاحب کرامت بزرگ گزرے ہیں، سے حاصل تھی۔ ان دونوں بزرگوں سے ہمایوں بادشاہ مغفرت پناہ کو بڑی مخلصانہ عقیدت تھی۔ ہمایوں کو شاید ہی کسی اور سے ایسی عقیدت رہی ہو انہی سے ہمایوں نے بھی "دعوت اسماء" کا طریقہ سیکھا تھا۔

جب شیر شاہ نے اقتدار سنبھالا تو ہمایوں کے تعلق کی وجہ سے وہ شیخ غوثؒ کے خلاف ہو گیا۔ اسلئے شیخ گجرات چلے گئے۔ وہاں کے حکام و سلاطین نے سر آنکھوں پر لیا اور وہ سب شیخ کے عقیدت مند رہے۔ شیخ کی کرامتوں اور کمالات باطنی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ میاں شیخ وجیہہ الدین جیسا متبحر عالم ربانی بھی ان کی بارگاہ تقدس کا حاشیہ نشین بن گیا تھا۔ ان کے دامن فیض سے دہلی، گجرات اور بنگالہ میں کتنے ہی صاحب مرتبہ بزرگ پیدا ہوئے۔ ان کے کمالات روحانی کے آثار اب تک ہندوستان میں باقی ہیں۔

میں '' نے انھیں سب سے پہلے 966ھ/1558ء میں آگرہ کے بازار میں دور سے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ سوار ہو کر جا رہے تھے اور ان کے آگے پیچھے، دائیں بائیں لوگوں نے اتنا ہجوم کر رکھا تھا کہ اس بھیڑ میں کسی کا داخل ہونا ممکن نہ تھا۔ اس قدر و منزلت پر ان کے انکسار و تواضع کا یہ عالم تھا کہ لوگوں کو دائیں بائیں گھوم کر اور اس قدر جھک کر سلام کا جواب دے رہے تھے کہ ان کے سر کو لحظہ بھر کے لیے قرار نہ تھا۔ ان کی پشت زین کے تکیہ سے ٹکرائی جاتی تھی۔

اس سال شیخ ممدوح گجرات سے آگرہ آئے تھے۔ اکبر کی نوعمری کا زمانہ تھا۔ وہ ان کی تحریص و ترغیب پر ان کے مریدوں میں شامل ہو گیا، لیکن کچھ ہی دن بعد ان کا منکر ہو گیا۔ خان خانان، بیرم خاں اور شیخ گدائی سے ان کی نبھ نہ سکی اس لیے وہ ناراض ہو کر گوالیار چلے گئے۔ وہاں ایک خانقاہ قائم کر کے مریدوں کی تربیت و تکمیل میں مشغول رہے۔ سماع و سرود اور وجد کا بھی ذوق تھا بلکہ انھوں نے سماع کے متعلق رسالہ بھی تصنیف کیا ہے۔

لباس فقر میں بڑے جاہ و جلال والے تھے۔ انکی مدد معاش ایک ہزار تنکہ تھی۔ جو کوئی ان سے ملنے آتا تھا وہ اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے۔ غیر مسلموں سے

بھی ان کا یہی سلوک تھا۔ اسی سبب بعض اہل فقر اُن کے مخالف بھی ہو گئے تھے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کی نیت کیا تھی:

چون رد و قبول ہمہ در پردۂ غیب است
زنہار کسی را نکنی عیب کہ عیب است

(چونکہ رد و قبول بھی پردۂ غیب میں ہے اس لیے کسی کا عیب ظاہر مت کرو کہ یہ خود عیب ہے)

80 سال عمر پا کر 970ھ/1562ء میں آگرہ میں انتقال فرمایا اور گوالیار میں دفن کیے گئے۔ شیخ نہایت سخی اور دریا دل آدمی تھے۔ طبیعت میں بڑا انکسار تھا۔ چنانچہ کبھی اپنے آپ کو "میں" نہیں کہا ہمیشہ خود کو "فقیر" ہی کہا کرتے تھے۔ اس معاملہ میں ان کا کچھ عجیب طرح کا حال تھا کہ جب کسی کو غلہ دیتے تو اس کے وزن کو ظاہر کرنے کے لیے "من" کا لفظ ادا نہیں کرتے تھے بلکہ کہتے تھے اتنے "میم" اور "نون" (من) فلاں آدمی کو دے دو!

شیخ برہانؒ

شیخ برہان بڑے زاہد، متوکل، گوشہ نشین اور مستغنی بزرگ تھے۔ کہتے ہیں وہ میاں الہداد باری کی، جن کا سلسلہ ایک واسطے سے سید محمد جون پوری سے ملتا ہے کی صحبت میں صرف 3 دن رہے اور فقر و فنا کا یہ فیض حاصل کیا، کہ درجۂ کمال تک جا پہنچے۔ نہایت عبادت گزار اور صاحب حضور تھے۔ تقریباً 50 سال تک گوشت بلکہ بہت سی چیزوں کا کھانا پینا ترک کر دیا، صرف تھوڑے سے دودھ اور شیرینی پر گزر کرتے رہے۔ آخری عمر میں تو پانی تک ترک کر دیا تھا۔ دیکھنے میں بس ایک روحانی اور نورانی مجسمہ دکھائی دیتے تھے۔ کالپی میں ان کا حجرہ نہایت تنگ و تاریک تھا۔ اس حجرے میں وہ ہمیشہ ذکر و فکر اور مراقبے میں مشغول رہتے تھے۔ مہدوی طریقہ پر "پاس انفاس" میں مصروف رہتے تھے۔ عربی علوم نہیں پڑھے تھے پھر بھی قرآن کی تفسیر اس بلاغت کے ساتھ فرماتے کہ حیرت ہوتی تھی۔ ان کی صحبت میں دلوں کو کھول دینے والا اثر تھا۔

میں[2] جب چنار کے سفر سے لوٹا، یہ 967ھ/1559ء کا کوئی مہینہ تھا اور عبداللہ

خاں اوزبک کا دور دورہ تھا۔ ایک رات شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بڑی پہنچی ہوئی باتیں کیں اور اپنے ہندی کے شعر جن میں وعظ، نصیحت، تصوف، توحید اور تجرید کے مضامین تھے وہ بھی سنائے۔

دوسرے دن مہر علی سلدوز جو درویش دوستی کی صفت کے باوجود پورا ترکی تھا اور مردم آزاری، ستم رانی سے باز نہیں آتا تھا۔ میرے ساتھ شیخ کی ملاقات کے لیے آیا، اتفاق یہ تھا کہ جب وہ چلنے لگا تھا تو اس نے اپنے خدمت گاروں اور ملازموں کی خوب پٹائی کی تھی اور ان کو مغلظ گالیاں دی تھیں، جب ہم[3] پہنچے تو شیخ نے سب سے پہلے جو بات فرمائی وہ یہ حدیث تھی:

"قال النبی ﷺ المسلم من سلم المسلمون من یدہ ولسانہ"

(رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں)

یہ حدیث پڑھ کر انھوں نے اس کے نکات کے بڑی عالمانہ اور دلکش تشریح کی۔ مہر علی پر ایسا اثر ہوا کہ وہ کھڑا ہو گیا اور اپنے کیے پر نادم و شرمندہ ہو کر توبہ کرنے لگا۔ شیخ سے دعا و فاتحہ کی درخواست کی، کچھ نذرانہ بھی پیش کیا جو شیخ نے قبول نہ کیا۔ شیخ ممدوح کی عمر 100 سال ہوئی ہے۔ انھوں نے 970ھ/1562ء میں رحلت فرمائی۔ میں[4] نے ان کی تاریخ اس مصرعے سے نکالی ہے:

"دل گفت کہ شیخ اولیاء بود"

ان کو وصیت کے مطابق اسی حجرے میں دفن کیا گیا جس میں کہ وہ گوشہ نشین رہے تھے۔

شیخ محمد کنبو سنبھلیؒ

قادری سلسلے کے بزرگ تھے۔ راہ سلوک میں انھوں نے بڑے مجاہدے اور ریاضتیں کی تھیں۔ وجد و سماع کا بڑا ذوق رکھتے تھے، خود بھی نہایت خوش آواز تھے۔ جب ان پر حال و کیفیت طاری ہو جاتی تو بے اختیار خود بھی گانے لگ جاتے اور اس درد بھری آواز میں کہ

حاضرین پر رقت طاری ہو جاتی۔ ان کی محفلوں میں سماع کا لطف حاصل ہوتا تھا۔ ان کا خیال اب بھی مجھ(۲) کو سرشار کر دیتا ہے۔

ابتدا میں علوم ظاہری کی تحصیل کی تھی۔ عشق و تعشق کے میدان میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ کسی نہ کسی خوبصورت سے ان کے عشقیہ تعلقات ضرور قائم رہتے تھے۔ اس معاملے میں اپنے زمانہ کے مشہور تھے۔ لوگوں کی انگلیوں کی انہیں کوئی پرواہ نہ ہوتی تھی۔ کہتے ہیں دل کے معاملات میں الجھے رہتے تھے۔ اسی مناسبت سے وہ شیخ محمد عاشق مشہور ہو گئے۔

983ھ/1575ء میں ان کا وصال ہوا۔ ان کی وفات "ہشتم از شوال" سے نکلتی ہے۔

شیخ فخر الدین

ایک خوش نشین، خوش صحبت اور بذلہ سنج تھے۔ بیشتر لوگوں سے دور خلوت میں رہا کرتے تھے۔ ہر جمعہ کو ان کی خانقاہ میں صوفیوں کی مجلس منعقد ہوتی تھی جس میں سماع لازمی ہوا کرتا تھا۔ ان کی مجلس سماع میں سماع کا کیسا ہی منکر اور مخالف آ جاتا، وجد و حال سے بچ نہیں سکتا تھا۔ شیخ کی مجلس کی کیفیت دوسروں کو متاثر کر دیتی تھی۔

اس مجلس کے بعد دستر خوان بچھایا جاتا تھا۔ ان کی مجلس میں چھوٹے بڑے کا کوئی امتیاز نہ ہوتا تھا۔ بادشاہ اور فقیر برابر کے ہم نشین ہوتے تھے۔ خان خاناں ہر جمعہ کی نماز [illegible] کی مسجد میں ادا کرتا تھا۔ شیخ کی صحبت میں اس پر اکثر اوقات بڑی رقت طاری ہو جاتی تھی۔ خانقاہ کے معمول کے مطابق خان خاناں وہاں نشست و برخاست اور کھانے (کھانے پینے) میں دوسروں سے کوئی امتیاز نہیں برتتا تھا۔

شیخ [illegible]

[illegible] بزرگ تھے۔ صفائے قلب اور سوز و گداز ان کے چہرہ سے ہویدا تھا۔ [illegible] دن رات گریہ و زاری کرتے رہتے تھے۔ گانے کی آواز جب ان کے کان میں پڑتی تو اس طرح بے قرار ہو جاتے جیسے کسی نے ان کے

باطن میں آگ لگا دی ہو۔ ان کے یہاں صبح و شام سماع کی محفل جمی رہتی تھی، اس وقت ان کا یہ عالم رہتا تھا کہ اگر پتھر پر بھی اس عالم میں نگاہ پڑ جائے تو پانی بن جائے۔

اپنے والد بزرگوار شیخ حسن سے بیعت تھے۔ اپنے بڑے بھائی شیخ محمد حسن سے جو شیخ امان پانی پتی کے پیر تھے، انھوں نے فیض حاصل کیا تھا۔ طبیعت میں عجز و انکسار بہت تھا۔ خدمت خلق کا بڑا خیال و اہتمام کرتے تھے۔ اگر وہ چلے میں بھی بیٹھے ہوئے ہوں اور کوئی محتاج شخص خواہ وہ کسی غیر مسلمان کے پاس سفارش کے لیے لے جانا چاہتا تو حجرۂ اعتکاف سے نکل آتے اور اس کے گھر دور دراز کی مسافت طے کر کے پیدل ہی چلے جاتے۔ حاجت برآری کے بعد لوٹ کر پھر اعتکاف میں بیٹھ جاتے، گویا اس سے ان کا چلہ نہیں ٹوٹتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی عبادتوں پر لوگوں کی حاجت روائی کو مقدم سمجھتے تھے۔ اگر کوئی کافر یا ظالم حاکم ایک بار کہنے پر ان کی سفارش کو قبول نہ کرتا یا جان بوجھ کر گھر سے ملاقات کے لیے نہ نکلتا تو وہ سارا دن اس کے انتظار میں وہیں بیٹھے رہتے۔ پھر بھی ملاقات نہ ہوتی تو دوسرے دن جانے کے لیے انکار نہ کرتے اور بے تکلف اس طرح چلے جاتے جیسے ان کو کسی طرح کی کدورت نہیں ہوئی۔ ان کے اس انکسار کو دیکھ کر وہ شخص شرمندہ ہو جاتا اور ان کے پاؤں پر گر پڑتا اور اس حاجت مند کی حاجت پوری ہو جاتی۔

ایک دن شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے مزار پر حسب معمول مجلس سماع میں بیٹھے تھے کہ اچانک ایک دیوانے شخص نے چیخ ماری اور شیخ کو جھولی بھر کر اٹھا لیا اور سر کے بل ان کو زمین پر پٹک دیا۔ ان کی دستار کھل کر گر گئی۔ لیکن ایسا ضبط و تحمل تھا کہ چہرے پر ناگواری کا ذرہ برابر بھی اثر نہ تھا۔ اس کے وجد و حال کا خیال کر کے کوئی تعرض نہ کیا۔ اس پاگل نے دوبارہ یہی حرکت کی تو شہر کے حاکم نے اسے سزا دینے کا ارادہ کیا شیخ نے اسے اپنی حمایت میں لے لیا اور بڑی عذر خواہی کر کے اسے سزا سے بچا لیا۔

علوم ظاہری میں ان کی بڑی دسترس تھی۔ اپنے شاگردوں کو عموماً "تفسیر عرائس، عوارف اور فصوص الحکم" نیز ان کی شرحیں پڑھایا کرتے تھے۔ شیخ امان پانی پتی نے ایک رسالہ "غیریہ" لکھا تھا۔ اس کے جواب میں شیخ عزیز اللہ نے ایک رسالہ "عینیہ" کے نام

سے لکھا۔ اس رسالہ میں نظریہ "وحدت الوجود" کے بڑے اہم نکات بیان کیے ہیں۔

اس زمانے میں خان خاناں کی سرپرستی کے تحت چل رہے تھے۔ ہندوستان تک اور اس کے بعد بھی چند سال تک میں(۲) نے ان کی خدمت میں تصوف کی بعض کتابوں کی سماعت کی تھی۔ 975ھ 1567ء میں وہ عالم فانی سے عالم بقا کو تشریف لے گئے۔ ان کی وفات کی تاریخ ہے۔

"قطب طریقت زمانہ" (قطب طریقت حیات تمکیں رہے)

اپنے رسائل، تصنیفات اور خطوط میں وہ ہمیشہ خود کو "ذرۂ ناچیز عبدالعزیز" لکھا کرتے تھے۔ اس لیے ان کی تاریخ کسی نے "ذرۂ ناچیز" سے بھی نکالی ہے۔

شیخ سلیم چشتی

حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر کی اولاد میں سے ہیں۔ ان کا اصل تعلق دہلی سے تھا۔ سلسلہ بیعت میں خواجہ ابراہیم سے متعلق تھے۔ خواجہ ابراہیم 6 واسطوں سے خواجہ فضیل بن عیاضؒ کے سجادہ نشین ہوتے ہیں۔

شیخ سلیم چشتی اور تری کے راستوں سے 2 مرتبہ حرمین شریفین کی زیارت و طواف کے لیے ہندوستان سے تشریف لے گئے تھے۔ روم، بغداد، شام، نجف اور مغرب کے دوسرے شہروں کی سیاحت بھی کی تھی۔ وہ سال بھر سیر و سیاحت میں رہتے تھے لیکن حج کے زمانے میں مدینہ منورہ پہنچ جاتے تھے۔ اس طرح انھوں نے 22 حج ادا کیے۔ 14 حج اپنی سیاحت کے پہلے دور میں اور 8 حج دوسرے دور میں۔ آخری بار جب حرمین شریفین پہنچے تو وہاں دو سال مکہ معظمہ میں اور چار سال مدینہ طیبہ میں مقیم رہے۔ جس زمانے میں وہ مکہ میں مقیم تھے، موسم گرما تو مدینے میں گزارتے اور حج کا موسم مکہ میں گزارتے تھے۔ اس دوران میں شیخ یعقوب کشمیری بھی ان کے ساتھ تھے۔ قیام کی تاریخ انھوں نے یوں کہی:

شد خدا یار کہ بہ محض کرم
منزل باشد حرم محترم

برسد چو سید ز تاریخ سال   نحن اجتاہ وخلنا الحرم

بلاد عرب میں شیخ سلیم" شیخ الہند" کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی عمر 95 سال کی ہوئی، ساری عمر انھوں نے شریعت نبویؐ کے اتباع میں بڑی بڑی ریاضتوں اور سخت مجاہدوں میں گزاری۔ ایسی ریاضت مشائخین کے عہد میں سے کسی اور نے کم ہی کی ہوگی۔ غسل روزانہ کرتے تھے۔ طہارت کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ کبھی نماز پنجگانہ فوت نہیں ہوئی۔

جب شیخ امان پانی پتی ان سے ملنے آئے تو پوچھا سلوک وطریقت کا مقصود آپ کو استدلال کے ذریعہ ملا یا کشف کے ذریعے؟ انھوں نے جواب دیا" ہمارے مسلک کا تعلق بس دل ہی سے وابستہ رہا"۔

بہت سے اہل کمال شیوخ نے انؒ کے دامن تربیت سے استفادہ کیا، ان کے قائم مقام بنے۔ ان تربیت یافتگان میں ایک شیخ کمال الوری تھے۔ یہ نہایت بوڑھے آدمی تھے لیکن دل میں عشق الہی کی آگ بھڑک رہی تھی۔ ایک اور بزرگ شیخ پیارے بنگالی ہیں جو بنگالہ کے شہروں میں بہت مشہور ہیں۔ اسی طرح شیخ فتح اللہ ترین سنبھلی، شیخ رکن الدین اجودھنی اور حاجی خادم ہیں جو فتح پور کی خانقاہ کے منتظم اور ان کے خلیفہ ارشد ہیں۔

جس زمانے میں کہ شیخ دوسری مرتبہ ہندستان تشریف لائے تھے، مجھے پتہ چلا کہ وہ عربی انشاء میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ میں نے ان کی آمد کی تاریخ نکالی اور عربی میں مبارک بادی کا خط لکھ کر بدایوں سے بھجوایا تھا۔

976ھ/1568ء میں شیخ اعظم بدایونی کے واسطے سے جو ان کے چچا کا لڑکا اور داماد تھا، خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے گفتگو کے دوران مجھ[7] سے پوچھا کہ احادیث میں حضور اکرم ﷺ اور شیخینؓ کی قبروں کا حال کس طرح بیان کیا گیا ہے؟ میں نے کہا" احادیث میں تو اس طرح ذکر ہے اور بعض نے اس طرح بیان کیا ہے"۔ شیخ نے کہا سہروردی نے" واقعہ صادقہ" میں تینوں قبروں کی صورت بیان کی ہے اور پہلے قول کو ترجیح دی ہے۔

میں[8] حسب ارشاد 2 روز شیخ اعظم مذکور کے ہمراہ پرانی خانقاہ کے حجرے میں مقیم

رہا۔ اس دوران میں نے تفصیل سے گفتگو نہ کی، پھر اجازت لے کر پشاور چلا گیا۔ اس کے بعد 978ھ/1570ء میں نے بھی کئی بار حاضری دی۔

میں "؟" نے شیخ کی جو کرامت دیکھی وہ یہ تھی کہ فتح پور کے اس پہاڑ میں جہاں سردی کا موسم نہایت سخت ہوتا ہے سوائے ایک باریک کرتے اور ململ کی چادر کے وہ دوسرا کوئی کپڑا نہیں پہنتے تھے۔ ہر روز دو مرتبہ غسل کرتے تھے۔ چلہ میں وصال کے روزے رکھتے تھے اور صرف آدھے تربوز بلکہ اس سے بھی کم پر گزر کر لیتے تھے۔

شیخ سلیم کی وفات 979ھ/1571ء میں واقع ہوئی۔ ان کی تاریخ وفات "شیخ ہندی" ہے۔

شیخ نظام الدین "امیٹھی وال"

امیٹھی لکھنؤ کا ایک قصبہ ہے۔ شیخ نظام الدین اس قصبہ کے رہنے والے اور شیخ معروف چشتی کے شاگرد اور مرید ہیں۔ ان کا سلسلہ شیخ نور قطب عالم سے ملتا ہے۔ پہلے اکتسابی علوم کے طالب علم رہے، لیکن ان کی فطرت بلند پرواز تھی اس لیے علوم ظاہری سے فیوض باطنی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ہمیشہ آنکھیں بند کیے اللہ سے لو لگائے رہتے تھے۔ ذکر اور باطنی توجہ سے کبھی غافل نہ رہے:

یک چشم زدن غافل ازاں ماہ نباشم
ترسم کہ نگاہی کند آگاہ نباشم

(میں پلک جھپکنے کے وقت تک بھی اس معشوق سے غافل نہیں رہنا چاہتا، کیونکہ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مجھ پر نظر کرے اور میں آگاہ نہ رہوں)

تھوڑی ہی مدت میں اپنے پیر سے ارشاد و تکمیل کی اجازت لے کر قصبۂ امیٹھی میں آ کر رہ گئے۔ یہاں وہ بڑے توکل و قناعت سے گزارا کرتے تھے۔ خاص و عام سے دور ہی رہتے تھے، جامع مسجد کے سوائے کہیں اور نہیں جاتے تھے، البتہ کبھی کبھی خیرآباد شیخ سعد کے مزار کی زیارت اور شیخ صوفی کے خلیفہ اللہ دیہ سے ملنے چلے جاتے یا گوپامئو میں اپنے

خاص مرید قاضی مبارک گوپا موی سے ملنے چلے جاتے۔ قاضی صاحب بھی بڑے متقی، صاحب کمال اور دولت مسند آرا تھے۔ قاضی مبارک جب طالب علم تھے تو انھوں نے شیخ کو اپنے والد کی خانقاہ میں دیکھا تھا اور ان میں بڑے اثر و جذب کو محسوس کیا تھا۔ شیخ عبد الغنی سے ملنے کے لیے وہ فتح پور بھی گئے تھے۔ شیخ عبد الغنی بھی بڑے صاحب مرتبہ بزرگ تھے۔ جس وقت بھی شیخ نظام الدین شیخ اللہ دیہ کی خانقاہ میں جاتے تو ان کی خدمت میں ایک روپیہ یا ایک تنکہ یا کوئی اور چیز بطور ہدیہ ضرور پیش کرتے۔

کہتے ہیں ایک مرتبہ انھوں نے شیخ اللہ دیہ کے لڑکے شیخ ابو الفتح کے ہاتھ میں جو اپنے والد کے سجادہ نشین ہیں، ابن عربی کی ''فصوص الحکم'' دیکھی، شیخ سے یہ کتاب چھین کر رکھ لی اور انھیں کوئی دوسری کتاب دے کر کہا: ''اس کا مطالعہ کیا کرو''۔

عبادات و معاملات میں وہ ہمیشہ ''احیاء العلوم''، ''عوارف''، ''رسالہ مکیہ''، ''آداب المریدین'' اور اس جیسی دوسری کتابوں سے ہی رجوع کیا کرتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ جمعہ کی نماز سے پہلے ظہر کی نماز باجماعت پڑھ لیتے تھے، اس کے بعد جمعہ کی جماعت کرتے تھے۔ ان کے جمعہ کے خطبے میں بادشاہ کا ذکر قطعاً نہیں آتا تھا۔

میں[10] نے ایک بار دیکھا کہ انھوں جمعہ کی نماز جوتے پہنے ہوئے ادا کی اور فرمایا کہ حضور اکرم ﷺ نے بھی جوتے پہن کر نماز ادا کی تھی۔ ایک مرتبہ ایک طالب علم نے ان سے کافیہ کی کتاب تبرکاً پڑھنی چاہی لیکن شیخ نے اغماض برتا، جب اس نے بڑی عاجزی اور اصرار کیا تو جواب دیا: ''کوئی دینی کتاب پڑھو''۔ اس نے کہا یہ بھی تو دینی کتاب ہے اور علم دین کا اس پر انحصار ہے''۔ یہ سن کر شیخ کو جذبہ آگیا اور فرمایا علم دین کا اس کتاب پر کس طرح انحصار ہو سکتا ہے کہ جس میں پہلی بحث ہی یہ ہے کہ اس کے مصنف نے کسر نفسی کے طور پر خدائے عز و جل کی حمد ہی درج نہیں کی۔

شیخ بہت کم مرید کرتے تھے۔ کوئی شغل نہیں بتاتے تھے۔ تلقین بھی بہت کم کرتے تھے۔ ان کے معزز مریدوں میں سب سے بڑے شیخ حاتم گوپا متوی تھے۔ یہ بھی قاضی مبارک کی خانقاہ میں طالب علم تھے۔ انھیں اسی خانقاہ سے شیخ نے اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ 27

شیخ حاتم کو بھی کبھی درس دیا کرتے تھے۔ کبھی کوئی کتاب عطا کر دیتے اور دوسرے مشاغل کی تلقین بھی کرتے، اس طرح انھوں نے حاتم کو بالکل اپنا مطیع بنا لیا تھا۔ انھیں دستار، جوتے اور کپڑے بھی عطا کرتے رہتے تھے۔ قاضی مبارک اور دوسرے طالب علموں نے جب یہ عنایات دیکھیں تو وہ شیخ حاتم سے جلنے لگے، شیخ نے ان کی دلی کیفیت بھانپ لی اور فرمایا: ''میں کیا کروں اللہ کی یہی مرضی ہے کہ اسے پھٹے کپڑوں، پرانے جوتوں اور مفلسی کے باوجود اللہ کی نعمت خاص عطا ہو''۔ چنانچہ انھوں نے شیخ حاتم کے لیے اپنے پورے اثر وجذب سے کام لیا کہ تھوڑی ہی مدت میں وہ درجۂ کمال تک پہنچ گیا۔ شیخ حقائق ومعارف کی گفتگو صرف شیخ حاتم سے کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد شیخ حاتم کی حالت میں تنزل ہونے لگا اور اس سے بعض لغزشیں سرزد ہو گئیں۔ بعد میں پھر اس نے اپنی حالت سنبھال لی اور شیخ کے پاس وہی مرتبہ حاصل کر لیا۔ جب وہ حضرت کی خلافت اور وراثت کا پوری طرح اہل بن گیا تو خدا نے اسے دنیا سے اٹھا لیا۔ شیخ نے اس کو یاد کرکے بارہا فرمایا کہ: ''خدا کا ایک بندہ تھا کہ میں جب بھی اس سے خدا کی باتیں کہتا تھا وہ سمجھ جاتا تھا، وہ بھی اٹھ گیا۔ اب میں کس سے یہ بات کروں''۔

جس زمانے میں میں[11] شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اس وقت شیخ اپنے سالے عبدالرزاق کو جو بعد میں ان کے خسر بھی ہو گئے تھے گفتگو میں مخاطب کرتے تھے۔ کبھی کبھی اپنے بیٹے شیخ محمد کو بھی واسطہ بنا کر خطاب کیا کرتے تھے۔ شیخ محمد اب ان کے سجادہ نشین اور قائم مقام ہیں۔

محمد حسین خان مرحوم کو جس کے حالات میں[12] نے تاریخ میں بیان کیے ہیں، انھیں حضرت سے بڑی عقیدت تھی۔ حسین خان اور میرے[12] اچھے روابط تھے۔ جس وقت اسے تعلق ہوتے ہیں ملا تھا تو میں[12] اس سے ملا تھا۔ 976ھ/1568ء میں سید اصغر بدایونی اور چوتھی مرتبہ کو پانوی کے ساتھ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ میں نے یہ خاص بات دیکھی۔ پہلی ہی ملاقات میں شیخ ہر شخص سے ایسی بات کرتے تھے جو اس کے حالات سے مطابقت رکھتی تھی۔ ان کی زبان پر ہمیشہ الحمد اللہ، سبحان اللہ، لا الہ الا اللہ، بسم اللہ،

لاحول ولاقوۃ الا باللہ، قرآن کی کوئی آیت یا کوئی حدیث یا کسی بزرگ کا قول ہی رہتا تھا۔ سید اصغر سے مصافحہ کیا تو درود پڑھا، قاضی احمد سے ملے تو سبحان اللہ کہا، میری[12] باری آئی تو بسم اللہ، اسی طرح ہر ایک کے مطابق کوئی نہ کوئی کلمہ ارشاد فرمایا۔ اسی اثناء میں کہ ابھی وہ گفتگو نہ کر پائے تھے کہ ایک غریب طالب علم نہایت برے حال میں آکر ملا۔ اس سے مل کر شیخ نے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھا۔ پھر شیخ عبدالرزاق کو مخاطب کر کے "کل شی ھالک الا وجھہ" کی تفسیر بیان کرنے لگے۔ وہ ہاں ہاں کرتے جاتے تھے۔ کبھی بطور تلمیح کسی چیز کی طرف اشارہ کر دیتے تھے۔ کسی اور کو خوف اور رعب کے مارے بات کرنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ میں بھی مبہوت بنا سن رہا تھا اور اپنی کوتاہیوں کا خیال کر کے ڈر رہا تھا کہ ایسا نہ ہو میرے[12] پوشیدہ حالات حضرت پر منکشف ہو گئے ہوں اور وہ اسے ظاہر فرما دیں۔ اسی ڈر سے میں[12] مجلس سے نکل بھاگنے کی فکر میں تھا کہ وہ طالب علم بول اٹھا، اس آیت میں "وجھہ" کی ضمیر کسی اور چیز کے لیے آئی ہو جیسا کہ بعض اہل معرفت نے بیان کیا ہے۔ اس کی بات سن کر حضرت جلال میں آگئے۔ ان کا چہرہ تمتمانے لگا اور فرمایا: میں نے اس شیطان سے ملتے ہی تعوذ پڑھا تھا چنانچہ دیکھ لو اس کی شیطانیت ظاہر ہوگئی۔ چونکہ وہ جان چکے تھے کہ اس کے اعتراض کے پیچھے کون سی بات چھپی ہوئی ہے۔ اسی لیے بار بار لا حول ولا قوۃ الا باللہ پڑھا۔ پھر قصیدہ بردہ کا یہ شعر پڑھا:

یا لائمی فی الھوی العذری معذرۃ

منی الیک ولو انصفت لم تلم

شیخ پر اس وقت بڑا جلال طاری تھا۔ آخر آپ نے حکم دیا کہ اسے مجلس سے اٹھا دو۔ پھر اسے اپنے پاس بلا کر ملامت کا اظہار کیا۔ حاضرین کو یہ واقعہ دیکھ کر بڑی عبرت ہوئی۔ وہ رات ان کی خانقاہ میں، میں[12] نے بڑی مشکلوں سے کاٹی اور بھاگ جانے کے لیے بے چینی سے صبح کا انتظار کرنے لگا۔ خدا خدا کر کے رات کٹ گئی۔ ابھی اتنا اندھیرا تھا کہ بغیر چراغ کے ایک دوسرے کے چہرے کو پہچاننا مشکل تھا۔ خیال ہوتا تھا کہ ابھی رات

باقی ہے۔ حضرت نے صبح کی نماز پڑھائی جب سورج نکلا، حضرت حجرے سے باہر تشریف لائے اور مسجد کے دروازے پر کھڑے ہوکر ہم تین مہمانوں کے لیے شیخ محمد کو کھانا لانے کا حکم دیا۔ میرے اضطراب کا یہ حال تھا کہ میں ہر لمحہ شیخ محمد کو واسطہ بنا کر رخصت ہونے کی اجازت حاصل کرنا چاہتا تھا، حضرت شیخ ایک ہاتھ میں قرآن پاک اور دوسرے ہاتھ میں تنکہ لیے ہوئے کسی بات کے ضمن میں آیت کریمہ "واعدولھم ما استطعتم من قوۃ و من رباط الخیل" کی وضاحت کر رہے تھے، میری روانگی کی اجازت کو ٹال گئے۔ ایک اور بات کہ میں حسین خان کو جو اس وقت اسولی کے پرگنہ میں تھا بڑی توجہ سے یاد فرمایا اور کہا: "وہ میرا طوطا ہے"۔

حضرت بڑے فیاض تھے امیر ہو یا فقیر ہر ایک کو کچھ نہ کچھ نقد یا تنکہ یا کوئی اور چیز ضرور دیتے تھے۔ مجھے[12] انھوں نے ایک تنکہ عنایت فرمایا تھا۔ اس سفر میں میں[12] نے ان کی ایک کرامت بھی دیکھی۔ جس وقت ہم تینوں آدمی امیٹھی، حضرت سے ملنے جارہے تھے وہ صورت سے فقیر معلوم ہو رہا تھا۔ ہمارے پہنچنے کے بعد وہی شخص اسی طرح حاضر ہو کر حضرت کے دروازہ پر آیا اور سوال کرنے لگا۔ بڑی عاجزی اور لجاجت کی لیکن حضرت نے اسے کچھ نہ دیا۔ حاضرین جو ان کی سخاوت اور دریادلی سے واقف تھے انھیں نہایت تعجب ہوا۔ انھیں متعجب دیکھ کر حضرت نے اچانک فرمایا: "اس چور کو دیکھو کہ راہزنی بھی کرتا ہے اور فقیری بھی" پھر آپ نے اسے مجلس سے نکال دیا لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس وقت ہم نے جو غور سے دیکھا تو پہچان لیا کہ یہ وہی شخص ہے جو چوری میں پکڑا گیا تھا۔ ایسا ہی ایک واقعہ دوسرے دن بھی پیش آیا جس کا ذکر طویل ہو جائے گا۔

رمضان کی آخری تاریخ کو حسین خان کے ہمراہ ہم لوگ پرگنہ سے حملہ کرتے ہوئے امیٹھی پہنچے۔ ہم یہ چاہتے تھے کہ فجر کی نماز شیخ ممدوح کے پیچھے ادا کریں اس لیے تیزی سے کوچ کرتے رہے۔ صبح ہو چکی تھی، ابھی 3 کوس باقی رہ گئے تھے۔ ہمیں جماعت کے فوت ہو جانے کا افسوس ہوا اور ہم نے گھوڑوں کو تیزی سے دوڑایا یہاں تک کہ طلوع آفتاب سے بس کچھ ہی پہلے شیخ موصوف کی مسجد میں پہنچے۔ اس وقت گھر سے باہر تشریف

لائے، جماعت قائم کی اور نماز پڑھائی۔ ایسا گمان ہو رہا تھا کہ وقت باقی نہیں رہا۔ تاہم ہمیں جماعت کا شرف حاصل ہوگیا۔ اتنی دیر سے جماعت کرنا حضرت کے معمول کے خلاف تھا کیونکہ وہ ہمیشہ صبح کی نماز ایسے وقت ادا کرتے تھے کہ ابھی صبح صادق کے طلوع کا بس گمان ہی ہوتا تھا۔ اسی دن شام کو انھوں نے مسجد میں تصوف پر تقریر کی اور خواجہ حافظ کے چند شعر پڑھے۔ بیان کے دوران حسین خان مرحوم کے ایک ساتھی نے پوچھا: ''خواجہ حافظ کس کے مرید تھے؟'' فرمایا ''خواجہ نقشبندی کے'' کسی بات پر ایک شخص نے پوچھا: ''گھوڑے کا گوشت امام اعظم کے مسلک میں حلال ہے''؟ آپ نے فرمایا: ''امام اعظم نے خود گھوڑے کا گوشت کھایا تھا''۔ جب آپ اس شعر پر پہنچے:

صوفیاں در دمی دو عید کنند

عنکبوتان مگس قدید کنند

مجھے اپنے خلوص پر پورا بھروسا تھا اس لیے میں نے بالکل ہی خالی ذہن ویسے ہی پوچھ لیا: ''دوعید سے کیا مراد ہے''؟ یہ سوال انھیں پسند نہ آیا اور فرمایا، یہ بات بایزید اور جنید کے پوچھنے کی ہے، شبلی اور منصور کے پوچھنے کی ہے تو کہاں اور یہ سوال کہاں؟ پھر اس سلسلے میں انھوں نے بہت سی باتیں بتائیں۔ میں نے شرمندگی سے سر جھکالیا اور بڑا نادم ہوا۔ حسین خان حیرت سے دانتوں میں انگلی دابے میری طرف دیکھ رہا تھا اور تمام ساتھی حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ میری خوش نصیبی سے اس وقت عید کے چاند کے دکھائی دینے کا شور بلند ہوا اور لوگ مبارک باد دینے اور مصافحہ کرنے میں مشغول ہوگئے۔ مجھے موقع مل گیا اور میں وہاں سے کھسک کر مغرب کے وقت اس خیمہ میں جو مسجد سے متصل باغ میں لگا ہوا تھا نہایت رنجیدہ اور اداس چلا گیا اور زندگی سے بس بیزار ہوگیا۔ حضرت شیخ جب اندر تشریف لے گئے اور مہمانوں کے لیے انھوں نے دسترخوان لگوایا تو اس وقت پوچھا: ''فلاں کہاں ہے؟ ان کے لڑکے شیخ محمد نے جواب دیا: ''وہ اپنی اس گستاخی کی وجہ سے مسجد میں ٹھہر نہیں سکا اور چلا گیا ہے۔ جماعت میں بھی وہ شریک نہیں تھا۔ یہ سن کر حضرت نے اپنے سامنے سے کھانا اور حلوہ اٹھا کر تبرکاً میرے لیے بھجوایا''۔ اس وقت مجھے بڑی

تسکین اور اطمینان حاصل ہوا اور معافی کی امید بندھ گئی!

صبح سویرے ہی حسین خان عید کے لیے لکھنؤ چلا گیا اور میں امیٹھی میں اکیلا رہ گیا۔ حضرت شیخ نے مسجد ہی میں عید کی نماز ادا کی اور نماز کے بعد کتاب ''عوارف'' کا درس دینے لگے۔ اسی موقع پر شیخ محمد نے میرا قصور معاف کرنے کے لیے سفارش کی۔ حضرت نے سبق بند کر دیا اور بڑی مہربانی اور شفقت سے ہم[12] سے بات کی۔ میں[12] نے روتے ہوئے ان کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ حضرت نے مجھے اٹھا کر سینہ سے لگا لیا اور کہا: ''میرے دل میں کسی کی طرف سے دشمنی اور کینہ نہیں رہتا۔ میں کسی کو کچھ کہتا ہوں تو صرف نصیحت اور لوگوں کی بھلائی کے لیے ہی کہتا ہوں اور رسول اللہ کی طرح جس کسی کو سخت بات کہہ دیتا ہوں تو اس کا نتیجہ بھلائی کی صورت میں نکلتا ہے۔ اگر کسی پر لعنت بھی بھیجوں تو وہ رحمت بن جاتی ہے''۔ پھر آپ نے اپنے سر سے ٹوپی اتار کر مجھے عنایت کی اور پاس کے حجرے میں مجھے اپنے ساتھ تنہا لے کر گئے اور فرمایا: ''میرے سامنے وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھو''۔ یہ دوگانہ میں نے ایک عجیب ہی حالت میں ادا کیا۔ حضرت نے فرمایا: ''لوگ مجھے کہتے ہیں کہ میں طالبوں کو تلقین نہیں کرتا میں انھیں کیا تلقین کروں، میری تلقین تو بس یہی ہے کہ زبان پر خدا کا ذکر رہے اور دل شکر گزار رہے''۔ اس کے بعد بس حضرت کا دریا جوش میں آ گیا اور بہت سی باتیں بیان کیں۔ اس موقع پر حضرت کی روش کے برخلاف کسی نے ہندی راگ چھیڑ دیا تھا اور اسے سن کر وہ سندھی درویش نہایت درد بھری آواز میں آہ و فریاد کرنے لگے۔ اس وقت میرے دل پر ایسا اثر ہوا کہ مجھ[12] پر حال طاری ہو گیا۔ حضرت نے فرمایا کہ: ''صحابہ جب نو مسلم بدوؤں کو دیکھتے تھے کہ وہ قرآن مجید سن کر بری طرح رونے لگتے ہیں تو خود پر افسوس کیا کرتے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ان سے فرمایا کرتے تھے۔ ''کنا نحن امثالکم ثم قست قلوبنا ای تمکنت و استقرت قلوبنا'' (ہم بھی تمہارے ہی جیسے تھے لیکن اب ہمارے دل ٹھہر گئے ہیں) اس کے بعد حضرت نے کچھ اور باتیں بیان کیں جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ پھر آپ نے مجھے[12] یہ دعا پڑھنے کی اجازت دی جسے میں[12] ہمیشہ پڑھتا رہتا

ہوں "اللھم انی اعوذبک من الصم والبکم والجنون والجذام والبرص"۔

جب میں[12] حضرت سے رخصت ہو کر لکھنؤ میں آکر مقیم ہو گیا تھا، کبھی نمک، کبھی خاص چاول اور کبھی مٹی کا پیالہ وغیرہ میرے لیے بھیج دیا کرتے تھے۔ حضرت کی عادت تھی کہ عموماً مجلسوں میں بیٹھے ہوئے نمک چاٹا کرتے تھے اور یہ حدیث پڑھتے تھے: "الملح دواء سبعین داء الأسام" (نمک بجز موت کے ستر بیماریوں کی دوا ہے)۔

حضرت نے میرے[12] چھوٹے بھائی شیخ محمد مرحوم کو بھی اپنی بیعت سے نوازا تھا، چنانچہ وہ حضرت کی تھوڑی سی توجہ سے بڑا عبادت گزار اور فرشتہ خصلت بن گیا تھا اور اکثر اوقات "طے کا روزہ" رکھے رہتا تھا۔ ہمیشہ قرآن پاک کی تلاوت، نوافل اور ذکر و اذکار میں مصروف رہتا تھا۔ اس طرح اس کا ایک لمحہ بھی فضول باتوں میں ضائع نہیں ہوتا تھا اور میری[12] طرح وہ بیکار مشغلوں میں الجھا ہوا نہیں رہا:

در حق گلاب وگل وحکم ازلی این بود
کین شاہد بازاری وآن پردہ نشین باشد

انہی دنوں اسی قابل رشک حالت میں وہ فوت ہو گیا۔ یقین ہے کہ وہ ایمان کے سایہ تلے جنت میں خوشی سے ہوگا۔

حضرت ممدوح کی عمر 80 سال سے زیادہ ہے، ان کے یہاں پیری میں بھی اولاد ہوتی رہی۔ آپ نے 979ھ/1571ء میں انتقال کیا۔

شیخ بھیکن" کاکری والے

لکھنؤ کے علاقے میں کاکری[13] نامی ایک قصبہ ہے۔ شیخ بھیکن اسی قصبہ کے رہنے والے تھے۔ یہ بڑے عالم، متقی اور متشرع تھے، تقویٰ اس درجہ کا تھا کہ اس معاملہ میں وہ امام اعظم ثانی تھے۔ برسوں درس و افادہ میں مشغول رہے۔ سات قرأتوں کے حافظ اور قاری تھے۔ شاطبی کا درس دیا کرتے تھے۔ طریقت میں میر سید ابراہیم ایرجی کے خلیفہ تھے۔ ایرجی موصوف اپنے زمانہ کے بڑے عالم گزرے ہیں۔ شیخ بھیکن تصوف کی باتیں صرف

خلوت میں وہ بھی محرمانہ راز سے کہا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر توحید کے رموز اعلانیہ بیان کیے جائیں تو وہ یا تو کہنے والے پر پڑتے ہیں یا سننے والوں پر بظاہر تو وہ ایسی باتوں کی ممانعت ہی کرتے تھے۔

ان کے لڑکے بڑے صاحب کمال ہیں۔ وہ سب کے سب علم وحکمت، فضل وتقویٰ سے آراستہ ہیں۔ میں ان بزرگوں کی خدمت میں محمد حسین خان مرحوم کے ہمراہ لکھنؤ میں حاضر ہوا تھا۔ وہ رمضان کا مہینہ تھا۔ اس وقت کوئی شخص علم منطق کی کوئی کتاب درس لینے کے لیے ان کے پاس آیا۔ آپ نے فرمایا "علوم دینی کی کوئی کتاب پڑھو"۔ ان کی وفات 891ھ/1456ء میں ہوئی۔

شیخ سعدیؒ

یہ بڑے مشائخین میں سے تھے۔ اپنے والد بزرگوار شیخ محمدؒ سے خلافت پائی۔ شیخ محمد وہی بزرگ ہیں جنھوں نے "شاطبی" پر فارسی میں ایک شرح 70 جزو میں لکھی ہے۔

شیخ سعدیؒ اکثر وجد وحال میں رہتے تھے، کیا ظاہر کیا باطن سراپا خلوص تھے، ہمیشہ خوش، بشاش اور مسکراتے رہتے تھے۔ اپنی عمر نہایت خوش اوقاتی اور آزادگی سے گزاری۔ انھوں نے اپنے ایک دوست کو رخصت کرتے ہوئے ایک پرچہ دیا جس میں یہ شعر درج تھا:

دیدہ سعدی و دل همراہ تست
تا نپنداری کہ تنہا میروی

ان کا انتقال 1002ھ/1593ء میں ہوا۔

سید تاج الدینؒ

شیخ محمد غوث کے خلیفہ تھے۔ یہ بزرگ "دعوت اسماء" کے مجاز تھے۔ ریاضت، فقر اور توکل میں ان کی اپنی ایک شان تھی۔ نہایت ایثار پیشہ اور سخی آدمی تھے۔

جب لکھنؤ آئے تو بہت سے آدمیوں نے ان کی صحبت سے فائدہ اٹھایا اور ارشاد و اصلاح کا مرتبہ حاصل کر لیا۔ ان کا لکھنؤ ہی میں انتقال ہوا تھا۔

شیخ محمد قلندر لکھنوی

پہلے یہ بزرگ سلطان ابراہیم لودی کے زمانہ میں سپاہگری کا پیشہ کرتے تھے، جس وقت بابر بادشاہ نے ہندوستان کو فتح کیا، سپاہ گری ترک کر کے فقر و عزلت گزینی کی راہ اختیار کر لی اور شیخ بہلول کے مرید بن کر عبادت اور ریاضت میں مصروف ہو گئے۔ اپنے پیر سے اسماء الٰہی میں سے چند اسماء کی دعوت و تلقین حاصل فرمائی اور ایک باغ میں جس کے اکثر درخت انھوں نے خود لگائے تھے، گوشہ نشین ہو گئے اور لوگوں سے میل جول اور تعلقات کا دروازہ بند کر دیا۔

کہتے ہیں کہ تیس سال سے زیادہ ہوئے کہ وہ صرف دودھ پر گزارہ کرتے ہیں اور اناج وغیرہ کچھ نہیں کھاتے۔ ایک دن محمد حسین خان ان کی ملاقات کے لیے گیا، میں[14] بھی اس کے ہمراہ تھا۔ اس وقت ایک بلی شیخ کے پاس آ کر درد بھری آواز میں چلانے لگی۔ آپ نے فرمایا یہ بلی فریاد کر رہی ہے کہ: "تم لوگوں نے آ کر اپنے بھی اوقات ضائع کیے اور صاحب خانہ کے بھی نیز حضور قلب میں خلل پیدا کر دیا"۔

شیخ نظام نارنولیؒ

نارنول ہندوستان کا مشہور شہر ہے۔ شیخ نظام نارنولی سلسلۂ چشتیہ میں شیخ خانو گوالیری کے جو قلعہ گوالیار میں رہتے تھے، مرید ہیں۔ لیکن انھوں نے زیادہ تر استفادہ اپنے بڑے بھائی شیخ اسمٰعیل سے ہی کیا اور تربیت و خلافت حاصل کی۔ ان کے بھائی ایسے صاحب ذوق صوفی تھے کہ ہمیشہ ان پر جذب و شوق کی حالت طاری رہتی تھی۔ عزلت نشین اصحاب خانقاہ کے احوال و کیفیات سے بخوبی واقف تھے۔ خود بھی بڑے صاحب تصوف اور اہل دل بزرگ تھے۔

میں(14) نے معتبر آدمیوں اور شیخ کے مریدوں سے سنا ہے کہ وہ چاند گرہن کی راتوں میں اپنے مریدوں کو بالنگنی کا تیل، کھلاتے تھے۔ یہ ہندوستان میں بڑی مشہور اور عام دوا ہے۔ اس کی تعریف میں اطباء نے رسالے لکھے ہیں۔ میں(14) نے خود بھی اس کے بعض خواص کا تجربہ اور مشاہدہ کیا ہے۔ اس تیل کے کھانے سے ان پر آخرت کے حالات کا کشف ہو جاتا تھا اور بڑے عجیب عجیب امور کا مشاہدہ ہوتا تھا۔ واللہ اعلم

شیخ نظام چالیس سال تک رشد و ہدایت کی مسند پر متمکن رہے، ان کے زمانہ سے آخر عمر تک ان کا یہی معمول تھا کہ ہر سال بڑے ذوق وشوق کے ساتھ حضرت قطب عالم خواجہ قطب الدین بختیار اوشی کی زیارت کے لیے پیدل دہلی جایا کرتے تھے۔ آخر عمر میں بڑھاپے اور بعض دوسرے موانعات کی وجہ سے خواجہ موصوف کا عرس انھوں نے نارنول میں منایا۔

شیخ نظام اپنے پیر کی طرح کسی کی تعظیم نہیں بجا لاتے تھے۔ امیر ہوں یا غریب ہر ایک کے ساتھ ایک ہی طرح نہایت بے تکلفی اور سادگی سے ملتے تھے، یہی روش مرید بنانے میں بھی ملحوظ رہتی تھی۔

میں(14) نے انھیں ایک بڑے ہجوم میں دیکھا تھا۔ گفتگو کا موقع نہیں ملا۔ ان کی وفات 997ھ/1589ء میں ہوئی۔ ان کی تاریخ وفات "آہ نظام" ہے۔

شیخ اللہ دیہ خیر آبادیؒ

بڑے متبحر عالم تھے۔ ابتدائے حال میں درس و افادہ میں مشغول رہے۔ شیخ صفی خلیفہ شیخ سعید سے ارادت و ارشاد کا تعلق تھا۔ ابتدائی دور میں علوم ظاہری کی تدریس میں مشغول رہے، مگر بعد میں انھوں نے کلیتاً صوفیاء کا مسلک اختیار کر لیا۔ فقر و توکل، تجرید و ایثار اور تصوف کے تمام لوازمات پر عمل پیرا رہے۔ ان پر ہمیشہ سماع و وجد کا ذوق غالب رہتا تھا۔ درود ہر وقت ورد زبان رہتا تھا اور محض اس لیے کسی کی ضیافت قبول نہیں کرتے تھے کہ ان کے متعلقین بچے اور متعلقین فقر و فاقہ میں اپنے والد کی طرح صبر و شکر کے ساتھ رہتے تھے۔

ان کے صاحبزادے شیخ ابو الفتح جو صاحب سجادہ اور اپنے وقت کے بڑے عالم اور ظاہر و باطن میں اپنے والد کا مکمل نمونہ ہیں مختلف علوم پر بڑے پایہ کی تصانیف کے مالک ہیں۔

شیخ اللہ بدیہ کے دروازہ سے کبھی کوئی سائل خالی ہاتھ نہیں لوٹا۔ ایک دن محمد حسین خان نے شیخ سے پوچھا، سالار مسعود جن کے معتقد ہندوستان کے عوام ہیں، کیسے آدمی تھے؟ آپ نے جواب دیا: "ایک افغانی تھا جو شہید ہو گیا"۔

وہ آخر عمر میں بادشاہ کی طلبی پر فتح پور تشریف لائے تھے اور اس "خلیفہ زمان" (اکبر) سے ملاقات کی تھی۔ اکبر کو معلوم ہوا کہ ان کو بلانے جب آدمی گیا تو وہ خانقاہ سے باہر سیر کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ طلبی کی اطلاع دی گئی تو وہیں سے کچھ تیاری کئے بغیر ہی ساتھ ہو گئے۔ ان کے خادم سفر کا سامان اور پالکی پیچھے لے کر آئے۔ اکبر کو یہ بات سنکر بہت خوشی ہوئی۔ جب اکبر نے ان سے کچھ دریافت کیا تو انھوں نے بادشاہ سے کہا کہ میں اونچا سنتا ہوں۔ اکبر نے کچھ رقم انھیں دی، ان کی مدد معاش کا حکم صادر کیا اور اسی وقت رخصت ہونے کی اجازت دے دی شیخ کی وفات 993ھ/1585ء میں ہوئی۔

شیخ داؤد چھنی والؒ

چھنی لاہور کے مضافات میں ایک قصبہ ہے۔ شیخ داؤد کے بزرگ عرب سے آئے تھے اور ملتان کے علاقے میں بمقام سیت پور مقیم رہے۔ شیخ اسی سیت پور میں ہی پیدا ہوئے تھے۔ ان کے پیدا ہونے سے پہلے ہی والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ پیدائش کے کچھ عرصے بعد والدہ بھی فوت ہو گئیں اور وہ یتیم و یسیر رہ گئے۔ ان کی سرپرستی اور تربیت ان کے بڑے بھائی میاں رحمۃ اللہ نے کی۔ جس وقت وہ قرآن کا سبق لیا کرتے تھے تو آنسو ان کے رخساروں پر بہنے لگتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے یہ پڑھنے پڑھانے کی مصیبت میں نہ ڈالو، بس اللہ کے سپرد کردو۔ لوگوں نے آخر سمجھ لیا کہ انھیں کسی معلم کی ضرورت نہیں ہے:

بہ تعلیم آداب اور چہ حاجت
کہ او خود ز آغاز آمد مؤدب

(اس کو تعلیم کے آداب کی کیا ضرورت ہے کہ وہ ابتداء سے ہی مؤدب رہا ہے)

مشہور ہے کہ انھوں نے حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کو خواب میں دیکھا تھا کہ انھوں نے سورۂ فاتحہ کی چند آیتیں ان کو سکھائیں۔ جب بھی تفریح کی خاطر کھیلنے جاتے تو حیران رہ جاتے تھے اور کہتے تھے کہ مجھے ان لڑکوں کے چہرے توے جیسے ہوئے، ان کے جسم خون آلودہ اور کھال ادھڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ بعض مجھے یوں دکھائی دیتے ہیں جیسے ان کے سر نہیں ہیں۔

ایک لمبے عرصہ کی مصیبتوں کے بعد حضرت اپنے وطن سے سنگرہ، پھر وہاں سے لاہور آئے۔ لاہور میں آپ نے مولانا عارف جامی کے شاگرد مولانا اسمٰعیل اُچھ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور کم عمری ہی میں اس خوبی کے ساتھ شرح اصفہانی پڑھ لی، ان کے ساتھ جو ولایتی[15] طالب علم پڑھتے تھے وہ ان کی ذہانت و ذکاوت پر حیران رہ گئے۔ ان کے استاد کہا کرتے تھے کہ جس طرح ہم اپنے استاد مولانا جامی کی ذات پر فخر کیا کرتے تھے اسی طرح یہ نوجوان بھی ایسا صاحب مرتبہ ہوگا کہ لوگ اس کے دیدار کو ہی بڑی برکت جانیں گے اور اس کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں گے بالآخر یہ ظہور میں آ کر رہا:

نگار من کہ بہ مکتب نرفت و خط ننوشت
بغمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

کچھ عرصہ بعد آپ نے بڑی ریاضتیں کیں۔ اس دوران خود بخود آپ پر ایک خاص جذبہ طاری ہوا اور حضرت غوث الثقلین سے ایک باطنی مناسبت پیدا ہوگئی۔ عالم مراقبہ میں وہ جو کچھ سوال کرتے تھے اس کا جواب انھیں مل جاتا تھا۔ پھر یہاں تک نوبت پہنچی کہ اسی عالم جذب میں سر و پا برہنہ دیپال پور کے علاقے کے جنگل میں جسے شیر گڈھ کہا جاتا ہے اور جو جنگلی جانوروں کا مرکز ہے گھومتے رہتے تھے۔

ما عاشق سر گشتہ صحرائی و مستیم

کبھی کبھی جب وہ حضرت مخدوم عالم گنج شکرؒ کے مزار پر چلے جاتے تو وہاں ان کو باطنی اشارے ملتے، بشارتیں سنائی دیتیں اور صاحب مزار سے گفتگو ہوتی۔ جس کی تفصیلات اس مختصر کتاب میں درج نہیں کی جاسکتی البتہ شیخ ابو المعالی ولد شیخ رحمت اللہ کی تصنیف "نفحات داؤدی" میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس جنگل میں حضرت ممدوح نے 20 سال گزار دیئے۔ اس کے بعد آپکی توجہ سلوک وارشاد کی طرف مائل ہوئی لیکن مشکل یہ تھی کہ بظاہر آپ کا کوئی پیرو مرشد نہ تھا۔ حضرت غوث اعظمؒ نے اپنی روحانیت سے آپ کی راہنمائی کی کہ سلسلۂ طریقت کے تحفظ کے لیے وہ شیخ حامد قادری ولد شیخ عبد القادر ثانی کے ہاتھ بیعت کریں۔ شیخ حامد چونکہ بارہا خود ان سے مقامات سلوک میں مدد لیتے رہتے تھے اور ہر مشکل مرحلہ میں ان سے دعا کراتے رہتے تھے اس لیے ان کو اپنا مرید بنانے، شجرہ لکھ کر دینے میں تامل تھا۔ یہاں تک کہ شیخ داؤد خود ایک دن ستگوڑھ جہاں مخدوم شیخ حامد مقیم تھے تشریف لے گئے اور نہایت عالم جذب میں ان سے فرمایا کہ: "یہ دیکھو خود غوث اعظم تشریف لائے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ سجادۂ عصا، شجرۂ خلافت، گھوڑا پالکی اور دوسرے لوازمات پیشوائی میرے حوالہ کردو"۔ جب شیخ مخدوم کو بھی اس معاملہ میں عین الیقین حاصل ہو گیا تو انھوں نے شیخ داؤد کی تمام فرمائشوں کی تکمیل کردی اور وہ وہاں سے شیر گڑھ کے نئے شہر میں آکر جھنگی کے قریب مقیم ہو گئے۔ یہ مقام ملتان اور پٹن کے درمیان تھا۔ آپ نے یہاں قیام فرما کر سلسلۂ سہروردیہ و چشتیہ اور قادریہ کو رواج دیا۔ ان کے تلقین وارشاد کی ایسی شہرت ہوئی کہ تا قیامت یہ شہرہ ختم نہیں ہو سکتا۔

جس زمانہ میں مخدوم الملک عبد اللہ سلطان پوری اہل اللہ کے درپے آزار ہو گیا اور بعض طالبان حق کو شہید بھی کرادیا تھا۔ سلیم شاہ افغان سور نے گوالیار سے حضرت کی طلبی کے لیے فرمان بھجوایا تھا۔ آپ تنہا ایک دو خادموں کے ساتھ گوالیار گئے۔ سلیم شاہ نے گوالیار سے باہر نکل کر نہایت عزت و احترام کے ساتھ آپ سے ملاقات کی۔ اسی جگہ آپ نے قیام کیا۔ سلیم شاہ نے نہایت خلوص و عقیدت کے ساتھ حضرت سے بات چیت

کی۔ اس رنگ کو دیکھ کر ہی فتنہ پردازوں کے ہوش اڑ گئے اور وہ اِدھر اُدھر کھسک گئے اور ایسے روپوش ہوئے کہ تلاش کے باوجود ان کا پتہ نہ چل سکا۔ مخدوم الملک نے کہا: "یہ جھوٹ بولنے والے آدمی نہیں ہیں"۔ کچھ گفتگو کے بعد آپ نے دریافت کیا: "ہم فقراء کو طلب کرنے کا آخر سبب کیا تھا؟" مخدوم الملک نے کہا، ہم نے سنا تھا کہ: "آپ کے مرید ذکر کے وقت "یا داؤد یا داؤد" کا نعرہ لگاتے ہیں"۔ آپ نے جواب دیا یہ سننے والے کی غلط فہمی ہے میرے مرید تو "یاودود، یاودود" کا ذکر کرتے ہیں۔

مخدوم الملک کے ساتھ آپکی ایک دن یا ایک رات نشست رہی۔ آپ نے اسے حقائق ومعارف کی باتیں بتائیں اور چند نصیحتیں بھی کیں۔ وہ نہایت متاثر ہوا اور آپ کو اسی مقام سے پورے اعزاز واکرام کے ساتھ رخصت کیا۔

ایک مرتبہ ان کی مجلس میں میاں حسام الدین ملتانی[15] کے زہد وتقویٰ کا ذکر چھڑ گیا۔ آپ نے کہا افسوس میاں ظاہری رسوم واخلاق میں پھنس کر حق تعالیٰ کی محبت ذاتی سے دور رہ گیا"۔

حضرت نہایت ایثار پیشہ اور فیاض دست تھے۔ ہر سال ایک یا دو بار اپنا سارا مال جو ھدیوں اور نذرانوں میں جمع ہو جاتا تھا، راہ خدا میں لٹا دیتے تھے۔ اپنی بیوی کے ساتھ اپنے سکونتی حجرہ میں اس حال میں رہتے تھے کہ بجز مٹی کے پیالے اور پرانے بوریے کے کچھ اور باقی نہ رہتا تھا۔ جب بھی ان کے پاس روپیہ جمع ہو جاتا اسی طرح خیرات کر دیتے۔ اس دریا دلی وکشادہ دستی کے باوجود حضرت غوث اعظم کے یوم ولادت اور عرس کے موقع پر انکی خانقاہ کے لنگر سے تقریباً ایک لاکھ زائرین کیا خاص، کیا عام سبھی کو کھانے پینے کی اشیاء دی جاتی تھیں۔ ابھی تک ان کے لنگر کی رونق اسی طرح قائم ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہو چکی ہے۔

آپ کی زبان مبارک سے بعض بڑے موثر کلمے ادا ہوئے ہیں مثلاً "بسم اللہ الدلیل الھادی فی ظلمات السحار والبوادی" اس پاک کلمہ کا اثر خطرات اور حادثات کے موقع پر ظاہر ہوا ہے اور بارہا اس کا تجربہ ہو چکا ہے: ایسی ہی بہت سی تسبیحات

ذکر اور اذکار آپ سے منسوب ہیں۔ آپ نے اپنی مہر کا سجع خود ہی تجویز کیا تھا:

محی داؤد عن اسم و رسم

فان الفقر یمحو کل وسم

میں[17] بیرم خاں کے عہد میں جو بلا شبہ ایک بہترین زمانہ تھا اور اس وقت ہندوستان حجلۂ عروسی کی طرح دلکش و بارونق تھا، آگرہ میں تعلیم پا رہا تھا۔ اس وقت میں نے بعض درویشوں سے آپ کی شان بزرگی کے قصے سنے تھے اور آپ کی عقیدت ومحبت کا بیج میرے دل میں پیوست ہو گیا تھا۔ اسی طالب علمی کے زمانہ میں چند بار میں[18] نے حضرت کی خدمت میں جانے کے ارادے سے شیر گڑھ کا ارادہ کیا لیکن والد مرحوم[19] مانع ہوئے اور راستہ ہی سے مجھے واپس لوٹا لیا۔ بعض اوقات کچھ اور موانعات پیدا ہوئے کہ میں[20] اس برکت سے محروم ہی رہا اور انتظار میں 12 سال نکل گئے۔

ایک مرتبہ حضرت کا ایک مرید شیخ کالّو نامی جس کی زبانی میں[20] حضرت کا حال سن کر غائبانہ معتقد ہو گیا تھا، بدایوں آیا۔ وہ جب بھی ملتا مجھ سے کہتا تھا: ''بڑا افسوس ہے کہ میاں صاحب زندہ ہیں اور تم ان سے ملنے ایک بار بھی نہیں گئے۔ اس کی یہ بات میرے خرمن اشتیاق کے لیے چنگاری بن گئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بھی ایک اچھا سبب پیدا کر دیا کہ محمد حسین خاں نے جس کی ملازمت سے میرا[21] تعلق تھا ابراہیم حسین میرزا کے تعاقب میں کولہ وکانت سے پنجاب کی طرف کوچ کیا اور مجھے اس سعادت سے فیض یاب ہونے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ میں پنجاب سے حضرت کی ملاقات کے لیے شیر گڑھ پہنچا میں نے حضرت کے جمال مبارک میں ایسا حسن پایا کہ کسی صاحب حسن کو اس سے نسبت نہیں دی جا سکتی۔ گفتگو کرتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے آپکے دانتوں سے نور برستا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ جس سے دل کی تاریکی چھوٹ جاتی تھی۔

میں[21] وہاں چند دن مقیم رہا۔ اس دوران کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا جس میں کہ سو، پچاس پچاس ہندو اپنے گھرانوں سمیت آکر اسلام قبول نہ کرتے ہوں۔ آپکی شخصیت کی وجہ سے مجھے تو اس شہر کے درو دیوار شجر و حجر تک تسبیح و ذکر کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

حضرت نے مجھے[21] ایک ٹوپی عنایت کر کے کہا کہ میری طرف سے اپنے اہل وعیال میں تم نائب رہو میرا یہی طریقہ ہے۔ پھر آپ نے میرے متعلقین کے لیے اپنے گھر سے ایک دو پٹہ اور رومال منگا کر عنایت کیا۔ میں نے عرض کیا اگر ایک پیراہن بھی عطا ہو جائے تو میرے لیے نور علی نور ہے۔ بڑے تامل کے بعد فرمایا: "وہ بھی وقت پر مل جائے گا"۔ میں[22] نے حضرت سے بعض دلی مقاصد اور اسرار بیان کیے اور ان کے جواب سنے، اس کے بعد میں نے رخصت ہونے کے لیے اجازت طلب کی۔ اسی اثناء میں حضرت بھی کمزوری کی وجہ سے پالکی میں بیٹھ کر اپنے گھر کو روانہ ہوئے۔ میں[22] نے ان کی پالکی کا پایہ اپنے کاندھے پر لے لیا اور کئی قدم چلا۔ اس وقت مجھ پر اس قدر گریہ طاری ہوا کہ ضبط نہ کر سکا۔ حضرت نے پالکی رکوائی اور مجھے بہت سی معرفت ومحبت کی باتیں بتائیں۔

جس دن میں رخصت ہو رہا تھا میں نے میاں عبدالوہاب کے وسیلے سے حضرت سے عرض کیا کہ ہندستان کے مشائخ کہتے ہیں کہ ایک سید کے ظہور کا زمانہ قریب آگیا ہے۔ ان میں سے اکثر نے ایک سید پر اتفاق بھی کر لیا ہے جس کے آباو اجداد اس سے پہلے کچھ عرصہ تک دہلی اور بدایوں پر حکمران بھی رہے ہیں اور اب وہ لوگ جہاد کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ حضرت غوث اعظمؒ کی طرف سے اس اہم خدمت پر مامور کیے گئے ہیں۔ ان لوگوں نے سرحد کے بعض امیروں کو بھی اپنا حامی بنالیا ہے، بعض لوگوں نے مختلف مقامات پر بشارت پا کر اس گروہ میں شرکت کر لی ہے اور اب یہ سب اپنے ارادوں کو عملی صورت دینے کی فکر میں ہیں۔ حضرت نے پوچھا اس سید کی وضع اور حالت کیسی ہے؟ میں[22] نے کہا وہ ایک گوشہ نشین متشرع اور متوکل فقیر ہے، بڑی عبادت و ریاضت کرتا ہے، دن کو مقبروں میں بیٹھا رہتا ہے، رات کو اپنے حجرہ میں عبادت کرتا رہتا ہے، سپاہ گری کے فن میں بھی بے مثل اور لاثانی ہے، اس کے اخلاق وعادات نہایت شائستہ ہیں، شادی شدہ کنبہ والا ہے۔ آپ نے فرمایا، اس جماعت کے لوگ درویش نہیں معلوم ہوتے کہ حضرت غوث اعظمؒ پر یہ افترا باندھتے ہیں اور اس بیچارے سید کا بھی خانہ

خراب کرنا چاہتے ہیں ان کی وہ ساری بشارتیں محض شیطانی وساوس ہیں۔ بھلا حضرت غوث اعظمؒ اس بات پر کس طرح راضی ہو سکتے ہیں؟ ان کا حکم تو یہ ہے کہ دنیا کی محبت بالکل دل سے نکل جائے اور خلوص و سچائی کے ساتھ عشق خداوندی حاصل کیا جائے، حرص و ہوس کا نام تک باقی نہ رہے۔ عبادت اور ریاضت کا طریقہ چھوڑ کر دنیا کے جال میں پھنسنا کہاں کی ہوش مندی ہے۔ میری جانب سے تم اس سید سے کہنا کہ تم نے جو ارادہ کیا ہے اس میں اللہ تعالیٰ تم کو استقامت عطا کرے، اگر تمہارے دل میں اس دنیائے فانی کی لذتوں کا ذرا سا شائبہ بھی رہ گیا ہے تو پہلے تم اس کو دور کرنے کی فکر کرو اور اس نادان جماعت کے بہکانے سے مغرور ہو کر بے راہ نہ ہو جاؤ۔ طالب دنیا کا منتہا و مقصود صرف سلطنت ہے جو چند روزہ اور فانی ہے، طالب حقیقی کو جاودان نعمتیں حاصل ہوں گی۔ اگر خدا کا طالب اپنے مطلب سے محروم رہ کر حسرت ہی میں رہ جائے تو اس کی ناکامی اول الذکر کی کامیابی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ اس سلسلۂ کلام میں انھوں نے بڑی نصیحت آمیز باتیں کیں جنھیں سن کر حاضرین پر ایسا اثر ہوا کہ سب بے اختیار رونے لگے، میں بھی وہاں سے روتا اور آنسو بہاتا رخصت ہوا۔

اس زمانہ میں اُلغ بیگی مرزاؤں کی بغاوت کی وجہ سے شیر گڑھ سے لاہور تک کا راستہ خطرناک ہو گیا تھا اور میں تنہا تھا، اس لئے آپ نے اپنے ایک خادم کو میرے ساتھ کر دیا کہ وہ مجھے شیخ ابو اسحٰق مہر کی خدمت میں جو حضرت کے بڑے اچھے خلیفہ تھے، پہنچا دے پھر وہ مجھے حسین خان کے لشکر میں جو ملتان سے لاہور آیا ہوا تھا اور وہاں سے کانت و گولہ جانے والا تھا، پہنچا دیں۔ غرض میں لاہور پہنچ کر حسین خان کے لشکریوں کے ساتھ ہندوستان کے لئے روانہ ہو گیا ایک دن سہارن پور کے مقام پر ایک باغ میں بیٹھا ہوا حضرت کی یاد میں ملول تھا کہ ایک مسافر قادر پیراہن ہاتھ میں لیے ہوئے میرے پاس آیا اور کہا کہ: "یہ لے لو ایک پیر بزرگ کے یہاں سے یہ مجھے حاصل ہوا تھا اور مجھے اس کے عوض کچھ راستہ کا خرچ دے دو"۔ میں[22] نے جب اس کرتے کے ملنے کا حال پوچھا تو اس نے بتایا کہ میں میرزا ابراہیم حسین کے لشکر میں تھا جب اسے شکست ہوئی تو سپاہیوں کا

ایک روز وہ جس میں میں "(مصنف)" بھی شامل تھا ملاقات کو آئے اور اس حال میں کہ پھٹے ہوئے کپڑے پہنے تھے۔ سب کے سب شیخ داؤد کی خدمت میں پہنچے۔ انھوں نے ہم میں سے ہر ایک کو ایک جوڑا عنایت کیا۔ جب میری باری آئی تو پیرہن اپنے بدن سے اتار کر مجھے دے دیا۔ میں نے اسکو پہننا بے ادبی جانا اور بطور تبرک کے طور پر اسے محفوظ رکھے رہا۔ اب وہ میں تمھیں دے رہا ہوں۔ میں "(مصنف)" نے اسے قمیص سے لے لیا:

محبت بیع اولات آمد بہ من   لذت جان یافتم زان زانچہ

خواندہ بودم فاتحہ وصل ترا   شد قبول الحمد اللہ فاتحہ

مجھے حضرت کی وہ بات یاد آگئی کہ فرمایا تھا: "کرتا بھی اپنے وقت پر تم کو مل جائے گا"۔ بلاشبہ یہ آپکی کرامت تھی۔ میں اس پیرہن یوسف کو جان کے برابر حفاظت سے رکھے ہوئے ہوں:

شوق تو در ضمیرم و مہر تو در دلم   با شیر اندرون شد و با جان برون شود

شیخ داؤد جہنی وال اپنے وقت کے قطب اور صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ آپ نے بڑی بڑی ریاضتیں اور سخت مجاہدے کیے تھے۔ ابتدا میں علوم ظاہری حاصل کیا اور ان کی تعلیم بھی دی، پھر ایسے متوکل اور خانہ نشین ہوئے کہ کبھی اہل دنیا سے ملنے نہیں گئے۔ صرف ایک بار شیر گڑھ سے گوالیار، وہ بھی سلیم شاہ کے بلانے پر گئے تھے۔ اکبر بادشاہ جب پٹن گیا تو اس نے شہباز خان کو شیخ کے بلانے کے لیے بھیجا تاکہ وہ ملاقات کا موقع دیں، لیکن آپ نے عذر فرمایا کہ ہماری غائبانہ دعا ہی کافی ہے۔ غرض آپ دنیا داروں کی صحبت سے ہمیشہ دور رہتے تھے اور "الفقر فخری" پر عمل کر کے ہمیشہ بخشش و ایثار سے کام لیتے تھے۔ جو طالبان حق آتے ان کو تلقین و ارشاد فرماتے۔ جو شخص بھی حضرت کی صحبت میں پہنچ گیا وہ آپ کے فیض روحانی سے مستفید ہو کر لوٹا۔

آپ نے 982ھ/1574ء میں وصال فرمایا۔ آپ کی تاریخ وفات "یا شیخ داؤد ولی" ہے۔

شیخ ابن امروہہ

سالک طریقت اور مجذوب تھے۔ اس حالت جذب کے باوجود شریعت کے لوازم ترک نہیں ہوتے تھے۔ ذرا ذرا سی پابندی کا بھی اہتمام رہتا تھا۔ ان کی بہت سی کرامتیں مشہور ہیں۔ آزادانہ زندگی گزارتے اور لوگوں کو مرید بھی کرتے تھے۔

جس زمانہ میں میں[25] میاں شیخ داؤد سے مل کر پنجاب سے واپس ہوا تھا اور امروہہ کے راستے بدایوں جا رہا تھا تو حضرت کی خدمت میں پہنچا تھا۔ اس وقت وہ کسی کی طرف خاص طور سے متوجہ ہوئے، بغیر کلام پاک کے ایک آیت بیان کر رہے تھے۔ کبھی کبھی میری طرف دیکھ لیتے تھے۔ انھوں نے اس وقت جزا اور صبر کرنے والوں کے اجر کی فضیلت بیان کی اور اس سلسلہ میں آیت ''والباقیات الصالحات'' میری طرف دیکھ کر تلاوت کی۔ اس تلقین کا مطلب جلد ہی ظاہر ہوا۔ ان کا اشارہ کسی مصیبت کی طرف تھا، چنانچہ میری[26] ایک بچی تھی جس کو میں بہت چاہتا تھا۔ میں ابھی سفر میں تھا کہ وہ بدایوں میں فوت ہو گئی۔ ان کے وہ تسلی آمیز ارشادات غالباً میرے ہی لیے تھے۔ واللہ اعلم۔ ان کی وفات 987ھ/1589ء میں ہوئی۔

خواجہ عبدالشہیدؒ

یہ خواجگا خواجہ کے صاحبزادے اور خواجگا خواجہ حضرت خواجہ احرار کے لڑکے ہیں۔ جس وقت خواجہ عبدالشہید پیدا ہوئے تو لوگ انھیں خواجہ احرار کی خدمت میں لے کر گئے۔ حضرت نے ان کو گود میں لے کر فرمایا: ''مرد حق آگاہ بنے گا''

خواجہ عبدالشہید ظاہری اور باطنی کمالات کا مجموعہ تھے۔ انھوں نے بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے۔ ان کی شخصیت انسانی کمالات کا آئینہ تھی۔ خلق خدا نے ان کی تلقین و ہدایت سے بڑا فیض اٹھایا۔ وہ طریقہ سلوک میں خواجہ احرار کے قدم بقدم چلتے تھے۔

سمرقند سے ہندوستان آکر یہاں 18 سال تک بسر کیے۔ 982ھ/1574ء میں فرمایا [illegible] سے کہ ہم۔

اپنی ہڈیوں کو سمرقند میں آبائی قبرستان میں پہنچادیں"۔ چنانچہ وہ سمرقند کے لیے روانہ ہوگئے۔ جس وقت وہ کابل پہنچے تھے تو میرزا شاہ رخ نے کابل والوں کو گھیر لیا تھا اور بدخشاں جا رہا تھا۔ خواجہ صاحب کی سفارش سے تقریباً 10 ہزار آدمی ظالموں کی قید سے رہائی پا گئے۔

خواجہ صاحب سمرقند پہنچنے کے دو تین دن بعد ہی اس دنیا سے رخصت ہوگئے اور اپنے بزرگوں کے زیر سایہ مدفون ہوئے۔ خواجہ صاحب کا مرتبہ اس سے بلند ہے کہ ان کی کرامتوں کا ذکر کر کے ان کے مراتب کو ظاہر کیا جائے۔

میں نے حضرت کا دیدار اس وقت کیا تھا جب کہ شاہی لشکر پٹنہ سے واپسی میں بھون گاؤں اور پنپالی کی حدود میں پہنچا تھا۔ آپ اکبر بادشاہ سے وداع ہونے کے لیے تشریف لائے تھے۔ میں نے دور ہی سے آپ کو دیکھا۔ ملاقات اور گفتگو کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔

شیخ ادھنؒ جونپوری

چشتی سلسلے میں اپنے والد شیخ بہاؤالدین کے مرید تھے۔ اپنے وقت کے بڑے مقتدر اور پیشوا تھے۔ طویل عمر پائی۔ ان کی زندگی عمر طبعی سے بھی زیادہ تھی۔ چنانچہ ان کے لڑکے تک ان کے سامنے ستر ستر، اسی اسی برس کے ہوگئے۔ اسی طرح پوتوں کی بھی ان کی زندگی میں لمبی عمریں ہوئیں۔

شیخ ادھن نے اپنی ساری زندگی عبادات اور حصول معرفت میں گزاری۔ علوم ظاہری بھی انھوں نے بہت حاصل کیے تھے لیکن کبھی درس نہیں دیا۔ سماع کا بڑا ذوق تھا۔ آخر عمر میں جسمانی کمزوری کی وجہ سے وضو بنانے اور نماز پڑھنے اور ضروری حاجتوں کے لیے خادموں کی مدد کے بغیر اٹھ نہیں سکتے تھے۔ اس حال میں بھی اگر راگ کی آواز کان میں پڑجاتی تو سماع کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے، پھر ان پر ایسا حال آتا کہ چند آدمی بھی مل کر ان کو بہ مشکل سنبھال سکتے۔ فرض نماز کے ادا کرنے میں بھی یہی حال تھا۔ سنت اور نفل تو

بیٹھ کر پڑھ لیتے لیکن فرض کھڑے ہو کر ادا کرتے تھے اور کسی کی مدد اور سہارے کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔

مشہور ہے کہ ان سے کرامتیں بے تکلفی سے صادر ہوتی رہتی تھیں۔ انھیں اللہ نے بکثرت اولاد دی تھی۔ محفل میں جب وہ اپنے ہوش مند سفید سفید داڑھی والے بچوں کے ساتھ بیٹھے ہوتے تو آنے والا بڑے شبہ میں پڑ جاتا کہ ان بڈھوں میں سے حضرت کون ہیں اور ان کے لڑکے کون!

اپنی محفلوں میں طریقت و حقیقت کے باب میں ایسی گہری باتیں بیان کرتے تھے کہ عوام تو عوام، خواص بھی ان کا احاطہ نہیں کر سکتے تھے۔ کوئی بوالہوس ان اسرار و رموز کی گرد کو بھی نہیں پا سکتا۔ ان کی یہی رمز بیانی ان کے متعلق شبہ کا باعث ہوگئی تھی۔

اکبر پہلی بار جب باغیوں کی بغاوت کو کچلنے کے لئے جونپور گیا تھا اور جونپور پہنچنے میں ابھی 3 دنوں کا سفر باقی تھا کہ شیخ کا جونپور میں انتقال ہوگیا میں[27] ان کی خدمت میں حاضر ہونے سے محروم ہی رہا۔

آپ کی وفات 970ھ/1562ء میں ہوئی۔ ان کی تاریخ وفات ''شیخ اوحن'' سے نکلتی ہے۔

شیخ عبدالغفورؒ اعظم پوری

اعظم پور، سنبھل کا ایک قصبہ ہے۔ شیخ موصوف شیخ عبدالقدوس چشتی کے مرید ہیں، ظاہری اور باطنی کمالات کا مظہر تھے۔ بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے تھے۔ حضور اکرم ﷺ کی طرح توفیق خداوندی ان کے ہمراہ رہتی تھی۔ ان تصرف واثر ملنے والوں پر بڑی جلدی ہوتا تھا۔ اگر طالب کی اہلیت و مناسبت کمتر بھی ہوتی تو شیخ کی کشش بہت جلد اسکو آگے بڑھا دیتی اور وہ بے اختیار خدمت گزاری پر مائل ہو جاتا۔

اکثر اوقات دینی علوم کا درس دیتے تھے۔ ان کا روح افزا کلام پریشان دلوں کے لیے راحت بن جاتا تھا اور ان کی معجز بیان زبان بے قرار جانوں کے لیے مرہم کا کام کرتی

بھی حسن صورت اور حسن سیرت دونوں میں وہ اپنے عہد میں سب سے ممتاز تھے۔ مرید بنایا کرتے تھے۔ لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے رہتے تھے۔ تصوف کے موضوع پر کئی ایک رسالے بھی لکھے تھے۔ بلاشبہ شیخ کے ظاہری اور روحانی کمالات میں کوئی کمی نہیں تھی۔ آپ نے 975ھ، 1567ء میں رحلت فرمائی اور اعظم پور میں دفن ہوئے۔

میاں وجیہہ الدینؒ احمد آبادی

یہ علوی نسب سے تعلق رکھتے تھے لیکن اپنے نسب کو انھوں نے مسافر ہونے کی وجہ سے شہرت نہ دی۔ اپنے زمانہ کے بڑے عابد و متقی عالم تھے۔ شریعت کی نہایت پابندی کرتے تھے۔ گوشہ نشینی ان کا شعار تھا۔ ہمیشہ دینی علوم کی درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ تمام عقلی اور نقلی علوم پر قدرت و عبور حاصل تھا۔ چنانچہ "صرف ہوائی" سے لے کر "قانون"، "شفا"، "شرح مفتاح" اور "عضدی" جیسی کتابوں میں سے شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہوگی جس پر انھوں نے شرح یا حاشیہ نہ لکھا ہو۔ ایک مخلوق ان کے علمی افادہ سے فیض اٹھاتی رہی۔

اللہ نے ان کی دعا میں بڑا اثر دیا تھا اور شفا رکھی تھی، چنانچہ ہر روز بے شمار مریض ان کے پاس دعا کرانے کے لیے آتے تھے۔ ان کی دعا کا بھی بڑی جلدی اثر ہوتا تھا۔ وہ کبھی اپنے طور پر دنیا دار اصحاب کے گھر نہیں گئے اگر ایک دوبار گئے بھی تو وہ بھی طلب کرنے پر نہایت اکراہ کے ساتھ۔ اپنے گھر اور مسجد سے ان کا قدم جمعہ کی نماز کے لیے بھی باہر نہیں نکلتا تھا۔ ان کا گھر ادنیٰ و اعلیٰ سب کا مرکز و مرجع تھا۔

وضع و لباس میں بھی وہ عام لوگوں سے کوئی امتیاز نہیں رکھتے تھے۔ موٹے جھوٹے کپڑوں پر ہی قانع رہتے تھے۔ جو کچھ نذر نیاز آتی وہ خیرات کر دیتے تھے۔

ارادت کا تعلق تو کسی اور سے تھا لیکن شیخ محمد غوث سے تربیت و ارشاد حاصل کیا تھا اور آداب طریقت میں ان کے پیرو تھے۔ انہی کے پاس سلوک کی تکمیل کی تھی۔ صوفیانہ مشرب سے بڑا ذوق اور مناسبت تھی۔

سلطان محمود گجراتی کے عہد میں، جب شیخ محمد غوث ہندوستان سے گجرات گئے تو شیخ علی متقی نے جو نہ صرف اس عہد کے بہت بڑے عالم تھے بلکہ دربار میں بھی ان کا بڑا اثر واقتدار تھا، ان کے قتل کا فتویٰ صادر کردیا۔ سلطان نے اس فتویٰ کو میاں وجیہ الدین کے دستخط وتصدیق پر منحصر کردیا۔ چونکہ میاں وجیہ الدین، شیخ محمد غوث کے گھر جاچکے تھے اور پہلی ہی بار ان کے شیدا وفریفتہ ہوگئے تھے۔ اس لیے انھوں نے اس فتویٰ کو پھاڑ کر پھینک دیا۔

جب شیخ علی متقی کو معلوم ہوا تو وہ دوڑے ہوئے میاں کے گھر آئے اور اپنے کپڑے پھاڑ دیے، کہا آپ کس لیے بدعت اور دین میں رخنہ اندازی کے حامی بن گئے ہیں، انھوں نے جواب دیا، ہم اہل قال ہیں اور شیخ محمد غوث ارباب حال میں سے، ہم ان کے اعلیٰ کمالات کو نہیں سمجھ سکتے اور ظاہر شریعت کے اعتبار سے بھی ان پر اعتراض وارد نہیں ہوسکتا۔

شیخ محمد غوث گوالیاری سے سلاطین گجرات کو جو عقیدت رہی ہے اس کا سبب یہی واقعہ تھا۔ میاں صاحب کے اس رویہ کی وجہ سے شیخ موصوف پھانسی سے بچ گئے۔ اس واقعہ کے بعد میاں صاحب اکثر اپنی مجلسوں میں کہا کرتے تھے۔ ظاہر شریعت پر ایسی ہی نظر ہونی چاہیے جیسی شیخ علی متقی کی ہے اور حقائق پر ایسی جیسے ہمارے پیر شیخ محمد غوث کی نظر ہے۔

میاں وجیہ کا انتقال 998ھ/1580ء میں ہوا۔ ان کی تاریخ وفات "وجیہ الدین" سے نکلتی ہے۔ واضح رہے ان چار بزرگوں سے جن کا ذکر کر آیا ہوں مجھے ملاقات کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔

میاں عبداللہ نیازیؒ سرہندی

نیازی پٹھانوں کے ایک قبیلے کا نام ہے۔ میاں عبداللہ پہلے شیخ سلیم چشتی فتح پوری کے مرید تھے۔ آپ اس حجرہ میں جو نئی خانقاہ سے متصل ہے اور اب وہاں عبادت خانہ شاہی

کی عمارت بنی ہوئی ہے۔ ہمیشہ معتکف رہا کرتے تھے۔

جس وقت شیخ سلیم پہلی بار براہ خشکی حج کے سفر پر گئے تھے، وہاں سے لوٹ کر آئے تو میاں عبداللہ نے شیخ سے مکہ معظمہ جانے کی اجازت مانگی۔ شیخ نے ان کو رخصت کرتے ہوئے ان تمام شیوخ و اہل اللہ کا اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا ایک تذکرہ دیا جن سے شیخ نے عرب و عجم اور ہندوستان میں ملاقات کی تھی۔ میاں عبداللہ نے بہت سے شہروں کی سیاحت کی اور ان مشائخین سے ملاقاتیں کیں۔

سید محمد جونپوری نے مہدویت کا دعویٰ کیا تھا۔ میاں عبداللہ کا گجرات اور دکن میں اس سلسلہ سے تعلق ہوا اور انھوں نے اسی مسلک کو اختیار کر لیا۔ بیانہ میں آکر کچھ عرصہ تک گوشہ گمنامی میں دنیا سے بے تعلق ہو کر زندگی بسر کرتے رہے۔ جب بیانہ کے شیخ علائی کی تحریک کی دھوم ہوئی تو سلیم شاہ نے مخدوم الملک کے بہکانے سے میاں عبداللہ کو بھی سخت ایذائیں دیں اور انھیں بری طرح پیٹا گیا۔ وہ مرتے مرتے بچ گئے۔ اس واقعہ کے بعد وہ دوبارہ دنیا کی سیاحت کے لیے نکل گئے۔

آخر عمر میں میاں عبداللہ نے مہدوی عقائد کو ترک کر دیا تھا اور سرہند میں عزلت گزیں ہو گئے اور تمام مشائخین کی طرح سلوک و طریقت پر کاربند ہو گئے تھے۔ جس زمانہ میں اکبر نے فتح پور میں اور ایک حجرہ کو جو شاہی محل سے متصل تھا تعمیر کرایا اور اس کا نام عبادت خانہ رکھا تھا تو اسی سلسلہ میں میاں عبداللہ کا حال اکبر کو معلوم ہوا تھا۔ اکبر نے ان کو سرہند سے بلا کر تنہائی میں گفتگو کی اور ان کے حالات دریافت کیے۔ اس وقت انھوں نے مہدویت سے انکار کر کے کہا، چونکہ پہلے یہ جماعت مجھے اچھی معلوم ہوئی تھی۔ اس لیے میں نے اس مسلک کو اختیار کر لیا تھا جب مجھے حقیقت کا پتہ چلا تو میں نے اس سے ہاتھ کھینچ لیا۔

اکبر جب 993ھ/1585ء میں اٹک جاتے ہوئے سرہند پہنچا تو انھیں دوبارہ طلب کر کے ملاقات کی اور ان کی مدد معاش کے لیے زمین کی پیش کش کی۔ انھوں نے توکل و قناعت کی وجہ سے اسکو قبول نہ کیا لیکن اکبر نے فرمان لکھوا کر ان کے حوالہ کر ہی دیا۔

انھوں نے مجبوراً وہ فرمان لے لیا لیکن توکل و قناعت کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑا اور اس زمین سے مرتے دم تک کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ ان کے سارے عمل کا انحصار "احیاء العلوم" اور "کیمیائے سعادت" پر تھا۔

الغ میرزا کی بغاوت کے زمانہ میں میں[28] محمد حسین خاں کے ہمراہ تھا۔ اس وقت ان سے میں نے سرھند جا کر ملاقات کی تھی۔ ان کے سامنے "احیاء العلوم" کھلی ہوئی تھی۔ اس کے چند مضامین انھوں نے بیان کیے۔ اس وقت محمود خاں اور اُس کے ایک شناسا نے جو سلیم شاہ کے عہد سے ان کی مصاحبت میں تھا اور شیخ علائی کی تحریک کے وقت میاں نے اسے سیف اللہ کا خطاب دیا تھا۔ میاں صاحب سے پوچھا: "دل کیا ہے؟" انھوں نے جواب دیا: "دل سے ہمارا فاصلہ ہزاروں منزلوں کا ہے اس کے بارے میں کیا پوچھتے ہو؟ اخلاق و عمل کی باتیں دریافت کرو" اس کے بعد ایک بوڑھے مغل نے کسی ذکر میں میر سید محمد جونپوری کی مہدویت کا مسئلہ چھیڑ دیا اور ان سے تصدیق و شہادت طلب کی۔ انھوں نے کہا: "جس وقت میر سید محمد جونپوری نے رحلت فرمائی تھی میں فراہ میں حاضر تھا، انھوں نے مہدویت کے دعویٰ سے انکار کیا تھا اور کھلے لفظوں میں کہہ دیا تھا میں مہدی موعود نہیں ہوں" واللہ اعلم۔ ان کی بات سن کر محمود خان نے آہستہ سے کہا میاں عبد اللہ نے بھی اچھا کام کیا کہ مہدویت کی حمایت کر کے بیچارے شیخ علائی کی گردن کٹوادی اور خود دامن بچا کر اس دائرہ سے نکل آئے۔

میاں عبد اللہ نے 90 سال کی عمر میں 1000ھ/1591ء میں اس سرائے فانی سے عالم بقا کی طرف کوچ کیا۔

شیخ ابو الفتح گجراتی

یہ حضرت میر سید محمد جونپوری کے داماد تھے لیکن انھوں نے سید صاحب کو نہیں دیکھا تھا۔ یہ رشتہ ان کی وفات کے بعد ہوا تھا۔ یہ بڑے جاہ و جلال والے بزرگ تھے۔ سلسلہ مہدویہ میں نہایت ثابت قدم اور راسخ العقیدہ تھے۔ مکہ معظمہ اور گجرات میں شیخ گدائی کے ساتھ

ان کی خوب دوستی رہی تھی۔ بیرم خاں خان خاناں کے عہد میں کسی اہم کام کے سلسلہ میں آگرہ آگئے تھے۔ کچھ ہی دن بعد جب بیرم خاں کی بساط الٹ گئی تو وہ گجرات چلے گئے۔

میں[29] اپنی طالب علمی کے زمانہ میں حاجی مہدی لاہوری کے داماد مولانا عبداللہ قندھاری کے ساتھ آدھی رات کے وقت شیخ کی خدمت میں پہنچا تھا وہ اس وقت آگرہ میں جمنا کے پار شیخ بہاؤ الدین مفتی کے محلہ میں مقیم تھے اور ایک خالی حجرہ میں تنہا بیٹھے کسی شغل میں معروف تھے۔ ہم[30] پہنچے تو انھوں نے حضور اکرم ﷺ کی یہ حدیث: "لا یقعد قوم یذکرون اللہ الا حفتھم الملائکۃ و غشیتھم الرحمۃ و نزلت علیھم السکینہ وذکرھم اللہ فیمن عندہ" پڑھی اور اس کی تشریح کی، پھر انھوں نے مجھے اسی حدیث کے ذکر کی تلقین کی۔ میں[31] نے کچھ عرصہ تک اس حدیث کا ذکر کیا اور واقعی میں نے اس کا بڑا اثر اور فیض محسوس کیا اور قرآن کا مطلب مجھ پر واضح ہوگیا۔ چند بار تو ایسا ہوا کہ جو بھی آواز میرے کان میں پڑتی تھی میں اسے ذکر ہی سمجھتا تھا۔

میں[32] نے ان کے بعض مریدوں کو دیکھا کہ انھوں نے اپنے لبوں کو سریش لگا کر بند کر دیا تھا کہ بے فائدہ گفتگو سے بچے رہیں۔ بعض اس مطلب کے لئے منہ میں کنکریاں بھر لیا کرتے تھے۔

ان کی وفات کے متعلق معلوم نہیں ہو سکا کہ کب اور کہاں ہوئی۔

شیخ ابو اسحاق لاہوری

حضرت میاں شیخ داؤد کے خلیفہ تھے اور اپنی تیز رفتاری میں مشہور تھے۔ اپنے آپ کو پیر کی محبت میں فنا کر رکھا تھا اور ایسی مناسبت پیدا کر لی تھی کہ دونوں ایک ہی مطلب کی دو عبارتیں معلوم ہوتے تھے۔ دنیا کے الٹ پھیر سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔ ان کو دیکھ کر اللہ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی اور دل میں خدا طلبی کا جذبہ جاگ جاتا تھا۔ بلاشبہ وہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے۔

ان کے صرف دو تین رفیق تھے جو ان کے پیر کے ہمراز اور ہم زبان تھے اور لاہور

میں رہتے تھے۔ ان کے علاوہ وہ کسی کو اپنے یہاں نہیں بلاتے تھے۔ پیری مریدی کا کوئی سلسلہ نہیں رکھا تھا، ہمیشہ ایک اندھیرے حجرہ میں جو ایک باغ میں تھا، گوشہ نشین رہتے۔ جب کبھی حضرت میاں سے ملاقات کا اشتیاق ہوتا تو لاہور سے پیدل نکل جاتے اور ایک رات میں 40 کوس کا فاصلہ طے کر کے شیر گڑھ پہنچ جاتے اور پیر کی آستان بوسی کر کے بغیر ملے اسی وقت لوٹ جاتے۔ کیوں کہ ان کو میاں صاحب کے دیدار کی تاب نہیں تھی۔

ایک سال میں[33] بھی ان بزرگوار کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور ان کے یہاں ایک رات ایک دن مہمان رہا۔ دوسرے دن شیر گڑھ کے لیے صرف ایک محافظ کے ساتھ روانہ ہو گیا وہ زمانہ نہایت خطرناک تھا، راستہ میں راہزن اور لٹیرے میرا راستہ روک لیتے تھے اور حیران ہو کر پوچھتے تھے اس خطرناک جنگل میں تم تنہا کہاں جا رہے ہو؟ میں جیسے ہی جواب میں یہ کہتا کہ میں میاں شیخ ابو اسحاق کی خدمت سے حضرت پیر دستگیر کی خدمت میں جا رہا ہوں تو وہ محض ان کا نام سن کر ہی احترام و عقیدت سے پیش آتے اور کھانے پینے کے لیے دودھ، دہی وغیرہ لے آتے اور راستہ بتا کر احتیاط و حفاظت کے لیے حضرت میاں کے نام کے ذکر اور ورد کرتے رہنے کی تاکید کرتے۔ اس علاقہ میں حضرت کا نام ہر خاص و عام کی زبان پر تھا۔ غرض میں بحفاظت منزل پر پہنچ گیا۔

جس سال حضرت میاں نے وصال فرمایا تھا، ان کی وفات کے کچھ ہی دن بعد پنجاب میں عام وبا پھوٹ پڑی تھی اسی وبا میں تین چار ماہ کے اندر اندر حضرت کے تمام اہل خاندان اور مشہور خلفاء جو تقریباً پچاس ساٹھ آدمی تھے، جن میں ترجمان اسرار میاں عبد الوہاب جن کو ''میاں بابو'' بھی کہا جاتا تھا شامل تھے ایک کے پیچھے ایک اس دنیا سے رخصت ہو کر حضرت سے جا ملے۔ حضرت کی وفات کے کچھ ہی عرصہ بعد میاں شیخ ابو اسحاق بھی انتقال فرما گئے۔

میاں شیخ داؤد کے بعد سلسلہ عالیہ قادریہ کے نام لیوا ان کے صاحبزادے میاں شیخ عبد اللہ رہ گئے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد اس سلسلہ کے گدی نشین میاں شیخ ابو المعالی ہیں:

سلام اللہ اکر اللیالی!
علی الشیخ الصفی ابی المعالی

شیخ رکن الدینؒ

شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے صاحبزادے ہیں۔ قلم ان کے علم وکمال کا پوری طرح احاطہ نہیں کرسکتا۔ انھوں نے جو" مکتوبات قدسی" جمع کیے ہیں وہ ان کی فضیلت کا واضح ثبوت ہیں۔ گنگوہ تھانیسر کے علاقے میں ایک قصبہ ہے اور یہی قصبہ ان کا وطن بھی ہے۔ یہ بڑے صاحب مرتبہ بزرگ ہیں۔ ان کے بشرہ سے ہی ان کے کمالات جھلکتے ہیں۔ تصوف میں ایک خاص شان کے مالک ہیں۔ ان کے سلوک کا معاملہ ان کے شیوخ کے طریقہ پر ہے۔ ذوق وحال سے بڑی مناسبت ہے۔ امراء و حکام کے گھر شدید ضرورت کے علاوہ نہیں جاتے۔ ہمیشہ گوشہ نشین رہتے ہیں۔ میں[34] نے انھیں بیرم خاں کے ہنگاموں کے وقت دہلی میں شیخ عبدالعزیز کی محفل میں دیکھا تھا۔

میاں مصطفیٰ گجراتی

وہ اس بوہرہ فرقہ کے فرد تھے جو گجرات میں تجارت کرتا ہے۔ میر سید محمد جونپوری کے ایک مرید کے مرید ہوئے اور فقر وفنا کا راستہ اختیار کرلیا اور مرتے دم تک اسی راہ پر گامزن رہے۔

جب اکبر بادشاہ بنگالہ کی تسخیر کے بعد پٹنہ سے لوٹ کر اجمیر گیا تھا تو حسب الحکم آصف خان ثانی میر بخشی ان کو گجرات سے اپنے ہمراہ لے کر آیا تھا۔ اکبر نے ایک رات دیوان خانہ کے صحن میں علماء کی مجلس منعقد کی اور شیخ مصطفیٰ سے مہدویت کے مسئلہ کی تحقیق چاہی، انھوں نے جواب دیا اور علماء سے ان کا بڑا طویل مناظرہ ہوا۔ اس بحث میں ابراہیم سرہندی نے اپنی منحوس عادت کے مطابق سخت کلامی سے کام لیا اور شیخ کو بڑی اذیت پہنچائی۔

میر سید محمد کے ایک مرید شیخ محمد لاہجی نے ایک کتاب "شرح گلشن" تصنیف کی تھی اور خود بھی مہدویت کا دعویٰ کر کے بڑے فتنے برپا کیے تھے۔ اس بحث کے دوران میں[35] نے اس کتاب کے مضمون کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا۔ یہ بات چونکہ شیخ کے مدعا کے خلاف پڑتی تھی اس لیے ان کو مجھ سے غالباً رنجش ہو گئی ہو گی۔ جب بادشاہ فتح پور پہنچ گئے تو ان کے لیے حکم صادر ہوا کہ وہ چند دن تک خواجہ عبد الصمد مصور شیریں قلم کے گھر مقیم رہیں۔ اس وقت میں[36] ان کے یہاں معذرت خواہی کے لئے گیا اور اپنی گستاخی کی معافی چاہی۔

اس وقت وہ بہت کمزور ہو گئے تھے اسی محفل میں ان کے لیے طشت لایا گیا ان کے منھ سے بہت سا خون گرا۔ جب ان کو گجرات جانے کی اجازت مل گئی تو وہ وطن پہنچنے کے بعد یا راستہ ہی میں انتقال فرما گئے۔ یہ واقعہ 983ھ/1575ء میں پیش آیا۔ ان کے مکتوبات ان کی یادگار ہیں۔ جو فقر و فنا اور سوز و ساز سے بھرے ہوئے ہیں۔

شیخ اسحٰق "کاکو" لاہوری

ان کے والد کا نام شیخ کاکو تھا۔ لاہور والے شیخ اسحاق کی ولایت کے معتقد ہیں۔ یہ بڑے صاحب علم، متوکل اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ کبھی کسی کے دروازہ پر نہیں گئے نہ کسی سے مدد مانگی۔ ہمیشہ درس و تدریس میں مصروف رہتے۔ صوفی مشرب ہونے کے باوجود تمام علوم کے بہت بڑے عالم تھے۔ ہمیشہ اللہ کی یاد میں مشغول رہتے تھے۔ جب تک ان سے کوئی بات پوچھی نہ جاتی اس وقت تک وہ خود سے بات نہ کرتے تھے۔

ایک دن ایک نامعقول شخص نے راستہ چلتے ہوئے ان کو پکڑ لیا اور کھیر کا ایک مٹی کا دیگچہ ان کے سر پر رکھ دیا اور کہا اسکو میرے ساتھ لے چل۔ حضرت نے بلا تأمل و انکار اسے سر پر اٹھا لیا اور بازار سے اس کے مکان تک لے جا کر پہنچا دیا۔ اسی دن سے اس شخص کے دل کا کھوٹ نکل گیا اور دنیاداری چھوڑ کر وہ آخرکار عالم دین بن گیا۔

میں[36] نے 995ھ/1587ء میں شیخ موصوف سے ملاقات کا شرف حاصل کیا تھا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible] جب [illegible] پڑھنے سے [illegible] کھڑے ہوتے [illegible]

[illegible] 996ھ / 1588ء میں انتقال فرمایا۔

[illegible]

[illegible] ان کی زندگی مختلف مرحلوں سے گزری۔ ابتدا میں [illegible] پیشہ تھے [illegible] چونکہ سب کچھ چھوڑ کر ایک گانے والے کے عشق میں [illegible] کرتے رہے۔

[illegible] عشق [illegible]

[illegible]

ان کا تو عشق نے یہ حال کیا اور لوگ خوش عقیدگی کی وجہ سے اسے بھی ایک حال جان کر ان کو ولی سمجھنے لگے۔ اس واہی تباہی کی حالت میں عین نخاس میں کھڑے ہو کر درس دینے لگتے، جو کچھ ان کے پاس تھا انھوں نے اپنے اس محبوب کے پیچھے لٹا دیا۔ ایک رات وہ اس کے ساتھ بیٹھے شراب پی رہے تھے کہ محتسبوں کی ایک جماعت نے ان کے طلباء کے ساتھ چھاپہ مارا تو اور دیوار پر چڑھ کر گھر میں داخل ہوئے۔ لہو ولعب کا سارا سامان توڑ دیا۔ اصلاح کی خاطر انھیں سزا دینا چاہتے تھے کہ انھوں نے ان لوگوں سے وہی بات کہی جو کسی نے خلیفہ ثانی امیر المومنین حضرت عمرؓ سے کہی تھی کہ: "میں نے ایک خلاف شریعت کام شروع کیا اور تم لوگ تین غیر شرعی خطاؤں کے مستحق ہوئے ہو۔ اس لیے تم مجھ سے زیادہ سزا کے مستحق ہو۔ ایک تو یہ کہ تم نے میری برائیوں کی ٹوہ لگائی، دوسرے اجازت نہیں لی، تیسرے دیوار پھاند کر گھر میں داخل ہوئے" یہ سن کر وہ سب لوگ نہایت شرمندہ ہوئے اور وہاں سے لوٹ گئے۔

کچھ عرصہ کے بعد انھوں نے ان بد اعمالیوں سے توبہ کر لی اور احیاء العلوم، کو اپنا دستور العمل بنا کر ہمیشہ عبادتوں اور ریاضتوں میں بسر کرنے لگے۔

انھوں نے نہایت مفید اور بلند مرتبہ کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ امام غزالی کی تصنیف "جواہر القرآن" پر ایک شرح بھی لکھی تھی۔

اکبر نے ان کو خلوت میں بلا کر گفتگو کی تھی اور ان سے پوچھا کہ تم کس قوم کے ہو؟ انھوں نے برجستہ کہا لکھنے والوں کی قوم سے جن کو ہندی زبان میں کایستھ کہتے ہیں ان کی یہ بے تکلفی بادشاہ کو بہت پسند آئی اور کافی دیر تک ان سے باتیں کرتا رہا۔

میں[38] نے پہلی بار ان سے لاہور میں ملاقات کی تھی کسی موضوع پر ملتان کی بربادی، لاہور کے آباد ہونے، سلاطین لنگاہ، خاص طور سے سلطان حسین کا قصہ انھوں نے اس دلچسپ انداز میں بیان کیا کہ میں ان کی فصاحت اور واقعات کے تجزیہ وتنقید سے حیران رہ گیا۔ گفتگو کی یہ حلاوت وشیرینی میں نے مشکل ہی سے کسی میں پائی۔ وہ نہایت فیاض طبع انسان تھے۔ کوئی سائل ان کے در سے محروم نہیں جاتا تھا۔ ان کی نہ تو تجارت تھی نہ زراعت بادشاہ کی طرف سے کوئی مدد معاش بھی نہیں ملتی تھی، کسی کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ

آمدنی کے بغیر وہ اس قدر ایثار و فیاضی کس طرح کرتے ہیں۔ لوگ اس معاملہ میں ہمیشہ حیران ہی رہے۔ تقریباً 80 سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ ان کے جنازہ میں چھوٹے بڑے ہزاروں آدمی شریک تھے اور بڑی عقیدت سے کاندھا دے رہے تھے۔

میاں شیخ عبداللہ بدایونی

میاں صاحب اپنے زمانہ کی ایک زندہ نیکی اور اللہ کی برکت ہیں۔ بچپن میں جب وہ بوستان پڑھ رہے تھے تو اس شعر پر پہنچے:

محال است سعدی کہ راہ صفا

تواں رفت جز درپی مصطفےٰ

(سعدی یہ محال معلوم ہوتا ہے کہ سچائی کے راستے کو کوئی سوائے محمد ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے راستے پر چل کر حاصل کرے)

انھوں نے استاد سے کہا اس شعر کا مطلب ہندی زبان میں بتا دیجیے۔ استاد نے کہا تجھے اس حکایت سے کیا غرض؟ آپ نے فرمایا: "جب تک آپ اس کا مطلب ذہن نشین نہیں کرائیں گے سبق نہیں پڑھوں گا"۔ جب معلم نے اس کے معنی بتا دیے تو انھوں نے حضور اکرم کے متعلق پوچھا کہ وہ کون تھے؟ استاد نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ حالات اور معجزے بیان کیے۔ بس اتنا سنتے ہی ایک جذب سا ان پر طاری ہوا، اپنا کرتہ پھاڑ دیا اور کلمہ طیبہ پڑھا۔ اس واقعہ کی جب ان کے والدین کو خبر ہوئی تو دوڑے آئے لیکن جب دیکھا کہ ڈرانے دھمکانے سے وہ اپنے خیال سے نہیں ہٹیں گے تو انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا اور وہ اپنے آبائی وطن سامانہ سے قرآن سیکھنے، احکام دین معلوم کرنے کی خاطر دہلی چلے آئے اور بڑے بڑے علماء و مشائخین کی صحبت سے فیض اٹھا کر اپنے زمانہ کے بڑے عالم بن گئے۔

شیخ الہاقی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، انھی سے ذکر کی تلقین حاصل کی، پھر شیخ صفی خیر آبادی اور دوسرے بزرگوں سے وابستہ رہے اور بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے اور طریقت و سلوک کا تکملہ کیا۔ اپنے زمانے کے اکثر رہنماؤں سے فیض تربیت حاصل کیا،

خاص طور سے میاں شیخ لادن دہلوی اور میر سید جلال بدایونی سے ان کو بڑی عقیدت رہی۔ میر سید جلال کی وفات کے بعد ان کی جگہ پر برسوں بدایوں میں درس دیتے رہے بڑے بڑے مشہور عالم ان کی مجلس درس کے باعث عالم کہلائے۔

دور دور سے لوگ ان سے استفادہ کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ آخر حال میں ان پر حالت جذب کا غلبہ رہتا تھا۔ مجلس سماع میں حاضر ہوتے تھے اور انتہائی جذب و شوق میں نعرہ لگا کر اٹھ کھڑے ہوتے اور چند قدم تک جھومتے جاتے لیکن رقص اور وجد کیے بغیر ہی اچانک لاحول پڑھ کر اپنی جگہ لوٹ جاتے تھے۔ ان کے شاگرد بہت کہتے کہ حضرت تکلیف نہ کیا کریں ہم یہ خدمت بجالاتے ہیں، وہ قبول نہیں کرتے تھے۔

ان کے چہرہ مبارک پر فقر و فنا کی جھلک صاف نظر آتی تھی۔ ان کو اپنے بزرگوں سے تلقین و ارشاد اور سند خلافت ملی ہوئی ہے۔ لیکن پیری مریدی کے بکھیڑے میں نہ پڑے، بلکہ اس سے دور ہی بھاگتے ہیں۔

میں(36) ان کے پاس کلام، تحقیق اور اصول فقہ کی شرحیں پڑھا کرتا تھا میرے ساتھ نہایت ذہین اور مخلص شاگرد شریک درس رہا کرتے تھے اور سبق پڑھتے ہوئے بڑی الجھی ہوئی اور دقیق بحثیں کرتے تھے۔ میں نے کبھی بھی نہیں دیکھا کہ ان اونچی بحثوں اور گہرے نکات کے حل و افادہ میں انھیں کسی کتاب کے دیکھنے کی ضرورت ہوئی ہو۔ تمام علمی نظریے ان پر بخوبی روشن تھے اور گہرے نکات کے حل و افادہ میں انھیں کسی کتاب کا محتاج نہ ہونا پڑا، انھیں حل و تحقیق کا بڑا ملکہ حاصل تھا، خدا کی تائید و توفیق بھی ان کے ساتھ تھی۔ اس وقت ان کی عمر 90 سال ہے۔

شیخ جلال الدین قنوجی

ایک مجذوب اور سالک تھے۔ ان کے بزرگ ملتان سے آکر ہندستان کے قدیم شہر قنوج میں مقیم ہوگئے تھے۔ سلوک کا مرحلہ طے ہوا تو جذب کی حالت طاری ہوگئی مگر اس حال میں بھی اتباع شریعت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ 29

جب بھی ان پر حال طاری ہوتا تو وہ ملحقہ [illegible] کے چاہ پالی کی [illegible] میں داخل کر [illegible] ہاتھ اس میں ڈال کر بیٹھ جاتے [illegible] پانی [illegible] بھی [illegible] تھے۔ [illegible] جسم کی رگیں ان سے [illegible] بھولی ہوئی تھیں۔

ایک دن جمعرات کی شب کو [illegible] سے فارغ ہونے کے بعد میں حضرت کی خدمت میں پہنچا۔ وہ نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تھے [illegible] اپنے [illegible] گاؤں کی قبرستان کی طرف چلے گئے۔ ایک خادم ان کے ساتھ تھا۔ [illegible] قبر پر فاتحہ پڑھی اور خادم سے [illegible] ایک کا حال بیان کرتے رہے۔ وہاں سے لوٹتے ہوئے فرائض میں سے ایک مسئلہ اس خادم سے پوچھا اس نے جواب دیا کہ اگر کوئی شخص مر جائے، ایک لڑکا اور ایک لڑکی وارث چھوڑ جائے تو لڑکے کو متوفی کی چھوڑی جائداد میں سے 2 حصے اور لڑکی کو ایک حصہ ملے گا" مسئلہ بڑی توجہ سے سنا اور پھر سب خاموش چلے گئے۔

بعد میں پتہ چلا کہ اس حدیث کے مطابق کہ: "قبروں پر علم فرائض کا کوئی مسئلہ کہا جائے اور ورثے کی تقسیم کا ذکر کیا جائے تو اس کی برکت سے تمام اہل قبور کی مغفرت ہو جاتی ہے"۔ حضرت کا یہ معمول رہتا تھا کہ وہ کسی جمعہ کو ترک نہیں کرتے تھے۔

شیخ کچھو مجذوب گوالیاری

حسینی سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ پہلے سپاہ گری کا پیشہ کیا کرتے تھے۔ اچانک نوکری چھوڑ کر سقہ گیری کا کام شروع کر دیا۔ راتوں کو پردہ نشین بیوہ عورتوں کے گھر پانی پہنچایا کرتے تھے۔ لوگوں کو بغیر اجرت کے پانی دے دیتے تھے۔ اسی حال میں ان پر جذب طاری ہو گیا۔ کسی سے نہیں بولتے تھے۔ ہمیشہ اپنے آپ میں گم رہتے تھے:

می شدم دست بدیوار ز ضعف از کویت
آمدی جلوہ کناں صورت دیوار شدم

(میں اپنی کمزوری کے باعث تیری گلی میں دیواروں پر ہاتھ رکھ کر گزر رہا ہوں
جب تو نے اپنا جلوہ دکھایا تو میں دیوار کی طرح مبہوت و ساکت ہو گیا)

گوالیار کے بازار کے ایک سرے پر اپنا ٹھکانہ بنا رکھا تھا۔ وہ اس جگہ ہمیشہ سر جھکائے مراقبہ میں نظر آتے تھے۔ اگر حاضرین میں سے کسی کے دل میں کوئی بات کے پوچھنے کا خیال آجاتا تو بے کہے ہی وہ ہذیان کی صورت میں بڑبڑاتے ہوئے اس کا جواب دے دیتے اور اس کی مشکل حل ہو جاتی۔ غیب کی باتوں کی خبریں بیان کرتے رہتے۔ راتوں کو ہمیشہ قیام کی حالت میں رہتے، کبھی روتے اور کبھی ہنستے۔

میں[37] نے معتبر لوگوں سے سنا ہے کہ ایران سے ایک سید نے آکر ان سے سیادت کا ثبوت مانگا تھا۔ جواب میں آپ نے لکڑیاں جمع کر کے آگ بھڑکانے کا حکم دیا۔ پھر اس سید کا ہاتھ پکڑ کر کہا: "آؤ ہم دونوں اس آگ میں داخل ہو جائیں تا کہ جھوٹ اور سچ ظاہر ہو جائے۔ سید تو سہم کر کھڑا رہ گیا اور وہ آگ میں جا کر صحیح سلامت نکل آئے"۔ ان کی ایسی بہت سی خوارق عادت مشہور ہیں۔

979ھ/1571ء کو ایک رات سانپ سانپ چلاتے ہوئے دوڑے اور دروازے سے نیچے گر پڑے اور اسی وقت جان بحق ہو گئے۔ شیخ فیضی نے تاریخ وفات "کپور مجذوب" سے نکالی ہے۔

شیخ اللہ بخش گڑھ مکتیسری

دریائے گنگا کے کنارے سنبھل کے تحت گڑھ مکتیسر ایک قصبہ ہے۔ شیخ اللہ بخش اسی قصبہ میں 40 سال تک فقر و قناعت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ بڑے متوکل بزرگ تھے۔ ہمیشہ خدا کی یاد میں مشغول رہتے۔

70 سال کی عمر میں آپ سنبھل تشریف لے گئے تھے۔ شیخ بجو مرحوم سنبھلی کی ایک بوڑھی خادمہ جو بڑی عبادت گزار صائم الدہر اپنے وقت کی بی بی رابعہ تھی 35 سال سے شوہر کے بغیر زندگی بسر کر رہی تھی۔ ہمیشہ افطار دودھ سے کیا کرتی تھی غائبانہ طور پر شیخ ممدوح کی معتقد ہو گئی اور ان سے درخواست کی کہ: "مجھے خدا کا راستہ دکھا دیجئے! آپ نے جواب بھجوایا کہ "جب تک تم حضور اکرمؐ کی پیروی نہیں کرو گی اور کسی سے نکاح نہ کر لوگی

خدا کے راستہ کی تلاش تمہارے لیے ایک وبال ہے"۔ وہ اس وقت پالکی میں بیٹھ کر حضرت کے پاس پہنچ گئی اور انھی سے ان کا نکاح ہوگیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد دونوں آخرت کی منزل کے لیے کوچ کر گئے۔ میں[38] دہلی کے ایک معزز سید زادے سید قاسم کے ساتھ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ میں[38] نے انھیں نہایت خوش کلام اور خوش طبیعت پایا۔ جب ہاتھ دھونے کے لیے آفتابہ اور طشت آیا تو انھوں نے فرمایا: "ان سید صاحب سے ابتدا کی جائے کیونکہ ہاشمی کو اولیت حاصل ہے"۔

شیخ عارف حسینی

یہ صاحب دعوت بزرگ شاہ اسمٰعیل صفوی کے پوتوں میں سے ہیں۔ انھوں نے بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے ہیں۔ چنانچہ ہمیشہ جلی ہوئی جو کی روٹی اور کڑوی کسیلی ترکاری سے افطار کر لیتے ہیں، ایسی غذا کوئی دوسرا نہیں کھا سکتا۔

شریعت کی پابندی کا بڑا اہتمام رہتا ہے۔ کسی سے نہیں ڈرتے۔ چنانچہ شاہی دربار میں ابوالفضل کی بیٹھک کے بالکل ہی سامنے وہ بے جھجک پانچ وقت کی اذان کہتے ہیں ان کی بہت سی کرامتیں لوگوں میں مشہور ہیں وہ کاغذ کی گول کترنیں جلتی انگیٹھی میں ڈال دیتے ہیں اور اس میں سے سکہ لگی ہوئی اشرفیاں نکال کر جتنے بھی حاضرین مجلس ہوں انھیں دے دیتے ہیں۔ اگر انھیں کسی حجرے میں مقفل کر دیا جائے تو وہاں سے غیر محسوس طور پر نکل کر کسی اور جگہ ظاہر ہوتے ہیں۔

جب گجرات سے لاہور آئے ہوئے تھے تو انھوں نے لوگوں کو جاڑے کے پھل گرمیوں میں اور گرمیوں کے پھل جاڑوں میں دیے۔ اس کرامت پر پنجاب کے علماء خاص طور سے مخدوم الملک نے اعتراض کیا کہ یہ پھل ظاہر ہے لوگوں کے باغوں سے ہی ان کی اجازت کے بغیر حاصل کیے گیے ہیں۔ اس لیے ان کا کھانا غیر شرعی اور حرام ہے۔ ان علماء کی وجہ سے جب لاہور میں ان کی نبھ نہ سکی تو وہ کشمیر چلے گئے۔

کشمیر کے حاکم علی خان کو ان سے بڑی عقیدت ہوگئی۔ اس نے اپنی لڑکی کا ان سے

نکاح کر دیا۔ جب دیکھا کہ وہ تنگ کر رہنے والے آدمی نہیں ہیں تو ان سے لڑکی کا مہر لے کر طلاق دلوا دی اور شاہ عارف حسینی وہاں سے نکل کر تبت چلے گئے۔

تبت میں بھی ان کی کرامتیں بڑی مشہور ہیں۔ ایک عجوبہ یہ تھا کہ وہ درخت کو پکڑ کر ہلاتے تھے تو اس سے درہم و دینار جھڑنے لگتے تھے۔ غرض گجرات، ہندستان، کشمیر اور تبت میں ان کے بڑے تصرفات اور اثرات رہے ہیں۔ مگر جہاں جاتے تھے لوگ ان کے پیچھے پڑ جاتے تھے، اس لیے وہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں نکل جاتے تھے۔

جس وقت اکبر بادشاہ کشمیر سے کابل کی طرف سفر کر رہا تھا، شاہ صاحب نے اسی سفر میں اکبر سے ملاقات کی تھی اکبر نے ان پر محافظ اور نگران کار مقرر کر دیے جب بھی وہ اکبر کی ملاقات کو آتے تھے تو ایک سونے کے پیالہ میں مشک کافور اور دوسری تمام خوشبویات ڈال کر بطور تحفہ لے کر آتے تھے۔ اکبر نے ان سے بہت کہا کہ: ''آپ ہم سے کچھ سونا یا کوئی جاگیر قبول فرمالیں''۔ وہ ہر بار یہی جواب دیتے کہ: ''روپیہ تم اپنے احدیوں کو دو کہ وہ بدحال ہیں، میں لے کر کیا کرونگا؟''

میں(39) ایک مرتبہ قلیچ خاں کے ساتھ ابوالفضل کی کچہری میں ملاقات کے لیے گیا۔ حضرت، ابوالفضل کی ہی نگرانی اور حراست میں تھے۔ اس وقت وہ ابوالفضل کے بالاخانہ میں تھے۔ منہ پر نقاب ڈالے بیٹھے کتابت کر رہے تھے۔ کہنے لگے: ''یہ جو قلیچ خان ہے وہ کہہ رہا تھا میں قلیچ ہوں، تمہارا خادم اور غلام''۔

چہرہ چھپائے رکھنے کی عادت بہت پرانی تھی۔ شاید یہ اس لیے ہو کہ ایک مقام سے دوسرے مقام پر جائیں تو کوئی انھیں پہچان نہ سکے۔ میں نے ایک قابل اعتماد مقرب سے سنا ہے کہ کشمیر میں اکبر نے ایک دن شیخ ابوالفضل اور حکیم ابوالفتح کو شاہ صاحب کی خدمت میں بھیجا۔ ان لوگوں نے حسب الحکم ان سے پوچھا کہ: ''اگر آپ نقاب اٹھالیں تو کیا حرج ہے میں آپ کا دیدار کرلونگا۔ انھوں نے قبول نہ کیا اور کہا ہم فقیر آدمی دنیا سے الگ تھلگ ہیں اور ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو، تکلیف نہ دو''۔ حکیم ابوالفتح بڑا شوخ اور بے باک آدمی تھا اس نے ہاتھ بڑھا کر نقاب اتار لینا چاہا۔ شاہ صاحب نے اسے روک

دیا اور نہایت غصہ میں کہا: "میں بد شکل اور بد نما آدمی نہیں ہوں، لو میرا چہرہ دیکھ لو"۔ یہ کہہ کر گریباں پھاڑ ڈالا اور چہرہ سے نقاب اتار کر زمین پر پھینک دی۔ اس کے بعد کہا: "حکیم تو نے تو میرا چہرہ دیکھ لیا لیکن انشاء اللہ اس کا نتیجہ ایک دو ہفتے میں تیرے سامنے آجائے گا"۔ چنانچہ چندرہ دن پورے بھی نہیں ہوئے ہوں گے کہ حکیم ابو الفتح اسی سفر میں اسہال کے مرض میں فوت ہوگیا۔ ایسی کراماتیں شاہ صاحبؒ سے بے شمار ہوتی رہی ہیں۔

ایک دن اکبر نے کہا: "شاہ یا تو آپ ہمارے جیسے ہو جائیں یا ہم کو اپنے جیسا بنالیں"۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم بد نصیب اپنے آپکو تمہارے جیسا کس طرح بنا سکتے ہیں، ہاں اگر تم چاہتے ہو تو ہمارے برابر آکر بیٹھ جاؤ تاکہ ہمارے جیسے بن جاؤ"۔

میر سید علاء الدین اودھیؒ

بڑے اعلیٰ مقام پر پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ اللہ کی جیتی جاگتی نشانی تھے۔ ان کی کراماتیں اور کمالات نہایت روشن اور واضح تھے۔ لوگ ان کے عجیب و غریب خوارق بیان کرتے ہیں۔

صاحب کلام اور باذوق آدمی تھے، حقائق و معارف کو کبھی کبھی نظم میں بھی ادا کرتے تھے۔ ان کا یہ مطلع تو بہت مشہور رہا ہے:

ندانم آن گل خود رو چہ رنگ و بو دارد
کہ مرغ ہر چمنی گفتگوی او دارد

ان کے ایک ترجیع بند کا ایک بند حسب ذیل ہے:

کہ بچشمان دل مبین جز دوست
ہر چہ بینی بدانکہ مظہر اوست

شیخ عرفی نے اسی زمین میں کہا ہے:

کہ جہان صورت است و معنی دوست
در بمعنی نظر کنی ہمہ اوست

کسی اور کا شعر ہے:

کہ جہان پر تو یست از رخ دوست
جملہ کائنات سایۂ اوست

اسی موضوع پر میرا[40] بھی ایک شعر ہے:

اوست مغز جہان جہان ہمہ پوست
خود چہ مغز و چہ پوست چون ہمہ اوست

ان کی تربیت کے دامن سے بڑے بڑے مشائخ اٹھے ہیں۔ ان کے صاحبزادہ میر سید ماہرو اپنے والد کے قدم بقدم نظر آتے ہیں۔ ایک اور مرید میر سید علی سہری تھے، جو بڑے صاحب حال تھے۔ ہمیشہ روپوش رہتے تھے۔ ان کا فقر بھی ایک خاص شان رکھتا ہے۔ تصوف کے مضامین بڑی عجیب زبان میں ادا کرتے تھے۔ میں کانت دکول، جو کہ سنبھل کا ایک قصبہ ہے، میں حسین خان کے ساتھ ان کی خدمت میں گیا تھا اور ان کی گفتگو سے فائدہ اٹھایا تھا۔ میر سید علی ہمیشہ یہ دعا کرتے کہ: ''یا اللہ ہمیں شہید اٹھانا''۔

ایک مرتبہ ان کے گھر میں ایک چور گھس آیا۔ جب شور مچا تو میر صاحب اس وقت 90 سال کے ضعیف ہونے کے باوجود ایک لوہا اٹھائے اللہ اللہ کہتے ہوئے اس کا پیچھا کرنے لگے اور ایک دو کو مار گرایا اور زخمی کر دیا آخر ایک ضرب ان کو لگی اور وہ شہید ہو گئے۔ یہ واقعہ 998ھ/1580ء کا ہے۔ ان کی تاریخ وفات۔ ''چہ شد آن مرشد کامل'' سے نکالی گئی ہے۔

شیخ حمزہ لکھنوی

یہ ملک آدم کاکر کے پوتے ہیں جو سلطان سکندر اور ابراہیم لودی کے امرا میں سے تھا، ہمیشہ اپنے دادا کی قبر کے مجاور بنے بیٹھے رہتے تھے۔ ملک آدم کی قبر دو عام قبروں کے برابر بلکہ اس سے کچھ اور لمبی تھی۔

شیخ حمزہ ملقب بہ بالا، صاحب جذب اور بڑے شکوہ والے بزرگ تھے۔ جب بھی شہر میں آتے شیر کی طرح خراماں راستہ طے کرتے۔ ان کے ہاتھوں میں پتھر ہوتے، انھیں وہ ہر طرف پھینکتے جاتے لیکن کمال یہ تھا کہ وہ پتھر کسی کو لگتے نہ تھے۔ ان کی گفتگو زندگی کے عمل کے واسطے پاکیزہ تھی۔ ہمیشہ کلام پاک کی تلاوت کرتے رہتے تھے جس کسی کو اہل جانتے تھے اس سے بات کرتے تھے، ان کو اپنے پاس بلا کر بٹھاتے۔ میں بھی ان کے پسندیدہ آدمیوں میں سے تھا۔ ان سے ملاقات کو میں اچھا شگون جانتا تھا۔ ورنہ اکثر لوگ تو ان کی حرکتوں کو دیکھ کر ہی بھاگ کھڑے ہوتے تھے اور پاس نہیں پھٹکتے تھے کہ کہیں کوئی ضرر نہ پہنچ جائے۔

شیخ بیرک

شیخ بیرک بھی لکھنؤ کے رہنے والے ہیں۔ دریائے گودی (دریائے گومتی) [42] کے کنارے جنگل کے اندر ایک غار میں جہاں تک کسی شخص کا پہنچنا محال ہے، چھپے رہتے تھے۔ ہفتہ میں ایک بار جمعہ کی نماز کے بعد افطار کرتے تھے۔ ان کے گھر میں ایک بوڑھی عورت رہتی تھی جو خشک روٹی اور اس بیری کے بیر جسے اس نے خود بویا تھا ان کے کھانے کے لیے لے آتی تھی۔

اگر کوئی بڑی مشقتیں برداشت کرکے ان کی ملاقات کے واسطے جاتا تو وہ مقررہ وقت پر اپنے حجرے کے دروازہ پر آکر بیٹھ جاتے مگر کوئی بات نہیں کرتے۔ جس زمانہ میں حسین خان لکھنؤ کا حاکم تھا میں [43] بھی اپنے ایک دوست عبدالرحمن نامی شخص کے ساتھ جو حسین خان کا خلیفہ تھا شیخ بیرک سے ملنے کے لیے گیا۔ اتنے ضعیف اور کمزور تھے کہ بس ہڈی چمڑہ نظر آرہے تھے۔ اس غار کے اندر اور باہر بہت سے بڑے بڑے سانپ پھن نکالے ہوئے نظر آرہے تھے۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے ڈر کر سانپ کو لکڑی سے مارنا چاہا، انھوں نے اشارہ سے روک دیا اور کہا: "ان سانپوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟" معلوم ہوا کہ 30 سال سے زیادہ عرصہ ہوگیا وہ اس غار میں رہتے ہیں اور یہ سانپ ہیں کہ ان سے مانوس ہوچکے ہیں اور کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ جب ہم لوگ رخصت

ہونے لگے تو انھوں نے چند باسی روٹی کے ٹکڑوں اور خشک میوہ کی طرف جو ان کے سامنے رکھا ہوا تھا اشارہ کیا کہ: "یہ اٹھالو" میرے[44] ساتھی نے سونے کا ایک ٹکڑا بطور تحفہ دینا چاہا، انھوں نے قبول نہ کیا۔ لکھنؤ کے یہ دونوں بزرگ شیخ حمزہ لکھنوی اور شیخ پیرک انھی دنوں انتقال فرما گئے تھے۔

شیخ محمد حسین سکندریؒ

سکندر دو آبہ کا ایک قصبہ ہے۔ شیخ محمد حسین بڑے صاحب ذوق بزرگ تھے، لوگوں سے دور عزلت نشین رہتے تھے۔ ملازمت ترک کرکے پورے پچاس سال تک عبادت و ریاضت میں گزارے تھے۔ اس دوران کسی کے دروازہ پر نہیں گئے۔ جب میں[45] 974ھ/1566ء میں ان سے ملنے گیا تو انھوں نے خواجہ حافظ کے اس شعر کے معنی پوچھے:

عفو خدا بیشتر از جرم ماست
نکتۂ سربستہ چہ گوئی خموش

میں[45] نے پوچھا اس میں آپ کو کس جگہ پریشانی محسوس ہو رہی ہے؟ انھوں نے کہا: "حافظ نے جب خود نکتۂ سربستہ کہہ دیا تو پھر خاموش رہنے کا حکم کیوں دے دیا؟" میں[45] نے کہا: "اس کی وضاحت آپ خود فرمائیں تو بہتر ہے"۔ انھوں نے کہا: "میرے ذہن میں تو یہ آتا ہے کہ "نکتۂ سربستہ" غالباً یہ ہو کہ "ہمارے سارے گناہ خدا ہی کے خلق کیے ہوئے ہیں"۔ یہ بات کہنا ہی حد ادب سے تجاوز کرنا ہے، اس لیے خاموش رہنے کا حکم دیا گیا۔ میں بھی جواب میں خاموش رہا۔

اسی طرح کی تاویل انھوں نے اس آیت میں بھی کی "واعبد ربک حتی الیقین" ان کا کہنا تھا کہ یہاں "حتی" کا لفظ "انتہائی غایت" کے لیے آیا ہے اور "انتہائی غایت" کی یہاں پر گنجائش ہی نہیں۔ شاید یہ انتہائی کاف خطاب کے لحاظ سے ہو"۔ ان کی اس بات کا مطلب میں سمجھ نہ سکا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے اس سے اس کی کیا مراد تھی؟ ان سے وہ میری[46] آخری ملاقات تھی۔

شیخ عبدالواحد بلگرامیؒ

بلگرام قنوج کے ماتحت ایک قصبہ ہے یہ بڑے صاحب فضل و کمال بزرگ تھے۔ ریاضت و عبادت بہت کیا کرتے تھے۔ ان کی ذات تمام اخلاق حمیدہ کی جامع تھی۔

ابتداء میں وہ ہندی راگ گایا کرتے تھے اور خود بخود حال میں آجاتے۔ کچھ عرصہ سے راگ راگنی کا یہ مشغلہ چھوڑ دیا "نزہۃ الارواح" کی انھوں نے بڑی محققانہ شرح لکھی تھی۔ اسی طرح علم تصوف پر اور بھی کئی ایک رسالے لکھے، ان میں ایک "سنابل" نام کی کتاب بھی ہے اور بھی کئی دیگر عمدہ تصانیف ہیں۔

یہ اگرچہ کسی اور بزرگ کے مرید ہیں، لیکن شیخ حسین سکندرہ سے فیض و تربیت پائی ہے۔ ہر سال بلگرام سے حضرت شیخ کے عرس پر تشریف لاتے ہیں۔ اب بینائی کمزور ہو چکی ہے اس لیے اب آجا نہیں سکتے۔ قنوج میں انتقال ہوا۔

میں[47] 977ھ/1569ء میں لکھنو سے بلگرام گیا تھا وہ رات کو میری عیادت کے لیے تشریف لائے یہ میری[47] پہلی ملاقات تھی جو میرے لیے مرہم و شفاعت سے کم نہ ثابت ہوئی۔ کہنے لگے: "یہ سب عشق کے پھول اور پتے ہیں"۔ اتفاق کی بات ہے کہ اسی جگہ پر بدایوں سے مخدومی شیخ عبداللہ بداونی بھی پہنچ گئے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میرے لیے اگر کوئی رات شب قدر کے مانند ہے تو وہ یہی رات ہے۔

شیخ عبدالواحد کو نظم سے بھی مناسبت اور لگاؤ تھا۔ چنانچہ اپنے ایک ملیح و خوش ادا محبوب راجا نامی شخص کے لیے یہ شعر کہا تھا:

ای کردہ خیال تو بہ تخت دل ما جا
ہرگز نبود در دل ما غیر ترا جا

انہی کا ایک شعر یہ ہے:

مرد جنگ چو اول بہ صلح آمدۂ
دی بلطف نشین تا ز خویش برخیزم

عہد اکبری کے علماء

صرف انہی علماء کا ذکر کیا گیا ہے جن سے میری[47] ملاقات ہوئی یا جن کا میں[47] شاگرد رہا ہوں یا ایسے علماء جن کا اس عہد میں نام و شہرہ رہا ہے۔ جو شمار سے کہیں زیادہ ہے۔

میاں حاتم سنبھلی

یہ میاں عزیز اللہ طلبنی کے شاگرد ہیں۔ معقول و منقول میں انکی طرح جامع عالم کوئی اور نہ تھا، خاص طور سے علم کلام، اصول فقہ اور عربیت میں بے نظیر تھے۔ مشہور ہے کہ شرح "مفتاح اور" مطول" انھوں نے اول سے آخر تک 40 مرتبہ پڑھائی تھی، دوسری مختصر کتابیں اسی طرح پڑھاتے رہتے تھے۔

مخدوم الملک کے متعلق ان کی رائے تھی کہ وہ علم محاضرات[48] میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ مطلب یہ ہے کہ علوم دین کے مقابلہ میں وہ معلوماتی علوم پر زیادہ قادر ہیں۔

ملا علاؤ الدین لاری شرح عقاید نسفی پر ایک حاشیہ بڑے دعویٰ سے لکھ کر ان کے پاس لے گئے۔ میاں صاحب نے مطالعہ کے بعد اس پر ایسے اعتراضات کیے کہ ملا علاؤالدین سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

میاں صاحب فقہ میں امام اعظم ثانی کے برابر تھے۔ ریاضت اور مجاہدہ بھی بہت

کرتے تھے۔ تقوی و صلاح سے آراستہ تھے۔ ان علمی کمالات کے ساتھ لمبے عرصہ تک معتقد حاکم بھی رہے۔

خان خاناں بیرم خان کے زمانہ میں ایک مرتبہ میں 5 سال بعد ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اسی دوران شیخ مبارک کے یہاں تعلیم حاصل کرتا رہا۔ پہلے میاں صاحب اتنے لمبے عرصے تک ملاقات نہ ہونے کے احوال پوچھتے رہے۔ پھر انھوں نے دریافت کیا: ''شیخ مبارک کیسے مولوی ہیں؟'' میں نے جواب دیا ''علمیت، تقوی، فقر و مجاہدہ، امر معروف و نہی منکر میں بے مثل و بے نظیر ہیں''۔ اس زمانہ میں شیخ موصوف ان تمام باتوں کے بڑے پابند تھے۔ میاں حاتم نے کہا ہم نے ان کی بڑی تعریف سنی ہے لیکن مشہور ہے کہ وہ مہدوی ہیں۔ آخر اس کی حقیقت کیا ہے؟'' میں نے کہا: ''وہ میر سید محمد جون پوری کی بزرگی اور ولایت کے قائل ہیں ان کی مہدویت کے قائل نہیں۔ اس پر میاں صاحب نے کہا: ''میر سید محمد کے کمالات میں کیا شک ہو سکتا ہے''۔ اس مجلس میں میاں صاحب کے شاگرد میر سید محمد میر عدلی بھی موجود تھے، انھوں نے دریافت کیا: ''پھر ان کو یعنی ملا مبارک کو مہدوی کیوں کہتے ہیں؟ میں نے کہا: ''وہ چونکہ سب کو امر معروف اور نہی منکر کرتے رہتے ہیں اس لیے لوگ ان کو مہدوی سمجھتے ہیں'' انھوں نے کہا: ''ایک بار عبد الحی خراسانی جس کو چند دن کے لیے منصب صدارت برائے نام مل گیا تھا، خان خاناں کے سامنے شیخ کی بڑی مذمت کر رہا تھا، اس کی کیا وجہ تھی؟'' میں نے کہا: ''شیخ مبارک نے اس کو ایک خط لکھ کر نصیحتیں کی تھیں۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ مسجد میں آکر جماعت کے ساتھ نماز پڑھا کرو۔ بس یہ بات اسے ناگوار معلوم ہوئی اور اس نے یہ گمان کیا کہ شیخ مہدوی ہیں اور مجھ کو رافضی سمجھتے ہیں'' یہ سن کر میر سید محمد عدلی نے کہا: ''عبد الحی خراسانی کا اپنے رفض پر یہ استدلال تو صرف اسی صورت میں درست ہوگا جبکہ وہ اس منطقی کلیہ پر پورا اترے کہ تو نماز باجماعت ادا نہیں کرتا اور جو کوئی باجماعت نماز نہ پڑھے رافضی ہے اس لیے تو رافضی ہوا، حالانکہ اس کلیہ کا کبریٰ ممنوع ہے۔ اس طرح یہ بات بھی منطقی کلیہ پر پوری نہیں اترتی کہ شیخ امر معروف کرتے ہیں جو کوئی امر معروف کرے وہ مہدوی ہے۔

اس کے بعد میاں صاحب نے کہا میں اس استفتاء پر مہر لگا دوں گا لیکن میرے پاس ایک اور استفتاء آیا ہوا ہے جس پر تمام علماء کے دستخط ہیں۔ مجھے اس میں کچھ شبہات ہیں۔ تم اسے شیخ بہاؤالدین جو بڑے محقق مفتی ہیں، کے پاس لے جاؤ اور ان سے کہنا کہ سفر کی وجہ سے میرے ساتھ کتابیں نہیں ہیں۔ اگر آپ اس روایت کو بعینہ بھیج دیتے تو بہتر ہوتا جس کی بنیاد پر آپ نے اس استفتاء پر دستخط کیے ہیں۔ آپ نے فتویٰ دیا ہے کہ لوگ معصیت کے عالم میں اپنے بچوں کو فروخت کر سکتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ یہ روایت صرف "ابراہیم شاہی" میں ملتی ہے۔ فقہ کی دوسری کتابوں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ خود یہ ابراہیم شاہی علماء کے نزدیک معتبر کتاب نہیں سمجھی جاتی کہ فتویٰ دینے کے لیے سزاوار ہو۔ اگر آپ یہ کہیں کہ مفتی موجود روایتوں میں سے کسی کو ترجیح دے سکتا ہے تو پھر میں یہ کہوں گا کہ ابراہیم شاہی کی عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ حالت اضطرار میں ابوین کو اولاد کی بیع جائز ہے ظاہر ہے "ابوین" کا لفظ باپ اور دادا دونوں پر مشتمل ہے۔ چنانچہ کتاب نکاح میں جس کے ابوین مسلمان ہوں وہ اس کا کفو ہے جس کے آباء شرف اسلام سے مشرف ہوئے اس لیے یہاں باتفاق ابوین سے باپ اور دادا مراد ہے نہ کہ ماں اور باپ۔ ہم اس روایت میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اولاد کی بیع کا دونوں کو مل کر بطریق اجتماع اختیار حاصل ہے نہ کہ فرداً فرداً علیحدہ و انفرادی حیثیت کے لیے آخر کیا دلیل ہو سکتی ہے۔

میاں صاحب نے شیخ مبارک کا تو استفتا رکھ لیا اور مذکورہ استفتا مجھے دے دیا۔ یہ استفتا میں نے شیخ مبارک کو دکھایا تو اس نے میاں حاتم کی فقاہت کو بہت سراہا اور کہا: "ان کو دعا کے بعد میری جانب سے کہنا ہم نے بھی اس وقت کی وجہ سے اس پر مہر نہیں لگائی ہے"۔ جب میں نے وہ شیخ بہاؤالدین کو دکھایا تو انھوں نے قول پر بھروسہ کیا اور زیادہ غور نہ کیا۔ بے شک مجھ سے سہو ہو گیا۔ یہ بھی شیخ بہاؤالدین کی حق بینی و حق پرستی، نیک نفسی اور انصاف پسندی تھی کہ باوجود اس عظمت و کمال کے انھوں نے اپنی غلطی تسلیم کرلی:

بر سر آن نامہ کہ آصف نوشت
قدم رحم اللہ من انصف نوشت

میاں حاتم سنبھلی 10 سال تک برابر لوگوں کو اپنے علم و اخلاق سے فائدہ پہنچاتے رہے۔ 968ھ/1560ء میں وہ بھی اپنے والد سے جا ملے۔ ان کے چند نالائق لڑکے وارث رہ گئے ہیں:

چند نااہل پسرم مہرتان سنگ دل
یاد پدر نمی کنند این پسران ناخلف

مولانا عبداللہ سلطان پوریؒ

قوم کے انصاری ہیں۔ ان کے آبا و اجداد نے سلطان پور میں آ کر سکونت اختیار کر لی تھی۔ عبداللہ سلطان پوری اپنے زمانہ کا منفرد و یگانۂ روزگار عالم تھا۔ خاص طور سے عربی زبان، اصول فقہ، تاریخ اور دوسرے تمام علوم نقلی میں اسے بڑی مہارت حاصل تھی۔ بڑی اچھی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ جن میں سے ''عصمت انبیاء'' اور ''شرح شمائل النبی ﷺ'' بہت مشہور ہیں۔ ہمایوں بادشاہ جنت مکانی نے مخدوم الملک کا خطاب اور شیخ الاسلامی کا عہدہ دیا تھا۔ شریعت کو پھیلانے کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہا۔ نہایت متعصب سنی تھا۔ انھوں نے بہت سے ملحدوں اور رافضیوں کو قتل کرا دیا تھا۔

وہ نہایت اصرار سے کہتا تھا کہ ''روضۃ الاحباب'' کا تیسرا دفتر امیر جمال الدین محدث کا نہیں ہے۔ جس سال کہ گجرات فتح ہوا تھا اور وہ بادشاہی دیوان خانہ کا وکیل مختار تھا اور یہ زمانہ اس کے عین جاہ و جلال کا زمانہ تھا۔ میں[49] پنجاب کے سفر سے لوٹ کر آیا اور شیخ ابو الفضل جو اس وقت تک ملازم نہیں ہوا تھا اور حاجی سلطان تھانیسری کے ساتھ مخدوم الملک سے ملنے کے لیے گیا۔ ہم نے دیکھا وہ تیسرے دفتر کو سامنے کھولے بیٹھا ہے اور کہہ رہا ہے: ''دیکھو ایرانی عالموں نے دین میں کیا خرابی پیدا کر دی''۔ پھر اس نے وہ شعر دکھایا جو حضرت علیؓ کی تعریف میں کہا تھا:

حسین بس بود حق نمائی او
کہ کردند شک در خدائی او

اور کہنے لگا: ''اس نے تو رفض سے آگے بڑھ کر حلول خداوندی تک معاملہ پہنچا دیا۔ میں نے تو طے کیا ہے کہ اس جلد کو شیعوں کے سامنے جلا دوں''۔ میں[49] اس وقت نہایت گمنام اور غیر معروف تھا اور یہ اس سے پہلی ملاقات تھی، پھر بھی جرأت کر کے میں[49] نے کہا یہ شعر تو اس شعر کا ترجمہ ہے جو امام شافعیؒ سے منسوب ہے:

لو ان المرتضیٰ ابدی محله ... لصار الناس طرا سجد اله

کفی فی فضل مولانا علی ... وقوع الشاب فیه انه الله

عبد اللہ سلطان پوری نے مجھے[50] گھور کر دیکھا اور کہا: ''یہ کس جگہ کی روایت ہے؟'' میں کہا: ''شرح دیوان امیر کی!'' اس نے کہا: ''اس دیوان کا شارح قاضی میر حسین میبذی ہے اور وہ بھی رفض سے متہم ہے''۔ میں[51] نے کہا: ''یہ دوسری بات ہے''۔ شیخ ابو الفضل اور حاجی سلطان اپنے لبوں پر ہاتھ رکھ کر برابر مجھے[51] خاموش ہو جانے کا اشارہ کرتے رہے۔ پھر میں نے کہا کہ: ''بعض معتبر آدمیوں سے میں نے سنا ہے کہ تیسرا دفتر میر جمال الدین کا نہیں ہے بلکہ اس کے لڑکے میرک شاہ یا کسی دوسرے کا ہے، اس لیے اس کی عبارت پہلے دو دفتروں کی عبارت سے نہیں ملتی کیوں کہ اس کی عبارت شاعرانہ ہے اور دو دفتروں کی عبارت محدثانہ''۔ مخدوم الملک نے جواب دیا: ''ارے بابا میں نے تو دوسرے دفتر میں بھی ایسی باتیں دیکھی ہیں جو بدعت اور فاسد عقیدے پر صریحاً دلالت کرتی ہیں۔ میں[52] نے ان مقامات پر حواشی لکھ رکھے ہیں۔ چنانچہ مصنف نے لکھا ہے کہ طلحہؓ نے جب سب سے پہلے حضرت امیر المومنین (علیؓ) سے بیعت کی تو آپ نے فرمایا ''یدشلاء و بیعة شلا یعنی ہاتھ بھی شل اور بیعت بھی شل''۔ غور کرو کہ جو ہاتھ اُحد کے دن حضور اکرم ﷺ کی پناہ بنا ہوا تھا اور جس پر 11 زخم آئے تھے، اس کو حضرت علیؓ برا شگون کہیں جو شرعاً ممنوع ہے، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا میں اسے جھوٹ سمجھتا ہوں۔ میں نے کہا'' تفاؤل اور شگون میں تو بڑا فرق ہے''۔ اس وقت ابو الفضل نے چپکے سے میرے ہاتھ کو پکڑ کر رگڑ ڈالا اور روک دیا۔ مخدوم الملک نے کہا: ''ان کی تعریف کیا ہے''۔ ساتھیوں نے اس سے میرا[53] کچھ حال بیان کیا اور وہ ملاقات بخیر و خوبی ختم ہو گئی۔

جب ہم وہاں سے نکلے تو دوستوں نے کہا بڑی خیر ہوگئی کہ انھوں نے کسی بات کا برا نہیں مانا، ورنہ ڈانٹ پھٹکار سننا پڑتی۔

شروع شروع میں جب مخدوم الملک نے شیخ ابوالفضل کو دیکھا تھا تو اپنے شاگردوں سے کہا کرتا تھا: "اس شخص سے دین میں جتنا بھی خلل پیدا ہو کم ہی ہے"

چو طفیلش بدیدم مخدوم اہل دین را
کہ شود بلای جانہا بہ شما سپردم این را

مخدوم الملک نے 990ھ/1582ء میں مکہ معظمہ سے واپس آنے کے بعد گجرات میں انتقال کیا۔ اس کی تاریخ وفات میں یہ قطعہ کہا گیا:

رفت مخدوم ملک و با خود برد — رحمۃ اللہ نشانی پیشانی
جستم از دل چو سال تاریخش — گفت بہ شمار مصرعۂ ثانی

اس کی اولاد میں چند ناخلف لڑکے رہ گئے جو لائق ذکر نہیں۔ اس بارے میں تمام اسلاف اخلاف سے شاکی ہی رہیں گے کیونکہ زمانہ کا ماحول ان کو اچھا رکھ سکتا ہے نہ اچھا ہی پیدا کرتا ہے:

خوبی اندر جہان نمی بینم — گویا روزگار عنین شد

یہ تو وہ کہانی ہوئی کہ ایک متعصب سنی بادشاہ نے سبزوار پر جو رافضیوں کا مسکن اور مرکز ہے، حملہ کیا۔ وہاں کے رئیس اور سردار حاضر ہوئے اور کہا: "ہم تو مسلمان ہیں کس گناہ میں آپ نے ہم پر فوجی حملہ کیا ہے؟" اس نے کہا: "اس جرم میں کہ تم لوگ رفض میں بہت حد سے گزر گئے ہو"۔ انھوں نے کہا: "یہ تو ہم صریح کے کام کو انجام دے رہے ہیں" بادشاہ نے کہا کہ: "اگر تم سچے ہو تو اپنے شہر میں سے کسی ابوبکر نام کے شخص کو تو لا کر دکھاؤ تاکہ میں تم پر حملہ بند کروں"۔ لوگوں نے بڑی تلاش کے بعد ایک مفلوک الحال غیر معروف سے شخص کو پیش کیا کہ: "یہ اس نام سے منسوب ہے جو تم نے لیا تھا"۔ بادشاہ نے جب اسکو پھٹے پرانے کپڑوں اور بری حالت میں دیکھا تو کہا: "تم اس سے بہتر کسی آدمی کو

نہیں لا سکتے تھے"۔ ان لوگوں نے کہا: "بادشاہ سلامت تکلف برطرف، سبزوار کی آب و ہوا اس سے بہتر ابوبکر پیدا نہیں کر سکتی"۔

مولوی رومی نے اسی قصہ کی طرف اشارہ کیا ہے:

سبزوار است این جہان بےمدار
ماچو بوبکریم دروی خوار وزار

شیخ مبارک ناگوری

اپنے زمانہ کے بڑے نامی گرامی علماء میں سے تھے۔ تقویٰ، توکل اور صلاح میں سب سے ممتاز تھے۔ پہلے پہل انھوں نے بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے۔ امر معروف اور نہی عن المنکر کا ہر وقت خیال رہتا تھا۔ اگر ان کی محفل وعظ میں کوئی سونے کی انگوٹھی، ریشم، سرخ موزے یا سرخ و زرد کپڑے پہن کر آجاتا تو اسی وقت ان چیزوں کے اتار دینے کا حکم دیتے۔ جس کا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے ہوتا، اسے پھاڑ دینے کی تاکید کرتے۔ اگر راستے میں کسی جگہ راگ نغمے کی بھنک بھی پڑ جاتی تو وہاں سے قدم بڑھا کر تیزی سے نکل جاتے۔ مگر آخر میں یہ حال ہو گیا تھا کہ کوئی راگ، گانا یا ساز سنے بغیر ان کو چین نہیں پڑتا تھا۔ ان کے مسلک اور طریقے ہمیشہ بدلتے رہے، طبیعت میں بڑا تلون تھا۔

پٹھانوں کے دور میں کچھ عرصہ تک وہ شیخ علائی کے ساتھ رہے۔ جب اکبر کے عہد میں نقشبندی صوفیوں کو اقتدار حاصل ہو گیا تو خود کو اس سلسلہ سے وابستہ کر لیا۔ کچھ عرصہ تک ہمدانی مشائخین سے منسوب رہے، آخر میں جب عراقیوں نے دربار میں اپنا رنگ جما لیا تو انہی کے رنگ میں باتیں کرنے لگے: "تکلموا الناس علی قدر عقولھم" (لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق بات کرو!) پر ان کا عمل تھا۔

ہمیشہ علوم دینی کے درس دینے میں مشغول رہتے تھے۔ ہندستان کے علماء کے برخلاف انھوں نے شاعری، معمہ گوئی اور مختلف فنون میں بڑی دسترس حاصل کی تھی۔ تمام علوم پر ان کی نگاہ تھی۔ خاص طور سے تصوف پر بڑا عبور حاصل تھا۔ "شاطبی" تو پوری کی 30

پوری ان کو حفظ تھی۔ اس کے درس دینے کا انہی کو حق پہنچتا تھا۔ قرآن کی سات قراتوں کے حافظ اور قاری تھے۔

کبھی بادشاہوں کے گھر نہیں گئے۔ نہایت خوش گفتار اور صاحب مجلس بزرگ تھے۔ ان کی بذلہ گوئی اور نقلیں بڑی مشہور ہیں۔ آخر عمر میں جب بینائی کمزور ہوگئی تو گوشہ نشین ہوگئے اور اس فرصت میں ایک تفسیر لکھی جو تفسیر کبیر کی طرح چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے جس میں بڑی اچھی معلومات و مضامین درج ہیں۔ انھوں نے اس کا نام ''المنبع العیون'' رکھا۔ اس کے دیباچہ میں انھوں نے ایسا مضمون لکھا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ انھیں اس صدی کے مجدد ہونے کا دعویٰ تھا، انھوں نے جو کچھ تجدید کی ہے وہ سب پر روشن ہے۔ اس تفسیر کو ختم کرنے کے بعد وہ ہمیشہ قصیدہ فارضیہ جو 7 سو اشعار کا قصیدہ ہے، قصیدہ بردہ شریف، قصیدہ کعب بن زہیر اور دوسرے قصیدے جو ان کو یاد تھے، پڑھتے رہتے تھے۔ شیخ مبارک کا لاہور میں 1001ھ/1592ء میں انتقال ہوا۔ بلاشبہ ایسا جامع کمال عالم پھر نظر نہیں آیا۔ لیکن افسوس دنیا کی محبت اور جاہ و مرتبہ کی خواہش نے کہیں کا نہ رکھا۔ لباس تو درویشی کا پہنا رکھا تھا لیکن درحقیقت اسلام سے کوئی محبت اور انسیت نہ تھی۔

میں[54] نے ابتدائے عمر میں آگرہ میں ان سے چند سبق پڑھے تھے۔ ان کی استادی کا مجھ پر بڑا حق ہے لیکن انھوں نے جس طرح کی دنیا داری اور بے دینی اختیار کر رکھی تھی۔ روپیہ کے لالچ میں جو مکروفریب اور زمانہ سازی کرتے رہتے تھے، دین و مذہب میں تحریف و تنسیخ کا جو جال بچھا رکھا تھا، اس سے میرا[55] دل ان کی طرف سے پھر گیا اور ان کی استادی و تعظیم کے سارے حق زائل ہوگئے۔ جیسا کہ لوگ کہتے ہیں بیٹے کی وجہ سے باپ پر بھی لعنت پڑتی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں یزید اور اس کے باپ پر لعنت اسی طرح ان کا اور ان کے لڑکوں کا معاملہ ہے۔

میر سید محمد میر عدلی امروہی

امروہہ، سنبھل کے تحت قصبہ ہے۔ میر عدلی نہایت متقی اور صالح بزرگ تھے وہ اور

میرے[56] والد سنبھل اور بدایوں میں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ بدایوں میں انھوں نے میر سید جلال دانش مند سے جو حدیث میں میر سید رفیع الدین کے شاگرد تھے، پڑھا۔

تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد درس و تدریس کا مشغلہ رہا۔ آخر عمر میں بادشاہی مقربوں میں شامل ہوگئے۔ میر عدلی کا عہدہ انھیں عطا کیا گیا۔ اپنے فرائض منصبی وہ نہایت انصاف، سچائی اور دیانت داری سے انجام دیتے رہے۔ چنانچہ قاضی القضات بھی ان کے خوف سے اپنی خیانتوں اور خباثتوں سے باز آگیا تھا۔

جب تک وہ دربار میں رہے کسی بدعتی اور ملحد کو دین میں دخل اندازی کی ہمت نہ ہوسکی۔ ان کے بعد میر عدلی کا عہدہ کسی کی ذات پر نہیں جچا۔ یہ خطاب بس برائے نام ہی رہ گئے۔

موروثی تعلقات اور قدیم روابط کی وجہ سے وہ مجھ[57] پر بڑے مہربان رہتے تھے۔ میری ملازمت کے ابتدائی دنوں میں ہمیشہ کہا کرتے تھے۔ مدد معاش کے چکر میں نہ پڑو اور صدور کی خوشامد، در آمد کی ذلت نہ اٹھاؤ۔ باقاعدہ ملازمت میں داخل ہوکر "پادشاہی داغ" کرالو، کیونکہ یہ حکام بڑے فرعون اور متکبر ہیں۔ میں[58] نے ان کی یہ نصیحت قبول نہیں کی تھی اس لیے مجھے یہ سب دیکھنا پڑا، جو خدا کسی کو نہ دکھائے۔ 984ھ/1576ء میں میر سید محمد عدلی کو بکھر کی عملداری عطا کی گئی اور وہ 986ھ/1578ء میں اپنے رب سے جا ملے۔

شیخ گدائی دہلوی کنبوئی

یہ مشہور شاعر شیخ جمالی کے صاحبزادے ہیں۔ ظاہری علوم میں بڑا کمال حاصل کیا تھا۔ اپنے وقت کے بڑے بڑے علماء کی صحبتیں دیکھی تھیں۔

بیرم خاں کے ساتھ محبت و دوستی کا تعلق تھا۔ چنانچہ خان خانان نے ہندستان کی صدارت کا عہدہ ان کے ذمہ دے رکھا تھا۔ چند سال تک ان کا مکان ہندستان، خراسان، ماوراء النہر اور عراق کے اکابر و افاضل کا مرکز و مرجع بنا رہا۔ شاعری کا بڑا اچھا ذوق تھا۔

ہندی میں بھی شعر کہا کرتے تھے۔ وہ بیکانیر کے علاقے میں بیرم خاں کا ساتھ چھوڑ کر دہلی واپس آ گئے۔ بیرم خاں کے قضیوں کے باوجود ان کے عزت و احترام میں کوئی فرق نہیں آیا۔

دہلی کے بزرگوں کے مزاروں پر عرس کے دنوں میں ضرور تشریف لاتے تھے اور اپنی محفلیں بڑی شان و شوکت کے ساتھ منعقد کرتے تھے۔ 976ھ/1568ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ دوسرے بزرگوں کی طرح ان کی اولاد بھی نالائق ہی نکلی۔

شیخ گدائی کے کلام کا نمونہ:

غزل

گہی جان منزل غم شد گہی دل — غمت را ای برم منزل بہ منزل
مشو غافل زحال درد مندی — کہ از حال تو یکدم نیست غافل
دل دیوانہ درزلف تو بستم — گرفتارم بآن مشکین سلاسل
بجان دادن اگر آسان شدی کار — نبودی عاشقان را کار مشکل
گدائی جان بنا کامی بر آمد — نشد کا م ز لعل یار حاصل

میں[159] نے یہ اشعار تذکرۂ میر علاء الدولہ سے نقل کیے ہیں۔ یہ تذکرہ کچھ زیادہ قابل اعتماد نہیں۔ میرا[160] تو یہ خیال ہے کہ یہ اشعار شیخ گدائی کے نہیں۔

میاں جمال خان مفتی دہلی

اپنے والد شیخ نصیر الدین اور بھائی میاں لادن کے شاگرد ہیں۔ کنبوہ برادری سے تعلق تھا۔ اپنے وقت کے بڑے عالم تھے۔ علوم عقلی اور نقلی خاص طور سے فقہ و کلام، عربیت اور تفسیر میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ ''مفتاح'' کی دونوں شرحوں پر بڑا اچھا محاکمہ کیا ہے ''مطول'' جو درس کی قیمتی کتابوں میں سے ہے، کہتے ہیں انھوں نے اس کا 40 بار اول سے آخر تک درس دیا تھا۔

ہمیشہ وہ درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ دینی علوم کا افادہ عام تھا۔ بادشاہوں اور امیروں کے گھر نہیں جاتے تھے۔ ہمیشہ حاکموں کی نگاہ میں وہ معزز و محترم رہے۔ ان کے اکثر شاگرد اچھے عالم اور مفکر ہوئے ہیں۔

90 سال کی عمر پائی اور 984ھ/1576ء میں انتقال فرمایا۔

قاضی جلال الدین ملتانی

ان کا تعلق بھکر کے قلعہ کے مضافات سے رہا ہے۔ نہایت متبحر، حق گو اور حق پرست عالم تھے۔ پہلے تجارت کیا کرتے تھے پھر درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کر لیا۔ چند سال تک آگرہ میں پڑھاتے رہے۔

جب بعض وجوہ سے قاضی یعقوب کو معزول کر دیا گیا تو انھیں قضاوت کا عہدہ دیا گیا۔ اپنی ذات میں وہ بلا شبہ نہایت متدین اور امین قاضی تھے لیکن ان کا لڑکا نہایت بد دیانت اور ناخلف تھا۔ محکمہ کے تمام وکیل بھی انتہائی بدنفس تھے۔ ان کی ناشائستہ حرکتوں کی لپیٹ میں وہ بھی آ گئے، چونکہ اہل زمانہ کے ساتھ زمانہ سازی کی صلاحیت نہیں تھی۔ اس لیے بادشاہ نے ان کو دکن کی طرف جلا وطن کر دیا۔ دکن والے ان کی حق گوئی اور دین حق پر ثابت قدمی کا ذکر سن چکے تھے، اس لیے انھوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ پھر وہ وہاں سے کعبۃ اللہ حج کے لیے تشریف لے گئے اور اسی جگہ حق کو لبیک کہا۔

قاضی طوایس

طوایس خراسان کے علاقے میں ہے۔ یہ بہت دیانت دار قاضی تھے، لیکن بے علمی کی وجہ سے بعض احکام میں انھوں نے بڑی غلطیاں کیں۔ امراء کے ہاتھوں ان کو بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑتی تھیں۔ اس لیے وہ ان امیروں سے ہمیشہ بدگمان رہتے تھے۔ مقدمات میں امیروں کے مقابلے میں غریبوں کی جانبداری کرتے تھے خواہ ان ہی کی طرف سے زیادتی کیوں نہ ہو۔ یہ نہیں جانتے تھے کہ اس زمانہ میں ظالم ہی فریادی بن کر عدالت میں پہنچ جاتا

ہے۔ چنانچہ شیخ ابو الفضل کہا کرتا تھا اگر امام اعظم ہمارے زمانہ میں ہوتے تو وہ ایک دوسرا ہی فقہ لکھتے۔

جب خان زمان کا قصہ پیش آیا تو انھوں نے بادشاہ سے کہا تھا۔ باغی کا مال لینا جائز نہیں ہے۔ اس بات پر انھیں معزول کر کے قاضی یعقوب کو قاضی بنایا گیا اور وہ انھی دنوں فوت ہو گئے۔

قاضی یعقوب مانک پوری

یہ قاضی فضیلت کے داماد ہیں۔ علم فقہ اور اصول میں بڑے کامل تھے۔ نہایت خوش مزاج اور شگفتہ بیان تھے۔ مزاحاً عربی کے شعر ہندی بحروں میں کہا کرتے تھے۔ چند سال تک وہ ہندوستان کے قاضی القضاۃ رہے۔ کہتے ہیں اس زمانہ میں وہ قوت باہ کے معجون بہت کھایا کرتے تھے۔

ایک دن بادشاہی مجلس میں سرور انگیز چیزیں پینے کھانے کے لیے لائی گئیں۔ بادشاہ نے قاضی کو بھی شرکت کے لیے کہا۔ انھوں نے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے پوچھا: ''تم کس قسم کا نشہ کرتے ہو؟'' ایک ہندوستانی مصاحب نے برجستہ کہا: ''قاضی پارہ کھاتے ہیں'' ان کو قاضی القضاۃ کے عہدہ سے معزول کر کے بنگالہ کی قضاوت پر بھیج دیا گیا تھا۔ وہاں بھی اپنے نفس کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے قوت باہ کے نسخے اور دوائیاں ظلم و تعدی کر کے حاصل کیے تھے۔ جب معصوم کابلی نے بغاوت کی تو وہ بھی اس کے ساتھ ہو گئے۔ اس جرم میں انھیں بلا کر قلعہ گوالیار میں قید کر دیا گیا۔ گوالیار کے راستے ہی میں انتقال کیا اور میر معز الملک اور ملا احمد یزدی سے جا ملے۔

شیخ عبد النبی صدر الصدور

یہ شیخ احمد بن شیخ عبد القدوس گنگوہی کے بیٹے ہیں۔ چند بار مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ جا کر حدیث کا علم حاصل کیا۔ وہاں سے لوٹ کر آئے تو اپنے بزرگوں کی روش پر سماع کے منکر

تھے۔ محدثین کے طریقہ پر عمل کرتے تھے۔ تقویٰ، پاکبازی اور عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ جب انھیں صدارت کا عہدہ ملا تو انھوں نے لوگوں کو اتنی زمین مدد معاش میں دی اور اتنے وظیفے اور وقف قائم کیے کہ کسی بادشاہ کے زمانہ میں ایسا مقتدر صدر کوئی نہیں ہوا۔ جس قدر وظیفے اور اعانتیں انھوں نے جاری کیں۔ اس کا دسواں حصہ بھی کسی صدر نے نہ کیا ہوگا۔ اکبر کچھ عرصے تک تو ان کا ایسا معتقد رہا کہ ان کی جوتیاں سیدھی کر کے رکھا کرتا تھا۔ آخر مخدوم الملک اور دوسرے بدنفس علماء کے جھگڑوں کی وجہ سے بادشاہ کی عقیدت ان سے ختم ہوگئی:

جاہلانند ہمہ جاہ طلب
خویش راعلماء کردہ لقب

ان کے زوال کا بڑا سبب یہ تھا کہ جس زمانہ میں بادشاہ بانسوالہ کے سفر سے لوٹ کر فتح پور آئے تھے، تو قاضی عبد الرحیم قاضی متھرا نے شیخ کے پاس ایک استغاثہ بھیجا کہ ہم ایک مسجد کی تعمیر کا ارادہ کیے ہوئے تھے لیکن یہاں کے ایک سرکش مالدار برہمن نے ہمارا عمارتی ساز و سامان اٹھوالیا اور اس سے بت خانہ کی تعمیر شروع کرادی۔ میں نے جب اس کی تحقیق کا ارادہ کیا تو گواہ موجود ہیں، اس نے حضور اکرم ﷺ کو برا بھلا کہنا شروع کیا اور مسلمانوں کی سخت توہین کی۔ شیخ نے اس برہمن کو بلا بھیجا لیکن وہ نہ آیا۔ آخر بادشاہ نے بیربر اور شیخ ابو الفضل کو بھجوایا اور وہ اسے لے آئے۔ شیخ ابو الفضل نے جو کچھ لوگوں سے سنا تھا بیان کیا اور کہا کہ اس بات کی تحقیق ہوگئی ہے کہ اس نے گالی بکی تھی۔ اس کی سزا کے معاملہ میں علماء کے دو گروہ ہوگئے۔ ایک تو اسے قتل کرانا چاہتا تھا دوسرا اس کی تشہیر اور جرمانے پر زور دے رہا تھا۔ اس معاملہ میں بحث طول پکڑ گئی۔ شیخ نے بادشاہ سے اس کے قتل کی اجازت حاصل کرنے کے لیے بڑا اصرار کیا۔ بادشاہ نے صراحتاً اجازت نہ دی اور گول مول کہہ دیا کہ شرعی سزائیں تم سے تعلق رکھتی ہیں ہم سے کیا پوچھتے ہو؟ وہ برہمن اس جھگڑے میں مدتوں قید میں پڑا رہا۔ بادشاہی محل کی عورتیں اس کی رہائی کے لیے سفارشیں کرنے لگیں، لیکن بادشاہ کو شیخ کا بڑا لحاظ تھا اس لیے رہائی کا حکم نہ دیا۔ شیخ نے

اس کے قتل کے لیے جب اور زیادہ اصرار کیا تو بادشاہ نے جواب دیا۔ ہم تو تم سے پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ تم جو مناسب جانو کرو۔ شیخ نے مکان پر پہنچتے ہی اس کے قتل کا حکم دے دیا۔ جب یہ بادشاہ کے کانوں میں پہنچی تو اسے سخت غصہ آ گیا۔

ہندو رانیوں نے حرم میں اور ہندو مصاحبوں نے محفل میں کہا کہ ان ملاؤں کو آپ نے اپنی مہربانیوں سے سر پر چڑھا لیا ہے۔ اب تو ان کی جرأت ہو گئی ہے کہ آپکی مرضی اور پسند کا بھی ان کو خیال نہیں رہا اور آپکے حکم کے بغیر ہی وہ اپنا اختیار اور دبدبہ جتانے کے لیے لوگوں کو قتل کر دیتے ہیں۔ غرض اس طرح بدگویوں نے بادشاہ کے کان بھرے کہ مزید تحمل ممکن نہ رہا اور جو مادہ عرصہ سے اندر ہی اندر پک رہا تھا، پھوٹ کر بہہ نکلا۔

ایک رات انوپ تلاؤ کی محفل میں بادشاہ نے یہ معاملہ پیش کر کے اپنے دین کے نئے نئے مفتیوں سے اس مسئلہ پر رائے مانگی۔ کوئی کہتا تھا اس مقدمہ میں گواہوں پر اچھی طرح جرح اور تعدیل نہیں کی گئی۔ کوئی بول اٹھا شیخ عبدالنبی تو خود کو امام اعظم کی اولاد کہتا ہے، حالانکہ امام اعظم کے مذہب میں اسلامی حکومت کے ماتحت کافر نبی علیہ السلام کے بارے میں بدزبانی کریں تو ان کی یہ حرکت نقض عہد اور برائی ذمہ کا سبب نہیں بن سکتی۔ یہ بات حنفی فقہ کی کتابوں میں وضاحتاً موجود ہے۔ حیرت ہے کہ شیخ نے اپنے دادا سے کس طرح اختلاف کیا۔ اچانک دور سے بادشاہ کی نگاہ مجھ[62] پر پڑی۔ میری طرف متوجہ ہو کر نام لے کر آگے بلایا اور کہا" آگے آؤ، میں جب پہنچا تو پوچھا کیا تم نے بھی یہ مسئلہ سنا ہے کہ اگر ایک شخص کے قتل پر 99 روایتیں ہوں اور رہائی کے لیے صرف ایک روایت ملتی ہو تو مفتی کو اس ایک روایت کو ترجیح دینا چاہیے؟" میں[63] نے کہا ہاں ایسا ہی ہے جیسا کہ حضور فرماتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ "ان الحدود و العقوبات تندر ئی بالشبہات" میں نے اس کا مطلب فارسی میں سمجھایا۔ نہایت افسوس کے ساتھ پوچھا: "کیا شیخ عبدالنبی اس مسئلہ سے واقف نہیں تھا، اس نے بے چارے برہمن کو قتل کرا دیا، آخر ایسا کیوں ہوا؟" میں[64] نے کہا شیخ خود بڑے عالم ہیں وہ ضرور جانتے ہونگے۔ اس روایت کے ہوتے ہوئے انھوں نے حکم دیا تو ضرور کوئی مصلحت ہوگی۔ بادشاہ نے پوچھا: "کیا مصلحت ہو سکتی

ہے؟" میں نے کہا: فتنہ وفساد کی روک تھام اور عوام کی دلیری کا سد باب۔ اس سلسلہ میں قاضی عیاض کی "شفا" کی ایک روایت جو میری نظر سے گزر چکی تھی بیان کی، لیکن بعض خبیثوں نے کہا قاضی عیاض مالکی ہیں، ان کی بات حنفی ملک میں سند نہیں بن سکتی۔ بادشاہ نے مجھ[65] سے پوچھا: "تمہارے پاس کیا جواب ہے؟" میں نے کہا وہ یقیناً مالکی ہے۔ لیکن اگر کوئی تحقیق، مفتی، سیاسی مصلحت کی بنا پر اس کے فتویٰ پر عمل کرے تو شرعاً جائز ہے۔ اس موضوع پر بڑی لمبی چوڑی بحث ہوگئی۔ شہنشاہ کے مونچھ کے بال لوگوں نے بخوبی دیکھا کہ شیر کے بالوں کی طرح کھڑے ہوگئے تھے اور لوگ مجھے پیچھے سے ٹھوکے دے دے کر بحث سے روک رہے تھے۔ اچانک بادشاہ سے جھلا کر کہا: "تم جو کچھ کہہ رہے ہو، نامعقول ہے"۔ میں اسی وقت تسلیمات بجالایا اور واپس آکر جرگہ میں کھڑا ہو گیا۔ اسی دن سے میں نے پیش قدمی اور سبقت چھوڑ دی اور بحث اور مباحثہ سے کنارہ کشی کر کے گوشہ نشینی اختیار کرلی، کبھی کبھی کورنش بجالاتا تھا اور بس۔

اس واقعہ کے بعد سے شیخ عبدالنبی کا برابر زوال ہوتا گیا۔ اس کے اور بادشاہ کے درمیان ایک حجاب سا پڑ گیا۔ دونوں ایک دوسرے سے کترانے لگے، یہاں تک کہ شیخ نے دربار میں جانا بالکل ہی بند کردیا۔

اسی زمانہ میں شیخ مبارک آگرہ سے فتح پور کو کسی معاملہ میں مبارک دینے کے لیے آیا تھا۔ بادشاہ نے اس سے بھی یہ ماجرا بیان کیا اس نے کہا: "تم خود اپنے زمانہ کے مجتہد اور امام زمان ہو، شرعی اور ملکی احکام کے اجراء میں ان ملاؤں کے محتاج کیوں بنتے ہو؟ جو بجز جھوٹی شہرت کے ذرہ برابر بھی علم سے واقف نہیں ہیں"۔ بادشاہ نے کہا: "تم ہمارے استاد ہو ہم تم سے سبق پڑھتے رہیں گے، کسی طرح مجھے ان ملاؤں کے دباؤ سے نکال لو"۔ شیخ مبارک کو پرانی مخاصمت اور دشمنی کا سودا چکانے کا خوب موقع ملا۔ اس نے نہایت بدباطنی کے ساتھ: "آپ اجتہاد کا دعویٰ کردیا اور اس دعویٰ پر ان عالموں سے محضر لکھوا لیا"۔

یہی وہ واقعہ تھا جس کی بنیاد پر شیخ مبارک نے بادشاہ کے اجتہاد اور تمام مجتہدوں پر اس کی افضلیت کے متعلق محضر تیار کیا اور پاجیوں کی اس مجلس میں شیخ عبدالنبی اور مخدوم

الملک کو زبردستی پکڑ کر لایا گیا کسی نے ان کی تعظیم نہ کی، بیچارے جوتیوں کے پاس ہی بیٹھ گئے پھر ان کے ساتھ ایسی زبردستی کی گئی کہ انھوں نے اسی بے بسی میں اپنی گواہی لکھ دی جیسا کہ ہم تاریخ میں بیان کرآئے ہیں۔ دونوں کو بادشاہ نے حجاز کے سفر پر روانہ کردیا۔ شیخ عبدالنبی کی وفات 991ھ/1583ء میں ہوئی۔

شیخ احمدی فیاض امیٹھی وال

یہ بڑے عالم، متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ بہت زیادہ معمر ہوگئے تھے، چنانچہ چلنے پھرنے کی بھی طاقت نہ رہی تھی۔ اس بڑھاپے کے عالم میں سخت بیمار ہوگئے۔ بڑھاپے کی ان مصیبتوں کے باوجود انھوں نے ایک سال کے اندر پورا کلام پاک حفظ کرلیا تھا۔ اکثر درسی کتابیں پڑھاتے رہتے تھے۔ اگر کوئی شاگرد پڑھتے ہوئے غلطی کرتا تو محض یادداشت سے اسے ٹوک دیتے۔

تفسیر، حدیث، سیرت اور تاریخ پر بڑی اچھی نظر تھی۔ شیخ میاں نظام الدین امیٹھی وال کے ہم شہر اور ہمعصر تھے۔ میاں صاحب سے کہا کرتے تھے کہ وہ امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے سے کیوں روکتے ہیں؟

میں(66) جس وقت ان سے ملنے کے لیے گیا تو وہ شرح کافیہ کا درس دے رہے تھے۔ ایک بزلیہ قطعہ کوئی شاگرد، ان سے پڑھ رہا تھا۔ وہ قطعہ یہ ہے:

ابو بکر الولد المنتجب ۔۔۔ اراد الخروج لاعجب

فقد قال انی عزمت الخروج ۔۔۔ لکفارۃ هی لی ام اب

شک یہ پڑ گیا تھا کہ یہاں لفظ ''کفتارۃ'' ہے یا ''کفارۃ'' جو کافر کی تانیث میں مبالغہ کا صیغہ ہے، انھوں نے فرمایا معنی کے لحاظ سے ''کفارۃ'' ہوگا اور ''کفتار'' کا لفظ تو فارسی ہے۔ میں(67) نے کہا ''بہر حال'' ''کفتارۃ'' ''کفارۃ'' سے کہیں زیادہ واضح ہے۔

قاضی صدرالدین جالندھری

بڑے عالم متبحر، اہل تصوف و سلوک کے بڑے معتقد، نہایت خوش مزاج اور مجلسی آدمی

تھے۔ اگرچہ یہ مشہور ہے کہ انھوں نے کسی وقت شیخ عبداللہ مخدوم الملک سے پڑھا تھا، لیکن میں نے ان کی علمی تحقیقات کو مخدوم الملک سے کئی درجہ بڑھا ہوا پایا۔

اپنے مشرب میں ایک بے قید آدمی تھے۔ مزاج میں آزادہ روی بہت تھی۔ یہاں تک کہ لوگ ان کے متعلق بے دینی کا شبہ کرنے لگتے تھے۔ لوگوں کے ساتھ وہ بڑا حسن ظن رکھتے تھے۔ جو شخص بھی تارک دنیا ہو جاتا ہے خواہ وہ بدعتی ہی کیوں نہ ہو بڑے اعتقاد سے اس کی خدمت میں جا پہنچتے اور ہاتھ باندھ کر اس کے سامنے کھڑے ہو جاتے ان کی باتوں کو حجت مان لیتے۔ مشہور ہے کہ ایک بدعتی مجذوب بنا پھرتا تھا، وہ ان کے سامنے سے گزرا، قاضی اپنی عادت کے مطابق ہاتھ باندھ کر تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے۔ وہ مکار کہنے لگا کہ: ''خضر ہمیشہ ہمارے ساتھ رہتے ہیں''۔ قاضی اس کے پیروں پر گر گئے اور کہا: ''ہم کو بھی خضر سے ملا دو''۔ اس مکار نے کہانی الحال میں اپنی لڑکی کی شادی کے سلسلہ میں سخت متفکر ہوں اور یہ شادی 700 تنکہ کے لیے رکی ہوئی ہے، اس کام سے جب میں[68] فارغ ہو جاؤں گا تو تجھے ضرور خضر سے ملا دوں گا''۔ قاضی نے اسی وقت 700 تنکہ اسے دے دیا اور وہ شخص 2 دن بعد قاضی کے پاس آیا اور کہا آؤ میں تمھیں خضر سے ملاؤں۔ انھیں لے کر وہ دریا پر گیا۔ وہ شخص نہایت بلند قامت اور قاضی پست قد تھے۔ وہ پانی میں گردن تک جا کر کھڑا ہو گیا اور کہا آؤ خضر یہاں ہے۔ قاضی نے کہا: ''میں تیرنا نہیں جانتا کس طرح آؤں؟'' اس نے کہا: ''میں نے تو تم کو خضر کا ٹھکانہ بتا دیا اب تم نہیں آتے تو میرا کیا قصور؟

لوگ ان کے متعلق ایسی ہی اور مضحکہ خیز حکایتیں بیان کرتے ہیں جن کا لکھنا سنجیدگی کے شایان شان نہیں۔ اس واقعہ سے قاضی کی سادہ لوحی کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جس زمانہ میں بادشاہ نے لاہور کے امراء و اکابر کو مختلف علاقوں پر نامزد کر کے بھیجا تھا تو ہر ایک کو ایک شہر میں کسی ایک عہدے اور منصب پر مقرر کر دیا تھا۔ قاضی صدر الدین کو اس کو اس وقت گجرات میں بندر بھروچ کا قاضی بنایا گیا، وہ وہیں جا کر رہ گئے اور اسی جگہ انتقال کیا۔

ان کا ایک لڑکا شیخ محمد نامی ہے جو عالم و قابل آدمی ہے اور اسی مقام پر اپنے باپ کا جانشین بنایا گیا۔

میاں الہداد لکھنوی

نہایت صاحب تصرف، مستعد، دانشور اور عالم تھے۔ طبعاً نہایت ذہین تھے۔ خاص طور سے علم اصول فقہ میں تو ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ علم نحو میں انھوں نے ایک رسالہ لکھا تھا۔ اس رسالہ کا نام ایک مقتدر حاکم کے نام پر ''قطبی'' رکھا تھا۔ میں نے میاں صاحب سے ملاقات کی تھی۔ ان کی تصانیف میں دو چیزیں بڑی عجیب و نادر تھیں۔ پہلا تو ایک رسالہ تھا جس کا طول 14 سطر کا تھا اور عرض بھی اتنی سطروں کا تھا، اس کے حاشیوں پر بھی مضمون لکھا تھا۔ اس رسالہ میں 14 علوم کے احکام و مسائل درج تھے۔ دوسرا ایک اور رسالہ تھا جو مقامات حریری کے طرز پر لکھا گیا تھا۔ اس کے 5 حصے تھے اس کا نام انھوں نے ''قیلون'' رکھا تھا ان کا کہنا تھا کہ میری اور بھی تصانیف ہیں۔

ان کے چچا زاد بھائیوں کا بیان ہے یہ 14 علمی رسالے اور رسالہ قیلون اصل میں حکیم زبرقی کی تصانیف ہیں۔ جو جون پور میں آیا تھا اور قاضی شہاب الدین سے اس کا مشہور مناظرہ و مباحثہ ہوا تھا، پھر زمانہ کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے وہ شیخ اعظم لکھنوی کے کتب خانہ میں جنھیں ثانی امام اعظم خطاب ملا ہوا تھا، پہنچا۔ ان کے بعد وہ میاں الہداد کے پاس مرتے دم تک رہا۔ میاں الہداد شیخ اعظم کے صاحبزادے تھے۔

میر سید جلال الدین قادری

آگرہ کے مشہور سید ہیں۔ توکل و زہد میں ایک امتیازی شان کے مالک تھے۔ شروع سے آخر تک گوشۂ تنہائی میں رہے۔ امراء کی صحبت سے دور ہی دور رہے۔ بڑے آزاد مشربی کے ساتھ زندگی گزاری۔ حضرت شیخ محی الدین عبد القادر جیلانیؒ کی طرف سے لوگوں کو سر مرید بناتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے میر سید داؤد اپنے باپ کے

قائم مقام ہوئے۔ وہ نہایت تنگدستی اور فقر کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

جب شیخ مبارک کے خاندان کو عروج ہوا تو ان بیچاروں کا خاندان بھی ادبار و زوال کا نشانہ بن گیا:

صد ہزاران طفل سر بریدہ شد
تا کلیم اللہ صاحب دیدہ شد

شیخ حسین اجمیریؒ

ان کے متعلق مشہور تھا کہ وہ حضرت قطب المشائخ سلطان الواصلین خواجہ معین الدین سجزی چشتیؒ کے پوتوں میں سے ہیں۔ ابتدائی زمانہ میں جب اکبر کو حضرت اجمیریؒ سے بڑی عقیدت ہو گئی تھی تو شیخ حسین سے اس کا مزاج مکدر ہی رہا۔ بادشاہ کا یہ رنگ دیکھ کر دشمنوں کی بن آئی اور انھوں نے فتح پور کے بعض مشائخین کے اشارے پر اس بات کی گواہیاں دیں کہ شیخ صاحب نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی تھی۔ اس معاملہ میں صدر اور قاضیوں نے بھی زمانہ سازی کے بموجب محضر لکھ دیے۔ اس طرح اجمیر کی سالہا سال کی موروثی تولیت دوسروں کے سپرد کر دی گئی۔ دراصل شیخ کا وہاں بڑا عمل دخل تھا اور وہ اس صوبہ میں ایک طرح سے شاہانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کا یہ اثر و رسوخ بادشاہ کو کھٹک گیا۔ پھر کچھ اور چھوٹے بڑے معاملات ایسے بھی پیش آئے کہ شاہانہ تکبر و غیرت بھڑک اٹھی۔ آخر اکبر نے شیخ حسین کو جلا وطن کر کے مکہ بھجوا دیا۔ جب بادشاہی لشکر بانسوالہ کے سفر میں تھا۔ شیخ حسین اجازت لے کر مکہ گیے اور حج و زیارت سے فارغ ہو کر واپس آئے۔ جس وقت اکبر فتح پور سے آ کر محمد حکیم مرزا کی بغاوت کو کچلنے کے لیے کابل جا رہا تھا، شیخ حجاز کے سفر سے واپس آئے اور دربار میں پہنچے۔ دربار میں نئے مذہب کے توسلم مریدوں اور نو دولتیے مصاحبوں نے تعظیم و تسلیمات کے نئے نئے آداب وضع کر رکھے تھے۔ شیخ نے یہ آداب و تسلیمات ادا نہیں کیے۔ بادشاہ نے جب ان کو مطیع و مخلص نہ پایا تو گرفتار کر کے بھکر کے قلعہ میں بھجوا دیا۔ چند سال تک شیخ حسین بھکر میں رہے۔

1002ھ/1593ء میں بعض مقربوں کی سعی و سفارش سے شیخ کو بھکر سے طلب کیا گیا۔ شیخ بھکر سے آئے تو ان کے ساتھ اور بھی قیدی تھے۔ جن میں شیخ کمال بیابانی قلاب جیسے لوگ اور فتح پور کے قاضی بھی تھے، جو شیخ ابراہیم چشتی کی کوششوں سے 14 سال سے وہاں قید تھے۔ ان باغیوں کے نام میرزا نظام الدین احمد کے ذریعہ طلبی کا فرمان جاری کیا گیا تھا۔ یہ سب لوگ دربار میں آئے حسب قاعدہ کورنش بجالائے، بادشاہ کو سجدہ کیا، اکبر نے خوش ہو کر ان کی رہائی کا حکم صادر کر دیا۔ لیکن شیخ حسین جو اس وقت 70 سال کے بوڑھے ہو رہے تھے کبھی شاہانہ تسلیمات کے نئے آداب پر عمل نہیں کیا تھا، اس بار بھی انھوں نے قدیم وضع پر تعظیم کی اور بس اچٹتی ہوئی تسلیمات بجالائے۔ ان کے اس رویہ کو دیکھ کر اکبر دوبارہ ان سے خفا ہو گیا اور مرزا نظام الدین سے کہا کہ ان کی مدد معاش کے لیے 300 بیگھہ کی زمین بھکر ہی میں دی جائے اور انھیں دوبارہ اسی جگہ بھیج دیا۔ اکبر کی والدہ بیگم بادشاہ نے محل میں ان کی سفارش کرتے ہوئے کہا: ''بابو تم (اکبر کا پیار کا نام) شیخ کی والدہ بہت ضعیف ہیں اور اجمیر میں رہتی ہیں۔ بیٹے کو دیکھنے کے لیے اس کا دل کباب ہو رہا ہے اگر ان کو وطن جانے کی اجازت دے دی جائے تو کیا حرج ہے؟ وہ تو تم سے کسی مدد معاش کی خواستگار بھی نہیں ہیں''۔ اکبر نے ماں کا کہنا قبول نہ کیا اور کہا: ''آچہ جیو (ماں کو پکارنے کا نام) وہ وہاں جائے گا تو پھر اپنی دکان کھول کر بیٹھ جائے گا۔ لوگ اس کے لیے نذر نیاز اور ہدیے بہت لے کر آئیں گے اور وہاں لوگوں کو گمراہ کرنے لگے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ اپنی والدہ کو اجمیر سے یہاں بلالے''۔ والدہ کو بلانے کی بات شیخ کے لیے بھکر جانے سے زیادہ ناقابل قبول اور دشوار گزار تھی۔

اجمیر کی تولیت کے معاملہ میں بادشاہ نے خود میرا[69] نام تجویز کیا تھا۔ ایک رات صدر جہاں نے اس سلسلہ میں مجھے[70] خدمت میں پیش کیا۔ بادشاہ کا خیال بدل گیا اور اس تجویز کو جسے خود ہی پیش کیا تھا بدل دیا اور مجھے دربار ہی میں رہنے کا حکم دیا گیا۔ اس موقع پر صدر جہاں سے دریافت کیا وہ سادہ لوح بوڑھا (شیخ حسین) کہاں ہے؟ میں نے یاد دلایا ''لاہور میں ہے''۔ میں[71] نے صدر جہاں کو بڑے اصرار سے کہا کہ: ''اگر اس

سعادت کے لائق نہیں ہوں تو کم از کم اسے، شیخ حسین کو کوشش کرکے متولی بنوادو تا کہ حق، حقدار کو پہنچ جائے۔ لیکن کیا کیا جائے ان ہندستانی امیروں کو اپنے آدمیوں کی ترقی و تربیت کا ڈھنگ نہیں آتا اور یہ آپس میں ایک دوسرے سے صفائی اور خلوص سے نہیں رہتے۔ اس لیے صدر جہاں کی کوششوں کا مجھ[72] بے کس کے حق میں کوئی نتیجہ نہ نکلا اور نہ بیچارے شیخ حسین کے لیے کچھ ہو سکا۔ شیخ حسین شکستہ دل اور مضطرب گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں، نہ تو کسی کے گھر جانے کی قوت ہے نہ کچھ وسائل کہ روزی پیدا کرے۔ بادشاہ کے پاس اب عرض و گزارش اور سفارش کی بھی کوئی راہ نہیں رہی ہے۔

بہر حال شیخ حسین کی ذات نہایت غنیمت اور اس زمانہ میں باعث برکت ہے۔ میری ان سے کوئی جان پہچان اور ربط و تعلق نہیں۔ لیکن اس وقت جب کہ وہ حج کرکے پھر قید و بند کی زحمتیں برداشت کرکے آئے ہیں۔ مجھے[73] تو وہ ایک نورانی وجود اور فرشتہ صورت دکھائی دیتے ہیں۔ ہمیشہ ریاضت و عبادت اور مجاہدہ میں مشغول رہتے ہیں۔ صائم الدہر اور قائم اللیل ہیں، ملنے جلنے میں کسی سے وہ دنیا کی بات نہیں کرتے۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو کامیابی اور کشائش عطا کرے گا۔ کیوں نہ ہو؟" امید ہے ان صاحب خدا بزرگ کے طفیل میں مجھ جیسے قیدی کو بھی رہائی مل جائے تا کہ میں اس دربار کی بے معنی پریشان گفتاری، ہرزہ گوئی، بیہودگی اور جھوٹ لکھنے سے نجات پا جاؤں اور وطن جا کر اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہوں اور بقیہ عمر کسی مفید مشغلہ میں گزار دوں:

بسر آنم کہ گرز دست بر آید
دست بکاری زنم کہ غصہ سر آید

اسی وقت جب کہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں، صبح صادق طلوع ہو رہی ہے اور نسیم سحر چلنے لگی ہے۔ اگر میری اس دعا کا تیر قبولیت کے نشانہ پر جا لگے تو کرم خداوندی سے کیا بعید کہ وہ میری مشکل حل کردے:

غالباً خواہد کشود از دولتم کاری کہ دوش
من ہمی کردم دعا و صبح صادق می دمید

اگرچہ کسی شعر وغیرہ کا ترجمہ نہیں کیا، لیکن یہاں ایسا مطلب ہے۔ بے قرار ہو گیا ہوں کہ یہ ایک دو ابیات آج بے اختیار نوکِ قلم پر آ گئیں، خدا معاف کرے۔

ہرگز نچنین عزم نہ بود دل ما را
ایں بار بدل من غم بیگانہ گرانی

شیخ عبدالقادر

اوچ کے رہنے والے تھے۔ مخدوم شیخ حامد قادری کے صاحبزادے ہیں۔ جس وقت بیرم خان کے عہد میں حضرت مخدوم آگرہ میں تشریف رکھتے تھے، میں طالب علم تھا لیکن بدبختی سے ان کے پاس حاضری کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔

بیرم خاں بعض اہل غرض حاسدوں، خاص طور سے شیخ گدائی کے بہکانے سے حضرت مخدوم کے ساتھ اچھی طرح پیش نہیں آیا اور ان کو اوچ سے طلب کر لیا۔ مخدوم کو اس سلوک سے بڑا رنج ہوا۔ انھوں نے بیرم خاں کو بد دعا دی، چنانچہ دنیا نے دیکھا کہ بیرم خان کو جو بھگتنا تھا وہ بھگت کر چلا گیا۔ شیخ محمد غوث بیرم خان کے اس وبال کو اپنا اثر سمجھتے تھے۔ غرض جب حضرت مخدوم ملتان پہنچے تو ان کا وہاں انتقال ہو گیا اور ان کی لاش ملتان کے قریب موضع حامد پور میں امانتاً دفن کی گئی۔

ان کی وفات کے بعد شیخ عبدالقادر اور ان کے چھوٹے بھائی شیخ موسیٰ کے درمیان سالہا سال تک سجادہ نشینی کا جھگڑا ہوتا رہا۔ شیخ موسیٰ اکثر لشکر میں رہا کرتے تھے اور شیخ عبدالقادر فتح پور میں۔ ایک رات اکبر نے شیخ عبدالقادر کو کوکنار پینے کے لیے کہا۔ شیخ نے انکار کر دیا۔ اس وجہ سے بادشاہ کا مزاج مکدر ہو گیا۔ چنانچہ ایک مرتبہ شیخ عبدالقادر فتح پور کے دیوان خانہ خاص میں جماعت سے فارغ ہو کر نفل پڑھنے لگے تو بادشاہ نے فرمایا: "شیخ نفل تمھارا گھر جا کر ادا کرو۔" شیخ نے نہایت جرأت کے ساتھ کہا: "بادشاہ سلامت یہ کوئی تمہاری ملکیت ہے کہ تمہارا حکم چلے"۔ اکبر نے رنجیدہ ہو کر کہا: "یہ شیخ کس قدر جاہل ہے" پھر انھوں نے حکم دیا: "جب تم ہماری ملکیت تسلیم نہیں کرتے تو ہمارے ملک میں بھی نہ

رہو"۔ شیخ اسی وقت وہاں سے اٹھ آئے، مدد معاش کو چھوڑ کر چھوٹے بھائی سے جانشینی کا جو جھگڑا چل رہا تھا اس سے دستبردار ہوئے اور اوچ میں اپنے آبائی مقبرہ میں جا کر گوشہ نشین ہو گئے۔ شیخ موسیٰ کے غائبانہ مخدوم شیخ حامد کی ہڈیاں بھی اوچ لے جا کر اسی قبرستان میں دفن کر دیں اور اپنے اسلاف کی اتباع میں فقر و توکل کا مسلک اختیار کر لیا۔ ان کی عزیمت کی یہ برکت ہے کہ لوگ انھیں اتنا کچھ نذر و ہدیہ دیتے ہیں کہ کسی مدد معاش کے محتاج نہیں رہے۔

چھوٹے بھائی شیخ موسیٰ برسوں کے زہد و عبادت و مشیخیت چھوڑ دربار میں پہنچے اور بادشاہ کے ساتھ ارادت و عقیدت کا اظہار کیا۔ سپاہ گری کا پیشہ قبول کر کے فوج میں ملازم ہو گئے۔ اکبر نے ان کو پانصدی امیروں کی صف میں جگہ دے دی۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ ایک شخص مسلمان ہوا تو دوسرے نے کہا بڑا اچھا کام کیا۔ مسلمانوں میں بس تیری ہی ایک کمی تھی۔ اس تبدیلی کے باوجود شیخ موسیٰ کا یہ حال تھا کہ اگر نماز کا وقت ہو جاتا تو وہ عین دیوان خانہ خاص و عام میں بادشاہ کی موجودگی میں خود اذان دے کر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے، کسی کی مجال نہیں تھی کہ ان کو کچھ کہے۔ جب ان کے منصب پانے کی خبر عبدالقادر کو ملی تو انھوں نے کہا: "وہ تو ہزاری منصب کا اہل تھا، اس سے بڑا منصب کیوں حاصل نہیں کیا اور بے وجہ اب تک محروم پڑا رہا آخر شیخ کو ملتان میں جاگیر مل گئی"۔

شیخ عبدالقادر نے دنیا کو ٹھوکر ماری اور فقر و توکل کی بدولت وہ بڑی عزت و توقیر کے ساتھ مسند خلافت پر متمکن رہے۔ خلق خدا کو ہدایت و ارشاد سے مستفید کرتے رہے۔ ان کے اکثر اوقات عبادتوں، سخت ریاضتوں اور مجاہدوں میں گزرتے رہے۔ ان کی دینی سیادت کا سکہ سب کے دل پر نافذ ہے:

ما تو بروی فقر و قناعت نمی بریم
با پادشہ بگوئی کہ روزی مقدر است

شیخ کبیر

31 یہ مخدوم شیخ بہاؤ الدین زکریاؒ کے سجادہ نشین ہیں۔ ملتان کے لوگ ان کو اپنے وقت کا ولی

کہتے ہیں۔ ملتان والے ان کے اس قدر معتقد ہیں کہ اگر وہ کہہ دیں تو ایک دن میں ہزار سوار بلکہ اس سے زیادہ جمع ہو جائیں۔

ذکر و شغل اس قدر کرتے تھے کہ دیکھنے والا سمجھتا تھا کہ انھوں نے نشہ پی رکھا ہے۔ راتوں کو جاگنے کی وجہ سے آنکھیں اکثر سرخ رہتی تھی۔ اس لیے لوگ مست سمجھا کرتے تھے:

از بسکہ خون خورم ہمہ شب بی خود افتم
مردم نہند تہمت بی خوارگی مرا

شیخ موسیٰ قادری جن کا ذکر آچکا ہے۔ شیخ کبیر کے متعلق نشہ اور مستی کا ہی گمان رکھتے تھے۔ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ پچھلے اولیاء جن کا کتابوں میں ذکر ہے کہیں ایسے نہ رہے ہوں جیسے ہمارے شیخ کبیر ہیں کہ ولی بنے بیٹھے ہیں اور پہلے کے شاعر کہیں شیخ فیضی اور اس جیسے دوسرے شاعروں کی طرح نہ گزرے ہوں کہ ملک الشعرا بنا ہوا ہے۔ میں نے ایک مرتبہ فتح پور میں شیخ کبیر سے حسین خاں کے ساتھ ملاقات کی تھی۔ شکوہ بزرگی تو ان کے ظاہر سے عیاں تھا، باطن کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے، قطعہ:

هر کرا جامہ پارسا بینی — پارسا دان و نیک مرد انگار
ور تو احوال او ندانی چیست — محتسب را درون خانہ چکار

ان کی وفات 995ھ/1587ء میں ہوئی۔ اپنے بزرگوں کے مقبروں میں دفن کیے گئے۔

میر سید علی لدھیانہ

یہ شیخ تھانہ کے شیخ عبد الرزاق کے خلیفہ ہیں۔ بڑے عالم صاحب کمال تھے۔ وجد و حال کی کیفیت بڑی غالب تھی۔ 80 برس سے زیادہ عمر پائی تھی۔

جب سے انھوں نے اپنے مرشد سے تلقین و ارشاد کی اجازت حاصل کی، اس وقت سے ساری عمر گھر پر ہی گزاری، قدم باہر نہیں نکالا۔ ان کی محفل میں کیا امیر کیا فقیر ساری

مخلوق حاضر رہا کرتی تھی، ان کی بڑی کرامتیں مشہور ہیں۔ سب سے بڑی کرامت تو یہی تھی کہ جو بھی خلوص و عقیدت کے ساتھ ان کی صحبت میں حاضر ہوتا وہ گنہ گاری اور دنیا داری چھوڑ کر اللہ کا مطیع و فرماں بردار بن جاتا اور حقیقی منزل کو پالیتا۔

ان کے معتقدین میں میرزا نظام الدین احمد کا داماد محمد جعفر بھی تھا کہ یہ نہایت سلیم الطبع نوجوان تھا، لیکن فسق و فجور میں مبتلا رہتا تھا، پرگنہ شمس آباد اسے جاگیر میں ملا ہوا تھا۔ وہ لاہور سے اس پرگنہ کی فوجداری کے لیے رخصت ہوا تو اثنائے راہ میں لدھیانہ ٹھہرتا ہوا یہاں میر موصوف کی خدمت میں پہنچنے کی اسے توفیق ہوئی، بس ایسا اثر ہوا کہ بد اعمالیوں سے توبہ کر لی۔ شہادت کا ایسا شوق اس کے دل میں پیدا ہو گیا کہ بے جھجک اپنے آپ کو خطرات میں ڈال دیتا تھا اور جان کی پروا نہ کرتا تھا۔ بار ہا اس نے میر صاحب سے شہادت پانے کے لیے دعا کی التجا کی۔ انھوں نے اس پر پھونک ماردی۔ تین چار مہینے کے اندر وہ اس قدر صالح، عبادت گزار اور نیک بن گیا کہ بہت سے متقی اور پرہیزگار اس پر رشک کرنے لگے۔ اس کی خدا ترسی کا یہ عالم تھا کہ اس حکومت، شان وشوکت کے باوجود تہجد کی نماز کے لیے اٹھتا، کسی خادم کو زحمت دیے بغیر وضو کا پانی خود لے آتا۔ میر صاحب نے شہادت کے لیے جو پھونک ماری تھی اس کا اثر بہت جلد ظاہر ہو گیا اور میرزا جعفر شمس آباد کے ایک موضع میں حربی کافروں سے مردانہ وار لڑتے ہوئے شہید ہو گیا۔

اسی سال اس موقع پر جب کہ میں[74] میرزا نظام الدین احمد کے ساتھ رخصت لے کر وطن جا رہا تھا تو میر صاحب موصوف کی خدمت میں پہنچا۔ اس وقت جعفر کی شہادت کا ذکر چھڑ گیا۔ آپ نے فرمایا: ''شہیدوں کو اس عالم میں بڑی فرحت و لذت حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ کلام پاک میں بھی کہا گیا ہے:

''بل احیاء عند ربھم یرزقون فرحین''

(وہ اللہ کے پاس زندہ ہیں اور خوشی و مسرت ان کے لیے مہیا کی گئی ہے)

اس سلسلۂ گفتگو میں انھوں نے ایک قصہ بھی بیان کیا کہ: ''ایک نوجوان جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اس علاقے میں شہید ہو گیا تھا لیکن وہ اپنی اصلی شکل میں جمعہ کی راتوں

کو اپنی بیوی کے ساتھ بستر پر گزارا کرتا تھا" یہ قصہ مجھے[75] معلوم تھا اس لیے میں نے عرض کیا کہ میں نے لوگوں سے یہ تک سنا ہے کہ ان میاں بیوی کے بچے بھی ہوئے ہیں۔

اسی طرح پیاور میں جو میر[76] وطن ہے ایک اور قصہ مشہور ہے۔ وہاں اسحٰق نامی پٹھان شہید ہو گیا تھا۔ اس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ بھی ہر جمعہ کی رات اپنی نئی نویلی دلہن کے پاس آیا کرتا تھا اور اس کو اس راز کے افشا سے اس نے منع کر دیا تھا۔ انھی دنوں اس کی بیوہ حاملہ ہو گئی اور لوگوں نے اس پر ناجائز کام کا الزام لگا دیا تو اس نے بڑا اصرار کرنے کے بعد اپنی ساس یعنی اسحٰق شہید کی ماں سے سارا قصہ بیان کر دیا۔ مقررہ رات کو اس کی ساس نے جو اپنے بیٹے کو دیکھ لیا اور وہ اس کا نام لے کر آغوش میں لینے کے لیے دوڑی مگر وہ شکل اچانک غائب ہو گئی۔ اسی دن سے بس اسحٰق کی وہاں آمد و رفت بند ہو گئی اور وہاں ماں نے اپنے بیٹے کے نام ایک کنواں کھدوایا، جو اب تک موجود ہے۔ پیاور کا قصہ بھی میں[77] نے اس محفل میں بیان کر کے میر صاحب سے پوچھا: "کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟ انھوں نے جواب دیا: "ممکن ہے عقلاً بھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میرزا نظام الدین نے کہا ہو سکتا ہے کوئی جن اس شہید کی صورت میں آتا ہو"۔ آپ نے فرمایا: "جنوں کو انبیاء، اولیاء، صلحاء اور شہید کی تمثیل اتارنے پر قدرت حاصل نہیں ہے"۔ میر سید علی کی وفات 1002/1593ء میں ہوئی۔ ایک علم نے "شیخ امام" ان کی تاریخ کہی ہے۔ اب ان کے جانشین میر سید محمود ہیں۔

شیخ معین

یہ مشہور واعظ "معراج النبوۃ" کے مصنف ملا معین کے پوتے ہیں۔ نہایت نیک نفس اور فرشتہ خصلت آدمی تھے۔ مدت تک لاہور میں قاضی رہے۔

ان کے متعلق مشہور ہے کہ اپنی قضاوت کے دوران ایک مقدمہ بھی فیصل نہیں کیا۔ اگر مدعی مقدمہ کے فیصلے پر اصرار کرتا تو وہ اسے انتہائی عاجزی کے ساتھ کہتے تھے خدارا تم دونوں آپس میں صلح کر لو تاکہ میں تمہارے جھگڑے میں اللہ کے پاس پکڑا نہ جاؤں اور

مجھے آخرت میں شرمسار نہ ہونا پڑے۔ وہ فریقین سے کہا کرتے تھے کہ تم دونوں عقل مند ہو اور مجھ اکیلے نادان کو دو دانشمندوں سے سابقہ آپڑا ہے۔ خدارا تم دونوں مجھے اللہ کی بارگاہ میں شرمندہ نہ کرو۔

اگر کوئی عورت اپنے شوہر کے غائب رہنے کی بنا پر تفریق کا مطالبہ کرتی تو وہ تا حد امکان اپنے پاس سے اس کا خرچ دے دیتے اور کہتے یہ رقم لے کر جا اور شوہر کا انتظار کرو اور اس سے علیحدگی اختیار نہ کرو۔ اپنی مدد معاش کو جو کافی اچھی تھی، ساری کی ساری کاتبوں پر خرچ کر دیتے تھے۔ ان کاتبوں سے وہ قیمتی اور عمدہ کتابیں لکھواتے۔ ان کا مقابلہ و تصحیح کراتے، پھر جلد بندھوا کر طالب علموں کو مفت دے دیتے۔ ساری عمر ان کا یہی مشغلہ رہا اور انھوں نے لوگوں کو ہزاروں جلدیں بخش دیں۔ 935/1528ء میں انھوں نے انتقال کیا۔ ان کے دو لڑکے رہ گئے ہیں ایک تو پہلوانی میں اور دوسرا کبوتر بازی میں مشہور ہے۔ بادشاہ سلامت کے یہاں بھی ان کے فنوں کا ذکر آیا تو بادشاہ نے دونوں کو بلا کر ان کے کھیل تماشے دیکھے۔

میر عبد اللطیف قزوینی

یہ سیفی حسینی سادات میں سے ہیں۔ علوم عقلی اور نقلی کے بڑے عالم تھے۔ ان کے باپ دادا سے علم تاریخ گویا ان کے یہاں موروثی ہے۔ چنانچہ حیرتی شاعر نے قاضی یحییٰ کے والد کی تعریف میں کہا ہے:

قصہ تاریخ از و باید شنید
کس درین تاریخ مثل او ندید

انھوں نے یا ان کے کسی عزیز نے شاہ اسمٰعیل کے خروج کی تاریخ "مذہب ناحق" سے نکالی تھی۔ جب اس گستاخی پر پکڑے گئے اور مواخذہ ہوا تو کہہ دیا کہ ہم نے تو "مذھبنا حق" ہمارا مذہب حق ہے! تاریخ کہی تھی۔ بس یہ معنی خیز جواب دے کر چھوٹ گئے۔

سیفی سید سب کے سب بڑے پکے سنی رہے ہیں، چنانچہ اس جرم میں شاہ طہماسپ نے ان کی زمینیں جاگیریں چھین لی تھیں۔ ہندوستان میں میر عبداللطیف کے آنے کا بھی یہی سبب تھا۔

میں[78] نے میرزا غیاث الدین آصف خاں کی زبانی سُنا ہے کہ جب بادشاہ میر عبداللطیف اور ان کے خاندان کا دشمن ہو گیا تھا۔ میر علاؤ الدولہ نے جو تذکرہ کا مصنف ہے اور عبداللطیف کا چھوٹا بھائی ہوتا ہے اور انہی سے تربیت پائی ہے۔ اپنے بڑے بھائی کو "حضرت آقا" کہا کرتا تھا۔ کسی مصلحت کی وجہ سے اس نے اپنی مذمت میں ایک قصیدہ کہا تھا جس کا ایک مصرع ہے۔

لعنت کنم بہ یحیٰی و بر حضرت آقا

لوگوں نے اس سے کہا تو نے تو میر صاحب کی آغوش میں تعلیم و تربیت پائی ہے، پھر ان کی توہین کیوں کی؟ اس نے جواب دیا، دیکھتے نہیں ہو، اسی حق کی وجہ سے تو اس کو میں نے "حضرت آقا" کہا ہے اور اپنے باپ کا نام یحیٰی تو بغیر تعظیم ہی کے لیا ہے۔

جب فتنہ پردازوں نے شاہ طہماسپ کو میر یحیٰی کی طرف سے بدگمان کر دیا تو شاہ نے اپنے ایک نمائندے کو آذر بائیجان فرمان دے کر بھیجا کہ میر یحیٰی اور ان کا لڑکا میر عبد اللطیف نہایت متعصب سنی ہیں اور انہی کی وجہ سے قزوین میں سنیوں کا زور بندھا ہوا ہے۔ اس لیے ان دونوں کو گرفتار کر لیا جائے اور اہل سنت کی جو کتابیں ان کے پاس ہیں، ضبط کر کے ہمارے پاس بھیج دی جائیں۔ ان کے اہل و عیال اور قبیلہ والوں کو اصفہان میں منتقل کر دیا جائے۔ میر علاؤ الدولہ کو بھی جو ان دنوں آذربائیجان میں تھا، ایک تیز رفتار قاصد کے ذریعہ اسی طرح کا خط لکھ کر بھیجا۔

غرض حسب الحکم میر یحیٰی کو سپاہیوں نے گرفتار کر لیا اور وہ ڈیڑھ سال تک اصفہان میں قید رہے اور اسی قید میں ان کا انتقال ہو گیا۔ میر عبداللطیف وہاں سے فرار ہو کر عرصہ تک گیلان کے پہاڑوں میں رہے، پھر بادشاہ غفران پناہ (ہمایوں) کے وعدے پر

ہندستان چلے آئے۔

یہاں آنے کے بعد ان کا بڑا اعزاز و اکرام رکھا گیا اور بے اندازہ شاہانہ سرفرازیوں سے نوازے گئے۔ اکبر نے ان کے پاس دیوان حافظ کے چند سبق اور کچھ دوسری چیزیں بھی پڑھیں۔ میر عبداللطیف نے 5 رجب 981ھ/1573ء کو فتح پور میں انتقال فرمایا۔ قلعہ اجمیر پر میر سید حسین خنگ سوار کے پہلو میں دفن ہوئے۔ قاسم ارسلان نے ان کی تاریخ "فخر آل یسٰین" نکالی ہے۔

میر غیاث الدین علی

میر عبداللطیف قزوینی کا لڑکا ہے۔ اسے دربار سے نقیب خاں کا خطاب حاصل ہے۔ یہ نہایت فرشتہ خصلت اور صاحب علم و کمال شخص ہے۔ علم سیر، تاریخ اور اسماء الرجال میں تو عرب و عجم میں بھی اس جیسا ماہر فن اور کوئی نہ ہوگا۔

میرزا کے ساتھ میرا[79] بڑا دوستانہ رہا۔ وہ اور ہم[80] ساتھ ساتھ پڑھتے بھی تھے۔ اب وہ رات دن بادشاہ سلامت ہی کی خدمت میں رہتا ہے اور تقریباً 100 سال سے خلوت و جلوت میں تاریخی قصے، حکایات جو فارسی اور ہندی افسانے، جس کا اسی زمانہ میں ترجمہ ہوا ہے، بادشاہ کو پڑھ پڑھ کر سناتا ہے۔

اکبر کے ساتھ اس کا ایسا ملاپ ہے کہ وہ خاندان شاہانہ کا ایک حصہ بن کر رہ گیا ہے۔ اکبر ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی جدائی کو گوارا نہیں کرتا تھا۔

ان دنوں اسے ہلکا سا بخار ہو گیا ہے امید ہے کہ جلدی اسے شفا ہو جائے گی۔ بہر حال نیک لوگ ہر جگہ معزز رہتے ہیں۔ خدا ان کو سلامت رکھے۔ بدوں کی زندگی کی دعا کیوں کی جائے کہ وہ رہیں گے تو وہی اپنی برائی کرتے رہیں گے۔

خواجہ محمد یحییٰ

حضرت خواجہ احرار سے 3 واسطوں سے خاندانی رشتہ رکھتے ہیں۔ فن تحریر میں بڑا عبور حاصل

تھے۔ خط نسخ بڑی عمدگی کے ساتھ لکھتے تھے۔ اس فن میں وہ ماہر استاد تھے۔

نہایت اچھے اخلاق و عادات کے مالک تھے۔ یہ خوبی تو ان کو موروثی ملی تھی۔ کم سخن تھے لیکن ہمیشہ ان کی محفل گرم رہتی تھی۔ سخی ایسے تھے کہ جو بھی جاگیر کی آمدنی ہوتی وہ ان کے دوستوں پر صرف ہو جاتی تھی۔ لوگوں کے آڑے وقتوں میں ہمیشہ کام آتے تھے۔

جب دربار میں مفسدوں کا عمل دخل حد سے زیادہ بڑھ گیا اور پرانی محفل درہم برہم ہو گئی تو انھوں نے بھی دربار سے کنارہ کشی کر لی اور حجاز جانے کی اجازت حاصل کر لی۔ بادشاہ نے ان کو حجاز کے قافلے کا میر حاج مقرر کیا اور کافی خرچ دے کر انھیں رخصت کیا۔ وہ حج کی سعادت حاصل کر کے لوٹ آئے۔

آگرہ میں ان کے اکثر اوقات عبادت و ریاضت میں گزرتے تھے۔ اسی جگہ ان کا انتقال ہوا:

ترا ز کنگرۂ عرش میزنند صفیر
ندانمت کہ دریں دامگہ چہ افتادہ است

شیخ حسین بدخشی

مخدوم شیخ حسین خوارزمی کے خلیفہ تھے۔ ان پر سکر کی کیفیت غالب رہتی تھی۔ فجر کی نماز کے بعد ہر روز کبرویہ سلسلے کے طریقہ پر کتاب مصباح کو جو شیخ رشید کی تصنیف ہے، ان کی محفل میں پڑھا جاتا تھا۔ کتاب سنتے سنتے ان پر حال طاری ہو جاتا تھا۔ اسی طرح ان کے یہاں مثنوی مولوی معنوی بھی لازماً پڑھی جاتی تھی۔ شریعت پر ثابت قدم تھے۔ ان کی صحبت و گفتگو بڑی اثر انگیز ہوتی تھی۔ اگر کوئی شخص ان کی تعریف کرتا تو کہتے: "اپنے اوپر تم ہمارا بھی عکس دیکھتے ہو"۔

بدایوں میں چند ترک ان کے مرید تھے۔ ان سے ملنے وہ چند بار بدایوں تشریف لائے تھے اور بدایوں والے ان کی صحبت مبارک سے فیض یاب ہوئے۔ وہاں سے لوٹ کر جب وہ آگرہ میں مقیم تھے تو ان کا وصال ہو گیا۔

شیخ عبدالقادر

اوچہ کر شیخ عبدالقادر ثانیؒ کی اولاد میں سے ہیں۔ شیخ صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی شیخ اللہ بخش دونوں نے بڑے تقویٰ و پرہیزگاری کے ساتھ تربیت پائی۔ دونوں بڑے صاحب کمال رہے۔

کچھ عرصہ تک یہ دونوں فتح پور میں رہے۔ جس زمانہ میں نئے مذہب کی باتیں شروع ہوئی تھیں اکبر نے شیخ اللہ بخش پر مہربان ہو کر گجرات میں صدر کے عہدہ پر فائز کیا تھا نیز شہباز خان کے پاس بھیج دیا تھا۔ یہ تقرری در حقیقت ان کی جلاوطنی تھی۔ جب گجرات میں بغاوت ہوئی تو انھوں نے بڑی اچھی خدمات انجام دیں اور وہاں باغیوں کی نقل و حرکت کی اطلاع تیز رفتار قاصدوں کے ذریعہ بھجواتے رہے۔ بادشاہ نے خوش ہو کر 3 صدی کے منصب کے لیے فرمان صادر کر دیا۔ اسی زمانے میں ان کا وہاں انتقال ہو گیا۔

اکبر نے ان کے بڑے بھائی شیخ عبدالقادر کے لیے مکہ معظمہ کی طرف خارج کر دینے کا حکم جاری کیا تھا۔ جس زمانہ میں خان خانان بیرم خان اور میرزا نظام الدین احمد گجرات کے نظم و نسق پر مامور تھے، وہ وہاں تشریف لے گئے تھے۔ ان کے لیے سامان سفر درست کیا گیا اور وہ حج و زیارت کی برکت سے فیض یاب ہو کر واپس آئے۔ اب اپنے وطن لاہور میں عبادت الٰہی میں مشغول ہیں۔

شیخ ابوالمعالی

میاں شیخ داؤد کے بھتیجے، داماد اور جانشین ہیں۔ احوال و مقامات میں نہایت تیز رس اور بلند مقام رکھتے ہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز، بلکہ بزرگوں سے بھی آگے ہیں۔ اپنے پیر کی محبت میں انھوں نے خود کو بالکل ہی مٹا دیا اور ہمیشہ پیر کی اتباع میں مصروف رہے۔ خود ان کے اشعار ہیں:

ہستم از جام محبت ہمہ دم والہ و مست　　　　این و آن راچہ شناسم کہ من والہ و پرست

دل افسردہ کسی باید شگفت ہر کسی گری
دم داؤدی باید کہ آہن را دہد نرمی

بہ تخت فقر بنشینم چو حاصل گشت مقصودم
سلیمانی کنم کز جان غلام شاہ داؤدم

رباعی

یارب نظری زمین مقصودم بخش — آزادگی زبود و نابودم بخش
ہر چند یم در خور این دولت خاص — یک ذرہ ز عشق شیخ داؤد بخش

ان کی زبان پر اکثر یہ جملے رہتے تھے۔

"یا ابا المعالی، کن عبد الرب المتعالی ولا تکن عبد الدراھم دلالی"

کہتے ہیں جب یہ پیدا ہوئے تھے تو ان کو قطب الاقطاب حضرت میاں شیخ داؤد کے پاس لے کر گئے اور ان سے نام رکھنے کے لیے کہا گیا۔ حضرت میاں نے فرمایا: "ان کا نام شاہ ابو المعالی رکھو"۔ اس زمانہ میں ایسے نام ہندستان میں نہیں ہوا کرتے تھے، کیونکہ یہ مغلوں کے نام کے مشابہ تھا۔ لوگوں نے اسے مغلوں کی آمد کے لیے فال نیک سمجھا۔ چنانچہ ایک برس بھی نہیں گزرا ہوگا کہ ہمایوں ہندستان آ گیا اور اس نے اپنے محبوب ابو المعالی کو پنجاب کی حکومت عنایت کی۔

ابو المعالی کی پیدائش کی تاریخ "ابو المعالی حق پرست" سے نکلتی ہے۔ ان کے یہ شعر ان کی مستانہ وار محبت کے گواہ ہیں:

غرض از حال میگوید سخن — بی سخن این قیل وقال دیگر است
حالت عشقش بود گفتن محال — ورنمی گویم محال دیگر است

فرحتی نقد جان فدا کیش کن
دولت وصل رائگان ندہند

سخن عشق بدل ورنہ ولب را بکشا
سر این شیشہ فرو بند کہ باول نخورد

فرقِ با تمکِ انا الحق زن و از دار مترس   زانکہ منصور درین راہ رسن دار بود

آنچہ ما زان جان جانہا دیدہ و دانستہ ایم
بہر گفتن نیست بہر دیدن و دانستن است

انھوں نے مجھے [81] لاہور میں یہ رقعہ بھجوایا تھا:

''عزیزی! اس ہنگامہ پرور زمانہ میں ہر آنے جانے والے سے ہم تمہاری خیر و خیرت کے طالب رہے کہ اچانک تمہارا محبت نامہ وصول ہوا۔ اس وقت حضرت قادری کے اشعار میری روح کو بے چین کیے ہوئے ہیں۔ اس لیے مزید کچھ لکھنے سے معذور ہوں۔ سب کو ہماری طرف سے دُعا''

آن عزیزی کہ ہمہ شب بدل من گردد
خرم آن روز کہ در دیدۂ روشن گردد

سلام شوق! مولانا عبد الغفار اور شیخ عمر کا ایک ضروری کام ہے جو آپ کی ذرا سی توجہ سے پورا ہو جائے گا، اگر فرصت ہو تو ان کا کام کر دیجئے۔

مولانا جمال تلمہ

لاہور میں ان کے نام سے ایک محلہ بھی مشہور ہے۔ حاجی مہدی کے داماد ہیں۔ حاجی مہدی بہت مشہور عالم گزرے ہیں۔ مولانا جمال اوچ کے ملا اسمٰعیل کے شاگرد ہیں، لاہور میں مدرس ہیں، اپنے وقت کے بڑے عالم ہیں۔ تقریباً تمام علوم عقلی و نقلی کو انھوں نے حاصل کیا ہے۔ ذاتی طور پر نہایت ذہین، جدت طراز اور قابل جوہر ہیں۔

8 سال سے برابر درس و تدریس کا مشغلہ ہے، ان کی خوش بیانی اور تنقیح و توضیح کا بڑا شہرہ ہے۔ چنانچہ وہ معقول و منقول کسی بھی علم کی مشکل مسائل بآسانی شاگردوں کو سمجھا

دیتے ہیں۔ نہایت مہربان و شفیق استاد سمجھے جاتے ہیں۔ صلاح و تقویٰ سے آراستہ نہایت با اخلاق انسان ہیں اور قرآن کے حافظ بھی ہیں۔

شیخ فیضی کی تفسیر میں اکثر مقامات پر انھوں نے اصلاح دی ہے اور اس کی تحریر کو مربوط کیا ہے۔ اس وقت ان کی عمر پچاس(50)، ساٹھ(60) سال کے لگ بھگ ہے:

چیست بحث علم اگر تا فرق فرقد میرود
ذکر مولانا جمال الدین محمد میرود

مولانا عبدالشکور لاہوری

بڑے دانش و عالم ہیں۔ متانت فہم اور جدت طبع میں کافی مشہور ہیں۔ مشائخ سے گہری عقیدت اور حسن ظن رکھتے ہیں اور اپنے اکثر اوقات صوفیا کے اقوال کے مطالعہ میں صرف کرتے ہیں۔ ہمیشہ عبادتوں، نوافل، وظائف، دعاؤں اور تلاوت قرآن میں مشغول رہتے ہیں۔ سخی ایسے کہ جو کچھ پونجی ہوتی ہے وہ فقراء اور اہل ضرورت پر خرچ کر دیتے ہیں۔

جب علماء ابتلا و آزمائش میں مبتلا ہو گئے تھے، بادشاہ نے ان کو جلاوطن کر کے جونپور کا قاضی بنا دیا تھا جب بادشاہ نے الہ آباد کا سفر کیا اور وہ دربار میں حاضر ہوئے تو وہاں کی قضاوت کا عہدہ قاضی زادہ رومی کو جو نہایت خوش مزاج اور باکمال عالم ہیں تفویض کر دیا گیا۔ اس وقت سے مولانا عبدالشکور معزول ہیں، تھوڑی سی آمدنی پر گزر بسر کر لیتے ہیں۔ اطمینان سے علمی افادے میں مشغول ہیں۔

شیخ کبیر ولد شیخ منور

اپنے والد کے قائم مقام ہیں۔ یہ ایک صالح نوجوان ہیں جو چھوٹی عمر میں ہی بلند مدارج تک پہنچ گئے اور ایسا کمال حاصل کیا کہ بوڑھے اساتذہ سے بھی آگے ہو گئے۔ اس آخری زمانہ میں لڑکا باپ سے بہتر نکلے تو اسے بس عجوبہ ہی سمجھنا چاہیے۔

انھوں نے اکثر متداولہ علوم اپنے والد اور خسر میاں سعد اللہ بنی اسرائیل سے حاصل کیے اور ان بزرگوں سے آداب محفل اور دوستی کا سلیقہ خوب سیکھا ہے۔ بادشاہ کے مزاج

شناس ہیں۔ افیون کی بُری لت لگی ہے۔ اس کے علاوہ تکبر، جھوٹ اور شیخی کے بھی بیمار ہیں خدا ان بُری باتوں سے انھیں توبہ کی توفیق عطا فرمائے۔

جس زمانہ میں وہ بادشاہ کے حسب الحکم اپنے والد کے ہمراہ پرگنہ بجواڑہ اور شمالی پہاڑی کے دامن کی طرف گئے ہوئے تھے تو انھوں نے وہاں سے مجھے[82] یہ رقعہ لکھا تھا۔

رقعہ

"کان لی قلب اعیش بہ ضاع منی تقلبہ"

"امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہو نگے۔ جناب من ہمارا دل عبادت کدۂ خلوص میں معتکف ہے اور یہ خاکی جسم کہ اس پر خاک ہی پڑے تو بہتر۔ اس بیابان کثرت میں درندوں اور وحشیوں کے ساتھ آوارہ نہیں بلکہ ایسے گروہ کے ساتھ بندھا ہوا ہے کہ وحشی جانور بھی ان کو دیکھ کر وحشت کھا جائیں۔ سبحان اللہ! خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا ہو کر رہے گا۔ ذلیل نفس نے اب گوشۂ عافیت کی قدر جانی ہے۔

جب سے میں سن تمیز پر پہنچا اس وقت سے اب تک کہ میری عمر 40 سال ہو گئی ہے۔ میری ہمیشہ توجہ اسی جانب رہی کہ روحانی دردمندوں کی صحبت میں رہ کر اپنے نفسانی عیوب اور باطنی بیماریوں کا علاج کروں لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسی سخت بیماری میں مبتلا کر دیا کہ اب اس کا علاج خود اللہ کے سوا کسی اور سے نہیں ہونے کا۔

بہرحال اب نہ وہ صحبت روحانی حاصل ہے، نہ اطمینان قلب، وہ گوشۂ عافیت بھی اجڑ کر رہ گیا۔

آپ براہ کرم نواب فیاضی علامی فہامی کو سلام و شکریہ پہنچا دیں۔ دعاؤں میں مجھے ضرور یاد رکھیے۔ امید ہے میاں احمد صحت و سلامتی سے ہونگے مجھے اپنا مشتاق سمجھیں"۔

شیخ سعد اللہ نحوی

مشرقی ہند کے رہنے والے ہیں۔ بیانہ میں مقیم رہے اور بچپن ہی سے شیخ محمد غوث کی

خدمت سے مشرف رہے اور ان کے فیض سے دعوت اسماء کے عمل اور وظیفہ کے لیے بڑی مستقل مزاجی سے ریاضتیں کیں۔

بیانہ میں انھوں نے ایک خانقاہ تعمیر کرائی تھی جو برسوں طالب علموں اور اہل سلوک کا ملجا و ماوا بنی رہی۔ وہ لوگوں کی تلقین و ہدایت میں برابر لگے رہتے تھے۔ خاص طور سے علم نحو میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ اپنے زمانہ کے بے مثل نحوی تھے۔

70 سال تک سوائے دودھ اور جنگل کے پھل اور کھلبری کے اور چیز سے افطار نہیں کیا۔ سخاوت اور ایثار میں بھی بڑے دراز ہاتھ ہوئے ہیں۔

میں سلیم شاہ کے عہد میں اپنے نانا کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ ان سے میں نے کافیہ کے چند سبق پڑھے ہیں۔

آخری دنوں میں وہ تمام چیزوں سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ ہمیشہ ایک عالم حیرت میں ڈوبے رہتے اور ایک علیحدہ کمرے میں گوشہ نشین رہتے تھے۔ بچوں تک کو اپنے پاس نہیں بلاتے تھے۔ اسی عالم میں 989ھ/1581ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اسی خانقاہ میں دفن کیے گئے۔

کہتے ہیں جس دن ان کا انتقال ہوا تھا ایک چڑیا ان کی میت پر اچانک آکر گر پڑی۔ دیکھنے والے اس واقعہ پر نہایت حیران رہ گئے۔

شیخ نصیر الدین

ہندوآن کے رہنے والے ہیں۔ کیمیا گری میں ان کی بڑی شہرت ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ ہمایوں بادشاہ کے سفر و حضر کے رفیق و مصاحب تھے۔

جوئے کی شکست کے بعد جب ہمایوں آگرہ پہنچا تو اس نے شیخ سے کہا کہ نئے لشکر کی تیاری کے لیے روپیہ کی ضرورت ہے۔ شیخ نے تانبے کی تمام دیگیں، تھالی اور برتن جمع کرائے اور بادشاہ کے سامنے انھیں خالص سونا بنا کر دے دیا۔ اس بات کا بڑا چرچا ہوا اور دور دور تک ان کی شہرت پہنچ گئی۔

میری[83] رشتہ داری بھی انہی کے خاندان میں ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں، میں[80] نے تحقیق کی تو پتہ چلا کہ شیخ خود کیمیا کے نسخہ سے واقف نہ تھے انہیں کسی درویش نے کیمیا کے اجزاء سے بھری ہوئی ایک زنبیل دے دی تھی اس سے انھوں نے بہت سے تانبے کو سونا بنا لیا۔ جب وہ ختم ہو گئی تو سونا بنانا ان کے بس میں نہ رہا کیونکہ وہ اس علم سے واقف نہ تھے۔

میں[84] نے ان کو بیرم خان کے عہد میں میر سید رفیع الدین محدث کے بھتیجے سید شاہ میر کے مکان پر دیکھا تھا۔ بڑے با اخلاق نورانی چہرے والے بزرگ تھے۔ اسی زمانہ میں ان کا انتقال ہو گیا تھا اور حضرت ہی میں دفن کیے گئے۔

شیخ مبارک الوری

سلیم شاہ ان کو شاہ مبارک کہا کرتا تھا اور ان کی اس قدر تعظیم کرتا تھا کہ خود اپنے ہاتھ سے ان کی جوتیاں سیدھی کرتا تھا۔ وہ غالباً سید ہونے کا بھی دعویٰ کرتے تھے۔ پٹھانوں کے بیچ ان کی بڑی عزت تھی۔

جس زمانہ میں پٹھانوں کو زوال ہوا اور وہ مغلوں سے شکست کھا کر بھاگے، بعض پٹھانوں نے شیخ الاسلام فتح پوری کو اس شبہ میں کہ ان کے پاس بہت روپیہ ہے، گرفتار کرکے رنتھنبور کے قلعہ میں بھیج دیا۔ اس خبر کو سن کر شیخ مبارک الور سے پیادہ راستہ وہاں پہنچے اور شیخ سلیم کو چھڑا لیا۔

انھوں نے جب دوسری بار کعبۃ اللہ کی زیارت کی تھی تو میں[84] 16 سال کا تھا اور اس وقت اپنے والد کے ساتھ پیادہ جا کر شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ بعد میں 987ھ/1589ء میں جب کہ اکبر نے اجمیر کی آخری زیارت کی تھی اور الور کے راستے فتح پور لوٹ رہا تھا میں[84] نے دوبارہ حضرت سے ملاقات کی تھی۔

بلا شبہ وہ نہایت صاحب کمال شخص تھے۔ نہایت فیاض اور ایثار پسند آدمی تھے۔ سننے میں آیا ہے کہ حال ہی میں 90 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا ہے۔

شیخ چاپئین لدہ سوہنوی

قصبہ لدہ سوہنہ کے رہنے والے ہیں۔ یہ قصبہ میوات میں دہلی سے 18 کوس کے فاصلے پر ہے۔ وہاں ایک گرم چشمہ ہے جو گندھک کی کان سے نکلتا ہے۔ اس کا پانی سبز رنگ کا ہے اور اس سے گندھک کی بو آتی ہے۔ جاڑوں میں بھی اتنا گرم رہتا ہے کہ جسم پر ڈالا نہیں جا سکتا۔ خارش کے مریض کے لیے اس چشمہ میں نہانا مفید ہے۔ اس کی بو اور پانی کا رنگ خود بڑا ثبوت ہے کہ یہ گندھک کی کان سے نکلتا ہے۔

وہاں کا ایک اور عجوبہ ہے کہ گرمیوں کی راتوں میں اس قصبہ کے پہاڑوں میں کسی کے جلائے بغیر جگہ جگہ تھوڑی تھوڑی آگ جلتی ہوئی نظر آتی ہے۔

شیخ چاپئین حضرت عبدالعزیز دہلوی کے مشہور خلفاء میں سے ہیں۔ فقر و قناعت ان کا مسلک ہے۔ خاص خاص شاگردوں کو تصوف کی کتابیں جیسے "فصوص" اور "نقد فصوص" وغیرہ کا درس دیتے ہیں۔ آخری عمر میں شہنشاہ اکبر ان کا نہایت معتقد ہو گیا تھا اور بعض مہموں میں ان سے دعا کرائی تھی۔ اپنے محل خاص کے قریب عبادت خانہ میں ان کی رہائش کا انتظام کرا دیا تھا۔ راتوں میں ان کے ساتھ خلوت میں باتیں ہوا کرتی تھیں، لیکن جب اکبر نے ان کو "نماز معکوس" پڑھتے دیکھا تو اس کی عقیدت و ارادت جاتی رہی۔

989ھ/1581ء میں جب بستر مرگ سے جا لگے تو شیخ عبدالعزیز کے لڑکے شیخ قطب عالم کو جو فوج میں ملازم تھا، دہلی سے بلوایا اور خرقہ، عصا اور مشیخیت کا سارا سامان اس کے سامنے رکھ کر کہا یہ تمہارے والد کی امانت تھی اس کے لیے تم سے زیادہ کوئی دوسرا مستحق نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی تاریخ وفات "حقیقت فقر" سے نکلتی ہے۔

شیخ عبدالغنی بدایونی

یہ بھی شیخ عبدالعزیز کے خلیفہ ہیں۔ ترک تعلق میں اپنے وقت کے "ادہم" اور عالم تجرید میں اپنے زمانے کی "شبلی" ہیں۔

بدایوں میں وہ طالب علم ہی تھے کہ ان پر کیفیت و حال طاری ہو گیا۔ کبھی کبھی ایسا

ہوتا تھا کہ میں سبق پڑھنے کے دوران جب کہیں سے نغمہ کی آواز آجاتی تو پہروں بے ہوش ہو جاتے۔ جب ان کے ساتھی پوچھتے کہ تم نے کیا دیکھا جو یہ حالت ہوگئی؟ تو کہا کرتے تھے مجھے کچھ پتہ نہیں۔

شادی شدہ ہونے کی وجہ سے روزی کی تلاش میں دہلی آئے اور وہاں کے حاکم تاتار خاں کی خدمت میں پہنچے۔ تاتار خاں تھا تو حاکم لیکن درحقیقت نہایت خدا رسیدہ آدمی تھا۔ اس ملازمت کے دوران شیخ موصوف شیخ عبد العزیز کے مرید ہو گئے اور تمام مروجہ مشہور کتابیں ان سے پڑھیں اور تحصیل علم کے بعد برسوں سبق پڑھایا۔ درس و تدریس کے مشغلہ کے دوران ہی جذبہ باطنی اچانک جوش میں آیا اور تمام مشاغل ترک کر کے شیخ عبد العزیز کی خانقاہ میں کچھ عرصہ تک عبادت گزار درویشوں میں شامل رہے۔ بڑے مجاہدے اور ریاضتیں کیں۔ جب کمال باطنی حاصل کر لیا تو آبادی سے باہر قدمگاہ حضور اکرمؐ کے قریب ایک مسجد میں جا کر جو خان جہان کی مسجد مشہور ہے، مقیم ہو گئے۔ اگرچہ اہل و عیال اور خاندان کی بڑی ذمہ داریاں تھیں لیکن انھوں نے کل کا مسلک اختیار کر لیا اور تقریباً ایک قرن ہو چکا، اس گوشہ عزلت سے قدم باہر نہیں نکالا ہے۔

1003ھ/1594ء میں خان خاناں ان کی خدمت میں گیا اور ان سے نصیحت کرنے کی فرمائش کی۔ انھوں نے فرمایا ”حضور اکرمؐ کی پیروی اختیار کرو“۔ اس تحریر کے قریبی زمانہ ہی میں احمد صوفی، حاجی بخاری جو اس آخری دور فتن کے سر بر آوردہ اشخاص ہیں اور نئے دین الٰہی کے نومسلم ہیں:

حذر از صوفیان شہرو دیار ہمہ نا مردمند و مردم خوار
ہر چہ دادی بدست شان خوردند ہر چہ آمد ز دست شان کردند
کار شان غیر خواب و خوردن نہ ہیچ شان فکر روز مردن نہ

ان لوگوں نے اپنی بدنامی پر پردہ ڈالنے اور اپنے فسق کو چھپانے کے لیے یہ چاہا کہ شیخ عبد الغنی اور ایک دو اور بقیۃ السیف بزرگوں کو اپنا ہمنوا بنا لیا جائے، چنانچہ ان لوگوں کو دہلی سے لاہور حاضر ہونے کے لیے فرمان جاری کر دیے گئے۔ شیخ نے میرے پاس ایک

خط بھیجا جس میں انھوں نے آنے سے بڑی معذوری ظاہر کی تھی۔ میں نے احمد صوفی کو کسی نہ کسی طرح ان لوگوں کی تجویزیں سمجھائیں یہاں تک کہ اس نے ان بزرگوں کی حاضری کا خیال چھوڑ دیا اور معافی کا ایک خط لکھ کر بھیج دیا۔ اس طرح یہ معاملہ بخیر وخوبی گزر گیا۔

شیخ بہلول دہلوی

علم حدیث کے بڑے اچھے عالم تھے۔ صاحبان فقر وفنا کی صحبت میں رہے۔ چنانچہ وہ ایک عرصے سے فقر وتوکل کے راستے پر نہایت ثابت قدمی سے قائم ہیں۔ دنیا اور دنیا والوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ ہمیشہ طالب علموں کو درس دینے اور علمی فیض پہنچانے میں مشغول رہتے ہیں۔

شیخ عبدالحق دہلوی

آپ کا تخلص حقی تھا۔ علوم عقلی ونقلی دونوں سے بہرہ یاب اور ہنر وکمال کا مجموعہ تھے۔ تصوف میں بھی آپ کا بلند درجہ تھا۔ ان کی تصانیف میں ایک تو "تاریخ مدینہ سکینہ (جذب القلوب الی دیار المحبوب)" کا ترجمہ اور ہندستان کے متاخر مشائخین کرام کے حالات کا ایک مجموعہ (اخبار الاخیار فی اسرار الابرار) ہے جس کی تاریخ تصنیف "ذکر الاولیاء" سے نکلتی ہے۔

عنفوان شباب سے ہی انھیں علوم وفنون سے بڑی دلچسپی تھی۔ شیخ فیضی اور مرزا نظام الدین احمد سے قدیم روابط تھے۔ کچھ عرصے تک وہ ان لوگوں کے ساتھ فتح پور میں رہے۔ اس زمانہ میں میں "مؤلف" نے بھی ان سے استفادہ کیا تھا۔ جب دین پادشاہی کا قضیہ پیدا ہوا اور حالات بڑی حد تک تبدیل ہو گئے تو دوستی اور تعلقات میں بڑا فرق پیدا ہو گیا۔ شیخ موصوف کے بھی بعض لوگوں سے تعلقات بگڑ گئے اور انھوں نے کعبۃ اللہ جانے کا عزم کر لیا۔

جلد ہی وہ دہلی سے اس طرح روانہ ہو گئے کہ کوئی سامان سفر ساتھ نہ تھا۔ غرض کسی نہ کسی طرح گجرات پہنچ گئے۔ وہاں مرزا نظام الدین احمد نے ان کے لیے سفر کا سامان مہیا کر

دیا اور ہر طرح سے مدد کر کے جہاز پر چڑھا دیا اور وہ حجاز پہنچ گئے۔ بعض قدرتی موانعات کی وجہ سے وہ مدینہ کی زیارت نہیں کر سکے۔ چند روز مکہ معظمہ میں رہے اور شیخ عبدالوہاب ہندی خادم شیخ محدث رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث کی اجازت حاصل کرلی اور وطن واپس ہو گئے۔ یہ شیخ عبدالوہاب حاجی کے ساتھ حج سے جب آگرہ واپس آئے تھے تو میں(84) نے ان کے ہاتھ سے آب زمزم پیا تھا اور برکت کے لیے حدیث کا درس پڑھا تھا۔

شیخ عبدالحق اب اپنے حال و کیفیت کو چھپائے ہوئے علوم رسمی پڑھانے میں مشغول ہیں۔ نہایت عالی ہمت آدمی ہیں، اس لیے وہ اپنے راستہ پر استقامت و کامیابی سے بڑھتے رہیں گے۔

جن دنوں وہ مکہ شریف سے دہلی تشریف لائے تھے میں(84) حسب طلب بڑی تشویش وعجلت میں بدایوں سے بادشاہی لشکر کی طرف جارہا تھا۔ ان سے بس ایک مختصر سی ملاقات ہوئی۔ جب میں(84) لاہور پہنچ گیا تو انھوں نے ایک خط بھیجا جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

"بندگی و نیاز کے بعد جس زمانہ میں آپ دہلی تشریف لائے تھے تو مجھے کچھ دیر کے لیے ملاقات سے نوازا تھا لیکن یہ ملاقات اتنی مختصر تھی کہ شوق و اشتیاق کی پیاس بجھی نہیں بلکہ اور بڑھ گئی، بہت سی باتیں کہنے سننے سے رہ گئیں۔ آج اس دنیا میں دوستوں سے ملاقات و گفتگو کی مہلت ہی نہیں ملتی، اگر دوستی سچی ہے تو انشاء اللہ عالم مستقبل میں اطمینان سے باتیں ہوں گی۔

آج تو بس تعلقات کو درست رکھنے اور نسبتوں کو پاک رکھنے کی سعی ہی کی جاسکتی ہے ہم نشینی بس کل کے روز ہی نصیب ہوگی جبکہ جدائی اور وصال کے سارے حجاب اٹھ جائیں گے۔ بہر حال آپ مجھے فراموش نہ کریں۔ میں تو ہمیشہ آپ ہی کے خیال میں رہتا ہوں۔ مجھے کامل یقین ہے کہ آپ کے دل میں محبت و حقیقت پسندی جاگزیں ہے۔ اہل حرمین میں سے ایک بزرگ یہ دعا ہمیشہ پڑھا کرتے تھے "الھم کما انعمت فزد کما زدت فادم کما ادمت تبارک" اللہ تعالیٰ محبت و دوستی کی نعمت کو بڑھائے، برقرار رکھے اور مبارک بنائے۔ اگر کبھی آپ اپنے عنایت نامہ سے نوازیں تو حضرت شیخ کلیم اللہ کے حالات سے ضرور مطلع فرمائیں۔ چند باتیں آپ سے عرض کی تھیں، اس سلسلہ میں بھی کچھ

نہ کچھ لکھنے کا ارادہ کیا لیکن قلم نہیں چلا۔ اب اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ جب ان کا ذکر چھڑا اسے آیا تو اس نے اسی مطلب کے شعر کہے بلکہ صراحتاً لکھ دیا کہ یہ تکلف سے بعید ہے کہ اس خط کے پہنچانے کی ذمہ داری آپ بجا لائیں گے۔ والدعا۔"

شیخ فیضی دکن سے واپس آنے کے بعد حسب معمول احباب نوازی اور مجلس آرائی میں مصروف رہتا تھا اور دوستوں پر جان چھڑکتا رہتا تھا لیکن نہ معلوم کیا وجہ تھی کہ سخت پریشان اور رنجیدہ رہتا تھا۔ اس نے لاہور سے شیخ عبدالحق کو بلاوے کے چند خط لکھے لیکن ان کے دل میں فیضی کی طرف سے بڑا رنج تھا اس لیے وہ نہ آئے اور معذرت کے جواب لکھ دیئے۔ شیخ فیضی نے اس سلسلہ میں انھیں جو رقعہ لکھا تھا اس کا خلاصہ یہ ہے:

"آپ سے ملاقات کا شوق محض رسمی اور ظاہری نہیں ہے، نہ احاطۂ بیان میں آسکتا ہے۔ پہلے میں آپ کی مرضی و منشاء سے واقف نہ ہو سکا یہی گمان رہا کہ آپ بھی ملنے کے خواہش مند ہو گئے۔ لیکن بعد میں یہ پتہ چلا کہ آپ نے دوستی کی یہ راہ ہی سرے سے بند کر رکھی ہے تو میں نے بھی آپ کی مرضی کو اپنی مرضی پر ترجیح دے دی۔ خدا کرے یہ صورت حال گوارا ہو جائے۔ بس اتنا ہی کہنا ہے کہ آپ نے اپنے "خلوت کدہ تنگ" پر کسی ہنگامہ کو پسند نہیں فرمایا۔ آج سے دو تین دن پہلے نقارۃ الاولیاء میاں شیخ موسیٰ میرے ویرانے پر تشریف لائے تھے۔ ان سے معلوم ہوا کہ بعید نہیں کہ جناب انہی دنوں آ جائیں، ان سے میں نے اس کا سبب بہت کچھ دریافت کیا، لیکن گول مول جواب دے کر ٹال گئے۔ خدا کی قسم اس میں میری جانب سے کوئی اشارہ نہیں اور نہ کبھی ہوگا۔

"وقت گویا چہ حاجت طومار!"

اگر وہاں رہیں تو بھی منظور ہے اگر آ جائیں تو نور علیٰ نور۔ خدا کی قسم کہ میں نے اب یہ خواہش بالکل ہی دل سے نکال دی ہے، نہ اپنی یاد کا ذکر کیا ہے نہ اس کی طرف کوئی اشارہ اور نہ میں ایسا کروں گا، اس لیے اس بارے میں آپ زحمت نہ اٹھائیں، لیکن مجھے بال و پر ہوتے تو میں پرواز کر کے اس حجرہ کی چھت پر آ بیٹھتا اور نکات محبت کی ریزہ چینی کرتا اور والہانہ گیت گاتا۔ اب اور کیا لکھوں؟ آپ کی طرف سے ہی ساری تاخیر اور رکاوٹ

ہے۔ خدارا مجھ پر اپنے اسرار کے قافلے کی راہ تو بند نہ کیجیے۔ واضح رہے اگر یہ راستہ اس طرف سے بند ہوگا بھی تو ادھر سے بند نہیں کیا جائے گا، کھلا ہی رہے گا۔ اسکندر فقر میاں پھول کو نیاز مندی پہنچا دیجیے۔ ابھی 2 دنوں میں کسی بہانہ یہ رباعی ہو گئی تھی:

رباعی

فیض دم پیری ست قدم دیدہ بہ   ہر گام کری نہی پسند دیدہ بہ
از عینک شیشہ ہیچ نکشاید ہیچ   نختی جتراش اتواں وبردیدہ بہ"

خدا کی عجیب شان کہ آج وہ شیخ فیضی نہیں رہا۔ اب تو ان گزر جانے والوں کی صرف باتیں اور یادیں رہ گئی ہیں۔ وہ بھی کب تک، کیونکہ ہمارا[85] بھی کچھ ٹھکانہ نہیں کہ کب کوچ کر جائیں:

عنقریب است کہ از ما اثری باقی نیست
شیشہ بشکستہ وی ریختہ وساقی نیست

مولانا الہداد سلطان پوری

سندھ میں وہ قریۂ بہودہ کے رہنے والے تھے۔ مخدوم الملک کے شاگرد رہے۔ شرافت اور حسب و نسب میں نہایت ممتاز و اعلیٰ ہیں۔ ابتدا میں علم کی غرور اور جوانی کی ترنگ میں نہایت متکبر تھے لیکن اب جب کہ دنیا کا اچھا خاصا تجربہ ہو چکا ہے ان کا تکبر، فقر و انکسار میں تبدیل ہو گیا ہے۔

کچھ عرصے تک پنجاب کی صدارت کے عہدے پر فائز رہے، اب کافی عرصہ سے اللہ آباد کے نئے شہر کی تعمیر کے کاموں کے عہدے پر مقرر ہیں اور اسی پر قناعت کر لی ہے۔ دنیا والوں کے گھروں پر دوڑ دھوپ نہیں کرتے۔ بڑے نیک اور عبادت گزار ہیں۔

مولانا عثمان سامانہ

عقلیات میں حکیم الملک کے شاگرد ہیں، نقلیات دوسرے اساتذہ سے حاصل کیے۔ مولانا

بڑے مستعد آدمی ہیں۔ کیف و حال سے خالی نہیں، بڑے سمجھ دار اور نیک عالم ہیں، اکثر اوقات عبادت ہی میں صرف کرتے ہیں۔ شاہی دربار کے خادموں میں شامل ہیں۔

چند سال تک وہ قلیچ خان کے وسیلے سے دوآبہ میں پرگنوں کے انتظام و بندوبست پر مقرر کیے گئے تھے اب دربار میں بلا لیے گئے ہیں اور منصب داروں میں داخل کر لیے گئے ہیں۔

حاجی سلطان تھانیسری

مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی زیارت سے فارغ ہو چکے ہیں۔ علوم نقلی میں بڑی مہارت پیدا کی ہے۔ عرصہ تک شاہی خدمات پر مقرر رہے۔ 4 سال تک مہابھارت کے ترجمہ میں جو "رزمنامہ" کے نام سے موسوم ہے تنہا بڑی مستقل مزاجی سے مصروف ہیں۔ اس کا آغاز نقیب خاں سے ہوا تھا اور تکمیل انھوں نے کیا۔

ان کے پرگنہ کے ہندوؤں نے چغلی کھائی کہ حاجی سلطان گاؤکشی کے جرم میں مبتلا ہیں۔ بس بادشاہ نے ان کو جلاوطن کر کے بھکّر کی طرف بھیج دیا۔ اس زمانہ میں صوبہ بھکّر کا نظم و نسق خان خانان کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے بڑی مہربانی اور شفقت سے کام لیا اور جلے دل پر مرہم رکھنے کی کوشش کی۔ جب وہاں کی فتوحات سے فارغ ہوا تو ان کو اپنے ساتھ دربار لایا اور معافی و رہائی کے لیے بادشاہ سے کہا جو قبول کر لی گئی اور حاجی کا معاملہ اللہ نے ٹھیک کر دیا۔ شیخ ابوالفضل کو بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو تھانیسر و کرنال کا کروڑی بنا دیا جائے، اب بھی وہ اسی خدمت پر مقرر ہیں۔

جس زمانہ میں وہ مہابھارت کا ترجمہ کر رہے تھے، کسی نے پوچھا یہ تم کیا لکھ رہے ہو؟ انھوں نے کہا: "10 ہزار سال پرانی خرافات کو مروجہ زبان کے پیکر میں اتار رہا ہوں"۔

سید شاہ میر سامانہ

صحیح النسب سید ہیں۔ فضائل علمی سے آراستہ اور تقویٰ و زہد سے آراستہ، نہایت متوکل و قانع عالم تھے۔ دریائے جمنا آگرہ کے اس پار طالب علموں کو پڑھانے میں مصروف رہتے

تھے۔ شیخ بہاء الدین مفتی مرحوم کے پڑوس میں رہتے تھے۔ ان کی خانقاہ میں بہت سے عالم اور صوفی رہتے ہیں اور ان سے استفادہ کرتے ہیں۔

ان کا ایک خادم مولانا فرید نامی، کاتا تھا اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے کبھی علم حاصل نہیں کیا تھا لیکن اس سے کوئی بھی مشکل مسئلہ یا دقیق و گہری بحث کسی بھی بڑی سے بڑی کتاب میں سے دریافت کی جائے تو وہ گھڑی بھر میں دوات و قلم لے کر اس مسئلہ کو تحریری صورت میں حل کر کے رکھ دیتا تھا اور عجیب بات یہ ہے وہ جو کچھ لکھتا تھا خود اسے پڑھ نہیں سکتا تھا یا زبانی طور پر اس کو بیان نہیں کر سکتا تھا۔ شیخ ضیاء اللہ جن کا تعلق سلسلہ غوثیہ سے تھا اُن کے معتقد تھے تو پھر سید مشار الیہ کا کیا ذکر؟ اس کے متعلق یہ بھی سننے میں آیا کہ اس نے ایک رات مشرق یا مغرب میں ہونے والے کسی واقعہ کی اطلاع سید شاہ کو دی تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ کوئی جن اس نے مسخر کر رکھا ہے بعض کچھ اور کہتے تھے۔

جس سال بادشاہ نے شیخ ضیاء اللہ کو آگرہ بلا کر عبادت خانہ میں ٹھہرایا تھا اور علماء و مشائخین کا کافی بڑا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔ میں[86] نے ایک رات خلوت میں شیخ سے فرید کاتب کے متعلق دریافت کیا اور اس کے متعلق جو باتیں مشہور تھیں بیان کیں اور ان سے پوچھا کہ کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟ شیخ نے پہلے تو اپنے مفردات، مولفات اور فضائل و کمالات اور ذاتی حالات بیان کیے، پھر کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ جو ساری نعمتیں عطا کر رکھی ہیں ان سب کے باوجود میں شیخ فرید کی خوشہ چینی کے بھی لائق نہیں ہوں اور جو کچھ تم نے اس کے بارے میں سنا ہے وہ عشر عشیر بھی نہیں ہے اس کا درجہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے اور یہ سب اس کو حضرت میر مشار الیہ کے آستانہ کی جاروب کشی کی بدولت نصیب ہوا ہے۔

اس واقعہ سے پہلے میں[86] نے سید شاہ میر کو بدایوں میں جہاں وہ مدد معاش کے سلسلہ میں آئے تھے، دیکھا تھا۔ کتاب "مشارق الانوار" سامنے رکھی ہوئی تھی اور علمی مذاکرہ گرم تھا۔ بلاشبہ وہ جدت پسند طبیعت اور ذہین شخصیت کے مالک تھے۔ لیکن جس قدر کہ شیخ ضیاء اللہ اور دوسرے آدمی ان کی تعریف کرتے ہیں۔ میں نے ان کو اس درجہ کا نہیں

پایا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے، غالباً انھوں نے اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کی ہوگی۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ جس چیز سے کسی کو محروم رکھا گیا ہو وہ کسی اور کو بھی نہ ملے۔

سید نیسین

سید شاہ میر کے چچیرے بھائی ہیں۔ اکثر درسی کتابیں گجرات میں میاں وجیہ الدین سے پڑھی تھیں۔ علوم رسمی کی تحصیل کے بعد میاں صاحب کے مرید ہو گئے اور حج کے لیے چلے گئے۔ وہاں حدیث کا علم حاصل کیا اور اجازت حاصل کر کے ہندستان واپس آئے۔ کچھ عرصہ تک لاہور میں امراء اور حکام کی صحبت میں رہے۔ پھر انھوں نے یہ تعلقات ترک کر دیے اور درویشی کا لباس پہن کر سرہند میں بقیہ عمر گزار دی۔ اپنے چند نیلے پوشاک والے خادموں کی بڑی اچھی تربیت کی، وہ پیشوائی میں صاحب اِدعا تھے۔

ہمیشہ گجرات اور پھر وہاں سے حرمین شریفین جانے کی آرزو کرتے رہتے تھے۔ سرہند میں بھی زیادہ عرصہ ٹھیر نہ سکے اور بنگالہ چلے گئے۔ اب وہیں سیر و سیاحت میں لگے ہوئے ہیں نہ معلوم ان کا کیا انجام ہونا ہے اور وہ کس سرزمین کا پیوند بننے والے ہیں؟

شیخ ضیاء اللہ

شیخ محمد غوث کے جانشین ہیں۔ تصوف میں جو انداز بیان ان کا ہے صوفیاء میں کم ہی کسی کا رہا ہوگا۔ ان کی محفل میں ہمیشہ معرفت و حقیقت کی ہی باتیں کرتے تھے۔ ان باتوں کا موضوع ہمیشہ توحید اور وحدت ہی کا مسئلہ ہوتا تھا۔ ان کے باطن کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ آخر کون سا داعیہ اپنے سینہ میں چھپائے ہوئے تھے؟

پہلے پہل جب ان کے فضائل کا شہرہ بلند ہوا تو میرے سننے میں آیا کہ شیخ اپنے والد کی مسند فقر و ارشاد پر جانشین ہو گئے ہیں بلکہ بعض پہلوؤں سے وہ ان پر بھی فضیلت رکھتے ہیں۔ قرآن شریف کے بھی حافظ تھے اور اس کی تشریح و توضیح کرتے تو کسی تفسیر سے مدد لینے کی ان کو ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

970ھ/1562ء میں ان سے ملاقات کے لیے میں[86] آگرہ گیا اور کسی واقف کار کو وسیلہ اور ذریعہ بنائے بغیر بے تکلفی اور سادگی سے جس کا میں مدت سے عادی تھا سلام علیک کہہ کر مصافحہ کیا: کیونکہ میرا یہ خیال ہے کہ بزرگوں سے ملاقات کے لیے دنیاوی تکلفات برتے جائیں تو یہ حصول مقصد میں آڑ بن جاتے ہیں۔ شیخ کی محفل میں بھی تعظیم وتکریم کے مراسم کا لحاظ رکھا جاتا تھا اس لیے ان کو میری[86] بے تکلفی کچھ پسند نہ آئی۔ اہل محفل نے مجھ سے پوچھا: ''آپ کہاں سے آرہے ہیں؟'' میں نے جواب دیا: ''بسوان سے''۔ پھر پوچھا گیا: ''تم نے کچھ پڑھا لکھا بھی ہے؟'' میں نے جواب دیا: ''عرصہ پہلے ہر فن کی کچھ نہ کچھ تحصیل کی ہے''۔

بسوان ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اس وقت وہاں ان کے باپ کا مرید قلیج چوگان بیگ جاگیردار تھا، اس لیے شیخ نے مجھے کوئی اہمیت نہ دی اور طنز واستہزا کرنے لگے۔ ایک مسخرے کو اشارہ کیا کہ مجھے تنگ کرکے محفل سے اٹھا دے۔ میں مشائخ کی ایسی اداؤں کو خوب جانتا تھا اور بارہا ایسے مواقع پیش آئے تھے۔ میں[86] ان باتوں سے انجان بنا رہا۔

وہ مسخرہ ہزل کرنے لگا کہ: ''کہیں سے عطر کی مہک آرہی ہے جس سے میرا دماغ جوش کھانے لگا ہے۔ اہل محفل ہوشیار رہیں تاکہ کسی کو میرے ہاتھوں کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے''۔ یہ کہتے ہوئے اپنے منھ سے کتے کی آواز نکالنے لگا۔ ان کے ایک صوفی نما مصاحب نے مجھ سے پوچھا: ''یہ عمدہ عطر کیا تم نے لگا رکھا ہے؟'' میں[86] نے کہا: ''ہاں لیکن بات کیا ہے؟'' اس نے کہا: ''یہ جو باؤلا شخص ہے اس کو کسی وقت کتے نے کاٹ کھایا تھا جس وقت بھی وہ خوشبو سونگھ لیتا ہے کتے کی آواز منھ سے نکالنے لگتا ہے اور کتے کی طرح بھونکتے ہوئے لوگوں کو کاٹنے دوڑتا ہے۔ آپ ذرا ہوشیار رہیے۔'' یہ سن کر حاضرین پریشان سے ہو گئے۔ شیخ بھی مجھے ڈرانے کے لیے اس سے ڈرنے کا دکھاوا کرنے لگے۔ اور اس طرف ہٹ گئے جدھر نئی عمارت بن رہی تھی۔ اس طرح انھوں نے ان انسان نما شیطانوں کی حوصلہ افزائی کی۔

اس موقع پر میں[86] نے کہا: ''بڑی حیرت ہے کہ اس بارگاہ عالی پر لوگ بڑی دور

دور سے اپنی ضرورت پوری کرانے آتے ہیں اور یہاں ایک کتے کے کاٹے انسان کا علاج نہیں ہو سکتا۔" انھوں نے کہا: "کیا تم اس کا علاج جانتے ہو؟" میں[رح] نے کہا: "ہاں" وہ کیا علاج ہے؟" میں نے کہا: "اس کے سر پر پتھر اور جوتے مارے جائیں تو اچھے آپ ٹھیک ہو جائے گا۔ چنانچہ شیخ سعدیؒ نے فرمایا ہے:

سگ دیوانہ را دارو کلوخ است

(پاگل کتے کا علاج ڈھیلا ہے)

میری[رح] بات سن کر سب دنگ سے ہو کر رہ گئے۔ پھر میں نے کہا: "ڈھیلا پتھر، ایک ہوئی ماننے بھی ہے جو کتے کا ٹنے کی موثر دوا ہے"۔ شیخ نے جب دیکھا کہ یہ حیلہ کارگر نہیں ہوا تو کہا: "آؤ اللہ رسول کے ذکر میں مشغول ہو جائیں"۔ پھر انھوں نے کلام پاک کھولا اور سورۂ بقرہ کی ایک آیت کی تفسیر شروع کر دی اور طرح طرح کی لچھے دار باتیں بیان کرنے لگے۔

شیخ جو بھی الٹی سیدھی بکواس کرتے جاہل شاگرد اس پر ہاں کہہ دیتے۔ میرا دل تو ان کی طرف سے بھرا ہوا تھا اس لیے میں نے قصداً ٹوک دیا اور ان سے پوچھا: "یہ مطلب جو آپ بیان کر رہے ہیں کسی اور تفسیر میں بھی ہے؟" کہنے لگے: "میں تو یہ تاویل و اشارہ کے طور پر بیان کر رہا ہوں، ویسے یہ مضمون بہت وسیع ہے"۔ میں نے کہا: "اچھا تو پھر یہ بتائیے یہ مطلب حقیقی ہے یا مجازی؟ انھوں نے جواب دیا "مجازی" میں[رح] نے کہا ان دو حقیقی و مجازی مطلبوں میں کونسا علاقہ ہے؟ اس طرح میں نے ان کو علم بیان کی بحث میں الجھا دیا۔ انھوں نے بہت الٹی سیدھی باتیں کیں اور ہر طرف دوڑ لگانے لگے اور جب میں نے ان کو نہ چھوڑا تو بس گھبرا گئے۔ قرآن کو پٹک کر کہنے لگے: "میں نے علم جہل نہیں پڑھا ہے"۔ میں نے کہا: "آپ قرآن کا ایک ایسا مطلب بیان کرتے ہیں جو کسی اور جگہ نہیں ملتا ہے اور جب آپ سے حقیقی اور مجازی مطالب کا باہمی رابطہ علاقہ دریافت کیا جاتا ہے" شیخ نے دیکھا کہ کسی طرح بات بنانا مشکل ہے تو بات کو ادھر ادھر پھیر کر بکھر گئے۔ مجھ سے سوال پوچھنے لگے میں[رح] نے ایک غزل قصیدہ بردہ بلکہ حقیقی، اس کا

ایک باب میں نے شیخ کے سامنے رکھ دیا اور قصیدہ کے مطلع کے سلسلہ میں جو نکتے میرے ذہن میں آئے تھے، بیان کیے، بڑی تعریف کی اور خود بھی اس بارے میں چند نکات بتائے۔ ان سے پہلی ملاقات کا تو یہ رنگ تھا۔ دوسری ملاقات اس وقت ہوئی جب کہ میں[86] اکبر بادشاہ کی ملازمت میں تھا اور شیخ حسب طلب حیران و پریشان تھا عبادت خانہ شاہی میں آکر ٹھہرے ہوئے تھے۔

جمعہ کا دن تھا کہ بادشاہ پہلے ایک دو آدمیوں کے ساتھ وہاں تشریف لے گئے۔ میرزا غیاث الدین، علی آخوند، میرزا آخوند اور میرزا علی آصف خان کو کہہ رکھا تھا کہ شیخ کو بحث میں الجھا کر تصوف کا مطلب دریافت کرو، دیکھیں وہ کتنے پانی میں ہے؟ چنانچہ آصف خان نے گفتگو شروع کی اور "لوائح" کی یہ رباعی پیش کی:

گر در دل تو گل گزرد گل باشی　　　　در بلبل بیقرار بلبل باشی

تو جزئی وحق کل است اگر روزی چند　　　　اندیشہ کل پیشہ کنی کل باشی

اور پوچھا کہ: "اللہ تعالیٰ کو کل کس طرح کہا جا سکتا ہے جب کہ وہ جز اور کل ہونے سے برتر و اعلیٰ ہے"۔

شیخ تباہ حالی کے بعد دربار میں آئے تھے، ان کا سارا غرور پندار خاک میں مل چکا تھا اور بڑی مصیبتیں جھیل چکے تھے، نہایت عاجز و شرمندہ تھے اس لیے انھوں نے ایسے دھیمے لہجے میں کچھ باتیں کہیں جو کسی کی سمجھ میں نہیں آئیں مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں نے جسارت کر کے کہا مولوی جامیؒ نے اگرچہ اس رباعی میں اللہ تعالیٰ پر "کل" ہونے ہی کا اتفاق کیا ہے، لیکن ایک اور رباعی میں جزئیت بھی بیان کی ہے:

این عشق کہ ھست جزء لاینفک ما　　　　حاشا کہ شود بہ عقل ادرک ما

خوش آنکہ دمد پرتوی از نور یقین　　　　ما را برہا ند از ظلام شک ما

لیکن اس کل ہونے اور جز ہونے کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ جز ہو یا کل سب کچھ وہی ہے اور اس کے علاوہ دوسرا کوئی وجود حقیقت میں نہیں ہے۔ دراصل اس کی اصل حقیقت کو عبارت میں نہیں لایا جا سکتا اس لئے اس کی تعبیر کبھی کل سے کبھی جز سے کی

جاتی ہے۔ پھر میں[86] نے وحدت وجود کو ثابت کرنے کے لیے اور چند مسائل جن پر میں[86] نے ان دنوں عبور حاصل کیا شیخ کی طرف سے تائید اً بیان کیے۔ میری[86] اس تقریر پر بادشاہ بہت خوش ہوئے۔

انہی دنوں شیخ کے سوتیلے بھائی شیخ اسمٰعیل نے جو فتح پور کے محلہ خواجہ جہان میں میری قیام گاہ سے قریب ہی رہتا تھا اور ہماری آپس میں جان پہچان اور ملاقات تھی اس نے عبادت خانہ میں تخلیہ کرا کے میری اس ملاقات کو یاد دلایا جو 11 سال پہلے شیخ سے ہوئی تھی اور جس کا ذکر اس نے میری زبانی سن لیا تھا۔ یہ سن کر شیخ حیران رہ گئے اور کہا "مجھے یاد نہیں کہ ایسا کبھی ہوا ہوگا"۔

شیخ اب آگرہ میں اپنے باپ کی طرح مشائخانہ وضع میں عیش و آرام سے بسر کر رہے ہیں، ان کی محفلوں میں مذہبی دکانداری کا رنگ ہے، اپنی پرانی حالت پر قائم ہیں۔ ان کی عام فریب سادہ لوحی کے بڑے قصے مشہور ہیں جن کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں۔

میر ابو الغیث بخاری کہا کرتے تھے وہ جیسا کچھ بھی ہوا کرے لیکن وہ درویشانہ لباس، فقیرانہ مجلس اور تصوف کی باتیں کرنے کا اہتمام کرتا ہے اور اپنی روش پر استقامت سے قائم ہے بس اس کی ان اداؤں پر ہم دل و جان سے نثار ہیں۔ جس سال کہ خان زمان کی مہم میں کامیابی حاصل ہوئی وہ لشکر کے ہمراہ امیٹھی گئے تھے وہاں حضرت میاں شیخ نظام الدین سے ملاقات کی، وہ آیت کریمہ۔ "ویسقون فیھا کاساً کان مزاجھا زنجبیلا عینا فیھا تسمی سلسبیلا" کی تفسیر بیان کر رہے تھے۔ شیخ نے اپنی حیثیت ظاہر کی اور مداخلت کر کے کہا۔ "اس آیت میں اور ایک دوسری آیت فرق ہے"۔ حضرت نے فرمایا: "سبحان اللہ باپ تو وہاں غوطے کھا رکھا ہے، شفاعت کامل کا محتاج ہے اور بیٹا یہاں اللہ تعالیٰ کے کلام میں تناقض ثابت کر رہا ہے":

"دری خود ہر آنچہ در سینہ بود"

میر ابو الغیث بخاریؒ

یہ بڑے پاک مشرب، عالی ہمت بزرگ تھے۔ انکے اخلاق، فرشتوں کے اخلاق کے مانند

تھے۔ فنا کے پردے میں فقر کی جھلک صاف دکھائی دیتی تھی۔ انھوں نے بہت سے علماء و مشائخین سے استفادہ کیا تھا۔ سخاوت، بخشش، آزادہ روی، حسن معاشرت، صدق معاملت اور میل ملاپ میں اللہ کی کھلی نشانی تھے۔ احکام شریعت کی پابندی اور صوفیائے سلف و خلف کی پیروی پوری طرح کیا کرتے تھے۔ سنت اور نماز باجماعت سے ایسا شغف تھا کہ جب وہ موت کے قریب تھے اس وقت بھی تکبیر تحریمہ ان سے چھوٹنے نہ پائی۔ ان کی مجلس بھی اللہ اور رسول ﷺ کے ذکر نیز بزرگوں کی باتوں سے خالی نہیں رہی۔

ان کی تاریخ وفات "میر ستودہ سیر" ہے۔

میاں کمال الدین حسین شیرازی

احباب کے تذکرے نے میرے دل کو کھول دیا ہے۔ ان کے ذکر میں اگر طوالت ہو تو عزیز قارئین تنگ دل نہ ہوں۔

میاں کمال الدین حسین مولانا حسن شیرازی کے لڑکے ہیں۔ جس وقت شاہ اسمٰعیل نے نکال باہر کیا تھا تو وہ شیراز سے مکہ معظمہ چلے گئے تھے پھر وہاں سے گجرات پہنچے اور سلطان سکندر لودی کے زمانہ میں سید رفیع الدین محدث اور میاں ابوالفتح خراسانی کے قافلہ کے ساتھ آگرہ آئے اور اس جگہ بس گئے۔ شیخ زین الدین خوافی مشہور شاعر نے مولانا حسن کی شان میں کہا ہے:

هست شعر من ز عقل و نقل خواہم بشنود
جامع المعقول والمنقول مولانا حسن

مولانا حسن کے صاحبزادے میاں کمال الدین حسین نہایت فرشتہ خصلت انسان ہیں۔ ان کے اخلاق حمیدہ اور صفات پسندیدہ کا ذکر تحریر و تقریر سے بالاتر ہے۔ اکبر ان کی بزرگی اور بڑائی کے پیش نظر اس بات کا خواہاں تھا کہ وہ بادشاہی ملازمت میں رہیں۔ لیکن انھوں نے قبول نہ کیا اور دنیاوی اعزازت سے منھ پھیر کر مختصری مدد معاش کی زمین پر صبر کر لیا۔ فقر و ایمان کو اپنا سرمایہ بنا لیا۔ وہ ہمیشہ عبادت و اطاعت میں مصروف رہتے تھے

اور بڑے اطمینان و بے فکری کے ساتھ کبھی دہلی میں اور کبھی آگرہ میں رہا کرتے تھے۔

لڑکپن سے بڑھاپے تک عبادات،، ذکر الٰہی، تلاوت کلام پاک برابر ان کا معمول رہا، کبھی اس میں فرق نہیں آیا۔ ان فضائل و کمالات کے علاوہ علمی استعداد بھی بہت اچھی تھی۔ شاعری، خوش خطی، حسن املاء اور انشاء پردازی میں بھی باکمال تھے۔ ابتدائی عمر میں جب میں بیرم خاں کے عہد میں آگرہ آیا تھا تو میرا سب سے پہلا قیام مسجد فیض بخش میں انھی کے مکان پر رہا تھا۔ اس دوران میں نے ان کے آستانے سے بڑی سعادتیں حاصل کیں اس وقت سے اب تک کہ میں[86] یہ سطریں لکھ رہا ہوں پورے 40 سال گزر چکے ہیں۔ اس طویل مدت میں انھوں نے تعارف و آشنائی کی ہمیشہ رعایت برتی اور میرے ساتھ برابر مہربانی اور دلسوزی سے پیش آتے رہے۔ ان کی اتنی مہربانی ہے کہ اب مزید اضافہ کی گنجائش ہی نہیں رہی:

بس عشق کہ آں کم شد و بس حسن کہ آں کاست
عشق من و حسن تو ہماں بلکہ فزون ہم

انھوں نے مجھے لکھا تھا:

"ان دنوں جب کہ بندوں کی خدائی کا دور دورہ ہے، محبت و دوستی اٹھ چکی ہے، میں تنہائی اور جدائی کے غم میں مضطرب و بے چین رہا۔ بے قراری میں کبھی دہلی چلا جاتا اور وہاں کے مزاروں کی زیارت میں لگا رہتا۔ کبھی اپنے بے سہارا بچوں کو دیکھنے کے لیے آگرہ چلا آتا۔ اسی افراتفری میں تھا کہ تمہارے متعدد خط یکے بعد دیگرے پہنچے۔ خدا گواہ ہے کہ تمہارے خطوط سے بڑی تسلی اور تسکین حاصل ہوئی۔ چند دن تک ان خطوط کو بار بار پڑھتا رہا اور صبح و شام تمہارے لیے دعائیں کیں:

الٰہی تا قیامت زندہ باشی

مکرم و محترم میرزا نظام الدین احمد کی رحلت کی خبر سن کر نہایت ملال اور رنج ہوا۔ "انا للہ و انا الیہ راجعون" مرحوم خوبیوں کا مجموعہ اور نادر روزگار تھے۔ بس کیا کہا جا سکتا ہے یہ جو صدمے مسلسل اور متواتر پہنچ رہے ہیں ان کا ذکر ہم آخر کس سے کریں۔ اب ہم

اپنی موت کے منتظر بیٹھے ہیں کہ بجز اس کے کوئی چارہ نہیں۔ ہمیشہ یہ دعا زبان پر رہتی تھی۔

"اللّٰھم ارحمنا اذا عرق الجبین و کثر الانین ونسی منا الطبیب ویکی علینا الحبیب اللّٰھم ارحمنا اذا ادارنا التراب و دعنا الاحباب و فارق النعیم وانقطع عنا النیھم"

امید ہے کہ آخرت اچھی ہوگی اور دنیا سے ایمان سلامت لے جائیں گے۔ خط کی روانگی میں عجلت تھی اس لیے میں نے رات بڑی جلدی میں یہ چند سطریں لکھی ہیں۔ تمہارے ساتھ جو دلی اشتیاق ہے وہ بہر حال حد بیان سے باہر ہے بس اس کو تم اپنے دل ہی سے محسوس کر سکتے ہو الفاظ سے اسے محسوس نہیں کرایا جا سکتا۔"

شیخ ابوالفتح تھانیسری

اپنے زمانہ کے بڑے متبحر اور بلند مرتبت عالم تھے۔ حدیث کا علم مولانا سید رفیع الدین محدث سے حاصل کیا تھا۔ میر صاحب ہی کے محلہ میں، آگرہ میں تقریباً 50 سال تک عقلی و نقلی علوم کا درس دیتے رہے۔ ان کے درس کی بدولت بڑے ہی ذہین اور صاحب علم پیدا ہوئے ہیں۔ میں(86) اور میاں کمال الدین حسین نے بھی ان بزرگوار کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا ہے۔

ان کا لڑکا شیخ عیسیٰ اب آگرہ میں مفتی کے عہدے پر مقرر ہے۔

مولانا عثمان بنگالی

پرانے بزرگوں میں سے تھے، سنبھل میں آکر مقیم ہو گئے تھے۔ میاں حاتم سنبھلی نے بھی ان سے پڑھا ہے۔ کبھی کبھی وہ مولانا عثمان کی خدمت میں جاکر ان سے دعا کی درخواست کرتے تھے۔

میں(86) بھی لڑکپن میں میاں مرحوم کے ساتھ مولانا مذکور کی خدمت میں حاضر ہو کر سعادت اندوز ہوا کرتا تھا۔ بڑے خدا ترس بزرگ تھے۔

شیخ حسین بوھری

بڑے درجہ کے عالم تھے۔ دہلی کے مدرسہ میں طالب علموں کو پڑھانے میں مصروف رہتے تھے۔ ہندستان میں جو علوم نقلی مروج و مشہور ہیں ان میں ان کے مقابلہ کا کوئی نہیں تھا۔ وہ سب سے ممتاز و سر برآوردہ تھے ساتھ ہی نہایت با اخلاق آدمی تھے، علم و اخلاق کے سارے محاسن ان کی شخصیت میں جمع تھے۔

مولانا اسمٰعیل عرب

شیخ حسین کے ہم عصر اور ان کے ہم پلہ عالم تھے۔ خاص طور سے علم ہیئت، حکمت اور طب میں تو ان کا کوئی نظیر نہیں تھا۔ شیخ حسین کے ساتھ درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے۔ ان کے فیوض سے طالب علم پوری طرح استفادہ کرتے رہتے تھے۔

مولانا کافی مالدار آدمی تھے۔ شہر کے بعض شریر لوگوں کے اشارہ پر چوروں نے ان کے گھر ڈاکہ ڈالا اور انھیں شہید کر دیا۔

قاضی مبارک گوپاموی

علم کے اونچے مدارج پر ان کا مقام تھا۔ قضاوت کے عہدہ میں بڑی دیانتداری اور نکتہ رسی سے کام لیتے تھے۔ علوم کی تحصیل اور اخلاقی تربیت میاں شیخ نظام الدین امیٹھی والی کی خدمت میں حاصل کی تھی۔ میاں صاحب نے انھیں اپنی نگرانی میں رکھ کر تربیت دی تھی۔

جب بھی قاضی مبارک میاں صاحب سے کہتے کہ: "اگر مسلک ولایت میں سے بھی کچھ برکتیں مجھے عنایت ہو جائیں تو کیا حرج ہے؟" میاں صاحب ان کو جواب دیتے: "قاضی مبارک! تجھے تو دنیا بھی ملے گی اور آخرت بھی!"

قاضی مبارک آخر عمر تک بڑی عزت و تکریم کے ساتھ بسر کرتے رہے اور دنیا سے محترم و معزز ہی اٹھے۔ قاضی مبارک سے استفادہ کے لیے دور دراز سے لوگ گوپامو آتے تھے، بہت سے لوگوں نے تو اسی جگہ زندگی بسر کرنا شروع کر دیا تھا اور ان کے فیض

سے درجۂ کمال تک پہنچے تھے۔ ان کے دامنِ تربیت سے فیض یاب ہونے والوں میں مخدوم بدھ بھی ہیں جو اکثر درسی کتابوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ ایک دوسرے معلم سید محی الدین بھی ان کے شاگرد ہیں۔ ان کے شاگردوں کا یہ قافلہ اپنے ٹھکانے پہنچ چکا ہے۔ اب ان کا کوئی قائم مقام نہیں رہا۔

علم کا میدان تو اب روز بروز شیروں سے خالی ہوتا جا رہا ہے اور ان کی جگہ روباہ (لومڑی) صفت لوگوں نے لے لی ہے۔ "مشارق الانوار" کے مصنف نے بھی یہ فریاد اپنے زمانہ میں کی تھی کہ "لولا تخلص الغاب عن وسامة ذی الشبین لما صبح بها نقالة ابو لحصین"۔

حسین ناقہ ماند مسکین حسن را
ازان روز ترسم کہ این ہم نماند

مولانا ویس گوالیاری

بڑے دانشور اور مناظرہ و مجادلہ کرنے والے عالم تھے۔ اصول و فروع کے مباحث میں ان کی ٹکر کا کوئی نہ تھا۔ حافظہ کا یہ عالم تھا کہ بحث مباحثہ کے وقت جب کسی عبارت کو نقل کرنے کی ضرورت ہوتی تو کتاب کے صفحوں کے صفحے زبانی پڑھتے چلے جاتے اور کہتے یہ عبارت فلاں کتاب میں ہے کھول کر دیکھ لو۔ اس کے بعد وہ اپنے حریف کے سر ہو جاتے اور اسے الزامات کی زد پر رکھ لیتے، لیکن اکثر ایسا ہوا کہ جب کتابوں میں حوالے کی کھوج کی گئی تو وہ عبارت کہیں نہیں ملی۔ اسی طرح انھوں نے ایک دن بادشاہ کے سامنے مولانا الیاس منجم کو بھی جو ہمایوں بادشاہ کے استاد اور رصد و نجوم کے ماہر تھے۔ الزام لگا کر نیچا دکھا دیا۔ مولانا الیاس کو اس بات کا اتنا رنج ہوا کہ لکھنؤ کی سرکار میں موہان کے قصبہ میں ان کی جاگیر تھی، اس جاگیر کو چھوڑ دیا۔ سپاہ گری پر دو حرف بھیجے اور کوچ پر کوچ کر کے گجرات چلے گئے اور وہاں سے مکہ معظمہ پہنچے۔ جب وہ عراق، آذربائیجان، اردبیل کے سفر میں پہنچے جہاں ان کا وطن بھی تھا تو شاہ اسمٰعیل ثانی کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا جو

بہت مشہور ہے۔ مولانا الیاس جب اردبیل پہنچے تو اس وقت شاہ طہماسپ نے اسمٰعیل کو قہقہہ کے قلعہ میں قید کر رکھا تھا۔ مولانا نے اس کے نام ایک رقعہ لکھا کہ سیاروں کے حساب سے مجھے اس کا علم ہوا ہے کہ تمھیں فلاں مہینے رہائی مل جائے گی اور اس چاہ ندامت سے نکل کر مسند عزت پر قدم رکھو گے اور تخت سلطنت پر جلوس کرو گے۔ جیسا انھوں نے کہا تھا ویسا ہی ہوا۔ کچھ ہی عرصہ بعد شاہ طہماسپ کو زہر دے کر مار ڈالا گیا اور عراق میں بڑا انقلاب رونما ہو گیا۔ امیروں اور وزیروں نے شاہ اسمٰعیل کو قید خانہ سے نکال کر اردبیل کے راستے تخت نشینی کے لیے لے گئے۔ مولوی الیاس نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ جب تم قہقہہ سے اردبیل پہنچو تو مجھ سے لازماً ملنا تاکہ بالمشافہ بعض ضروری امور طے کر لیے جائیں اور اسمائے عظمیہ کا عمل روبرو انجام دیا جائے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ شاہ اسمٰعیل کو وہاں سے عجلت میں گزرنا پڑا اور وہ مولوی موصوف کے گھر پر نہ جاسکا۔ اردبیل سے روانہ ہونے کے بعد وہ لوٹ کر آیا اور مولوی الیاس سے ملنا چاہا لیکن انھوں نے مکان کا دروازہ بند کر لیا اور ملاقات کی اجازت نہیں دی۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد بادشاہ نے مجبوراً دروازہ توڑ دیا اور زبردستی ان کے حجرہ میں گھس کر ملاقات کی۔ بادشاہ کے آنے پر انھوں نے اپنا چہرہ چھپا لیا اور دیوار کی طرف رُخ کر کے کہا وہ مقررہ گھڑی گزر گئی اور تو نہیں آیا، اب میں تیرا چہرہ دیکھنا نہیں چاہتا۔ شاہ اسمٰعیل مایوس لوٹ آیا۔ اگرچہ سلطنت اس کی جم جا گئی لیکن ایک ہی سال بعد امیروں نے متفق ہو کر اس کی بہن پری جان خانم کو اس کے قتل پر مقرر کیا، اسے بھی اس کا پتہ چل گیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ کوئی تدبیر کرتا پری جان خانم نے اس کو بیہوش کر دیا اور دروازہ بند کر دیا۔

شیخ محمد شامی

نسلاً عرب ہیں اور شیعوں کے بڑے مجتہد شیخ زین الدین جبل عاملی کے بھتیجے ہوتے ہیں۔ شیخ زین الدین کو خلیفہ روم نے بڑے حیلہ و تدبیر سے مکہ معظمہ میں گرفتار کرا کے استنبول بلوایا اور قتل کرا دیا تھا۔

شیخ محمد منصب داروں میں شامل ہیں۔ بہادر اور شجیع آدمی ہیں، عربوں کی روایتی سخاوت بھی ان میں موجود ہے۔ نہایت متواضع اور با اخلاق بزرگ ہیں۔ عربی اور ادبی علوم میں ان کو ایسی مہارت حاصل ہے کہ شاید ہی کسی کو ہو۔

شیخ حسن علی موصلی

یہ شاہ فتح اللہ کے شاگرد ہیں، لیکن نہایت مخلص سنی۔ جس سال کابل فتح ہوا یہ صاحب شاہی ملازمت میں داخل ہوئے تھے۔ انھیں بڑے شاہزادہ کی تعلیم پر مقرر کیا گیا تھا۔ وہ شاہزادہ کو فارسی کے رسالے اور علم حکمت کی کتابیں پڑھایا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ تک شیخ ابوالفضل نے بھی خفیہ طور پر ان سے ریاضی اور طبعیات اور حکمت کے فنون کی تعلیم حاصل کی اور ان علوم کے نکات و رموز سیکھے۔ اس استادی کے حق کے باوجود وہ بھی ان کی تعظیم نہیں کرتا تھا۔ خود تو اوپر بیٹھتا تھا اور استاد زمین پر۔ اس جیسے لوگوں کے طور طریق ان کو ایک آنکھ نہ بھاتے تھے چنانچہ وہ ایسے بیزار ہوئے کہ ملازمت چھوڑ کر گجرات چلے گئے۔ وہاں کچھ عرصہ تک مرزا نظام الدین احمد کی صحبت میں رہے۔ مرزا اور ان کے لڑکے محمد شریف نے عقلی علوم میں ان سے استفادہ کیا اور بڑی دسترس و کمال حاصل کر لیا۔

شاہ فتح اللہ کے انتقال پر ابوالفضل اور دوسرے مصاحبوں نے دربار میں شیخ حسن علی کے علم و فضل کا ذکر کر کے بادشاہ کو بخوبی سمجھا دیا کہ آج شاہ فتح اللہ کے جانشین صرف وہی ہیں۔ چنانچہ ان کے بلانے کے لیے شاہی فرمان جاری کیا گیا اور وہ حسب الطلب لاہور آئے۔ کورنش کے موقع پر نظام الدین احمد نے ان کو زبردستی سجدہ کرایا۔ اس بات کا انھیں سخت صدمہ ہوا اور وہ اس کو برداشت نہ کر سکے اور اپنی ماں سے ملنے کا بہانہ کر کے وطن جانے کی رخصت حاصل کر لی اور 998ھ/1589ء میں خان خاناں کے دور حکومت میں سندھ پہنچے اور خدا کے بھروسے پر اپنے ملک کی سمت چل پڑے جب ہرمز پہنچے تو وہاں سے اکبر کے درباریوں کو پیغام بھیجا۔

"الحمد للہ میں نے منافق دوستوں سے چھٹکارا پا لیا، انشاء اللہ منزل مقصود پر پہنچ جاؤں گا"۔

قاضی نور اللہ شوستری

شیعہ مذہب کے پیروکار تھے اور نہایت منصف مزاج، عادل، نیک نفس، حیادار متقی تھے۔ شرفاء کی تمام خوبیاں ان میں موجود تھیں۔ علم و فن، جدت طبع، تیزی فہم اور ذہانت و ذکاوت جیسی تمام خوبیوں سے آراستہ تھے۔ ان کی بڑی اچھی اچھی تصانیف ہیں۔ شیخ فیضی کی مہمل بے نقط تفسیر پر انھوں نے "سرنامہ" لکھا جو حد تعریف سے ماورا ہے۔ شعر گوئی کا طبعی ملکہ ہے، نہایت دلکش اشعار کہتے ہیں۔ شیخ ابو الفتح کے توسط سے بادشاہ کی بارگاہ میں رسائی ہوئی تھی۔

جس زمانہ میں شاہی لشکر لاہور پہنچا تھا تو شیخ معین قاضی لاہور حاضری کے لیے آئے۔ بڑھاپے کے ضعف اور کمزوری کے سبب دربار میں بیہوش ہو گئے۔ بادشاہ کو ان کے بڑھاپے پر بڑا ترس آیا اور فرمایا: "شیخ اب کام کے قابل نہیں رہے اس لیے ان کی جگہ قاضی نور اللہ کو مقرر کر دیا جائے"۔

انھوں نے لاہور کے شرپسند مفتیوں اور مکار محتسبوں کو جو معلم الملکوت شیطان کے بھی کان کاٹتے تھے، سیدھا کر دیا اور رشوت کے دروازے بخوبی بند کر دیے اور ان پر کڑی نگرانی رکھی کہ اس سے بڑھ کر ان کا انتظام نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان کے متعلق بجا طور پر کہا جا سکتا ہے:

توئی آن کس کہ نگردی ہمہ عمر قبول
در قضا ہیچ زکس جز کہ شہادت زگواہ

ایک مرتبہ شیخ فیضی کے مکان پر محفل جمی ہوئی تھی اور قاضی موصوف تفسیر نیشا پوری سامنے رکھے آیت کریمہ "اذ یقول لصاحبہ لا تحزن ان اللہ معنا" کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ اس آیت کریمہ کے متعلق سبھی نے اتفاق کیا ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ کی شان میں نازل ہوئی ہے، "اگر یہاں صحبت لغوی مراد ہے تو یہ کوئی مدح کی بات نہیں اور اگر اصطلاحی ہے جیسا کہ اہل حدیث کا مسلک ہے تو ہم کو یہ تسلیم نہیں"۔ میں(86) نے کہا: "اگر ایک بچے سے بھی جو عربی زبان جانتا ہو پوچھا جائے تو وہ بھی کہے گا یہ آیت مدح پر

صریحاً دلالت کرتی ہے، ذم کا کوئی پہلو نہیں۔ اسی طرح کوئی کافر، حبشی، یہودی اور ہندستانی جو عربی زبان جانتا ہو یہی کہے گا"۔

غرض قاضی سے اس موضوع پر بڑی گرما گرم بحث رہی اور شیخ فیضی نے اپنی عادت کے مطابق قاضی کا ساتھ دیا، حالانکہ وہ اپنے عقیدہ کے لحاظ سے دونوں جانب سے بے تعلق سا تھا۔ اتفاق کی بات کہ نیشاپوری کی تفسیر سے بھی میری(۸۸) تائید ہو گئی بلکہ یہ اضافہ بھی تھا کہ "اگر اس وقت حضور اکرم داعی حق سے جا ملتے تو ان کے وصایا کے لیے صدیق اکبرؓ ہی نمائندہ ہوتے کوئی اور نہیں"۔

حاجی ابراہیم محدث

آگرہ میں زہد و تقویٰ کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ علوم دینی خاص طور پر درس حدیث ان کا مشغلہ تھا۔ شریعت کی پابندی پر سختی کی وجہ سے لوگ ان سے ملتے ہوئے جھجکتے تھے۔ کیونکہ وہ امر معروف اور نہی عن المنکر سے کبھی نہیں چوکتے تھے۔ جب حسب طلب عبادت خانہ شاہی میں آئے تو شاہی مراسم اور تکلفات کی پابندی نہیں کی اور بے خوف وعظ و نصیحت کرنے لگے۔ خواجہ عبد الصمد شیرازی جو قدیم آرائشی سامان کرایہ پر چلانے کی وجہ سے خواجہ عبد اللہ کے نام سے مشہور تھے اور نماز، روزہ اور عبادتوں میں بہت مشغول رہتے تھے، حاجی سے بڑی عقیدت رکھتے تھے وہ ان سے کہا کرتے تھے:

"خواجہ جب تک دل میں خلفائے راشدین کی محبت نہ ہو یہ نماز اور روزہ کچھ فائدہ نہیں دیتا"۔

شیخ جلال واصل کالپی والے

یہ شیخ محمد غوث کے خلفاء میں سے ہیں۔ پہلے جو علوم حاصل کیے تھے بعد میں وہ سب کچھ بھلا بیٹھے۔ سماع وجد و حال ہی کا ذوق اور مشغلہ تھا، بادشاہ سلامت ان سے خاص تعلق رکھتے تھے۔

شیخ غوث کے خلفاء میں شیخ سلیم کے خلفاء کی نسبت تصنع اور بناوٹ بہت کم تھی۔ یہ
دونوں گروہ ایک دوسرے کے بڑے مخالف تھے۔ بعد میں چل کر تو یہی مخالفت پیش آیا کہ
جب حضرت شیخ کے سامنے آیت کریمہ "وقالت الیهود لیست النصاری علی شیء
و قالت النصاری لیست الیهود علی شیء" پڑھی گئی تو آپ نے فرمایا صدق الله و
الحمد لله کہ اب ان دونوں کا کوئی نشان باقی نہیں رہا"۔

ملک محمود پیارو

وہ فن تفسیر، حدیث اور فارسی نظم و نثر کے اچھے عالم تھے۔ نہایت صالح مزاج اور ذوق وحال
سے بہرہ مند تھے۔ نسلاً وہ سلاطین گجرات کے خاندان سے ہیں۔ والد کا نام ملک پیارو تھا۔
ملک محمود نہایت فصیح زبان دانشور اور مدبر تھے۔ چنانچہ بادشاہی محفلوں میں اکبر کی
مصاحبت کا انھیں شرف حاصل تھا۔ اولیاء اللہ سے بڑا اعتقاد تھا اس لیے اکبر نے انھیں چند
روز کے لیے حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے روضہ مبارک کا متولی بنا دیا تھا۔
ملک محمود کو مخدوم جہانیاں بخاری کے جانشین مخدوم شاہ عالم بخاری سے ایسی
عقیدت ہوگئی تھی کہ انھوں نے بادشاہ سے اس درگاہ کی مجاورت کی درخواست کی جو
بڑے پس و پیش اور ردو بدل کے بعد قبول کرلی گئی اور وہ احمد آباد جا کر اس آستانہ کے
مجاور بن بیٹھے۔
توکل و قناعت کا گوشہ اختیار کرلیا اور اسی مجاورت میں انتقال ہوا۔ میں[86] نے
اجمیر اور فتح پور دونوں جگہوں پر ان سے ملاقات کی تھی۔ شعر سے بھی ان کو بڑا ذوق تھا۔
چنانچہ یہ مطلع انہی کا ہے:

دارم دلی گردان کہ من قبلہ نمائی خوانمش
ردموی ابر وئش کند ہر چندی گردانمش

صدر جہاں پیہانی

پیہانی، قنوج کے ماتحت ایک گاؤں ہے۔ صدر جہاں عالم اور خوش مزاج عالم ہیں ان کی

ساری عمر لشکر ہی میں گزری۔ علوم و کمالات شیخ عبد النبی سے حاصل کیے اور شیخ موصوف ہی کی سعی و کوشش سے اتنے سال تک ممالک محروسہ کے مفتی رہے۔

جب ہندستان کے ائمہ پر زوال آیا تو انھوں نے اپنی خدمات، زمانہ سازی اور دنیا داری کی بدولت بہت جلد اپنی عزت و احترام کو بحال کر لیا۔

جب وہ حکیم ہمام کے ساتھ حاکم توران کے پاس سفارت پر گیے، پھر وہاں سے واپس آئے تو ان کو صدارت کے عہدے پر مقرر کیا گیا۔ جن دنوں لاہور میں بچے کھچے علماء کو مکہ معظمہ بھجوا دینے کی افواہیں گرم تھیں اور ایک طویل فہرست مرتب کی گئی تھی، ایک دن صدر جہاں کہنے لگے: "مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس فہرست میں میرا بھی نام درج نہ کرا دیا گیا ہو" میرزا نظام الدین احمد، جنھوں نے اس فہرست کو ترتیب دیا تھا کہا: "تم کو بادشاہ کیوں بھیجنے لگے؟" صدر جہاں نے کہا: "آخر کیوں نہیں"۔ میرزا نے جواب دیا: "تمہاری زبان سے کبھی کلمۂ حق نکلا نہیں جو تیرے اخراج کا سبب بنتا"۔

طبیعت شاعرانہ ہے اور شعر و سخن سے بڑی اچھی مناسبت ہے، لیکن وہ شعر گوئی سے الگ ہی ہیں۔ یہ مطلع انہی کا ہے:

ہر تار زلف یار خدایا بلا شود
وانگہ بہر بلا دل ما مبتلا شود

جس طرح شعر گوئی سے توبہ کر لی ہے، توقع ہے بے مروہ بخشوں، ریاکاری، خود نمائی خود پسندی، بیہودہ گوئی اور جھوٹ بولنے سے بھی توبہ کی توفیق انھیں نصیب ہو جائے۔

شیخ یعقوب کشمیری

صرفی تخلص کرتے تھے۔ فضائل و کمالات کا مجموعہ تھے شیخ حسین خوارزمی کے خلیفہ ہیں۔ حرمین کی زیارت سے بھی مشرف ہو چکے ہیں۔ شیخ ابن حجر سے حدیث کا درس حاصل کیا تھا۔ درویش کے لباس میں بڑے بڑے سفر کیے اور بڑی دنیا دیکھی اور عرب و عجم کے اکثر شیوخ کی صحبت سے استفادہ کیا اور ارشاد و ہدایت کی اجازت حاصل کی۔ ہندستان اور

کشمیر میں ان کے مرید بکثرت ہیں۔

شیخ یعقوب بڑی اچھی کتابوں کے مصنف ہیں۔ انھوں نے اپنا خمسہ پورا کرلیا ہے۔ متعدد رسالے فن معما پر لکھے ہیں۔ صوفیانہ رنگ میں رباعیات کہی ہیں اور ان کی شرح بھی لکھی ہے۔ انھیں صوفیاء کی حالت ذوق سے لگاؤ نہیں ہے لیکن اس سے قطع نظر وہ تمام عربی علوم، تفسیر، حدیث اور تصوف میں قابل اعتماد مستند عالم ہیں۔ کچھ ہی عرصہ قبل وہ تفسیر لکھ رہے تھے جو ان کے کمالات علم وفضل کا واضح ثبوت ہے۔

ہمایوں بادشاہ اور خود شہنشاہ کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ گفتگو اور مصاحبت کا اعزاز حاصل تھا، وہ بادشاہ کے منظور نظر اور بڑے مکرم ومحترم تھے۔ طبعاً نہایت فیاض اور صاحب ایثار تھے۔

ان کے مرتبہ کے لحاظ سے شعر گوئی مناسبت نہیں رکھتی تھی لیکن اس وادی میں بھی ان کا دخل تھا۔ یہ چند شعر ان کے ہیں:

در ہر چہ بنگرم آن رخ نیکوست جلوہ گر
در صد ہزار آئینہ یکروست جلوہ گر

خلقی بہر طرف شدہ سرگشتہ بہر دوست
وین طرفہ ترکہ دوست بہر سوست جلوہ گر

خالت از مکر بران گوشہ ابرو بنشست
ہر کجا گوشہ نشینی است در و مکری ہست

مشکن ای غم دل ما را و ببین کان دل کیست
دل ما ہست ولی بین کہ درو منزل کیست

عمر یکو بیش گزری پای زسر باید کرد
قصہ کوتہ زسر خویش گزر باید کرد

اسم شیدا پر یہ معما انھی کا ہے:

ماہ حسن از رخ نقاب انداختہ
دہ کہ عمداً روز را شب ساختہ

جس زمانہ میں لاہور سے اسے اپنے وطن جانے کی اجازت ملی تھی، انھوں نے راوی کے اس پار سے یہ خط میرے نام لکھا تھا:

"قادری! مخلصانہ دعا و نیاز

سفر کے وقت مشایعت سنت ہے۔ آپ جیسے مخلص خلیق سے یہ سنت محض مجبوریوں کی وجہ سے ہی ترک ہوئی ہوگی۔ امید ہے جناب فراموش نہیں کریں گے۔ اگر آپ کو مسودات کے لیے کشمیری کاغذ کی ضرورت ہو تو مطلع فرمایئے تاکہ میں کشمیر سے اپنی تفسیر کے مسودات بھیج دوں۔ اگر آپ کاغذ کو دھو دیں تو اس کی تحریر اس طرح اڑ جاتی ہے کہ سیاہی کا کوئی نشان باقی نہیں رہتا، جیسا کہ آپ نے بھی تجربہ کیا ہوگا۔ والسلام"

جب وہ کشمیر گئے تو ایک اور رقعہ وہاں سے بھیجا جو بس آخری خط تھا۔ مولانا شیخ عبدالقادر کے نام

قطعہ

از دوانی بداؤنی پیشک   در فنون فضیلت است فزون
پس دلیل زیادت معنیش   کہ بجایش بصورت ست فزون

"آپ کے خطوط وصول ہوئے، کوتاہی لیاقت کی وجہ ہے ان کے جواب سے قلم قاصر تھا، لیکن خلوص و بندگی کے جذبات بے اختیار زبان قلم پر آگئے۔ امید ہے کہ جس وقت آپ نواب فیاض کے خسخانہ میں دوپہر کے وقت کشمیر کی ہواؤں سے زیادہ سرد چٹائی پر بیٹھے برفاب کے گھونٹ مزے مزے سے لیتے ہوئے دلچسپ گفتگو میں مشغول ہوں گے، ہم اسیران غم محروموں کو بھی ضرور یاد کریں گے۔

ای بہ بزم وصل حاضر غائبان را دستگیر
زانکہ دست حاضران از غائبان کوتاہ نیست

شیخ محی الدین محمد آپکی خدمت میں نیاز مندی عرض کرتا ہے قبول فرمایئے۔ آپ نے ضرور سنا ہوگا کہ میران سید قطب الدین نے میرے نیاز نامہ کا جواب نہیں دینا چاہا اور غالبا آپ حق ہمسایگی کی وجہ سے اس بات کا یقین کر لیں گے لیکن حق بات کہیے کہ یہ حق اس حق پر ترجیح رکھتا ہے یا نہیں؟

آپ جناب میران کے اظہار محبت و دوستی پر قطعاً بھروسہ نہ کریں کیونکہ وہ پائیدار نہیں ہے۔

''اظہار مضمر'' پر جدید آصف خانی طرز پر میں نے جو اشعار کہے تھے، ان کا مسودہ میرے پاس سے گم ہو گیا ہے۔ غالبا آپ نے اس مسودہ کی ایک نقل اتاری تھی، براہ کرم اپنے نسخہ میں سے اس کی نقل بھیج دیجیے۔

جواب

''آپ کی تعریف کیا کروں، کیونکہ عبد القادر کے الفاظ کوزہ ہیں اور آپکی تعریف سمندر۔ آپکے لئے دعا کیا کروں:

بسوئی سدرہ زمن مرغ طاقت نبرد
کہ نامۂ بزد از دعات در منقار

اپنے شوق و اشتیاق کا کیسے اظہار کروں:

یا ممن بہا یا ذن یدہ طوقنی — من صحۃ الزمان قد عوقنی
الا اقدر ان لکتب شوقی لکم — ما اشوقنی الیک ما اشوقنی

اس وقت سے جب سے کہ آپ اس طرف گئے ہیں نوروز سے پہلے اور اس کے چند دن بعد آپ کے دو خط پہنچے:

مردی در از نیکو در شہر خویش امروز
با خواستہ نشستہ از بخت خویش فیروز

جن میں سے ایک خط میں لکھا ہوا تھا:

(از دوائی بداونی بیگ

اس کے جواب میں عرض ہے:

مثنوی

ای زبانت کلید نامۂ غیب — دل پاکت تنیجۂ لاریب
دادہ اعجاز کلک تو بیرون — گنجہائی نہان کن فیکون
گفتی از منطق گہر پرور — کز دوانی بداوئی خوشتر
گر دوانی دگر بداؤن چند — ہمہ از گنج فضل تو مپند
دلم آئینہ جمال تو شد — مظہر فیض لایزال تو شد
چہ عجب گر زروی حق بینی — خویشتن را درو ھمی بینی

اگر خود نمائی کا تقاضا ہے تو بس اتنا ہی کافی ہے، ورنہ پھیکا پھیکا جواب لکھنے سے فائدہ! لیکن مخلصانہ خطوط کے لکھنے میں کوتاہی خواص کا طریقہ نہیں، اس لیے معذرت خواہی کے لیے لکھ رہا ہوں کہ اس رقعہ کو سابقہ جرموں کا کفارہ تصور فرمایئے اور وہ جو آپ نے ہوائی خسخانہ اور برفاب کے متعلق لکھا:

از عمر برف ست و آفتاب تموز

کافی دن ہوئے کہ میں اس ٹھنڈی آب و ہوا سے محروم ہی ہو گیا ہوں:

گرگ دھن آلودہ و یوسف ندریدہ

والا مضمون ہے۔

بادشاہ سلامت نے اجمیر کی تولیت کے سلسلے میں میرا نام لیا تھا لیکن ابھی تک اس کی منظوری نہیں ہوئی۔ میری انتہائی آرزو ہے کہ یہ معاملہ جلد طے پا جائے، تا کہ مجھے ملک کی آب و ہوا سے نجات ملے اور دل کو یقین کی ٹھنڈک نصیب ہو۔ اس دنیا کا خس خانہ تو بس برف کی طرح گھل جانے والا ہے:

ای عجب دلستان بگرفت وشد جانستان ملول
ہوا ھائی عشق زین آ ھائی ناگوار

آپ بھی اس معاملہ میں حکمۃ سعی فرمایئے۔ انشاء اللہ اجمیر جانے کے بعد اجمیر اور کشمیر کو ہم قافیہ سمجھتے ہوئے "جھالرہ" کا پانی پیوں گا جس طرح آپ وہاں "برفتن" کا پانی نوش جان فرماتے ہیں۔

یہ رمضان کا مہینہ 1003ھ/1594ء ہے۔ بندہ زادہ بداؤں چلا گیا ہے اور دعا میں مشغول ہے"۔

یہ غزل بھی شیخ یعقوب کشمیری کی ہے جو انھوں نے کسی سفر میں لکھ کر میرے پاس بھیجی تھی:

وردی کین نامہ ئیکردم رقم	کان یجری الدمع لزوجا بدم
ہر رقم کز خامہ ام ظاہر شدی	کاد یمحوا معنی ذرک الرقم
محو حرف اشتیاق از لوح دل	لیس فی وسعی وقد جف القلم
اور بلائی ہجر محنت ہا بود	لیتنی کوشفت عن تلک الحکم
اصرتی از دریای اشکم نہ محیط	لیس الامثل اشف من دیم

مختصر یہ کہ شیخ یعقوب کشمیری کی تعریف وتوصیف میری عاجز زبان سے ادا نہیں ہو سکتی۔ ان کے اوصاف وکمالات کی نشانیاں ان کے حالات سے بخوبی نمایاں ہیں۔

شیخ نے 12 ذی قعدہ 1003ھ/1594ء کو انتقال کیا۔ ان کی تاریخ وفات "شیخ ام بود" کہی گئی ہے:

سلام علی الدنیا و طیب نعیمھا	کان لم یکن یعقوب فیھا یجالس
درین خرابہ مجورہ بسوئی گنج مراد	کہ جای محنت ورنج ست این خراب آباد

مولانا میرزا سمرقندی

مولانا انسانی شکل میں فرشتہ تھے۔ حرمین شریفین کی زیارت کر آئے تھے۔ بیرم خان خانان کے عہد میں آگرہ میں مقیم تھے۔ ایک ایک خلق ان سے فیضیاب ہوئی تھی۔ منطق میں "شرح شمسیہ" امیر سید محمد کی تصنیف ہے۔ جن کے والد امیر سید علی ہمدانی تھے۔ یہ وہی

بزرگ ہیں جن کی کوششوں سے کشمیر میں اسلام کی اشاعت ہوئی تھی۔ میں[86] نے "شرح شمسیہ" کا کچھ حصہ اور پوری کی پوری "مختصرات" مولانا میرزا کے پاس پڑھی تھی۔ حضور اکرم کی یہ مستند حدیث۔ "قال النبی ﷺ من تری غیرہ ثم قتلہ ومہ ھدر"۔ ان کی زبان سے سنی اور اس کی روایت کی اجازت حاصل کی جو 6 واسطوں سے حضور اکرم تک پہنچی ہے اور اس حدیث کی سند کا قصہ "نجات الرشید" میں تفصیل سے درج ہے۔ مولانا خان زمان کی بغاوت کے زمانہ میں آگرہ سے دہلی آ گئے تھے۔ اس کے بعد ان کا کچھ پتہ نہیں چلا کہ کہاں گئے۔

قاضی ابو المعالی

عزیز بخاری کے داماد، شاگرد اور خلیفہ ہیں۔ عزیز بخاری کو فقہ پر ایسا عبور تھا کہ اگر تمام حنفی فقہ کی کتابیں دنیا سے اٹھالی جائیں تو وہ از سر نو ان سب کو لکھوا دیتے۔

انھوں نے عبد اللہ خان بادشاہ توران کو فن منطق اور علم جدل کو ملیامیٹ کرنے پر آمادہ کیا، ماوراء النہر سے ملا عصام الدین اسفرائینی اور اس کے خبیث طالب علم ان کی ہی وجہ سے شہر بدر کیے گئے تھے۔ اس ہنگامہ کا سبب یہ ہوا کہ جب یہ علم بخارا اور سمرقند میں پھیلا تو خبیث اور شریر لونڈے جہاں بھی کسی سلیم الطبع صالح آدمی کو دیکھتے، کہنے لگتے: "یہ گدھا ہے" کیونکہ "لاحیوان" اس سے منسوب ہے۔ چونکہ "انتفائی عام" مستلزم انتفائی خاص ہے۔ اس لیے انسانیت کا سلب ہونا لازم آتا ہے۔ اس قسم کے منطقی مغالطے جب بکثرت پھیل گئے تو قاضی نے عبد اللہ خاں کو اس کے سد باب پر آمادہ کیا اور اس گروہ کو نکال باہر کرا دیا اور منطق و فلسفہ کی تعلیم پر پابندی عائد کر دی۔

ایک روایت یہ بھی نکالی کہ اگر اس کاغذ سے جس پر منطق لکھی ہوئی ہو، استنجا کیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ قاضی ہمیشہ ہر نماز کے بعد حلقہ میں ذکر کیا کرتے اور مرید بناتے تھے969ھ/1561ء میں آگرہ میں آئے۔ میں[86] نے "شرح وقایہ" سے پہلے کے چند سبق ان سے پڑھے۔ بلا شبہ وہ اس فن میں تجربے پایاں تھے۔

مولانا میر کلاں

ملا خواجہ کے پوتے ہیں۔ خراسان کے بڑے مشائخین میں سے تھے۔ ظاہری اور باطنی کمالات سے آراستہ، نہایت متبحر دانشور اور عالم تھے، خاص طور سے علم حدیث میں تو اپنے زمانہ میں یکتا تھے۔ حدیث کی اجازت انھوں نے سید میرک شاہ سے لی تھی اور مولانا زین الدین محمود کمان گر بہبرائی کے منظور نظر تھے اور نیکی ان کی سرشت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے محفوظ رکھا تھا۔ ہمیشہ دینی تعلیم و تدریس میں مصروف رہتے تھے اور ہمیشہ سر جھکائے مراقبہ میں بیٹھے رہتے تھے۔

عقیدت و مریدی کا تعلق شیخ جلال ہرویؒ سے تھا جو سربرآوردہ مشائخین اور مشاہیر میں سے ہیں۔ مولانا میر کلاں بلاشبہ فرشتہ خصلت انسان تھے۔ ان کی شخصیت اسمائے حسنیٰ کی مظہر تھی۔ 80 سال کی عمر پائی۔ ان کی والدہ سیدہ تھیں اور زندہ تھیں۔ اس اندیشہ سے کہ کہیں انکی بیوی ان کی والدہ کی نافرمان نہ نکلے۔ انھوں نے شادی ہی نہیں کی اور والدہ کی زندگی ہی میں انتقال فرما گئے۔ جس وقت مولانا کا انتقال ہوا ان کی والدہ کلام پاک کی تلاوت میں مصروف تھیں جب انھیں ایسے عزیز و سعادت مند بیٹے کی وفات کی اطلاع دی گئی اور لوگ ان سے تجہیز و تکفین کی اجازت مانگنے لگے تو اس نیک بی بی نے "انا للہ و انا الیہ راجعون" پڑھا، اجازت دی اور پھر تلاوت میں مشغول ہو گئیں اور اس سیدہ نے کسی طرح کی بے قراری اور صدمے کا اظہار نہیں کیا۔

مولانا میر کلاں کی وفات 981ھ/1573 میں آگرہ میں ہوئی اور آگرہ ہی میں دفن کیے گیے۔ ان کے ایک سال بعد ہی ان کی والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔

میں[86] ان بزرگ سے ملنے کی سعادت حاصل کر چکا ہوں، لیکن ان سے کوئی استفادہ نہیں کر سکا۔

مولانا سعید ترکستانی

اپنے زمانہ کے بہت بڑے عالم تھے۔ ملا احمد جنید سے انھوں نے پڑھا ہے۔ ملا محمد سرخ

سے بھی کچھ استفادہ کیا اور کچھ عرصہ تک ملا عصام الدین ابراہیم کے بھی شاگرد رہے۔

ہندستان آنے کے بعد اکبر سے ملاقات ہوئی تو اکبر کو ان کی مصاحبت نہایت پسند آئی۔ ان پر درویشی اور انکساری کا بڑا غلبہ تھا لیکن وہ نہایت خوش مزاج اور ذہین تھے۔ چنانچہ عہد حاضر میں ان جیسے فہم اور علمیت والا عالم شاید ہی پیدا ہوا ہو۔ گفتگو اور بیان نہایت فصیح اور دلکش ہوتا تھا۔ شاگردوں پر نہایت مہربان رہتے تھے۔

ہندستان سے کابل لوٹ کر گئے اور 970ھ/ 1562ء میں وہیں ان کا انتقال ہوگیا۔

حافظ کومکی

حافظ تاشقندی کے نام سے مشہور ہیں۔ نہایت متبحر عالم تھے، خاص طور سے عربی میں بڑا کمال حاصل تھا۔ مولانا عصام الدین کے شاگرد ہیں۔ تمام علوم بخوبی جانتے تھے اور لوگوں کو اپنے علم سے فائدہ بھی بہت پہنچایا۔ ماوراء النہر میں تمام علماء ان کو اپنا بڑا مانتے تھے۔ بظاہر وہ فوجی وضع قطع میں رہتے تھے، ہمیشہ ترکوں کی طرح ترکش کمر سے باندھے ہوئے سوار رہا کرتے تھے۔ 977ھ/1569ء میں ہندستان تشریف لائے۔ اکبر سے ملاقات کی اور بھاری انعامات سے سرفراز کیے گئے۔ پھر براہ گجرات حرمین شریفین کے لیے روانہ ہوگئے۔ وہاں سے روم گئے اور شاہ روم سے ملاقات کی۔ ہندستان سے 10 گنا زیادہ وہاں ان کی تعظیم و تکریم کی گئی یہاں تک کہ وزارت کی پیش کش کی گئی لیکن انھوں نے قبول نہیں کیا اور ماوراء النہر لوٹ آئے اور وہیں انتقال فرمایا۔ میں[86] ان سے اور مولانا سعید ترکستانی سے نہیں مل سکا۔

قاضی نظام بدخشی

قاضی خاں لقب تھا، بدخشاں کے رہنے والے ہیں ان کا مقام اس پہاڑ سے قریب تھا جس میں لعل کی کان ہے۔ نصابی علوم میں مولانا عصام الدین ابراہیم کے شاگرد ہیں۔ ملا سعید سے بھی استفادہ کیا تھا۔ تصوف سے بڑی وابستگی تھی۔ چنانچہ علم تصوف پر بھی پورا عبور

حاصل تھا۔ طریقت میں شیخ حسین خوارزمی کے مرید تھے۔ خدا والوں کی صحبت کے طفیل دنیاوی اعزاز بھی حاصل ہوا۔ چنانچہ وہ بدخشاں میں امرائے شاہی میں داخل تھے۔ ہندستان آئے تو اکبر بادشاہ نے اندازہ سے بڑھ کر پذیرائی کی۔ پہلے تو قاضی خاں کا پھر غازی خاں کا خطاب ملا۔

قاضی نظام نہایت فصیح زبان اور خوش بیان عالم تھے۔ معتبر تصانیف کے مصنف ہیں۔ ایک رسالہ کلام و بیان، ایمان تحقیق و تصدیق کے موضوعات پر لکھا۔ شرح عقائد پر حاشیہ لکھا ہے۔ تصوف میں بھی بہت سے رسالے تصنیف کئے ہیں۔ اودھ میں بعمر 70 سال 992ھ/1584ء میں انتقال فرمایا۔ فتح پور میں پہلا وہ شخص جس نے فتح پور میں بادشاہ کے سامنے سجدہ کرنے کی رسم ایجاد کی وہ قاضی نظام بدخشی تھے۔ ملا عالم کابلی بڑی حسرت سے کہا کرتے تھے افسوس اس کی ابتداء و اختراع میرے ہاتھوں نہیں ہوئی۔

مولانا الہداد لنگر خانی

لنگر خان لاہور کا ایک محلہ ہے۔ مولانا اکثر علوم متداولہ میں ماہر اور متبحر عالم ہیں۔ شریعت کے بڑے پابند، نہایت متقی اور پرہیزگار بزرگ ہیں۔ اب بھی درس و تدریس میں مشغول رہتے ہیں۔ بے مروت دنیاداروں کے گھر کبھی نہیں جاتے۔ بادشاہوں اور امیروں سے بھی کچھ طلب نہیں کیا۔ یہاں تک کہ سرکاری مدد معاش بھی قبول نہیں کی۔ اب ان کی عمر 80 سال ہے۔

مولانا محمد مفتی

لاہور کے معتبر اساتذہ میں سے ہیں۔ بڑے صاحب کمال عالم ہیں، مفتی کے عہدہ پر فائز ہیں۔ صحیح بخاری اور مشکوٰۃ کا جب بھی ختم ہوتا ہے تو وہ ایک بڑی محفل منعقد کرتے ہیں جس میں بغرا[87] اور حلوؤں سے ضیافت کی جاتی ہے۔

ان کا گھر علماء و فضلاء کا مرکز ہے۔ اس زمانہ میں ان کی عمر 90 سال کی ہو چکی ہے

اور نہایت کمزور و ضعیف ہو گئے ہیں اس لیے درس دینا چھوڑ دیا ہے۔ چار پانچ لڑکے ہیں جو سب کے سب علم و کمال میں اپنے باپ کا نمونہ اور جانشین ہیں۔

میر فتح اللہ شیرازی

شیراز کے سیدزادے اور اپنے زمانہ کے بے مثل عالم تھے، مدتوں فارس کے حکام و اکابر کے مشیر و راہنما رہے۔ تمام علوم عقلی جیسے حکمت، ہیئت، ہندسہ، نجوم و رمل، حساب، طلسمات و جر ثقیل وغیرہ کے عالم و ماہر تھے۔ اس فن میں ایسی مہارت و دسترس تھی کہ اگر بادشاہ تیار ہو جاتا تو وہ رصدگاہ تیار کر دیتے۔ علوم عقلی کی طرح عربی علوم، حدیث، تفسیر اور کلام میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی۔ ان کی بڑی اچھی تصانیف ہیں۔ لیکن بلحاظ علم و تصنیف وہ میرزا جان شیرازی کی برابری نہیں کر سکے جو ماوراء النہر کے یگانہ روزگار عالم گزرے ہیں۔

میر فتح اللہ مجلسوں میں نہایت با اخلاق، منکسر المزاج اور نیک نفس تھے۔ لیکن خدا کی پناہ جس وقت وہ پڑھانے بیٹھتے تو اپنے شاگردوں کو گالیوں اور فحش الفاظ سے نوازتے رہتے۔ اسی وجہ سے ان کے درس میں زیادہ لوگ نہیں جاتے تھے اور کوئی اچھا شاگرد ان کے حلقہ سے نہیں نکلا۔

چند سال وہ دکن میں رہے۔ وہاں کے حاکم عادل خاں کو میر سے بڑی عقیدت تھی۔ جب اکبر کی خدمت میں آئے تو عضد الملک کا خطاب پایا۔ کشمیر میں 997ھ/1588ء میں ان کا انتقال ہوا۔ اس مقام پر جو تخت سلیمان کے نام سے مشہور ہے، مدفون ہیں۔

ان کی تاریخ وفات "فرشتہ بود" سے نکلتی ہے۔

شیخ منصور لاہوری

شیخ اسحاق کاکوی کے شاگردوں میں سے ہیں لیکن زیادہ تر علم انھوں نے مولانا سعد اللہ سے حاصل کیا ہے اور وہ ان کے داماد بھی تھے۔ ہندستان میں جتنے عقلی علوم رائج ہیں ان سب میں وہ پوری مہارت رکھتے ہیں۔ نہایت خوش طبع، سمجھدار اور اچھا جاننے والے آدمی

ہیں۔ امراء و سلاطین سے تعلقات رکھنے کا خوب ملکہ آتا ہے۔

کچھ عرصہ تک تو مالوہ کے قاضی القضاۃ رہے۔ جس زمانہ میں لاہور میں اکبر کا قیام تھا مالوہ سے اکثر حاضر ہوئے اور اسی تاریخ سے پرگنہ بجوارہ اور پہاڑی سرحدوں کے نظم و نسق پر مامور ہیں۔ ان کے لڑکے ملا علاء الدین مشہور دانشمند اور مدرس ہیں۔ عرصہ تک خان خاناں کی صحبت میں عزت واکرام سے رہے۔ جب بادشاہ کی خدمت میں حاضری ہوئی تو وہاں بھی بڑی عزت پائی۔ بادشاہ نے فوجی ملازمت کی پیش کش کی لیکن انھوں نے قبول نہ کیا اور درس و تدریس میں معروف رہے۔ جو کچھ انھیں جاگیر سے ملا کرتا تھا وہ طلباء پر صرف کر دیتے تھے۔ ہندستان کے عالموں میں پیر محمد خان کے بعد ان جیسا اور ملا نور محمد خان جیسا کوئی اور شخص سخی، فیاض اور ایثار پیشہ نہیں گزرا۔

انھوں نے شرح عقائد پر جو حاشیہ لکھا ہے وہ بہت مشہور ہے۔ حج و زیارت کے لیے حرمین شریفین تشریف لے گئے اور وہیں رحلت فرمائی۔ میں ان سے ملاقات نہیں کر سکا۔

ملا پیر محمد شیروانی

نہایت عقل مند، خوش اخلاق اور میٹھی باتیں کرنے والے عالم تھے، لیکن طبیعت میں سنگ دلی اور بے رحمی بہت تھی۔ شریعت کی پابندی بھی نہیں کیا کرتے۔ شیروانی جب قندھار پہنچا اور بیرم خان خاں خاناں کے یہاں ملازمت کر لی اور بہت جلد ترقی کے مدارج طے کیے۔ ہندوستان فتح ہوگیا تو اسے خان کا خطاب دیا گیا۔ اس کے بعد ناصر الملک کا خطاب ملا اور تین چار سال اس نے نہایت شان و شوکت سے بسر کیے۔ لیکن ظالم کو کبھی فروغ نہیں ہوتا چنانچہ وہ بھی کچھ ہی عرصہ بعد مالوہ ندی میں ڈوب کر مر گیا اور فرعون اور نیل ندی کی یاد تازہ کر دی۔

میں نے بس اسے دور ہی سے دیکھا تھا، خدا کا شکر ہے کہ اس کی مجلس میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔

میرزا مفلس اوزبک

ملا احمد جند کے شاگرد ہیں۔ مناظرہ و مجادلہ کے فن میں نہایت تیز تھے۔ لیکن ان کی تقریر فصیح نہیں ہوتی تھی۔ درس دیتے ہوئے بڑی مضحکہ خیز حرکتیں کرتے تھے۔ شکل وصورت بھی اچھی نہ تھی، لیکن نہایت نیک اور متقی آدمی تھے۔

ماوراء النہر سے ہندستان آئے تو 4 سال تک آگرہ میں جامعہ خواجہ معین الدین فرنخودی میں سبق دیتے رہے۔ پھر حرمین شریفین کی زیارت کی اور مکہ معظمہ میں انتقال فرمایا اس وقت ان کی عمر 70 سال تھی۔

مولانا نور الدین محمد ترخان

تمام علوم، حکمت و کلام پر مستند عالم تھے۔ علوم عالیہ کے ساتھ ساتھ شاعری سے بھی لگاؤ تھا، چنانچہ نہایت خوش طبع شاعر سمجھے جاتے تھے۔ آخر عمر میں شعر گوئی سے توبہ کر لی تھی اور حضرت غفران پناہ ہمایوں بادشاہ کے روضہ کے متولی بنا دیے گئے تھے۔ دہلی میں ان کا انتقال ہوا۔

مولانا الہداد امروہہ

نہایت خوش طبع، آزاد مزاج، محقق عالم، شیریں کلام، خوش باش اور ندیم پیشہ شخص تھے۔ مزاح وظرافت کا بڑا اچھا ملکہ تھا۔ غرض اہل مجلس کے لیے "مایۂ حضور اور مایۂ سرور" سمجھے جاتے تھے۔

شاہی فوجی ملازمت میں انھوں نے کچھ روپیہ بچا رکھا تھا اور اسی پر ان کی گزر بسر کا دارو مدار تھا۔ ساری عمر میرے ساتھ بڑی محبت اور خلوص سے پیش آتے رہے۔

990ھ/1582ء میں جب کہ لشکر سیالکوٹ کے علاقے میں اٹک گنگ کی طرف جا رہا تھا، ان کا انتقال ہو گیا۔ لاش امروہہ میں ایک مقام پر جہاں انھوں نے آخری ٹھکانے کی پہلے سے تیاری کر رکھی تھی لے جا کر دفن کی گئی۔ اس عہد کے جو مشائخ اور علماء تھے ان کا

ذکر ہم نے کر دیا ہے۔ میں نے ان میں سے اکثر کی صحبت پائی ہے اور ان کے دیدار سے فیضیاب ہوا ہوں!

ان تمام بزرگوں میں سے جن کا ذکر کیا گیا اس قحط الرجال کے دور میں بس چند رہ گئے ہیں۔ بعض لوگوں کی نظروں سے اوجھل گوشہ نشین ہو گئے، ذہنوں سے ان کی یاد بھی جاتی رہی ہے۔ باقی بچے کھچے لوگ اپنی آخری سانس گنتے ہوئے بے چینی سے اس کوچ کا انتظار کر رہے ہیں جس کے بعد لوٹنا نہیں ہوتا۔ ان کے کانوں میں برابر الرحیل الرحیل کی صدا گونج رہی ہے۔ جانے کب اس آواز پر اٹھ کر چلے جائیں:

تاریخ جہان کہ قصۂ خرد و کلان ... درج ست درو چہ شیر مردان یلان

در ہر ورقش بعنوان کہ فی عام کذا ... قدمات فلان ابن فلان ابن فلان

تمام ممالک محروسہ ہندستان کے طول و عرض میں علماء و مشائخ اتنے ہیں کہ ان کا شمار خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ اسی طرح وہ لوگ بھی جو شرارت، باطنی خباثت، دین فروشی، کنجوشی اور رذالت، بے راہ روی اور بے اعتدالی میں مشہور و معروف ہیں کچھ کم نہیں۔ ہم نے ایسے پس ہمت لوگوں کے تذکرے میں اپنے قلم کو الجھانا مناسب نہیں جانا، کیوں کہ ایک بڑا کام پیش نظر ہے اور زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔

میرا اپنا حال اس نیشاپور کے برف فروش سے کچھ مختلف نہیں جو گرم ہوا میں برف بیچ رہا تھا۔ جب سورج نکلا تو کہنے لگا اے مسلمانوں خدا را! رحم کی نگاہ سے مجھ نقصان کے مارے کو دیکھو کہ اس کی پونجی پگھل پگھل کر اس کے ہاتھوں سے بہتی جا رہی ہے:

عمر برف است و آفتاب تموز

اند کی ماندو خواجہ غرہ ہنوز

اور میں یہ جو مرنے والوں کی تاریخ وفات لکھتا رہتا ہوں، اس کی مثال اس درزی کی ہے جو قبرستان کے دروازے پر اپنی دکان لگائے ہوئے تھا اور ایک کوزے کو کھونٹی پر لٹکا رکھا تھا۔ جب بھی کوئی جنازہ شہر سے نکلتا وہ اس کوزہ میں ایک کنکر ڈال دیتا اور ہر مہینہ ان کنکریوں کو گن کر حساب لگا لیتا کہ کتنے جنازے اٹھائے گئے۔ پھر وہ کوزہ خالی کر

کے دوبارہ اسے ٹانگ دیتا اور اسی طرح کنکریاں ڈالتا رہتا۔ یہاں تک کہ دوسرا مہینہ آجاتا۔ کافی عرصہ تک وہ اسی طرح کرتا رہا۔ اتفاق سے ایک درزی مرگیا۔ ایک شخص جسے اس کی وفات کی خبر نہ تھی اس سے ملنے آیا۔ دکان بند پاکر اس نے ہمسایہ سے دریافت کیا کہ "درزی کہاں ہے؟"

ہمسایہ نے کہا "وہ اسی کوزہ میں گر پڑا ہے":

بنگر کہ بدیگری کشاید
کزوی چو گزشت بر تو آید

سبحان اللہ ہماری زندگی بھی کیا زندگی؟ بس ایک عذاب ہے حلق میں جاکر پھنس گئے ہیں کہ ملنے اور تڑپنے کی بھی مجال نہیں چھٹکارنے کی امید کہاں؟

قطعہ

چو غنچہ خون خورودل تنگ باش ولب بکشا — کہ نیست غنچۂ این باغ را امید کشاد
نشان ز سرو قدی می دہد کہ خاک شدہ است — بہر زمین کہ فتادہ است سایۂ شمشاد
چو ہر نفس ز چمن میرود بیاد گل — مدام جامہ کبود است سوسن آزاد

غرض میں نے ان 2 محترم گروہوں یعنی صوفیا و علماء کا تذکرہ تقدیم و تاخیر کا لحاظ کیے بغیر درج کردیا ہے۔ سخن شناس قارئین اعتراض نہ فرمائیں۔ کیونکہ یہ انتخاب نہایت پریشان حالی میں بڑی عجلت میں لکھا گیا ہے۔ نیز میرے پاس یادداشت بھی نہیں تھی کیونکہ بیاض رکھنے کی کبھی فرصت ہی نہیں ملی۔

میں تو وہ بخیہ گر ہوں جس کی سوئی ہر وقت کھو جاتی تھی اور وہ کہا کرتا تھا: "مجھے کیا سمجھتے ہو، اگر میرا وقت سوئی کے ڈھونڈنے میں ضائع نہ ہوتا تو ہر روز میں ڈھیروں کام کرکے رکھ دیتا"۔ میں نے جن لوگوں کا تذکرہ کیا ہے ان میں سے بعض تو اس قبیل کے ہیں کہ میری خواہش کے مطابق تو ان کا نہ ہونا ہی بہتر ہوتا، کیونکہ بہت سے ایسے صدیق ہیں جو بعد میں زندیق ہی ثابت ہوتے ہیں۔ اگر ان تمام میں سے کوئی ایک شخصیت بھی

ایسی ہو جو اللہ کی بارگاہ میں مقبول ہو تو بس میری نجات اور شفاعت کے لیے وہی ایک شخص کافی ہوگا۔ ویسے یہ سارا گروہ ولایت کے اعزاز سے موصوف ہے اور ان میں سے اکثر میں ولایت خاصہ جلوہ گر رہی ہے۔

میں نے بے دینوں اور دنیاداروں کا ذکر ان کے ساتھ شامل نہیں کیا ہے۔ اس معاملہ میں میں نے عارف بسطامیؒ کے قول پر عمل کیا ہے۔ وہ اپنے ایک معتقد کو نصیحت کر رہے تھے کہ اگر تم اس زمانہ میں کسی ایسے شخص کو دیکھو جو مشائخین کی باتوں پر ایمان رکھتا ہو تو میرے لیے اور خود کے لیے اس سے دعا کرانا، کیونکہ وہ شخص یقیناً خدا کے نزدیک مقبول ہے:

الٰہی نمی برم و چارہ نمی دانم
بجز محبت مردان مستقیم الاحوال

یہ بھی ایک حسن اتفاق ہے کہ ان صاحب دل اہل اللہ حضرات کی تعداد 111 ہے۔ اسی لفظ سے "قطب" کے بھی اعداد نکلتے ہیں اور لفظ "الف" کے بھی کہ اس مسودہ کو لکھتے وقت ہزارواں ہی سن چل رہا ہے۔

ان بدبختوں کی طرف سے جنھوں نے دین اسلام پر صریحاً طعنہ زنی کی ہے جو نہایت بے حیا اور بے دین ہیں، جن کی وجہ سے ملک و ملت میں فتنہ و فساد برپا ہو گیا ہے اور ان کو بجا طور پر "فتنۂ آخر زمان" کہا جاتا ہے، میرا دل سخت نالاں ہے، پھر بھی حکماء کا ذکر کرتے ہوئے ان میں سے چند کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔

عہد اکبری کے حکماء

ان حکیموں میں سے بعض حکمت علمی و عملی میں ایسے حاذق تھے جیسے ان کے ہاتھوں میں ید بیضائے موسوی آ گیا ہو۔ اپنی مہارت فنی کے لحاظ سے اعجاز مسیحی کی یاد دلاتے تھے۔ بعض کی اہمیت بس اس حد تک ہے کہ انھوں نے طب کو ایک شریف فن سمجھ کر حاصل کر لیا اور اپنی مشق سے اس کو پیشہ بنا لیا ہے۔ یہ ہوں یا وہ ہوں ایک بات سب میں مشترک ہے اور وہ ہے ''دنیا پرستی اور اقتدار پرستی''۔

حکیم الملک گیلانی

اس کا اصل نام شمس الدین ہے۔ حکمت و طب میں جالینوس زماں اور مسیح دوراں تھا۔ طب کے علاوہ دوسرے مروجہ نقلی علوم میں بھی سب سے نمایاں و ممتاز تھا۔ مجھے اس سے کبھی کوئی ربط نہیں رہا۔ جب میں نیا نیا شاہی ملازمت میں داخل ہوا تھا تو ''نامہ خرد افزا'' کو پیش کرتے وقت اس نے بلا کسی سبب کے میرے ساتھ کچھ اچھا رویہ نہیں رکھا۔ جب بادشاہ نے مذکورہ کتاب کے متعلق اس سے پوچھا کہ فلاں کی تحریر و انشا کیسی ہے؟ تو اس نے کہا اس کی عبارت فصیح تو ہے لیکن پڑھنے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہوتی۔

میرے ساتھ کچھ ایسا ہی معاملہ تھا لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ وہ خدا کے بندے کا نہایت خیر خواہ اور لوگوں کے کام بنانے والا بامروت اور آشنا پرور مخلص تھا۔ دین و عقیدہ

میں بھی نہایت مہارت تھی۔ اور شیخ الہدیہ، بہت سے طالب علموں کو منطق پڑھانے میں مصروف رہتا۔ ان طالب علموں کے اخراجات کی کفالت اور ان کی سرپرستی بھی وہی کرتا تھا۔ کسی وقت بھی ان دونوں کے بغیر دستر خوان پر نہیں بیٹھتا تھا اور محض انہی شاگردوں کے خیال سے لوگوں سے مدد اور ہدیوں میں بہت شرکت کرتا تھا۔

ایک دن شیخ سلیم چشتی کی محفل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ نصاب اور فقیہوں کا حال اور علماء کے طریقوں کی تعریف و توصیف اور شیخ بو علی سینا کی خوبیاں بتا رہا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ علماء اور علماء ایک دوسرے سے الجھ کر اپنے اپنے مسلک کی بڑائی جتانے کے لیے لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ میں نیا نیا گیا تھا کسی کو پہچانتا نہ تھا۔ اصل بحث کیا تھی، اس کا بھی علم نہیں تھا۔ تاہم میں نے اس وقت شیخ شہاب الدین سہروردی کے یہ شعر پڑھ دیے:

وکم قلت لـلقوم انتم علیٰ — شفا حفرة من کتاب الشفاء

فلما استهانوا بتوبيخنا — فرغنا الی الله حسبی کفا

فماتوا علی دین اسطاطلیس — وعشنا علی ملة المصطفیٰ

مزید تائید کے لیے میں نے مولانا جامی کا یہ شعر "تحفة الاحرار" سے سنایا:

نور دل از سینۂ سینا مجوی
روشنی از چشم نابینا مجوی

میرے شعر سننے پر حکیم بڑی طرح بگڑ گیا۔ شیخ سلیم نے کہا: "ان لوگوں میں پہلے ہی سے آگ لگی ہوئی تھی، تو نے آ کر اسے اور بھی بھڑکا دیا"۔

مشائخین اور علماء کا جب تختہ الٹ گیا تو حکیم دین کے مخالفوں اور مرتدوں کی بے حد امکان خوب خبر لیتا رہتا تھا۔ آخر جب حالات بہت بگڑ گئے تو اس نے مکہ معظمہ جانے کی اجازت طلب کی اور 988 یا 989ھ 1585ء میں حج پر چلا گیا، اور وہیں وفات پائی۔

حکیم سیف الملوک دماوندی

ایک طرف تو بڑا عالم و حکیم تھا، دوسری طرف شعر گوئی اور ہجو گوئی بھی کرتا رہتا تھا۔ اچھا

تخلص شجاعی رکھے ہوئے تھا۔ اتفاق کے بھی عجیب کرشمے ہوتے ہیں، چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ حکیم جیسے ہی کسی بیمار کے سرہانے پہنچا، بیمار ملک الموت کا ہاتھ تھام کر رخصت ہو گیا۔ مسخروں نے اس کا نام ہی "سیف الحکماء" مشہور کر دیا تھا۔

حضرت شیخ جامی محمد خبوشانی کے ایک پوتے تھے جو مخدوم زادے کے لقب سے مشہور تھے۔ حکیم نے ان کا علاج کیا اور بیچارے کا بیڑہ اس پار پہنچا دیا۔ لوگوں نے ان کی وفات کی تاریخ کے لیے دلچسپ فقرہ تراش لیا۔ "سیف الحکماء کشت" (سیف الحکماء نے مار ڈالا) ایک جلال طبیب تھے۔ ان کے بارے میں کسی نے یہ قطعہ کہا تھا جو حکیم سیف الملوک پر پوری طرح ٹھیک بیٹھتا ہے:

ملک الموت از جلال طبیب — شکوہ برد دوش پیش خدا
بندۂ عاجز شدم زدست طبیب — میکشم من یکی و او صدہا
یا ورا عزل کن ازین منصب — یا مرا خدمت دگر فرما

ہندستان میں چند سال تک وہ بیرم خاں کی سرکار میں نہایت معزز و مکرم رہا، لیکن جیسی خواہش تھی ایسی ترقی نہ ملی تو ناراض ہو کر ایران چلا گیا اور وہاں سے ایک ہجو لکھ کر بھیج دی کہ اس عہد میں شیرینی اور مزاح کے ساتھ شاید ہی کسی نے ایسی عمدہ واقعہ نگاری کی ہوگی۔ اس ہجو کے چند شعر جو مجھے یاد رہ گئے ہیں، تفریح طبع کے لیے درج کیے جاتے ہیں:

صاحبا بز غالۂ بی وقت برای بربری — گاہی او را گربہ گاہی موش پیران گفتہ ام
ہمچنی بی قشقہ و زنار یعنی شیخ ہند — نا مسلمانم اگر او را مسلمان گفتہ ام
ای شفیع الدین محمد بسکہ بی چادوی سخن — آن سخن چادت را نشنو را انسان گفتہ ام
ای فریدون در تعرض روی بی شرم ترا — نی بہاری کہ در تختی چو سندان گفتہ ام

میر فریدون نے اس کے جواب میں کہا:

اشک حکمت باف لاف ای شک آقائی اجل
آنکہ او را در معیت خانہ دربان گفتہ ام

جس زمانے میں مظفر الملک سپاہ گری کو چھوڑ کر دلی میں روپوش ہو گیا تھا، اس نے کہا تھا

شاہ درویشان مظفر الملک از من در ہم است
بندہ مولائی ز درویشی پشیمان گشتہ ام

حکیم زنبیل شیرازی

علم و دانش میں ممتاز حکیم تھا اور بادشاہ کے مصاحبوں میں داخل تھا۔

حکیم معین الملک شیرازی

اچھا شخص دوائی کرتا تھا۔ علم و کمال میں نہایت بلند مرتبہ تھا۔ اچھے اخلاق و عادات کا مالک تھا۔ بندیہ نامی شہر میں انتقال فرمایا۔

یہ اشعار اسی کے ہیں۔ خواجہ نظام الدین احمد مرحوم کے باغ سے رخصت ہوتے وقت اس نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر بطور یادگار مجھے دیے تھے۔ وداع ہونے کے بعد وہ لاہور سے راجہ علی خان حکمران برہانپور کے پاس سفیر بن کر چلا گیا۔ بس یہ اس سے میری آخری ملاقات تھی۔ وہ شعر مندرجہ ذیل ہیں:

چنان از عشق پر عشقم کہ در دنیا نمی گنجم — ہمہ جا پر عشقم گشت و من در جا نمی گنجم
اگر با غیر عشق الفت نمی گیرم عجب نبود — مثال عشقم میدان کہ در صحرا نمی گنجم
نشان از من چہ می پرسی کہ من خود ہم نمی دانم — ہما سر توحیدم کہ در آنجا نمی گنجم

ہیچ ویرانی نشد پیدا کہ تعمیری نداشت — در دل ویران عشق است اینکہ تدبیری نداشت
صید آہوی شدم کز ہر طرف کردم نگاہ — غیر جانی پاک در فتراک نخچیری نداشت

حکیم مسیح الملک شیرازی

حکیم نجم الدین عبد اللہ بن شرف الدین حسن کا تربیت یافتہ تھا۔ نہایت درویش صفت پاک

اعتقاد آدمی تھا۔ فن طبابت میں اسے ید بیضا حاصل تھا۔ دکن سے ہندستان آیا، پھر شہزادہ سلطان مراد کے ہمراہ گجرات اور دکن کی مہم پر معین کیا گیا۔ لیکن مالوہ ہی میں فرشتہ اجل نے آگھیرا۔

حکیم مصری

طب میں نظری اور عملی طور پر نہایت دور رس اور ماہر شخص تھا۔ علوم نقلی پر بھی اچھا عبور حاصل تھا۔ عجب عجب علوم سیکھ رکھے تھے۔ جیسے دعوت اسماء، علم حروف اور علم تکسیر وغیرہ۔

ہمیشہ مسکراتا نظر آتا، خندہ پیشانی سے ملتا اور گفتگو کرتا۔ لوگ اسے مبارک قدم کہا کرتے تھے۔ شیخ فیضی کے علاج میں اس نے بڑی کوشش کی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ وہ بھی کہا کرتا کہ موت کے معاملہ میں تو سب عاجز و بے بس ہیں۔ اگر علم طب سے عمر میں اضافہ ہوتا تو حکیم لوگ دنیا سے جاتے ہی نہیں۔

وہ کبھی کبھی مزاحیہ فارسی شعر بھی کہتا تھا۔ یہ اسی کا شعر ہے کہ خواجہ شمس الدین دیوان خوافی کے متعلق کہا تھا:

خواجہ شمس الدین چہ قلمی کند
در طبابت باش دقلی می کند

ایک دن اس نے کنیر کے پھول جس کو عربی میں دفلی کہتے ہیں کو دیکھ کر فی الفور کہا:

چو آتش جست کا گل از سر دفلی

بادشاہ نے لاہور میں بادشاہی محل کے صحن میں ایک چبوترہ بنوایا اور حکم دیا کہ ہر شخص اس جگہ ہمارے ساتھ نماز پڑھ سکتا ہے۔

اس موقع پر حکیم مصری نے شعر کہا:

شاہ ما کرد مسجدی بنیاد — ایہا المومنین مبارک باد
اندرین نیز مصلحت وارد — تا نماز ان گذار بشمارد

حکیم مصری نہایت سادہ لوح، بے غرض آدمی تھا۔ کسی سے کچھ واسطہ نہیں رکھتا تھا۔ برہانپور، خاندیش میں ان کا انتقال ہوا اور وہیں دفن کیا گیا۔

حکیم علی

حکیم الملک کا بھانجہ اور حکمت میں اپنے ماموں اور شاہ فتح اللہ شیرازی کا شاگرد ہے۔ شیخ عبدالنبی سے علوم نقلی کی تحصیل کی ہے۔ علوم شرعی پر اس کی اچھی نگاہ ہے لیکن اس کے باوجود ''زیدیہ'' مذہب کا کٹر معتقد اور اس زمانہ کے بیشتر حکماء کی طرح متعصب شیعہ ہے۔

اکتسابی فنون خاص طور سے علم طب میں اچھی مہارت ہے۔ مریضوں کا علاج بھی کرتا رہتا ہے، لیکن نوجوان اور خود پسند ہے۔ ابھی عملی تجربہ بھی کچھ زیادہ نہیں، اس لیے اکثر بیمار اس کے ہاتھوں ہمیشہ کے لیے اپنے دکھوں سے رہائی پا جاتے ہیں۔

شاہ فتح اللہ شیرازی کا شاگرد ہے، لیکن جب شاہ صاحب بیمار ہوئے تو حکیم علی نے تپ محرقہ میں ''ہریسہ'' کھانے کے لیے تجویز کیا جس کے بعد وہ جانبر نہ ہو سکے۔

''مرگِ ہوش است شربت بہ او''

حکیم ابوالفتح گیلانی

بادشاہ کا چہیتا مصاحب تھا۔ اس نے مزاج شاہانہ پر ایسا قابو پالیا تھا کہ دوسرے تمام درباری اس سے حسد کرتے تھے۔ نہایت ہوشیار، ذہین اور تمام ہنروں میں یکتا تھا۔ نظم و نثر میں بھی باکمال ادیب تھا۔ اسی طرح بے دینی اور تمام بداخلاقیوں میں بھی اس کی شخصیت ضرب المثل تھی۔

میں نے ان دنوں جبکہ حکیم نیا نیا آیا تھا خود اس سے سنا، کہتا تھا: ''خسرو کیا ہے بس 12 شعر کا شاعر، انوری کو خوشامدی انوری کہا کرتا تھا اور اس کو میر بادنجان سے تشبیہ دیتا تھا جو ایک مسخرا تھا۔ خاقانی کے متعلق کہتا تھا اگر اس زمانہ میں ہوتا تو بڑی ترقی کرتا۔ اس طرح کہ جب وہ، خاقانی میرے گھر آتا تو میں تھپڑ مار کر اس کی سستی اور کاہلی کو دور کر دیتا

اور یہاں سے ابوالفضل کے گھر جاتا وہ اسے طمانچہ لگاتا۔ اس طرح ہم اس کے اشعار میں اصلاح کرتے رہتے"۔

حکیم حسن گیلانی

طبیب حاذق تھا۔ معالجہ میں اچھی شہرت تھی۔ عالم تو اتنا بڑا نہیں تھا، لیکن نہایت با اخلاق اور خوش کردار آدمی تھا۔

حکیم ہمام

حکیم ابوالفتح کا چھوٹا بھائی، اخلاق میں اپنے بھائی سے بہتر تھا۔ اگرچہ نیک نہیں تھا لیکن عملاً شر پسند بھی نہیں تھا۔

حکیم حسن، شیخ فیضی، کمالائی صدر اور حکیم ہمام حسب ترتیب ایک مہینہ کے اندر اندر فوت ہو گئے۔ ان کا مدتوں سے جمع کیا ہوا مال و اندوختہ ایک ہی گھڑی میں کہاں سے کہاں نکل گیا اور یہ حسرت و محرومی لیے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے:

جان بجانان دہ وگرنہ از تو بستاند اجل
خود بدہ انصاف جان من کہ این یا آن نکوست

حکیم ہمام کا لاہور میں انتقال ہوا۔ اس کی لاش بعد میں حسن ابدال لا کر اس کے بھائی کے پہلو میں دفن کی گئی۔

حکیم احمد ٹھٹھوی

عالم تو بہت اچھا تھا، طب بھی جانتا تھا، بس حکیم بنا ہوا تھا، ویسے تمام علوم کا جامع تھا۔ عرب اور عجم کی سیاحت کی تھی۔ نہایت خوش مزاج آدمی تھا لیکن بہت سے فضول خبط لگے ہوئے تھے۔ طبیعت کا لالچی بھی تھا۔ اہل بیت ہونے کا دعویٰ کرتا تھا۔ میں نے اس سے اکثر کہا کہ تجھ میں یہ استعداد نہیں کہ تو اہل بیت میں سے ہونے کا دعوے کرے کیونکہ

ہندوستان میں ایسے دعوے نہیں چل سکتے۔ اگر تو واقعی دیندار ہے تو دین اسلام کی دعوت دے کہ اس زمانہ میں اسلام کا بس نام ہی رہ گیا ہے، لیکن میرے۔ کہنے کا اس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ آخر اس نے اپنے اعمال کو بھگت لیا اور مرزا فولاد نے خنجر مار کر ہلاک کر دیا۔

مرنے پر میں نے اسے دیکھا دوسروں نے بھی دیکھا تھا۔ خدا کی قسم اس کی خدائی بے شک و لاریب ہے وہ عین سور کی شکل کا نظر آرہا تھا چنانچہ لوگوں نے اس کی تاریخ نکالی "خوک سقری" شیخ فیضی نے اس کی تاریخ "بیست و پنج ماہ صفر" نکالی ہے۔

میں نے حدیقہ کے اس شعر میں تھوڑا سا تغیر کر کے قاتل اور مقتول دونوں کی مناسبت سے دو تاریخیں نکالی ہیں:

فرحنا بغفران صادق

وحنا بوصف وی لایق

دوسری تاریخ ہے "زہی خنجر فولاد"۔

حکیم لطف اللہ گیلانی

بڑا حاذق طبیب تھا۔ وہ اچھے علم کا مالک تھا۔

حکیم مظفر اردستانی

کم عمری ہی میں شاہ طہماسپ کے طبیبوں میں شامل تھا۔ ہندستان آیا تو بڑی ترقی کی۔ بڑا باصلاحیت نوجوان ہے۔ اخلاق نہایت عمدہ اور کردار پاکیزہ ہے۔ بیماروں کو اس کی آمدی بڑی بابرکت معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ بلحاظ علم اتنا اونچا نہیں لیکن اس کا تجربہ بلا شبہ بہت اچھا ہے۔

حکیم فتح اللہ گیلانی

طب کی کتابیں بہت پڑھی ہیں۔ علم ہیئت سے بھی بخوبی واقف ہے "قانون" پر فارسی میں ایک شرح لکھی ہے۔ ان دنوں کابل میں قلیج خاں کے علاج کے لیے گیا ہوا ہے۔

شیخ بینا

یہ سرہند کے شیخ حسن طبیب کا لڑکا ہے۔ جراحی میں بڑا ماہر ہے۔ ہاتھیوں کے علاج میں تو اسے مہارت حاصل ہے۔ آج کل بے قید اور بے حیا ہو گیا ہے۔

اب تک ہم نے جتنے حکیموں کا ذکر کیا ہے، ان کے علاوہ اور بھی بہت سارے مسلمان اور ہندو حکیم ہیں، لیکن ان جاہلوں اور ملعونوں کے تذکرہ پر دل آمادہ نہیں ہوتا۔

عہدِ انگریزی کے شعراء

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

چندسال خان زمان کے پاس رہا، بعد میں بادشاہی ملازمت میں پہنچا۔ دربار میں اسے ملک الشعراء کا خطاب ملا۔ اس کے اشعار کے چند دیوان اور ایک مثنوی ہے۔ کہتے ہیں اس نے چالیس پچاس ہزار شعر کہے ہیں۔ مگر اس کا کلام کچھ زیادہ بلند نہیں، لیکن کیفیت وکیفیت کے لحاظ سے اس کے اشعار اپنے ہم عصروں سے کہیں زیادہ ہیں، تصوف کی زبان پر بھی بڑا عبور حاصل ہے۔

اس کی وفات جمعہ کی شب 27 رجب 980ھ/1572ء احمد آباد میں اچانک اور دفعتاً ہوئی اور اکبر کے حکم سے اس کو "سرگنج" (سرکھیج) میں جہاں بڑے بڑے مشائخین اور سلاطین دفن ہیں، دفنایا گیا۔

قاسم ارسلان نے قاسم کاہی کی زبان سے یہ تاریخ کہی:

قطعہ

دوش غزالی آن سگ ملعون   مست جنت شد بسوی جہنم
کاہی سال وفاتش بنوشت   ملحد دونی رفت زعالم

دیگر

بود گنجی غزالی از معنی   مدفنش خاک پاک سرگنج است
بعد یک سال تاریخش   احمد آباد و خاک سرگنج است

یہ مطلع اسی کے نام سے مشہور ہے لیکن میں نے غزالی کے دیوان میں اسے نہیں پایا:

شوری شد واز خواب عدم دیدہ کشودیم
دیدم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

غزالی کے کلام کا نمونہ:

در کعبہ اگر دل سوئی غیر است ترا   طاعت ہمہ فسق و کعبہ دیر است ترا

در دل تجلی است و ساکن میکدهٔ   می نوش که عاقبت بخیر است ترا

مازگرگ خود نمی ترسیم اما این بلا است
کز تماشای بتان محروم می باید شدن

خفتگان خاک یکسر کشتهٔ تیغ تو اند
هیچ دلی نیست شمشیر اجل را در میان

چون فانوس خیال و عالمی حیران درد
مردمان چون صورت فانوس سرگردان درد

شده زه بر کمان قامت زاهد روائی او
ولی زندان نمی ترسند از تیر دعائی او

رباعی

بحریست ضمیر من که گوہر دارد   تیغی است زبان من که جوہر دارد
صور قلم نغمهٔ محشر دارد   مرغ نگوتم تخلّم پر دارد

اس نے ایک قصیدہ میں صنعت "سیاق العدد" ایک تا سو کے اعداد میں بیان کی ہے جس کا مطلع ہے:

بہ یک سخن ز دو لعلت بہ فیض یافت مسیحا
حیات باقی و نطق و نشاۃ احیا

غزالی کا ایک شعر ہے:

ما بادہ ایم و گرد گریبان ما خم ست
داریم نشاۃ کہ دو عالم درو گم است

قاسم کاہی

اصل نام میاں کاہی کابلی ہے۔ اس کے اشعار میں پختگی نہیں۔ ان کا سارا مضمون دوسروں سے لیا ہوا ہے۔ تاہم بحیثیت مجموعی کوئی شخص اس کی برابری نہیں کر سکتا تھا۔ علم تفسیر، ہیئت، کلام اور تصوف پر اس کو بڑا عبور حاصل تھا۔ علم موسیقی میں بھی اس کی ایک کتاب ہے۔ تصوف، معما گوئی، تاریخ اور حسن ادا میں وہ اپنے زمانہ کا بے مثل شخص تھا۔

اگر چہ اس نے متقدمین اور معاصرین اکثر مشائخ کی صحبت سے فیض اٹھایا ہے اور مولوی جامی اور دوسرے بزرگوں کا زمانہ دیکھا ہے لیکن ساری عمر وہ الحاد و زندقہ میں مبتلا رہا۔ آزادی، سخاوت، ایثار پسندی اس میں بہت زیادہ تھی۔ ہمیشہ اس کے پاس قلندروں، آوارہ لڑکوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ کتوں سے اسے بڑا پیار تھا۔ غالباً کتے ملک اشراقی کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔

ایک قطعہ میں اس نے لڑکیوں کے ساتھ شیفتگی کو اس طرح بیان کیا ہے۔

قطعہ

این نصیحت بشنواز سیفی   تا ہمہ عمر ترا بس باشد
شعر خوب وپسر زیبارا   معتقد باش زہر کس باشد

ہم کو اس کے مذہب و مسلک سے کیا کام اس کے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں:

چون سایہ ہمراہم بہر سو روان شوی   باشد کہ رفتہ رفتہ بما مہربان شوی
ای پیر عشق صحبت یوسف رخی طلب   نبود عجب کہ ہمچو زلیخا جوان شوی

چون تار عنکبوت زہجر تو شد تنم
در گوشۂ خراب ازان حست مکنم

اس کی دو نوں میں صوفیانہ لحاظ سے بہت عمدہ ہیں اور کافی مشہور ہوئی ہیں۔
بعض مجالس میں پڑھا جاتا ہے اور بادشاہوں و صوفیوں کی محفلوں میں بڑی پسند کی
جاتی ہیں۔

مطلع

مرغ تا بہ فرق مجنون پر زدن انگیز کرد
آتش سودای لیلی بہ سر او تیز کرد

چون زنگس عارضش آئینہ پرگل شود
گرد ران آئینہ طوطی بگرد بلبل شود

اسم اللہ پر اس کا شعر ہے:

نیست از ہستیش کسی آگہ
ابدا کان لا نہا منہا یتہ لہ

اسم نبی ﷺ کا شعر:

تارہ شرح را شگافتہ ام
از محمد نبی شگافتہ ام

اس کا دیوان بھی بہت مشہور ہوا ہے۔ بوستان کے جواب میں قافیہ بہ قافیہ "گل افشان" نامی مثنوی لکھی ہے، جس کا مطلع ہے:

جہان آفریدہ بجان آفرین
بجان آفرین صد جہان آفرین

اس کے چند شعر:

بنا زکشت جہانی بت عشوہ گر من
ہنوز بر سر ناز است ناز پرور من

ریخت باران بلا بر تن غم پرور ما
چہ بلاہا کہ نیا ورد فلک بر سر ما

نہ نرگس ست عیان بر سر مزار مرا
سفید شد بحسرت چشم انتظار مرا

ایک جوگی کے لڑکے کے متعلق کہا:

آتشین روئیت زخاکستر چو نیلوفر شدہ
یا نقاب از آتش روی تو خاکستر شدہ

کاہی کے اس مطلع کا مضمون ملا وصفی کابلی کے مطلع سے ملتا جلتا ہے۔ وصفی کا مطلع ہے:

از تپ ہجران نہ خاکستر مرا بستر شدہ
بستر از سوز من بیمار خاکستر شدہ

لوگوں نے جب ملا قاسم سے کہا کہ تمہارے اکثر اشعار میں دوسرے شاعروں کا مضمون ملتا ہے۔ اس نے جواب دیا: ''اس معاملہ میں میں نے کوئی خاص التزام نہیں کیا اگر تمہیں پسند نہیں ہیں تو قلم تراش لو اور ایسے اشعار میرے دیوان سے نکال دو''۔ اس نے ''اصطرلاب'' کے متعلق ایک بڑا اچھا قصیدہ کہا ہے۔ جس میں ہمایوں بادشاہ کی مدح ہے۔ بلا شبہ اس قصیدہ میں کمال کر دکھایا ہے۔

جب خواجہ معظم خاں پاؤں میں تکلیف ہونے کے باوجود خیر آباد سے ملا قاسم کاہی کی عیادت کے لیے آیا تو اس نے فی البدیہہ یہ غزل اور اس کا ترنم بھی بنا دیا:

ماندی قدم زنانہ بر دل نیاز من — درون مباد پای ترا سرو ناز من
ہر چند وصف وصل تو کردم شب فراق — کوتہ نگشت قصۂ درد دراز من

ایک دن ملا بادشاہی باغ میں نہر کے کنارے سیر کر رہا تھا، صبوحی شاعر وہاں آنکلا اور

کہا: ''استاد آپ نے سنا ایک پارہ سومن عراق میں مرگیا''۔ ملا کاہی نے کہا: ''خدا تم کو بحفاظت زندہ رکھے''۔

گجرات کے پہلے سفر میں ملا غزالی لشکر کے ہمراہ تھا۔ اس وقت وہاں ملا قاسم کاہی کے فوت ہوجانے کی خبر اڑ گئی تھی۔ غزالی نے اس وقت یہ تاریخ کہی تھی۔ قاسم کاہی تو مرے نہیں لیکن یہ قطع تاریخ خوب ہوگیا:

قطعہ

رفت بی چارہ کاہی از دنیا　　سال تاریخ او اگر خواہی
چون بنا چار رفت شد نا چار　　از جہان رفت قاسم کاہی

اس سے پہلے کہ اس افواہ کا جھوٹ سچ ظاہر ہو جاتا، ملا قاسم کاہی نے غزالی کی وفات کی ایک تاریخ اور پھر اس کی تلافی میں دوسری تاریخ کہی تھی۔

بہر حال جھوٹ جھوٹے کے آگے آکر ہی رہتا ہے، اس شعر کے مطابق کہ:

شاعران دیدم زروی تجربت
بی تعاقب بی عقب بی عاقبت

اس زمانہ کے سارے ہی چھوٹے بڑے شاعر بجز تین چار معمر قدما کے حیدر مشرب بے قید اور آزاد ہیں۔ یہ دونوں غزالی اور کاہی تو ان آوارہ مشرب شاعروں کے پیشوا اور مقتدا تھے کہ انھوں نے اپنی خباثتوں کو اپنے شاگردوں اور ماننے والوں میں خوب جی کھول کر تقسیم کیا۔ میں جب ان شاعروں کو دیکھتا ہوں تو اس فکر میں پڑ جاتا ہوں کہ کہیں شعرائے متقدمین ایسے ہی نہ گزرے ہوں۔

خواجہ حسین مروی

یہ حضرت شیخ ربانی رکن الدین علاء الدولہ سمنانی کے فرزند ہیں۔ معقولات کا علم مولانا عصام الدین اور ملا حنفی سے حاصل کیا اور شرعی علوم میں خاتم العلماء محدثین شیخ ابن حجر مکی

کی شاگردی کی۔

شعر گوئی، انشاء پردازی، صنائع بدائع، حسن بیان، فصاحت و بلاغت، مزاح و لطافت میں بے نظیر شاعر تھا۔ اس کا ایک دیوان مکمل ہو گیا ہے۔ اس کے شعر اوسط درجہ کے ہوتے ہیں۔ نمونہ کلام:

ای از مژہ بی تو آب رفتہ   وز دیدہ خیال و خواب رفتہ

خود را بما چنان کہ بودی نمودۂ
افسوس آن چنان کہ نمودی نبودۂ

اس شعر کا ماخذ غالباً یہ رباعی ہے:

گویم مگو زاہل و قایم نہ ایم   و اندر صفت صدق و صفا یم نہ ایم
آراستہ ظاہریم و باطن نہ چنان   افسوس کہ آنچہ می نمایم نہ ایم

یہ اسی کے اشعار ہیں:

یا ماگرہ چو غنچہ در ابرو فگندۂ
با غیر لب چو پستہ خندان کشودۂ

مجتبی کہ مرا با تو ھست می خواہم
ھمین تو دانی و من دانم و خداوند

اکبر بادشاہ نے کتاب ''سنگھاسن بتیسی'' کا ترجمہ کرنے کا اسے حکم دیا تھا جسے وہ پورا نہیں کر سکا۔ اس ترجمہ پر اس نے جو نعت لکھی تھی اس کے چند شعر یہ ہیں:

خوش الحان عندلیب باغ ابلاغ   کحل نرگسش از کحل مازاغ
کشیدہ در زبور تیغ بی تیل   قلم بر نسخ توریت و انجیل
نبوت را بدر گاہش حوالہ   امام الانبیاء ختم الرسالہ

رباعی

آنم کہ ممالک سخن ملک من است — صراف خرد صیرفی سلک من است
دیباچۂ کن از دفتر من ورقیست — اسرار دوکون بر سر کلک من است

979ھ/1571ء میں اس نے ہندوستان سے وطن واپس جانے کی رخصت حاصل کی۔ شیخ فیضی نے جو اس کا تربیت یافتہ تھا اس کی تاریخ ''دام ظلہ'' نکالی وہ کابل چلا گیا۔ میرزا محمد حکیم نے اس کی عزت و تکریم کی۔ میرزا کو اس نے ہندوستان کے نفیس کپڑے اور قیمتی سامان کی پیشکش کی۔ دربار میں ایک محرر ان تحفوں کی فہرست بنا رہا تھا۔ خواجہ حسین نے جلد بازی کر کے وہ کاغذ محرر کے ہاتھ سے چھین لیا اور ہر کپڑے کی قسم اور نام تفصیل و وضاحت سے لکھنے لگا اور خود ہی اس کی قیمت بھی مقرر کر دی میرزا کو یہ جلد بازی اور اوچھاپن اچھا نہ لگا اور وہ مکدر ہو کر محفل سے اٹھ گیا، اٹھتے ہوئے کہہ گیا کہ یہ سارے تحفے لوگ لوٹ لیں ہم کو نہیں چاہئیں۔ خواجہ حسن کا جلد ہی کابل میں انتقال ہو گیا۔

قاسم ارسلان

اس کا باپ اپنے آپ کو ارسلان جاذب کی نسل سے بتاتا تھا۔ یہ ارسلان سلطان محمود غزنوی کا ایک مشہور امیر گزرا ہے۔ قاسم نے اسی مناسبت سے اپنا تخلص ارسلان رکھا تھا۔ اس کا اصلی وطن طوس ہے۔ ماوراء النہر میں نشو و نما ہوئی۔ قاسم ارسلان صاحب دیوان، شیریں کلام شاعر اور اچھا خطاط تھا۔ خوش طبع اور خاص و عام میں ہر دلعزیز تھا۔ بڑا ہنس مکھ اور بے تکلف آدمی تھا۔ تاریخ گوئی میں تو اس کا کوئی ہمسر نہیں ہوا۔ اس کے چند شعر یہ ہیں:

خواہم کہ سر بر آرم در حشر از زمینی
کانجا بناز بگرہ پا ماندہ ناز نینی

ای نیم جان آمدہ بر لب تراچہ قدر
جای کہ یک نگاہ بصد جان برابرست

مجھے یاد ہے کہ یہ آخری مصرع ایک اور غزل میں اس طرح ہے جس کے کہنے والے نامعلوم نہیں ہے۔ وہ شعر یہ ہے:

با آنکہ ہست خلوت وصل تو بی رقیب
شرم تو با ہزار نگہبان برابرست

اسی کا شعر ہے:

لفظ و معنی مجال من گر چند
بی تو چون روی در کتاب کنم

گریان چو بسر منزل احباب گزشتیم
صد مرتبہ در ہر قدم از آب گزشتیم

اس نے اجمیر کے پہاڑ کی تعریف میں جو حضرت خواجہ اجمیری کے مزار کے پاس ہے، مثنوی کہی ہے:

زہی کوہ اجمیر خیر سرشت
مقام سر مقتدایان چشت

چہ کوہی کہ چون سود بر اوج سر
محیط سپہرش بود تا کمر

نماید جرم مہ و آفتاب
براہ کوہ مانند چشم عقاب

چہ خورشید وروی عیان چشمہا
کواکب بود رنگ آن چشمہا

بی نسر طائر گردون شتافت
کہ بر قلہ اش راہ باید نیافت

شود گر ازان قلعہ تنگی رہا
بزیر فلک رازہم قلعہ ہا

نہ برقست ہر سو درخشان زتیغ
کہ آن کوہ را سود بر چرخ تیغ

ز بالائی آن قلعہ گاہ نگاہ
فلک چشمہ و چشم ماہی است ماہ

بر وصل آن قلعۂ پر شکوہ
ہزاران چو الوند و البرز کوہ

چو بر خیز داز دامن آن عقاب
فتد سایہ اش بر مہ و آفتاب

چنین ارسلان رفعت پایہ اش
کہ جا کردہ خورشید در سایہ اش

ملا نے اس سال جب کہ بادشاہ نے اٹک سے آکر لاہور میں قیام کیا تھا، 995ھ 1587ء میں وفات پائی۔

یہاں تک میں نے بہ ترتیب ان چار شاعروں کا اس لیے تذکرہ کر دیا کہ یہ شاعری میں بڑے مشہور و معروف ہیں۔ اس کے بعد میں جن شاعروں کا تذکرہ کر رہا ہوں ان کو حروف تہجی کی ترتیب سے بیان کروں گا۔

آتشی قندھاری

بابر بادشاہ کے ساتھ ہندوستان آیا تھا۔ لشکر میں واقعہ نویس تھا۔ ہمایوں بادشاہ کے زمانہ میں بھی وہ اپنے عہدہ پر فائز رہا۔ 973ھ 1565ء میں لاہور میں فوت ہوا۔

نمونہ کلام:

سر قلم رفت بی تو دریا شد تماشا کن
یا در کشتی چشم نشین و سیر دریا کن

اسی کا شعر ہے:

خنجر بمیان تیغ بکف چین بہ جبین باش
خونریز و جفا پیشہ کن و بر سر کین باش
از لطف و وفائی خبری را چکند کس
مائل بہ جفا ستمگری را چکند کس
در شفق گشت شب عید نمایان سر نو
تا کنیم از پئی جام ہی گلگون تک و دو

ہمایوں بادشاہ کی محفل میں ظفر کے قلعہ میں اس نے یہ رباعی کہی تھی۔

رباعی

صد شکر کہ شاہ از غم بیماری است   برخاست و بر مسند اقبال نشست

از صحت ذاتش خبری می آید   الحمد للہ کہ بہ صحت پیوست

اشرف خان میر منشی

مشہد مقدس کے حسینی سیدوں میں سے ہے۔ خوش نویسی میں بڑا ماہر اور 7 قلم کا استاد تھا۔ بادشاہ کے امیروں میں شامل تھا۔ شعر کہتا تھا لیکن شاعری تو اس کے لیے بس ایک تہمت ہی تھی۔ بس طبیعت موزوں تھی، چند شعر یہ ہیں:

نارسیدہ زلف ساقی دوران جامی
میرسد سنگ ملامت بسبویم چکنم

مائیم بعالم کہ دل شاد نداریم   ناشاد ولی چون دل خود یاد نداریم

رباعی

یارب تو مرا باتش قہر مسوز   در خانہ دل چراغ ایمان افروز
این خلعت زندگی کہ شد پارہ بجرم   از راہ کرم برشتہ عفو بدوز

رباعی

حیفش نسود چون زر خالص عیار عشق   آن بہ کہ نقد عمر کنم صرف کار عشق
تا صفحہ جمال تو گل گل شگفتہ است   بلبل صفت مراست بدل خار خار عشق

امیر قاضی اسیری

صاحب فضل وکمال شاعر، حکیم الملک کا ممتاز و پسندیدہ شاگرد تھا۔ اپنے زمانہ کا خوش کلام شاعر گزرا ہے۔ چونکہ ہندستان کی آب وہوا اس کے موافق نہ تھی اور بادشاہ کی محفل میں شناسائی کے باوجود کوئی امتیاز حاصل نہ ہو سکا تھا اس لیے ولایت چلا گیا اور اپنے آبائی وطن رے میں انتقال کر گیا۔ یہ اشعار اس کی بلاغت فکر کا نمونہ ہیں:

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] 1973 [illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

در موسم گل عزم سفر کرد ازین باغ | دلہا زغمش بہ یتہ آغشتہ بخون شد
تاریخ ولی از بلبل ماتم زدہ جستم | درنالہ شد و گفت گل از باغ برون شد

یہ شعر بھی میر اماں کے ہیں:

وصف قدت بالف چون کنم ای نخل حیات | کہ الف ساکن وقد تو بود در حرکات

دل بہ فکر آن دہان در تنگنائی حیرت است
حیرتش رودادہ از جائی کہ جای حیرت است

غافل از یاد تو ای شیرین شمائل نیستم | گر تو از من غافلی من از تو غافل نیستم

رباعی

اثبات وجود را چہ حاجت بہ بیان | چون خود ہمہ اوست آشکار و نہان
گویند نہ نفی غیر بکشائی زبان | نفی چہ کنم کجاست از غیر نشان

رباعی

سجادہ نشین مشعبد چرخ کبود | سیمائی صلاح صبح از رخ نبود
شد بہر قیام راست در یمنۂ روز | پیشین بہ رکوع رفت و دیگر بسجود

میر شرف امان اصفہانی

نہایت با سلیقہ شاعر تھا۔ بیس سال تک ہندستان میں درویشانہ حال میں رہا۔

نمونۂ کلام:

رو بہ سیل سرشکم بسوئی خانہ او
کہ گرد غیر بشوید ز آستانہ او

لعلت کہ آب زندگی از وی نشان دہد
کو حضرتا بہ بند واز ذوق جان دہد

تا بہ تیغت چو امانی سر خود در بازم
جان سپر ساختہ در وصف سپاہ آمدہ ام

ہمہ وصل تو ز ان غیر اضطراب ندارم
کہ سوی غیر نظری کنی و تاب ندارم

قاضی احمد غفاری قزوینی

قاضی احمد امام نجم الدین عبد الغفار کی اولاد میں سے ہیں۔ امام موصوف شافعی مذہب کی کتاب "حاوی" کے مصنف تھے۔ قاضی احمد بڑے صاحب علم انشاء پرداز مورخ اور خوش طبع بزرگ تھے۔ ان کی ایک کتاب "نگارستان" مشہور ہے، جس میں نہایت عجیب و غریب حالات لکھے ہیں۔ بلا شبہ ایسا دلکش و نادر مجموعہ اس دور میں کسی اور نے پیش نہیں کیا۔ تاریخ پر ان کی تصنیف "نسخ جہان آراء" ہے جس میں حضرت آدم سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک کے حالات اجمالاً بیان کیے ہیں۔

آخر عمر میں سلاطین عراق کی وزارت سے استعفیٰ دے کر بیت الحرام کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے اور حج کی سعادت حاصل کر کے بندرگاہ دابل سے ہندستان آنا چاہتے تھے کہ اجل نے گریباں پکڑ لیا۔ 975ھ/1567ء میں فوت ہوئے۔

شعر کا

پس از عمری نشیند گرد می در چشم آن بدخو
تپد دل در برم ترسم کہ ناگہ زود برخیزد

میر اشکی قمی

اس کے اشعار میں خیال آفرینی نہایت بلند ہے۔ آصفی کی پیروی کرتا ہے۔ آگرہ میں وفات پائی۔

نمونۂ کلام:

از بس کہ سنگ بر سر زدمی تو سینہ چاکی
آن سنگ در کف او گردید مشت خاکی

بی سنگ تہمت بر سر من دل تنگ خواہم زد   اگر دستم رود از کار بر سنگ خواہم زد

شمعت قصیر دار شبہا بندہ می شود
صد بار اگر سرش ببری زندہ می شود

مستانہ کشتگان تو ہر سو فتادہ اند   تیغ ترا مگر کہ بہ می آب دادہ اند

بسکہ تن بگداخت بی روز آتش سودا مرا
گر نہی زنجیر بر گردن فتد در پا مرا

کہتے ہیں جب مندرجہ بالا مطلع کو میر اشکی نے قندھار میں مولانا صادق کے سامنے پڑھا تو انھوں نے کہا: ”تم نے یہ مضمون امیر خسرو سے اڑایا ہے“۔

خسرو نے کہا ہے:

بسکہ بگداخت ز ہجرت تن پرور سودایم
گر نہی طوق بگردن فتد اندر پایم

اشکی کا ایک اور شعر ہے:

اگر خواہم کہ در راہ تو از سنگ بلا رفتم
زہر مو بر من آید سنگ و نگذارد در یار رفتم

اس نے "سنگ" پر اتنے مضمون باندھے ہیں کہ کسی اور کے لیے گنجائش نہیں رہی

لا غرتم میان سگان ہین بکوی خود
این ایک بسوی خود کشد آن یک بسوی خود

موی ژولیدہ کہ آید ز سر من تا پا زان میان سوئی سفید یست تن من پیدا

یول قلی انیسی

شاملو ترکمانوں سے تعلق رکھتا ہے۔ خان خاناں کے یہاں ملازم ہے۔ نہایت نرم وملائم اشعار کہتا ہے۔ ایک مثنوی بھی لکھی ہے۔

کلام کا نمونہ یہ ہے:

آتش کدہ است دل ز خیال تو و برو
داغ تو ہندوی کہ نگہبان آتش است

چو بینی شعلۂ را مضطرب آتش پرستی دان کہ روحش رفتہ و جسمش در آتش خانہ میر قصد

عشق و مقناطیس یک جنس اند کز دل تا وکش
تا برون می شد محبت جذب پیکان کردہ بود

ملا غنی احتی

نورسیدہ جوان ہے۔ کچھ عرصہ تک گجرات میں خواجہ نظام الدین احمد کے ساتھ رہا تھا۔ پہلے خوبی تخلص رکھا تھا۔ خواجہ مرحوم نے بدل کر "احتی" رکھوادیا۔ اب بڑے شاہزادے کی خدمت میں رہتا ہے۔

نہایت خوش طبع شاعر ہے۔ یہ رباعی اسی کی ہے۔

منم کہ غیر غم اندوختن نمی دانم
تمام اشکم و واسوختن نمی دانم
ہنوز خاطر اگر روشناس خورشیدم
چراغ بخت خود افروختن نمی دانم

اختری بدخشی

اسم باسمّٰی ہے "فتوحات" اور "فصوص الحکم" کی چند گمراہ کن باتیں یاد کرلی ہیں۔ چونکہ فرعون کے ایمان کے بارے میں ہر ایک سے بحث کیا کرتا تھا اس لیے لوگوں نے اس کو "وکیل فرعون" کا خطاب دے دیا۔ یہ مطلع اسی کا ہے:

گفتی و فاکنیم باحباب یا جفا
ای شوخ بندۂ سخن اولیم ما

الغی قلیج خان

"جان قربانی" نامی گروہ سے متعلق ہے۔ علمی اور عملی ہنر سے آراستہ ہے۔ اس وقت پنج ہزاری امیر ہے۔ دین کے بارے میں اس کا اعتقاد درست ہے۔ کچھ عرصہ تک "محلۃ الملک" کے عہدہ پر بھی فائز رہا۔ ان دنوں کابل کی حکومت پر مقرر ہے۔ طبیعت میں شعرو نظم کا اچھا سلیقہ اور ملکہ ہے۔

نمونۂ کلام:

تازہ عارض آفتاب حسن نقاب انداختہ
ذرہ سان خورشید را در اضطراب انداختہ

کشتۂ آن نرگس مستم کہ وز عین خمار

عالی را کشتہ و خود را بخواب انداختہ

دو نرگس مست تو آشوب عقل و دین ستند
کمان کشیدہ زہر گوشہ در کمین ستند

نیست در دل غنچۂ پیکان آن قاتل مرا   بی لبش خونی کہ خوردم شد گرہ در دل مرا۔

الفتی یزدی

علوم ریاضی میں بڑا ماہر تھا۔ خان زمان کے ساتھیوں میں شامل تھا۔ انہی ہنگاموں میں گرفتار ہوا۔ اگرچہ قتل ہونے سے بچ گیا لیکن موت سے جان نہ بچا سکا۔

اسی کا ایک مطلع ہے:

تا گرد صفت دامن یاری نگرفتیم
از پانہ نشستیم و قراری نگرفتیم

اسی مطلع پر خان زمان نے ایک ہزار روپیہ بطور انعام کے دیا تھا۔

مشت خاشاکیم و داریم آتشی ہمراہ خویش
دور نبود گر بسوزیم از شرارہ آہ خویش

الفتی عراقی

کچھ عرصہ تو وہ کشمیر میں میرزا یوسف خان کے پاس رہا، وہاں اس نے ایک "شہر آشوب" کہا تھا جس کا شعر یہ ہے:

سر موی موشگ پر ان درخت شعر است
قد جوزا و بروت سرطان را عشق است

اسی شہر آشوب میں میرزا یوسف خان کے ایک محبوب کے متعلق کہا تھا:

مرزا یوسف خاقان زمان را عشق مست
عشق پاک تو وخط دگران را عشق مست

بیرم خاں خان خاناں

بیرم خاں مرزا جہاں شاہ کی اولاد میں سے ہے۔ دانائی، سخاوت، خلوص، حسن اخلاق، نیازمندی و انکساری میں کوئی اس کی مثال نہ تھا۔ ابتدا میں وہ بابر بادشاہ کے ساتھ رہا۔ پھر ہمایوں بادشاہ کی خدمت میں ترقی کی اور خان خاناں کا خطاب پایا۔ اکبر بادشاہ نے اس کے القاب میں "بابا ام" کا اضافہ کر دیا۔

بیرم خاں فقرا اور درویشوں کا معتقد، خود صاحب حال اور خوش خیال آدمی تھا۔ یہ اس کی کوشش، بہادری اور حسن تدبیر تھی کہ ہندستان دوسری بار مغلوں کے ہاتھوں فتح ہوا اور ایک مضبوط سلطنت قائم ہو سکی۔

اس کی فیاضی کا ایسا شہرہ تھا کہ دور دراز سے اہل علم و فضل آتے تھے اور اس کی بارگاہ سے مالا مال ہو کر جاتے تھے۔ ایک دنیا اس کی شخصیت پر ناز کرتی تھی۔ آخر زمانہ میں دشمنوں نے اکبر کو اس سے بدظن کر دیا۔ پھر اس کا جو حشر ہوا وہ ہم بیان کر آئے ہیں۔

نمونہ کلام:

رباعی

ارباب فنا بلند و پست ایشا نند — وز جام بقا مدام مست ایشا نند
ای کوی تو کعبہ سعادت مارا — روی روئی تو قبلہ ارادت مارا
خوش آنکہ بجذبۂ عنایت سازی — وارستہ زقید رسم و عادت مارا

حضرت علی کرم اللہ وجہ کی تعریف میں ایک قصیدہ کہا ہے جس کا مطلع ہے:

شہی کہ بگذرواز نہ سپہر افسراو — اگر غلام علی نیست خاک بر سراو
محبت شہ مردان مجوزبی پدری — کہ دست غیر گرفت است پای مادراو

ایک اور قصیدہ اضطراب کے بارے میں کہا ہے:

آن چرخ چیست کامدہ برگردش مدار
آن بدر کز میانہ شبا بش کند گزار

یا آنکہ می کند بہ مہ و خور برابری
آمد بجان زحلقہ بگوشان شہر یار

نادر بہ چشم کوکب آفتاب را
چون مچہ لوای شہنشاہ نامدار

پیوستہ آسمان و زمین زیر حکم اوست
ہمچون نگین خاتم شاہ جم اقتدار

بر کف نہادہ خوان زری پر ز اشرفی
تا بر قدوم اشرف شاہان کند نثار

شاہ بلند قدر ہمایون کہ از شرف
بر درگہش سپہر نہد روی افتقار

کہتے ہیں ایک رات ہمایوں بیرم خان سے گفتگو کر رہا تھا۔ بات کرتے کرتے بیرم پر غنودگی طاری ہوگئی۔ بادشاہ نے ہوشیار کرنے کے لیے "او بیرم میں تجھ سے کہہ رہا ہوں کہا"۔ بیرم چونک اٹھا اور کہا: "ہاں بادشاہ سلامت میں حاضر ہوں"۔ لیکن میں نے سنا ہے کہ بادشاہوں کے سامنے آنکھوں کی، درویشوں کے سامنے دل کی اور عالموں کے سامنے زبان کی حفاظت و احتیاط رکھنی چاہیے، میں اس فکر میں گم تھا کہ حضرت والا بادشاہ بھی ہیں، درویش بھی اور عالم بھی۔ میں آخر کن کن چیزوں کی حفاظت کروں۔ ہمایوں کو اس کا یہ جواب بہت پسند آیا اور بڑی تعریف کی۔

بیرم خان 968ھ/1550ء میں پٹن، گجرات میں شہید ہوگیا۔ اس کی ہڈیاں، وصیت کے مطابق مشہد میں لے جا کر دفن کی گئیں۔

بیکسی غزنوی

نہایت فاضل و کامل شخص تھا۔ حرمین کی زیارت سے فارغ ہو کر ہندستان آیا۔ عرب میں حدیث کی بعض کتابیں "مشکوٰۃ" وغیرہ پڑھیں اور میر مرتضیٰ شریفی سے سیرت و شمائل نبیؐ کا درس لیا۔ بڑھاپے کی وجہ سے اپنے وطن لوٹ آیا لیکن بمقام پشاور 973ھ/1565ء کو انتقال ہوگیا۔

نمونۂ کلام:

در دیر و کعبہ جز بتو مائل نبودہ ام ہر جا کہ بودہ ام زتو غافل نبودہ ام
فلک رارسم بی مہری نہ در دوران مابودہ کہ دوران فلک تا بودہ بی مہر و وفا بودہ

قطعہ

بی کسی گر شنود طعنۂ دشمن صد بار لائق آنست کہ آشفتہ و در ہم نشود
زآنکہ این بیت کمال است بعالم مشہور این چنین بیت چرا شہرہ عالم نشود
سنگ بد گوہر اگر کاسۂ زرین شکند قیمت سنگ نی فزاید و زرکم نشود

رباعی

ای دل تو عنان بہ غصہ وغم ندہی یک لحظہ خوشی بہ مملکت جم ندہی
یاری اگرت بدست افتد زنہار خاک قدمش بہر دو عالم ندہی

مولانا بیکسی نے لکھا ہے کہ "ایک دن غفران پناہ ہمایوں بادشاہ نے دار الخلافہ دہلی میں ایک محل کے طاق پر شیخ آذری کا یہ مطلع اپنے خاص خط میں لکھا تھا:

شنیدہ ام کہ برین طارم زراندود است
خطی کہ عاقبت کار جملہ محمود است

اتفاق کہ ہمایوں کا کچھ ہی دن بعد انتقال ہوگیا اور اسے اسی محل میں دفن کیا گیا۔ یہ ہمایوں کی کرامت ہی کہی جاسکتی ہے۔

مولانا بیکسی پر کسی نے یہ واقعہ لکھ کر حسب ذیل قطعہ بھی درج کردیا جو لکھتے ہوئے موزوں ہوگیا تھا۔

قطعہ

درین کہ شاہ ہمایون بوقت رحلت خویش نوشت بر در سر منزلی کہ ساکن بود
خطی کہ عاقبت کار جملہ محمود است بحسن کہ عاقبت خود اشارتی فرمود

چو شد بحکم قضا مدفنش ہمان منزل — کہ بود قبلۂ حاجات و کعبۂ مقصود
بماہ بہمن پی تاریخ رحلتش گفتم
بنای منزل سلطان عاقبت محمود

باقی کولابی

شاعرانہ طبیعت رکھتا تھا۔ یہ اشعار اسی کے ہیں:

ز فرقت تو گرفتار صد الم شدہ ام
تو شاد باش کہ من جلای غم شدہ ام

خوبان اگر نداند امروز قدر ما را — دانند قدر ما را فردا کہ ما نباشیم

بچشم گاہ خون دل گہی خون جگر بستہ
من غم دیدہ راہی روی او راہ نظر بستہ
نگردد ہیچ سرو آزاد در باغ جہان ہرگز
چو نرگس ہر کہ او چشم طمع در سیم و زر بستہ

باقی کافی عرصہ تک ہندستان میں رہا۔ معصوم کابلی کی بغاوت میں مارا گیا

بیانی

یہ آگرہ میں ایک آزاد مشرب وارفتہ شخص تھا۔ اس کا مطلع ہے:

ہر کہ بماز وصل آن سرو سمن بر خورد
از خوشی طلعت طالع خوش بر خورد

اس نے ایک رباعی میں کاہی اور غزالی کا محاکمہ کیا ہے:

کاہی و غزالی آن دو لا یعقل مست — در غیبت جامی و نوائی زدہ دست
در دہر کسی بے خشش لب نگذشت — کاہی چہ خس است و ہم غزالی چہ سگ است

پیروی

خواجہ آصفی کا پیرو ہے۔ مصوری میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ صورت سے حقیقت کی طرف کھینچ لے جانا اس کا فن ہے۔ اس نے ایک رسالہ "صورت و معنی" بھی لکھا ہے۔ اس کا مطلع ہے:

خداوندا از معنی تنگ و ستم　　بہ بخشای کہ بس صورت پرستم
زلطف خویشتن ای ایزد پاک　　چنان سازی بصورت خانۂ خاک
کہ ہر صورت مرا کز دیدہ آید　　بسوی معنیم روی نماید

پیروی کے اور شعر یہ ہیں:

لب درد را شراب محبت کجا دہند
کیفیتی است عشق بتان تا کرا دہند

خواب دیدم یار قیش در دل افتاد اضطراب　　مردہ بودم دید اگر بیداری گشتم ز خواب
نظر چون افگنم وقت تماشا بر سر رویش　　عتاب آلودہ بیند سوی من تا نگرم سویش
وز دیدہ چون نگاہ بان نازنین کنم　　چون ننگرد ز شرم نظر بر زمین کنم
طفل اشکم بر رہ یار سر خویش نہاد　　خوش قیماشہ درین رہ قدمی پیش نہاد
ناز پروردہ چو تاب ستم عشق نداشت　　یار را نام جفا پیشہ و بد کیش نہاد
رفتم در اضطراب چو از من جدا شود　　کان مہ مباد باد گری آشنا شود

اس کی غزلیات کا ایک دیوان ہے، ہندستان میں فوت ہوا۔

بقائی

ولایت، ایران سے نیا نیا آیا ہوا ہے۔ دکن میں ملک قمی شاعر کے ساتھ رہتا تھا۔ وہاں سے گجرات پہنچا اور میرزا نظام الدین احمد کے ساتھ رہنے لگا۔ پہلے اس کا تخلص مشغولی تھا، مرزا نے بدل کر بقائی رکھ دیا۔

اس کے اشعار میں ایک کیفیت پائی جاتی ہے اور اس کے حالات باوضع، متوازن ہیں:

تا عشق ز مژگان بتان نیشتر آورد — خون از رگ و از ریشہ من جوش بر آورد
فریادکہ تا چشم زدن تیر خیالش — در دیدہ فرو رفت و سر از دل بر آورد

بجای اشک از چشم دل انگاری بارد
ہمہ خون جگر زین ابر آتش باری بارد

مرغ دل تا صید چشم او شکار انداز بود — ہر سر مو بر سرم چون مرغ در پرواز بود

اس نے اب خان خاناں کی ملازمت ترک کردی ہے۔ کہتے ہیں آگرہ آیا ہوا ہے اور لاہور جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

ملا نورالدین محمد ترخان

پہلے نوری تخلص کرتا تھا۔ چند سال تک سرہند کے علاقے میں سفیدون نامی پرگنہ کا جاگیر دار رہا اس لیے سفیدونی کے نام سے مشہور ہوا۔

علوم ہندسہ، ریاضی، نجوم اور حکمت میں بڑا ماہر و ممتاز تھا۔ ہمایوں کا ہم راز اور ہم سخن مصاحب تھا۔ اسی دربار سے اسے ترخان کا خطاب ملا۔ سخاوت و فیاضی اور مجلس آرائی میں بے مثل آدمی تھا۔ شعر کہنے کا بڑا اچھا سلیقہ حاصل تھا۔ اس کا ایک دیوان بھی ہے۔

ایک دن فتح پور میں چوگان بازی کے میدان میں ایک ہاتھی نے اسے زخمی کر دیا۔ کہا کرتا تھا: ''گواہ رہو کہ میں نے اس اذیت و پریشانی میں بعض باتوں سے توبہ کر لی ہے''۔ لوگوں نے بہت کچھ معلوم کرنا چاہا کہ آخر کن باتوں سے توبہ کی؟ لیکن کسی خاص بات کا ذکر نہ کیا۔ اس وقت میں نے کہا: ''پہلی وہ چیز جس سے توبہ کرنی چاہیے۔ وہ شعر ہی ہے مگر اس کو یہ پتہ نہیں میرا فقرہ پسند آیا یا نہیں لیکن دوسرے بہت خوش ہوئے۔

اس نے اپنے عہد حکومت میں جمنا سے ایک نہر کھدوائی تھی جو پچاس کوس تک کرنال بلکہ اس سے بھی آگے تک جاتی تھی۔ اس نہر سے اس علاقہ میں زراعت کو بڑا فائدہ ہوا اور رعایا خوش حال ہوگئی۔ یہ نہر اس نے شہزادہ سلیم کے نام پر بنائی تھی۔ اس نہر سے اس علاقے میں زراعت کو بڑا فائدہ ہوا اور رعایا خوشحال ہوگئی۔

بعد میں اس کے حالات بہت ابتر ہو گئے اور اس نے بڑی مصیبتیں اور غم برداشت کیے۔ جس وقت اکبر بادشاہ 994ھ/1586ء میں اٹک تشریف لے گئے تھے تو اسے دہلی میں ہمایوں کے مقبرہ کا متولی بنا دیا تھا۔ اسی جگہ اس نے انتقال کیا۔

نمونہ کلام:

دل تنگ دور از ان لب خندان نشستہ ام
مانند غنچہ سر بگریبان نشستہ ام

زروی مکرمت وز راہ احسان — بہ ترخان داد خانی شاہ عادل
ازین خانی ہمین نامیست بروی — ازین نام شرف او را چہ حاصل
زتر خانی ہم او را شکوہ ہست — بہ نزد خسرو دانای کامل
کہ غیر از خان خشکی می نماند — زتر خانی تری گردد چو زائل

جس زمانہ میں اکبر بادشاہ نے حکیم مرزا پر لشکر کشی کی تھی خان مذکور حکم عدولی کر کے 989ھ/1581ء میں پنجاب سے لوٹ کر اپنی جاگیر پر چلا گیا۔ بس یہ بات بادشاہ کی بد گمانی کا سبب بن گئی۔ جب اکبر اس سفر سے واپس آیا تو فتح پور میں شاہی عتاب میں رہا اور حساب کتاب کے سلسلہ میں چند سال تک سزائیں بھگتتا رہا۔

واقف کار لوگ اس کے زوال کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ تاتار خان جو دہلی کے حاکم تھے، سے ان کی مخالفت تھی۔ اس نے تاتار خان پر ایک ہجو کہی اس ہجو میں دہلی کے بزرگوں کی شان میں بھی بے ادبی کر گیا۔ بس اسی بے ادبی کی وبا اس پر پڑی تھی۔

اس نے یہ ہجو قاسم کاہی کے نام سے منسوب کر کے مشہور کرا دی تھی۔ جس کے شعر یہ ہیں:

مفتی دہلی ست میاں خان جہان | مفت نمادہ است قناوات
حاکم شہر ست ز تاتار خان | خادم او چہرہ حمارات

اسی ہجو کا مطلع:

آہ ز دہلی و مزارات | دادہ ز خرابی عمارات

اسی ہجو میں 250 شعر ہیں۔ دہلی کے ایک فاضل بزرگ جن کا نام شیخ محمد کنبو تھا ان تمام شعروں کا جواب بس ایک ہی شعر میں دے دیا۔

قطعہ

نورالدین لادہ پدر او ازین
زادم چنین لادہ زلاوات
چک زدہ آن ابلہ بیہودہ گوئی
لیس جواب بخرافات

اسی زمین میں مولوی نورالدین عبدالرحمن جامی کا قطعہ ہے:

آہ من العشق و حالات
احرق قلبی بحرارات
ما نظر العین الی غیرکم
اقسم باللہ و آیات

کہاں مولانا نورالدین جامی اور یہ نورالدین جو اپنے آپ کو جامی سمجھنے لگا تھا:

گرچہ ہمکار بانیان زدہم نائی چہ سود
یک مسیح ابرای اکمہ ترد دیگر اخور است

بہر حال آدمی لائق تھا، ممکن ہے اپنے کیے پر پشیمان ہوا ہو اور اللہ تعالیٰ اس کی ان مصیبتوں اور دکھوں کو اس کی غلطیوں کا کفارہ بنادے۔

جب نورالدین اپنے عہدہ سے معزول ہو کر آگرہ آیا ہوا تھا۔ ایک دن میں بازار جا رہا تھا کہ وہ اچانک سامنے سے نمودار ہوا۔ میرے ساتھیوں میں سے میاں کمال الدین حسین شیرازی نے جو نہایت خوش مزاج ظریف آدمی تھا اور آگرہ کے ایک بڑے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا، نور الدین سے کہا: ''نواب خان دہلی کے بزرگوں کا نام تو آپ نے لے لیا، اب اگر آگرہ کے بزرگوں پر بھی جناب مہربانی فرمائیں تو کیا حرج ہے؟ میں نے کہا: ''معلوم ہوتا ہے کہ وہ آگرہ کے بزرگوں میں کوئی قابلیت نہیں پاتے کہ ان کا تذکرہ کریں'' میری بات پر وہ ہنس دیا اور کہا: '' وہ ایک بہتان ہے جو مجھ پر باندھا گیا ہے''۔

تروی اودھ

ماوراء النہر کا رہنے والا ہے۔ لطیف الطبع آدمی ہے۔ پہلے الغ میرزا کے مصاحبوں میں تھا۔ جس زمانہ میں ان میرزاؤں نے بھڑوچ کے قلعہ پر قبضہ کر لیا تھا اس نے یہ رباعی کہی تھی:

اولاد شہر کہ در شجاعت فردند
شد فتح بہر کجا کہ رو آوردند
کردند چو فتح بھڑوچ از روی ستیز
تاریخ شد این کہ فتح بھڑوچ کردند

توسنی

اس کا نام منوہر ہے۔ سانبھر کے راجہ لون کرن کا بیٹا ہے۔ سانبھر کا نمک زار مشہور ہے توسنی کے کلام میں بھی بڑی ملاحت پائی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہاں کا سارا نمک بس اسی کے کلام میں بس گیا ہے۔

توسنی نہایت خوب صورت اور ذہین شاعر ہے۔ پہلے اس کا نام محمد منوہر تھا بعد میں بادشاہ نے اسے میرزا منوہر کا خطاب دیا لیکن اس کا باپ باوجود ہندو ہونے کے اسی نام محمد منوہر پر فخر کرتا تھا۔ اگرچہ ''محمد'' جیسے ناموں سے نسبت اکبر کو پسند نہ تھی۔ توسنی نہایت

موزوں طبع تھا جس کا اندازہ اس کے اشعار سے بخوبی ہوتا ہے:

شیخ مستغنی بدین و برہمن مغرور کفر
مست حسن دوست را با کفر و ایمان کار نیست

رباعی

بی عشق تو در جگر لبالب ما راست — بی درد تو در سرم سراسر خاراست
بت خانہ و کعبہ ہر دو نزدم کفر است — ما را بہ یگانگی ایزد کار است

جس وقت بادشاہ نے اس کا تخلص رکھا تھا اس نے چند شعر کہے تھے:

شربت آشنا ما ییا در بزم ما دردی نشان
کز جگر در کف کباب و خون دل در ساغر است
ننگ مردان است حرف از جان و دل گفتن بعشق
دل چو خون تخت بست جان چو باد صر صر است
توسنی سردہ سمند شوق در میدان عشق
می رسی ایمن بمقصد رہبرت چون اکبر است

ایک ہندو سے یہ جودت طبع اور کمال شعر کا ظاہر ہونا ایک حیرت انگیز بات ہے

قدروئی ابجری

مولانا نرگس کا بھانجہ ہے۔ لطافت طبع اور ذہانت میں ممتاز تھا۔ بیرم خان کے عہد اقتدار میں روم سے ہندستان آیا اور اسی کے یہاں تربیت و ترقی پائی۔ ایک پہاڑی لڑائی میں انکہ خان نے اسے قید کرلیا اور اکبر خان کے ساز و سامان و ساتویں امام علی رضا کے جھنڈے کے ساتھ اسے بھی مال غنیمت میں پیش کیا۔ بادشاہ کو اس کا کلام نہایت ہی پسند آیا۔

اس نے ''حسن و یوسف'' کے نام سے ایک رسالہ انکہ خان کے لڑکے یوسف محمد

خان کے نام پر لکھا تھا جس کا مطلع ہے:

بنام آنکہ روی دشمن و دوست
بہر جانب کہ باشد جانب اوست

محبوب کے حسن کی تعریف اس مثنوی میں اس طرح سے کی ہے:

رخش آئینہ گردن دستۂ عاج — پری رویان بان آئینہ محتاج
کفش چون آفتاب آئینہ نور — شعاع آفتاب انگشت آن حور

اس نے عماد کے "دہ نامہ" کا بھی جواب کہا تھا، جس کے چند شعر یہ ہیں:

از حسرت لعل آید ارت — وز فرقت زلف تا بدارت
موئی شدہ جسم ناتوانش — در جسم نماندہ جای جانش

صبح کی تعریف میں لکھتا ہے:

خاکستر صبح رفت برباد
در پنبۂ صبح آتش افتاد

چند اور شعر:

سر بزانو چو تم در ہجر آن پیان گسل
تو دۂ خاکستری گردو تنم از سوز دل

بادشاہ کے حکم سے اس نے ہاتھی کی تعریف کی تھی:

زخاک رہ شاہ گردون سریر — پی عطر بر خود فشاند عبیر
عقاب فلک بر سرش بی گزاف — بود پشۂ قلۂ کوہ قاف

975ھ/1567ء میں چوروں نے اسے تلوار مار کر شہید کر دیا اور آگرہ میں دفن ہوا۔

تشبیہی کاشی

دو تین مرتبہ ہندوستان آ کر چلا گیا۔ اس زمانہ میں آیا ہوا ہے اور بے دینی کو بڑھاوا دینے میں مصروف ہے۔ یہی خانی مسلک کا داعی ہے۔ اپنے آپ کو شیخ ابوالفضل سے بڑا مجتہد

سمجھتا ہے۔ توسل و سفارش سے دربار میں باریابی حاصل کر لی ہے اور اکبر کی شان میں ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا ہے جس میں بادشاہ کو اس طرف توجہ دلائی ہے کہ یک سو ہو کر تقلید پرستوں کو بالکل ختم کر دو تا کہ حق اپنے مرکز پر پوری طرح استوار ہو جائے اور خاص توحید فروغ پائے۔ اس نے ایک رسالہ شیخ ابو الفضل کے نام سے منسوب کیا ہے جو حروف و نقطوں کی کرتب بازی کا نمونہ ہے اور اس میں عددی مناسبتیں پیدا کی ہیں۔

حکیم عین الملک نے اس کے تخلص "تشبیہی" کے اعداد لفظ "زرتیقی" کے مطابق نکالے ہیں جو اس کے مکر و زرق سے پوری مناسبت رکھتا ہے۔ صاحب دیوان شاعر ہے۔ اس کی بکواس کا نمونہ یہ ہے:

یکی بر خود ببال آن خاک گورستان زشادابی
کہ چون من کشتۂ زان دست و خنجر در لحد داری

تو ہر رنگی کہ خواہی جامہ می پوش
کہ من آن جلوہ قدمی شناسم

و در دست این جہان و آن جہان ہیچ
کہ چہ در دست تست این ہیچ و آن ہیچ

اس نے شیخ ابو الفضل کی محفل میں محمود بسی خوانی کا رسالہ مجھے دیا تھا، جس کا دیباچہ یہ تھا:

"یا اللہ المحمود فی کل معالہ استعین بنفسک الذی لا الہ الا ہو الحمد للہ الذی وجد نعمہ بوجود کلیاتہ و اظہر وجود الکلیات من نفسہ سھوبھم کلیا و ھو یعلم نفسہ ولا نعلم نفوسنا د لاھو وھو کون لایکن الایہ و مکان لا بغیرہ وھو ارحم الراحمین"۔

سوال: یہ جو "خلق" کہا جاتا ہے وہ کون ہے؟

جواب: یہ جو "خلق" کہا جاتا ہے وہ اللہ ہے۔

اس کے منہ میں خاک دیکھو کیسی بکواس کی ہے۔ اس کے مذہبی جہل کا چار لفظوں پر

انحصار ہے، جنھیں اس نے رسالہ کے آخر میں اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا ہے۔ "کتب محمد اکرار بجانب عجمی مجتہدی طبارع ای کرب لت تش ب ی، ی انوی اخروی صاحب مقام" بقیہ رسالہ کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے۔

تقی الدین شوستری

ابھی ابھی شاہی دربار میں شامل ہوا ہے۔ علوم عقلی و نقلی پر بڑا عبور حاصل ہے۔ شعر بھی اچھے کہہ لیتا ہے۔ طبیعت موزوں اور شاعرانہ ہے۔

نمونۂ کلام:

گر دست منعدم کہ بروئیم نظر کنم
باری دھان بیادلبت پر شکر کنم
با آنکہ ہیچو سبزہ بجا کم نشاندۂ
دست و دلی کجاست کہ خاکی بسر کنم

ان دنوں وہ پادشاہ کے حکم سے شاہنامہ کو نثر کا جامہ پہنا رہا ہے، گویا مخمل کو ٹاٹ میں بدلنے میں مصروف ہے۔

ثانی خان ہروی

بڑے قدیم امیروں میں سے ہے۔ دانائی، تدبر اور حسن ذوق میں مشہور ہیں۔ اس کے پاس جب کسی شخص کے علم و فضل کی تعریف کر کے پیش کیا جاتا ہے تو وہ پہلی ہی ملاقات میں اس سے کہتا تھا کہ: "ہمارے ساتھ دوستی اور محبت کی شرط یہ ہے کہ ہمارے متعلق کینوں اور اوباشوں کی کہی ہوئی باتوں پر کان نہ دھرو، کیونکہ یہ لوگ خلوص کے دشمن اور نفاق کے بانی ہوتے ہیں۔ تاہم اس نے اپنا دیوان مکمل کر لیا ہے"۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

ای رسم تو آزار من و قاعدہ بیداد
بیداد ازین رسم و ازین قاعدہ فریاد

بگذر زنا خوش کہ درین دیر دیر
نیکی ندید ہر کہ بدی کرد با فقیر

رباعی

دیدم ز فراق آنکہ یعقوب ندید
در عشق کشیدم آنچہ مجنون نکشید
این واقعہ کز ہجر تو آمدہ بسرم
فرہاد گمان برد و وامق نشنید

ثانی خان کا اصل نام علی اکبر ہے۔ شاید یہی نام کی مناسبت ہے کہ اس نے بھی الحاد و بے دینی کی تائید میں رسالے لکھے ہیں اور فن نقط کی مناسبتیں پیدا کر کے بادشاہ کو اور شاید خود کو وہ شخصیت سمجھتا ہے جو لفظ "شخص" کے اعداد کے مطابق 990ھ/ 1582ء میں آنے والی ہے۔ محمود پسی خوانی کے عقائد بھی ان رسالوں میں بیان کیے ہیں۔ انھوں نے تصوف پر بھی ایک رسالہ لکھا ہے۔ یہ مزاحیہ مصرع اسی کا ہے:

احسن نجم بحر نجم احر نجابا مصدر

غالباً آخر عمر میں شعر گوئی سے توبہ کر لی۔

ثنائی مشہدی

اس کا نام خواجہ حسین ہے۔ ابھی وہ ہندوستان نہیں آیا تھا لیکن اس کی شہرت یہاں پہنچ چکی تھی، چنانچہ یہاں کے اکابر اس کے کسی شعر کو مصرع طرح بنا کر محفل سخن منعقد کیا کرتے

تھے اور ہر مشاعرہ میں اس کے لیے دعائیں کرتے تھے۔ بلا اختلاف سب اس کی استادی کے قائل تھے، لیکن جب وہ یہاں آ گیا تو حسد کی آگ نے عقیدت کو جھلسا کر رکھ دیا اور وہ بے چارہ گمنامی کے ایک گوشے میں لوگوں کے اعتراضات کا ہدف بنا رہا۔

اس کا دیوان مشہور ہے۔ ایک بہت اچھی مثنوی بھی لکھی ہے۔ کوئی بڑا عالم نہیں ہے۔ چنانچہ اس کی نثر اس کے قصیدوں کی طرح شاندار نہیں، شاعرانہ ذوق نہایت بلند ہے۔ بجز توحید و منقبت کے تمام اصناف سخن میں بڑی مہارت حاصل ہے، اسی کا شعر ہے:

چنان ناز بارد زپا تا سرش
کہ رفتن تواں ناز از بسترش

مگر اس کے استاد کے اس شعر کے مضمون سے ملتا جلتا ہے:

عشوہ دم انداز زمین ناز فشاندازھوا
طرز خرام کردن و پا بزمین نہادنش

نمونہ کلام:

گردش جا کند درپیش آئینہ شخص — چند تمثال خویش تافتہ روبر قفا
بسکہ از خانہ غم برون ریزیم — تنگی خانہ از برون در است

جدائی

نام میر سید علی ہے، یہ مصور بھی ہے اور کئی حیثیتوں کا مالک ہے۔ اس کی ہر تصویر شاہکار ہے۔ ہندستان میں وہ اپنے دور کا مانی ہے۔ داستان امیر حمزہ جو مصور 16 جلدوں میں ہے اس کے سرپرستی میں مکمل ہوئی۔ اس کی ہر جلد ایک گنجینہ اور ہر ورق ایک مرقع اور صفحہ صفحہ منقش ہے۔

شاعری میں اس کا ایک دیوان بھی مکمل ہو چکا ہے۔

نمونہ کلام یہ ہے:

صبح دم خاردم از حسدی گل میزد — ناخنی در دل صد پارۂ بلبل میزد

حسن بتان کعبہ ایست عشق بیابان او		سرزنش ناکسان خار مغیلان او

جذبی

نام یادشاہ قلی ہے۔ شاہ قلی خان نارنجی کا بیٹا ہے۔ موزوں طبع شاعر ہے۔

نمونہ کلام یہ ہے:

این چاشنی کہ حسن ازل با بتان دھد
جائی رسید عشق کہ بی درد جان دھد

اس کے باپ شاہ قلی خان کی رباعی ہے:

گاہ توبہ و گاہ کوزہ می شکنم
یکبار دوبارنی پیاپی شکنم
یارب زھد آموزی نفسم برہان
تاچندکنم توبہ و تاکی شکنم

پٹنہ کے سفر سے واپسی پر ایک دن راستہ میں جذبی، قاضی شمس الدین قزوینی اور بعض نے شاعر حسین ثنائی کے اس شعر پر:

گر بجنش جائی در پس آئینہ مخفی
چند تمثال خویش تافتہ رو بر قفا

بحث کر رہے تھے۔ میں وہاں پہنچا تو ان لوگوں نے اس شعر کا جس پر اختلاف تھا مجھ سے مطلب دریافت کیا۔ میں نے کہا "اب تو یہ معاملہ ہوگیا ہے کہ یار لوگ شعر اور "میجال" میں فرق نہیں کر پاتے"۔

یہ تیجال، سلطان حسین مرزا کے زمانہ میں ایک مسخرہ تھا جو بڑا باتونی اور زبان دراز تھا۔ عالموں کا لباس پہن کر یعنی عبا اور عمامہ پہن کر علما کی محفلوں اور مدرسوں میں طالب علموں کی ایک جماعت کو ساتھ لے کر جاتا اور پہلے نہایت معقول عالمانہ انداز میں مناظرہ اور مباحثہ شروع کر دیتا۔ جب لوگ اس کی تقریر سے متاثر ہوتے، پھر ... میں مہمل اور بیہودہ باتیں خلط کر دیتا جس سے عالم اور شبہ میں پڑ جاتے۔

جمیلی کالپی وال

اس کے والد شیخ جلال واصل تھے جو شیخ محمد غوث کے خلیفہ ہیں اور سرود وسماع کا بڑا ذوق رکھتے تھے۔ جمیلی کو اپنے باپ کی یہ کیفیت وحال تو نصیب نہ ہوا لیکن وہ حصول علم اور ذوق شعر سے محروم نہ رہا۔ اگرچہ اس کے اکثر اشعار مضحکہ خیز ہیں یہ چند شعر اس کی یادگار ہیں:

گر شادیٔ وصل تو مرا دست نداد
باری بہ غمت خاطر خود شاد کنم

اس نے حاکم کالپی قاسم علی خان کی مدح میں ایک قصیدہ کہا تھا جس کا ایک شعر یہ ہے:

بود نسبت تو بہ خیل خوانین
بسی نالایم بسی نامناسب

اس کا بڑا بھائی شیخ فضیل ہے جسے عربی پر بڑا عبور حاصل ہے۔ اس نے عربی میں بڑے فصیح شعر بھی کہے ہیں۔ اس نے معین الدین طغرائی کے جواب میں ایک قصیدہ کہا تھا جس کا مطلع ہے:

یا جمیل الوجہ وجھی عن قدیم الحال حال
واح روحی بالنوی والدمع کا کمسلسل سال

ایک دن اس نے یہ مطلع پڑھ کر سنایا۔ چونکہ یہ دونوں بھائی سبز فام ہیں، میں نے کہا "ایسا معلوم ہوتا ہے آپ نے اس مطلع میں اپنے چھوٹے بھائی کو مخاطب کیا ہے" اس جملہ پر وہ بہت ہنسا۔

طغرائی کے قصیدہ کا مطلع ہے:

یا خفی الـال قد بلبلت بابلبال بال
بالنوی زلزلت قلبی فھو بالزلزال زال

شیخ فضیل نے شیخ فیضی کی تفسیر پر عربی نثر ونظم میں جو "توقیع" لکھی ہے وہ اس کے علم وکمال کا واضح ثبوت ہے۔ ان دنوں دونوں بھائی لاہور سے اپنے وطن کے لیے رخصت ہو گئے ہیں۔

چشتی

شیخ حسین صوفی نام ہے، چشتی تخلص ہے۔ چونکہ وہ شیخ سلیم چشتی کا مرید تھا، اس لیے یہ تخلص رکھا تھا۔ شیخ پیر محمد فتح پوری کی خانقاہ کے صوفیوں میں شامل تھا۔ اس کا ایک دیوان ہے اور کچھ اور بھی تصانیف بھی ہیں۔ نثر میں ایک کتاب "دل و جان" کے نام سے نظم میں لکھی ہے۔ اس میں بہت تکلف کیا ہے۔ مضمون بھی اس کا اپنا نہیں بلکہ فتاحی استاد میر علی کی کتاب "حسن و دل" سے لیا ہوا ہے جس میں فتاحی نے خوب داد سخن دی ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے چشتی کا "حسن و دل" کا لکھنا بے فائدہ ہے۔ اس کے کئی ہزار اشعار ہیں۔ ذیل کا شعر چشتی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔

مطلع

چشتی ... عاشق قیس ما لیلی است

... از ... لیلی است

حجری

ہرات کے سیدوں میں سے ہیں۔ شعر و سخن میں خاصا سلیقہ رکھتا ہے۔ اکثر ... چشتی تھا ... میرزا ... کے نام پر ایک غزل ... لکھی ہے۔

نمونۂ کلام

... سلطان ...

... ایک ...

... بمراد ...

... خاطرت ...

... شده ... پائی گو

... بالا ... گو

جعفر بیگ

آصف خان قزوینی کے لقب سے مشہور ہے۔ سابق میر بخشی آصف خان میرزا غیاث الدین علی کا بھتیجا ہوتا ہے۔ اب وہ دربار کے اعلیٰ مرتبہ کے بخشیوں میں شامل ہے۔ اس کو اپنے چچا سے بڑی شکایت تھی کیونکہ اس نے اپنے عہد میں اسے ترقی کا موقع نہیں دیا۔ اب بھی وہ اپنے مرحوم چچا کے خلاف بغض و عناد ظاہر کرتا رہتا ہے۔

اپنے ہم عصروں میں اس کی شعری صلاحیتیں سب سے بڑھ چڑھ کر ہیں لیکن عیش و آرام اور گوناگون مصروفیات کی وجہ سے شعر گوئی کی مشق کچھ زیادہ نہیں علم سے بھی بے بہرہ نہیں۔ اگر وہ صرف شاعری کی طرف متوجہ رہتا تو زمانے کو اپنا مداح بنا لیتا۔

کلام کا نمونہ یہ ہے:

کارم امروز بہ بیداد گری افتادہ است
کہ بہر جا کہ نہد پای سری افتادہ است

گر گرد شمع سرگشت سرگشتہ چون پروانہ ام   آخر بگلشن میدہد پرواز گستاخانہ ام

گل ہر کس دستاراج خزان رفت
مرا ہم گلبن و ہم گلستان رفت

بآتش کارت افتادہ ست جعفر
دو صد بلبل باین جا یک سمندر

حیدری تبریزی

یہ حاجی تھا، لسانی کا شاگرد ہے۔ شریف تبریزی بھی اس کا استاد تھا، جس نے لسانی کی

تعریف کرتے ہوئے اسے "لسان الغیب" کہا ہے۔ حیدری ہندستان میں عرصہ تک رہا۔ ایک بار جا کر پھر واپس آ گیا۔ دوسری مرتبہ جو گیا تو لوٹ کر نہیں آیا۔ اس کا دیوان 14 ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اگرچہ اس میں اچھے شعر بہت کم ہیں۔

وہ شاہی ہاتھیوں کی تعریف اس طرح کرتا ہے:

نمود پشت ہای ریگ روان فیلہائش کہ در ہیجا ہست
کزپی غرق کردن اعدا ہر طرف موجہای بحر بلاست

حزنی

یہ عراق کے عالموں میں سے تھا۔ جب ھرات میں شورشیں برپا ہوئیں تو وہ وہاں کے خطرات سے بچ کر ہندستان چلا آیا، لیکن یہاں بھی وہ محروم و مجبور رہا اور انتقال کر گیا۔

ان کے کلام کا نمونہ:

مرا بہ سادہ لوحیہای حزنی خندہ می آید کہ عاشق گشتہ و چشم وفا از یار ہم دارد
زنادانی بمہر او گرد ہمدم کار من ضائع عجب تر آنکہ بر من منت بسیار ہم دارد

خرقہ بر آتش خم تا بوی ایمان بشنوی
از کہن دلقی کزو یکتا زپی زنار نیست

حیاتی گیلانی

بڑا دردمند اور مخلص دوست ہے۔ شاعری کی تمام اصناف میں تعریف و توصیف سے بالا ہے۔ حکیم ابو الفتح کے وسیلے سے بادشاہی ملازمت میں داخل ہوا اور ترقی کی وہ صاحب دیوان شاعر ہے۔ اس کے کلام میں اکابر شعراء کا رنگ جھلکتا ہے۔ اگرچہ وہ کچھ زیادہ پڑھا لکھا نہیں مگر ذکاوت و ذہانت فطری ہے۔

کلام کا نمونہ:

بہ ہر سخن کہ کنی خویش را نگہبان باش ‏ ‏ ‏ ‏ ز گفتنی کہ دلی بشکند پشیمان باش

چو بال مرغ کہ گر شغل روزگار این است ‏ ‏ ‏ ‏ ز مور ہم قدمی دام کن گریزان باش

خدا بہ شکوہ زبان من آشنا نکند

من و شکایت و انگہ ز تو خدا نکند

رباعی

دایم تو ستم نمودۂ معذوری ‏ ‏ ‏ ‏ ما ہی ز وفا شنودہ معذوری

گفتی کہ بمن جفا بہتان است ‏ ‏ ‏ ‏ خود را تو نیاز مودۂ معذوری

حیائی

یہ گجرات میں میرزا نظام الدین کے ساتھ تھا۔

ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

پیغام دوست داغ جگر تازہ می کند

درد و داغ و رنج سفر تازہ می کند

رباعی

عاشق رخ خویش بر درت سود و برفت

وان مہر کہ با تو داشت بنمود و برفت

یکشب بہ ہزار حیلہ در بزم وصال

پروانہ بہ شمع دیدہ بکشود و برفت

حاذق

اس کا اصل نام یادگار ہے۔ خود سلطان سنجر ماضی کی اولاد بتاتا ہے لیکن میرزا احمد نے تاریخ نظامی میں اسے چغتائی نسل کا بتایا ہے۔ بڑا نیک اور خوش عقیدہ آدمی ہے اور صاحب دیوان شاعر ہے۔

ان کے کلام کا نمونہ:

نماند آنقدر از گریہ آب در جگرم
کہ مرغ تیر تو منقار تر تواند کرد

بر صفحۂ عذار تو آن خط مشک شود
مضمون تازہ ایست کہ از غیب رو نمود

حاذق کے باپ کا تخلص والہی تھا۔ یہ مطلع اسی کا ہے:

ماہ عید ابر و نمود و خاطرم ارشاد کرد
شکر للہ کز غم سی روزہ ام آزاد کرد

حاذق کے لڑکے کا تخلص بجائی تھا۔ اس نے اپنے باپ کو زہر دے کر مار ڈالا۔ بادشاہ کے حکم سے اسے کشمیر سے لاہور لایا گیا اور یہاں کوتوال نے قصاص میں قتل کرا دیا۔ وہ بھی موزوں طبع تھا اس کا شعر ہے:

تا غمزۂ خون ریز تو غارت گر جان ست
چشم اجل از دور بحسرت نگران ست

خان اعظم

اصل خطاب اتکہ خان ہے۔ جس وقت چوسہ پر ہمایوں کو شکست ہوئی تو وہ گنگا پار کر کے فرار ہونا چاہتا تھا لیکن دریا میں غوطے کھانے لگا، اس وقت خان اعظم نے سہارا دیا اور مدد

دے کر کنارے پر لے آیا۔ یہ خدمت اس کی آئندہ ترقیوں کا ذریعہ ہوگئی۔ اس کا مرتبہ شعر وشاعری کے مقام سے بالاتر ہے لیکن وہ نہایت موزوں طبیعت کا مالک تھا۔

ان کے کلام کا نمونہ:

منہ ای طفل اشک از خانۂ چشم قدم بیرون
کہ می آیند مردم زادھا از خانہ کم بیرون

گر بجو رشید رخت لاف زند بدر منیر
آخر از گنبد فیروزہ نگون خواہد شد

منجر بیگ

چغتائی امیروں میں سے ہے۔ تردی بیگ خان کا داماد ہے۔ اس نے اپنے حالات اور بادشاہ کی مدح میں ایک مثنوی کہی ہے جس میں 300 شعر ہیں۔ وہ مختلف صلاحیتوں کا مالک ہے۔ سپاہ گری، خوش خطی، شعر ومعمہ، اسطرلاب ونجوم اور تطابق اعداد، غرض تمام علوم وفنون کا جامع ہے۔ صاحب تصنیف ہے۔ اپنی مثنوی میں اس نے اپنے ان تمام اوصاف کو گنایا ہے۔ ان کے علاوہ وہ فارسی اور ہندی راگ، راگنیوں میں بھی بڑا ماہر تھا۔ اس کو ایسے راگوں کا علم تھا جو بجز بلند مرتبہ سلاطین و امراء کے کسی کی محفل میں سننے میں نہیں آئی اور اس زمانہ میں تو ان کا نام ونشان بھی نہیں رہا۔ موسیقی میں اس کا مقابل کوئی نہیں تھا۔ اس نے بادشاہ کی نصیحت کے لیے جو مثنوی کہی تھی اس کے چند اشعار یہ ہیں:

شہر یارا جہان عجب جائی است — ہر زمان اندر و تماشائی است
چرخ نیرنگ ساز شعبدہ باز — ہر زمان بازئی کند آغاز
پیش ازین بودہ اند در عالم — تاجداران با سپاہ و حشم
زان دلیران پر ھوا و ہوس — ماند تاریخ ہائی کہنہ و بس

منجر بیگ نے جب یہ مثنوی بادشاہ کے سامنے پڑھی تو انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ اس کا ایک مکمل دیوان بھی ہے جس کے شعر بہت مشہور ہیں۔ اس کے چند شعر یہ ہیں:

آہم از دل چند درکویش نہان آید برون
بعد ازان چندان کنم افغان کہ جان آید برون

آہم گزشت از سر و پا باد رفت جان
تن خاک گشت و آتش دل شعلہ زن ہنوز

جس زمانہ میں خان زمان اور بہادر خان نے سرکشی و بغاوت کی تھی۔ خنجر بیگ بھی ان کے ساتھ ہوگیا تھا اور بنگالہ چلا گیا تھا۔ غالباً اسی فتنے میں وہ ہلاک ہوگیا!

خسروی

یہ مرزا قاسم جنابدی کا بھانجہ ہے۔ حجاز کے سفر کے بعد ہندستان آیا اور بڑے شاہزادہ کے یہاں ملازم ہوگیا۔ یہ بھی بہرحال قابل ذکر شخص ہے:

ز نور عشق باشد خسروی را دل چنان روشن
کہ شمع مرقد او میتوان کرد استخوانش را

میر دوری

اس کا نام سلطان بایزید اور خطاب کاتب الملک ہے۔ ہندستان میں خط نستعلیق کو اس سے بہتر کوئی لکھ نہیں سکا۔ شعر گوئی میں بھی خاصہ ملکہ حاصل تھا۔ آخری عمر میں حج سے بھی بہرہ مند ہوا۔

ان کے کلام کا نمونہ ہے:

گہ در درون جانی گہ در دل حزینی
از شوخی کہ داری یک جانمی نشینی

رباعی

تا از نظر آن یار پسندیدہ برفت
خون دلم از دیدۂ غمدیدہ برفت
رفت از نظر و ز دل نرفت این غلط است
کز دل برود ہر آنچہ از دیدہ برفت

خوش خطی میں میر موصوف کا ایک شاگرد خواجہ ابراہیم حسین احدی میرا ہم سبق تھا یہ شہر بلوطہ کے بزرگوں کی اولاد میں سے اور شیخ عبدالرحمن لاہوری بلوطی کے قریبی لوگوں میں سے ہے۔ بزرگی اور ولایت میں اپنے زمانہ کا شہرہ آفاق شخص تھا۔ عین جوانی میں اس کا انتقال ہوگیا۔ ایک ہی سال میں تھوڑے سے فرق سے مجھے اس کی اور میرزا نظام الدین احمد کی جدائی کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ دل کے داغ ہرے ہوگئے اور قدیم دوستوں کا غم روز بروز بڑھتا ہی جاتا ہے:

دریغا درد را مرہم ندیدم
امید وصل بود آن ہم ندیدم

اب تو افسوس کرنے کی بھی طاقت نہیں رہی۔ افسوس بھی کیا کریں، ہم سب ایک گنبد کے نیچے سر دھن رہے ہیں اور جد و جہد کر رہے ہیں۔ یہاں سے نکل کر ہی ایک دوسرے سے ملنے کا موقع ملے گا۔ میں نے خواجہ ابراہیم کی تاریخ وفات کہی ہے:

بر موجب حکم پادشاہ کونین
در ماہ صفر خواجہ ابراہیم حسین
چون کرد سفر ز عالم پر شر و شین
تاریخ شدش خواجہ ابراہیم حسین

وہ اسی قریبی زمانہ میں عراق سے آکر احدیوں میں شامل ہوا تھا۔ ابھی وہ کسی عہدے پر فائز نہیں ہوا تھا کہ اس نے شریف سرمدی چوکی نویس کے لیے جو احدیوں کا داروغہ تھا اور اس کی پلی ہوئی مونچھیں تھیں یہ رباعی کہی تھی:

این سادہ دل آخر احدی خواہد شد — محتاج کلاہ غولی خواہد شد
از غایت اضطرار روزی صد یار — قربان بروت مریدی خواہد شد

واثی

واثہ نیشاپور کا ایک گاؤں ہے۔ وہاں وہ کھیتی باڑی میں توکل وقناعت سے بسر کیا کرتا تھا۔ دل میں سیاحت کی سمائی اور ہندوستان کا رخ کیا۔

اس کے اکثر اشعار اسی دہقانی زبان میں ہیں لیکن فصیح زبان میں اس نے بہت سی غزلیں بھی کہی ہیں۔ اس کا دہقانی کلام پڑھنے لکھنے میں دشوار تھا اس لیے وہ زبان زد نہ ہو سکا:

الفتی بنکہ شعر بدی گفت
نیک زوباطن لو ندانش
چرخ چو گاؤی از قضا بشکت
پست بنی بجائی دندانش

دوائی

یہ حکیم عین الملک کا تخلص ہے۔ ماں کی طرف سے علامہ جلال الدین دوانی کی اولاد میں سے ہے۔ بڑی خوبیوں کا مالک اور ممتاز شخصیت رکھتا تھا۔ آنکھ کے علاج میں اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتا ہے۔

اس کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

ترا بر غم نہ ژالہ بر من دل تنگ می بارد — ز تاثیر حوادث بر سر من سنگ می بارد
چنان تندرست با اہل دل آن شوخ جفا پیشہ — کہ گاہ آشتی از غمزۂ او جنگ می بارد
دوائی از در احسان او کفر است نومیدی — کہ ابر فیض او فرسنگ در فرسنگ می بارد

اسد ہر شب بگردون نالہ ام با آہ و زاری ہا
سیہ روزی چو من یارب چہ سازد با چنین شب ہا

رفیعی

اصل نام میر حیدر معمائی اور ان کا وطن کاشان ہے۔ نہایت سمجھ دار، ذہین اور ہنر مند آدمی ہے۔ خاص طور سے فن معمہ اور تاریخ کہنے میں اس کا کوئی جواب نہیں۔ ان دونوں کے سوا وہ کسی اور فن کو اہمیت نہیں دیتا۔ ایک دن شیخ فیضی نے اس سے کہا کہ ہندوستان میں معمہ متروک ہوگیا ہے اور اب اسے عیب سمجھتے ہیں۔ اس نے کہا: "میں نے ولایت میں برسوں اسی معمہ گوئی میں اپنی جان کھپائی ہے۔ اب جب کہ اس فن میں بوڑھا ہوگیا ہوں اسے کس طرح چھوڑ سکتا ہوں؟"

خواجہ حبیب اللہ کے ساتھ گجرات سے لاہور آگیا۔ شاہی سرکار اور دوسرے عہدہ داروں سے تھوڑی بہت رقم لے کر وطن کے لیے رخصت ہوا لیکن ہرمز پہنچنے، پر کچھ دن مکران کے قریب اس کا جہاز ٹوٹ گیا اور اس کی ساری پونجی دریا میں بہہ گئی۔ اس کے سامان میں شیخ فیضی کی بے نقط تفسیر کے چند جزو بھی تھے جو علماء کی توقیعات سے آراستہ تھے۔ یہ جزو اور فیضی کا دیوان جو اس نے ولایت میں شہرت کی خاطر روانہ کیا تھا، سب طوفان کی نذر ہوگیا۔

رفیعی کے اشعار کا نمونہ:

نازک دلم ای شوخ علاجم چہ توان کرد
من عاشق معشوق مزاجم چہ توان کرد
من بجنابت رفیعی اشکہا بردم کہ تو
ھر حش گریان ترا از اہل عزای آید

رہائی

یہ شیخ زین الدین خوافی کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا دیوان بھی بہت مشہور ہے۔
اس کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

گروی امید وارم از لطف خویش یارا
بر تافتی ز ہر سو روی امید مارا

سفر کردم کہ شاید خاطرم از غم بیاساید چہ دانستم کہ صد کوہ غم در راہ پیش آید

روغنی

یہ ایک مسخرہ تھا، بے حیائی اسکا پیشہ تھا۔ اس کی بے شمار ہزلیات ہیں۔ برسوں بادشاہی ملازمت میں رہا۔ اس کے دیوان میں تقریباً 3 ہزار شعر ہیں۔

اس کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

حیات جاودان دارد شہید تیغ بیدادش
مگر در آبگیری آب حیوان دادہ استادش

از جفای او نمی نالم می ترسم کہ رقیب
یابد از تاثیر فریادم کہ از بیداد کیست

اس نے 980ھ/1572ء میں جبکہ شاہی لشکر گجرات جا رہا تھا، آبوگڑھ کے قلعے کے قریب اس کا انتقال ہو گیا اور اسی جگہ دفن بھی ہوا۔ قاسم ارسلان نے اس کی تاریخ وفات کہی ہے۔

"دادہ چو تنگی بکا فرستان جان"

زین خان کوکہ

ہندی ساز اور دف کے بجانے اور موسیقی کی تمام قسموں میں بے مثل ماہر اور یکتائے روزگار ہے۔ خوش خلقی کے سوا دوسری اور خوبیاں نہیں رکھتا ہے لیکن کبھی کبھی شعر کہہ لیتا ہے۔ اس کا شعر ہے:

آرام من نمی دہد این چرخ کج خرام
تا رشتۂ مراد بسوزن در آورم

سلطان سپلکی

سپلک قندھار کا ایک گاؤں ہے۔ ہندوستان کے لوگ اسے سپلکی کہتے تھے۔ سپلک ایک گھناؤنا جانور ہے۔ وہ بڑا تنگ ہوتا تھا اور کہتا تھا کہ عجیب مصیبت ہے لوگ مجھے ایسے گندے جانور کے نام سے پکارتے ہیں۔

نہایت آزاد خیال قلندر آدمی تھا۔ ایک دن ملا قاسم کاہی سے اس نے پوچھا آپ کی عمر کیا ہے؟ انھوں نے کہا" خدا سے 2 سال چھوٹا ہوں" سلطان نے کہا: "محترم ہم تو سمجھتے تھے آپ 2 سال بڑے ہیں آپ اپنی عمر گھٹا کر بتا رہے ہیں" مولانا قاسم ہنس پڑے اور کہا تم ہماری صحبت کے قابل ہو۔ واضح رہے کہ ملا قاسم کاہی دوسروں کی باتیں نقل کرنے کے عادی تھے۔ یہ بات بھی شیخ بایزید بسطامی کی تھی جو اس موقع پر جڑ دی۔ شیخ نے کہا تھا "انا اقل من ربی سنتین" اور یہ بس ایک صوفیانہ ترنگ تھی۔ ان کے اس قول کی عارفوں نے یہ تاویل کی ہے کہ خدا سے دو سال کم ہونے کا مطلب دو صفتوں میں کم ہونا ہے کیونکہ بندہ اللہ کی تمام صفات کا مظہر بن سکتا ہے بجز وجوب و قدرت کے۔ ظاہر ہے بندہ حدوث و عجز سے بچ نہیں سکتا۔ بہر حال خدا اس قسم کی صوفیانہ حشویات اور شطحیات سے بچائے رکھے۔

سلطان نہایت موزوں طبع آدمی تھا۔ خان زمان کا تخلص بھی سلطان تھا۔ جب سلطان نے اس کی شان میں ایک قصیدہ کہا اور پیش کیا تو خان زمان نے ایک ہزار روپیہ اور خلعت بطور صلہ اس کے پاس بھجوایا اور اس سے درخواست کی کہ اپنا تخلص ہماری خاطر بدل لو۔ اس نے صلہ واپس کر دیا اور کہا میرا نام سلطان محمد باپ کا رکھا ہوا ہے۔ اسے میں کیسے ترک کر سکتا ہوں۔ نیز میں تم سے کئی سال پہلے اس تخلص پر شعر کہتا رہا ہوں اور اسی تخلص سے مشہور بھی ہوں۔ خان زمان کو بڑا غصہ آیا اور اس نے کہا اگر تم یہ تخلص نہیں چھوڑو گے تو میں ہاتھی کے پیر سے بندھوا دوں گا نہ صرف یہ بلکہ وہ اس غرض کے لیے ہاتھی کو لے آیا۔ سلطان نے کہا: "میری بڑی خوش نصیبی ہے کہ میں شہادت کا درجہ پاؤں"۔ خان زمان نے

بہت ڈرایا دھمکایا۔ آخر مولانا علاؤالدین لاری خان زمان کے استاد نے کہا کہ جامی کی کوئی غزل محفل میں پڑھی جائے۔ اگر سلطان فی البدیہہ اس کے جواب میں غزل کہہ دے تو پھر اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے ورنہ تم جو چاہتے ہو اس طرح سے سلوک کرو۔ چنانچہ جامی کی یہ غزل پیش کی گئی:

دل خلوت را رقم صنع الٰہی دانست
بر سرِ ساد رخان حجت شاہی دانست

سلطان محمد نے فی البدیہہ اس کے جواب میں غزل کہی جس کا مطلع ہے:

ہر کہ دل را صدف سر الٰہی دانست
قیمت گوہر خود را بکماہی دانست

اگر چہ یہ غزل اتنی زیادہ اچھی نہ تھی، لیکن خان زمان سن کر بھڑک اٹھا۔ بڑی تعریف و توصیف کی اور بہت سارے تحفہ و تحائف دے کر رخصت کیا۔ اس واقعہ کے بعد وہ وہاں ٹھہر نہ سکا اور خان زمان سے اجازت لیے بغیر بدایوں چلا گیا۔ اس کے بعد جگہ جگہ کی سیر کرتا رہا اور آخر دکن چلا گیا۔

جس سال دکن کے چاروں حکمرانوں نے متحد ہو کر بیجانگر پر چڑھائی کی تھی اور ایک سخت لڑائی کے بعد اسے فتح کرلیا تھا اور اس قدیم اور مشہور بت کدے کو ڈھا دیا تھا۔ اسی سال سلطان دکن میں تھا اور اس لشکر کے ہمراہ جنگ میں شریک تھا چنانچہ اسے بڑا مال غنیمت بھی ہاتھ لگا تھا۔ اس کے بعد پھر اس کا پتہ نہیں چلا کہ کہاں گیا، کیا ہوا؟۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اس نے بڑی بے مروتی کا ثبوت دیا تھا کہ خان زمان جیسے قدرداں آدمی کی درخواست ٹھکرادی اور بزرگوں کے منہ آنے کی کوشش کی۔

ان کی غزل کا مطلع ہے:

زاھدا عرفان بدلق و سبحہ و مسواک نیست
عشق پیدا کن کہ اینجا داخل ادراک نیست

سلطان

یہ خان زمان کا تخلص ہے۔ اس کے حالات ہم نے اس منتخب میں تفصیل سے بیان کیے ہیں، بلکہ ہندوستان کی ساری تاریخوں میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ اس لیے مزید تفصیل کی ضرورت نہیں۔

اس کا شعر یہ ہے:

باریک چو موئیست میانی کہ تو داری
گویا سران موست دہانی کہ تو داری

اس کا بھائی بہادر بھی شعر کہتا تھا۔ ملا آصفی کی مدح میں اس نے اچھے شعر کہے ہیں۔

ملا آصفی کا مطلع ہے:

بر ما شب غم کار بسی تنگ گرفتہ — گو صبح کہ آئینہ ما زنگ گرفتہ

بہادر خاں نے کہا ہے:

آن شوخ جفا پیشہ بکف سنگ گرفتہ — گویا بمن خستہ رہ جنگ گرفتہ

میرتی

قاضی اور فقیہ ہونے کے باوجود خوش طبع شاعر تھا۔ علم عروض، قافیہ اور معمّہ میں بے مثل مہارت رکھتا تھا۔ ہندوستان آنے کے بعد حج کے لیے چلا گیا۔

رباعی

میرتی بحریم جان و دل منزل کن
قطع نظر از صورت آب و گل کن

جز معرفت خدائی ہیچ است ہمہ
بگذر ز ہمہ معرفتی حاصل کن

سپہری

خواجہ بیتا کے بھتیجے میرزا بیگ کا تخلص ہے، یہ صاحب دیوان شاعر ہے۔ یہ اشعار اس کی روشنی طبع کا نمونہ ہیں:

از تبسم دفع زہر چشم خشم آلود کن
کز نمک سازند شیرین چون بود بادام تلخ

سیاقی

یہ بیرم خان کے یہاں ملازم تھا۔ بیرم خان نے اس کے ذریعہ حضرت امام رضا کے آستانہ کے لیے 7 ہزار روپیہ کی نذر بھجوائی تھی۔ اس نے یہ ساری رقم خرچ کر دی۔ جس کے لیے شاہ طہماسپ نے اسے قید کر دیا۔ 974ھ/1566ء میں وہ قید سے رہا ہوا۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

رخسارۂ زردم چو در آئینہ عیان شد
آئینہ زعکس رخ من برگ خزان شد

سہمی

اس کا باپ تیر ساز تھا۔ اس پیشہ کی مناسبت سے اس نے یہ تخلص رکھا تھا۔ مرزا عزیز کوکہ کی خدمت میں تربیت پائی تھی۔ 12 سال کی عمر سے ہی شعر کہنے لگا تھا۔ اس لیے اس کی مشق بڑی اچھی تھی اور جلدی ہی انھوں نے شہرت پائی۔

ای تو سلطان ملک زیبائی
ما گدا پیشگان تماشائی

لشکر خان میر بخشی نے جو خراسانی اور کٹر رافضی تھا اور اپنا رفض چھپائے رہتا تھا، اس

سے پوچھا "ملا کیا سنی ناپاک بھی ہوتا ہے"؟ میرزا عزیز کوکا نے ترکی بہ ترکی کہا "ہاں، جیسے تم!"

قاسم ارسلان نے جمی کے بارے میں کہا ہے:

جمی و ظریفی و فریدون وزدند
چون گربہ و چون شغال و میمون وزدند

سقا

شیخ جامی کے مریدوں میں سے ہے۔ یہ ایک فانی مشرب درویش تھے۔ جذب و حال طاری رہتا تھا۔ آگرہ کے گلی کوچوں میں چند شاگردوں کے ساتھ لیے لوگوں کو پانی پلایا کرتے تھے۔ ان کے اشعار بھی پانی کی طرح رواں دواں تھے۔

ان کے ایک پیر زادہ ہندوستان آئے تو جو کچھ ان کے پاس تھا انھوں نے پیرزادہ کی نذر کر دیا اور خود سراندیپ[87] کی طرف چلے گئے۔ سیلون[88] کے راستہ میں وفات پائی۔ کہتے ہیں اس کفرستان میں ایک شخص نے جسے حضور اکرم ﷺ نے خواب میں اشارہ کیا تھا غیب سے ظاہر ہوا اور سقا کی تجہیز و تکفین کی۔

انھوں نے اپنے کلام کے چند دیوان مرتب کر لیے تھے، لیکن جب بھی ان پر جذب طاری ہوتا تھا اپنے دیوان کو دھو ڈالتے تھے۔ جو کلام بچ رہا وہ بھی اچھا خاصہ دیوان ہے۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

بخال عارضش در ہر نظر حیرانی دارم
بدور نقطہ چون پرکار سرگردانی دارم

سپاہی

خواجہ کلاں بیگ کا پوتا ہے۔ یہ رباعی اس کی ہے:

افسوس کہ وقت گل یزدی بگذشت
فریاد کہ تا چشم کشودی بگذشت
بی چشم و خلعت بنفشہ نرگس را
ایام بکوری و کبودی بگذشت

978ھ/1570ء میں آگرہ میں ان کا انتقال ہوا۔

سرمدی اصفہانی

کچھ عرصہ تک شاہی چوکی نویس رہا، اب شریف آملی کے ساتھ بنگالہ میں مقرر ہے۔ پہلے فیضی تخلص کرتا تھا جب بادشاہ کی مجلس میں شیخ فیضی کے ساتھ اس کا جھگڑا ہوا اس نے اپنا تخلص سرمدی رکھ لیا۔ موزوں طبع آدمی ہے۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

تا تیغ ناز آن بت مغرور شد بلند صد گردن نظارگی از دور شد بلند
می در سرو گل در بغل آئی چو در کاشانہ ام
بہر تماشا بشکفد خاشاک محنت خانہ ام

ساقی جزائری

یہ عرب ہے۔ اس کا باپ شیخ ابراہیم بڑا فاضل فقیہ تھا۔ شیعہ اس کو اپنے مسلک کا مجتہد سمجھتے تھے۔ مشہد کا رہنے والا تھا۔ ساقی بھی مشہد میں پیدا ہوا۔ کچھ علم حاصل کرنے کے بعد دکن پھر وہاں سے ہندوستان آیا۔ اب وہ بنگالہ میں رہتا ہے۔ نہایت خوش طبع اور شیریں کلام شاعر ہے۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

ز جانم گاہ گریہ آہ درد آلود می خیزد
بلی چون آب بر آتش فشانی دود می خیزد

سیدی

اس کا اصل نام سید شاہی ہے، جس کا تذکرہ ہم (80) کر چکے ہیں۔ یہ گرمسیر کے سیدوں میں سے ہے۔ جو کالپی میں متوطن ہو گئے تھے۔ سیدی خوش کلام شاعر ہے، تصوف سے بھی بہرہ مند ہے اور شیخ اسلام چشتی کا مرید ہے۔ کچھ عرصے تک بادشاہی ملازمت میں رہا۔ مختلف امراء کے ساتھ بسر کرتا رہا۔ اب کابل میں قلیچ محمد خان کے پاس ہے۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے۔

اول سرگری عشقست و دل در اضطراب
ہمچو طفلی کہ تپد ہنگام بیداری ز خواب

گل حمائل کرد تا سروی بالای من　　　من زگل در رشک و گل در غیرت از پیراہنش

نیافت از دل گم گشتہ ام نشان کہ چہ شد
نسیم اگر چہ دو زلف تو تار تار کشاد

شاہ ابو المعالی

ان کا ذکر ہم کر آئے ہیں۔ یہ بھی نہایت خوش طبع شاعر تھے اور شعر گوئی کا بڑا اچھا سلیقہ رکھتے تھے۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

جان من ہم صحبت اغیار بودن نیک نیست　　　جز من بیکس بہر یک یا بودن نیک نیست
خوش بود آزردن عاشق گہی کہ لطف نیز　　　دائما بر مسند آزار بودن نیک نیست
بر امید وصل خوش می باش در کنج فراق　　　نا امید از دولت بیدار بودن نیک نیست

جدا ز وصل توای دلبر یگانہ شدم
اسیر بند فراقت بہر بہانہ شدم

شیری

پنجاب کے ایک گاؤں کوکووالا کا رہنے والا ہے۔ اس کا باپ ایک بہت بڑے اور مشہور قبیلے ماجیان کی ایک شاخ سے تعلق رکھتا تھا۔ اپنی ماں کے متعلق کہا کرتا تھا کہ سیدزادی ہے۔ شیری نے فطرت عالی اور طبع رسا پائی ہے اور وضع کا پابند ہے۔ اس کے باپ مولانا مکی کی تربیت سے بہت سی خوبیاں پیدا ہو گئیں۔ اس کے والد کا مطلع ہے:

هست از باران لطف ای کریم کارساز
در دل دانا ہر یک قطرہ صد دریای راز

شیری کو شعر کہنے پر پوری قدرت حاصل تھی، چنانچہ اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے ایک رات میں 3 غزلیں کہی ہیں۔ ایک دن وہ محفل میں اپنے دیوان کا ایک قطعہ پڑھ رہا تھا۔ اس میں یہ مصرع بھی تھا:

"چار دفتر در آب چناب انداختم"

شیری نہایت خوددار، دردمند اور فقیر منش آدمی تھا۔ اس بات کی طرف اس نے اپنے اشعار میں اشارہ کیا ہے:

صاحب خوان فقیرم و ہرگز
ہمت من نخواہد از جانان
قرض ہندو بشرط دہ پنجاہ
بہ کہ انعام این مسلمانان

خاص طور سے "شکوہ و شکایت" کا مضمون اس سے بہتر کسی ہم عصر نے نہیں باندھا۔

گذشتگان ہمہ عشرت کنید کا سودید
ازان کہ عیش بر افتاد از میانۂ ما
ایا کسان کہ پس از ما رسید فاتحہ
بشکر آنکہ نبودید در زمانۂ ما

بلا شبہ قصیدہ اور قطعہ گوئی میں وہ اپنے تمام معاصرین پر سبقت لے گیا ہے۔ دوسروں کی فصاحت اس کے سامنے ماند پڑ گئی اور اس کے کلام نے سب کے لبوں پر مہر لگا دی۔ جیسا کہ خود اس نے اس قطعہ میں کہا ہے:

اگر از شعر شیریم پری — گویم از در میانہ انصاف است
نہ ہمہ شعر شاعری سرہ است — نہ ہمہ بادہ کسان صاف است

اس کا دیوان بہت مشہور ہے۔ جس زمانہ میں وہ مہابھارت کے ترجمہ کے لئے مقرر کیا گیا تھا تو کہا کرتا تھا کہ یہ فرسودہ داستانیں بخار میں مبتلا مریض کے خواب ہیں۔ ملا شیری نے 994ھ/1586ء میں یوسف زئی کی پہاڑی میں وفات پائی۔

شکیبی اصفہانی

وہ حال ہی میں ہندستان آیا ہے۔ بیرم خان کے لڑکے خان خانان کے ساتھ رہتا ہے۔ سلیقۂ شعر سے بہرہ مند ہے:

ھنوز نالہ شب ھای من اثر دارد — کمان شکستۂ من تیر کارگر دارد
دلم بہ ھجر در آویخت رحمتی ای بخت — کہ دست عربدہ باکوہ در کمر دارد
تو گل بدامن یاران فشان کہ حسنۂ ھجر — بنوک ہر مژہ صد پارۂ جگر دارد

اے خدا جنس مرا از غیب بازاری بدہ
می فروشم دل بدیداری خریداری بدہ

شجاعی

یہ سیف الملک حکیم کا تخلص ہے۔ وہ میر سید محمد جامہ باف کا علاج کر رہا تھا۔ میر نے اس کے بارے میں کہا تھا:

سیف قاطع بندگان مولوی سیف الملوک — آنکہ طرح تو بحکمت در عمل آوردہ بود

دی اجل میگفت ہمبر بران جان مریض | ہر کجا رفتیم پیش از ما علاجی کردہ بود

یہ اشعار مولانا شجاعی کے کلام کا نمونہ ہیں:

زسودائی بتان داری سری باموئی ژولیدہ
مسرت گردم کہ باعاشق سری داری و سودائی
تا زلف افتادہ بر رخسار جانان من است
یا مگر بر روی آتش رشتہ جان من است

شعوری ترقی

یہ ایک طالب علم ہے:

اس کے مشق سخن کا نمونہ یہ شعر ہیں:

ای کہ زبیم ہجر او در سکرات مردنی | مژدہ کہ آن مسیح دم میر سد و رسیدہ است
مراز خانہ برون ھر دم آرزوی تو آرد | گرفتہ شوق گریبان من بسوی تو آرد

ملا صادق حلوانی سمرقندی

نہایت بلند مرتبہ عالم تھا۔ نہایت خوش کلام اور صاحب فضل، ان کا مرتبہ اس سے کہیں زیادہ بلند ہے کہ اس کا ذکر شاعروں کے ذیل میں کیا جائے۔ لیکن افسوس ہم پر اور اس پر بھی کہ ایسا کرنا پڑا۔

سنتے ہیں وہ بڑی کوششوں سے ہندستان آیا، پھر یہاں سے بیت اللہ کی زیارت کے لیے گیا۔ وہاں سے 978ھ/1571ء میں لوٹ کر آیا ور اپنے وطن چلا گیا۔ مرزا محمد حکیم نے اس سے کابل میں ٹھہرنے کی فرمائش کی تھی اور اس سے درس لینے لگا تھا۔ ان دنوں وہ ما وراء النہر میں درس وتدریس میں مصروف ہے۔ شعر کا بڑا اچھا سلیقہ ہے، اس کا ذوق نہایت بلند ہے۔ ایک دیوان بھی مکمل کیا ہے۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

دل گم شد و نمی دھدم کس نشان ازو
در خندہ است لعل تو دارم گمان ازو

جز درت جای دل آوارہ را منزل نشد
از درت گفتم شوم آوارہ اما دل نشد

ھمچو خورشید از سرای ماہ سیما آمدی
خوب رفتی جان من بسیار زیبا آمدی

صبوحی

چغتائی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ نہایت بے قید اور لا ابالی شخص تھا، شعر خوب کہہ لیتا تھا۔

دلم کہ مہر تو دارد ہمین تو میدانی
نگفتہ ام بکس این راز خدادانا ست

اس نے آگرہ میں 973ھ/1565ء میں وفات پائی۔ تاریخ وفات ''صبوحی میخوار'' سے نکلتی ہے۔

صالحی

ہرات کا رہنے والا ہے، شعر و انشاء میں بڑا اچھا سلیقہ ہے۔ علم سے بھی بے بہرہ نہیں، اچھا خوش نویس ہے۔ عرصے تک منشیوں کا کام کرتا رہا، پھر اپنے وطن واپس چلا گیا۔
اس کے کلام کا نمونہ ہے:

شب فراق تو در خانہای دیدہ مرا
بستہ خون جگر آن چنان کہ خواب در آید

صادقی

قندھار میں پیدا ہوا، اصل تعلق ہرات سے ہے۔ کچھ عرصے تک ہندستان میں رہا، پھر واپس وطن چلا گیا۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

مرا از بسکہ از تیغ تو در تن چاک می افتد
بہر پہلو کہ می زخم دلم بر خاک می افتد

صرفی

یہ شیخ یعقوب کشمیری کا تخلص ہے۔ اس کا ہم کچھ حد تک ذکر کر آئے ہیں۔ شیخ بہت سی خوبیوں اور کمالات کا مجموعہ تھے۔ اس نے تصوف اور دوسرے علوم وفنون میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ اس کی طبیعت بڑی شاعرانہ تھی۔

بر رخ فگند چاشت گر آن مہ نقاب را
پیش از زوال شام رسید آفتاب را

آخری عمر میں اس نے تفسیر کبیر کی طرح ایک تفسیر لکھنے کا ارادہ کیا تھا، کچھ لکھ بھی لیتا تھا، لیکن اپنے وطن میں انتقال کر گیا۔

صرفی ساوجی

کچھ عرصہ گجرات میں خواجہ نظام الدین احمد کے ساتھ رہا تھا۔ پھر لاہور چلا آیا درویشانہ وضع میں رہتا تھا۔ جس زمانہ میں شیخ فیضی دکن میں مقرر ہو کر چلا گیا تھا تو یہ بھی اس کے ساتھ تھا۔ دکن ہی میں فوت ہو گیا۔ مگر یادگار ایک دیوان چھوڑ گیا۔ قصیدہ و غزل میں خاص رنگ اور طرز کا مالک تھا۔

زراہ کعبہ ممنونم و گرنہ میفر ستادم
کف پای بزحمت چینی خار مغیلانش

صبوری ہمدانی

خان زمان کے قتل کے دن یہ قید ہوا تھا۔ قتل ہونے سے تو بچ گیا مگر موت سے جان نہ بچا سکا۔ اس کے اشعار اوسط درجہ کے ہیں۔

سپردم جان من بی صبر ودل از داغ ہجرانش | چو در دست این کہ غیر از جان سپردن نیست درمانش
چو سوز آشکارا پیش او ظاہر نمی گردد | جہان آگاہ سازم از جراحتہای پنہانش
چو در شبگون لباس آن مہ بسیر شب بردن آید | فروغ صبح ظاہر گردد از چاک گریبانش

کاش از خنجر من سینۂ او چاک شود
تا ببیند دل پاکم دل او چاک شود

صالح دیوانہ

تھا تو دیوانہ لیکن دربار سے عاقل کا خطاب ملا ہوا تھا۔ اس کا یہ معمول تھا کہ جب تک خضر علیہ السلام کے نام پر کھانے کے 5 تھال کسی دریا یا چشمہ پر نہیں بھجوا دیتا، کھانا نہیں کھاتا تھا۔ یہ کام قاسم ہندی کے سپرد تھا جو ایک مہاوت کا لڑکا ہے۔ یہ بھی شاعر ہے لیکن نہایت کمینہ آدمی ہے۔ قاسم ہندی یہ تھال اٹھوا کر باہر لاتا اور شہدوں اور قلندروں سے کہتا، کھاؤ اور مزے اڑاؤ۔ صالح دیوانہ اس سے پوچھتا تھا۔ "تم نے خواجہ خضر کو بھی کھانے پر دیکھا؟" وہ بے حیا جواب دیتا: "ہاں ہاں حضرت خواجہ نے تو بڑے شوق سے کھانا تناول کیا"۔ اسی طرح اور بھی جھوٹی سچی باتیں لگا دیتا۔ دیوانہ ان باتوں پر یقین کر لیتا۔

بہر حال دیوانہ سوز وں طبع آدمی تھا، بس وہی مثل تھی کہ:

شعر رنگا رنگ از طبع کج حیدر کلج
ہمچنان سر میزند کز تودۂ انبار گل

دیوانہ کا شعر ہے:

چو سودای سر زلفش بیا افگندہ زنجیرم

ورنہ سودا بغیر از جان سپردن نیست قدم

چند برس تک تو وہ بارگاہ شاہی میں مقرب و معزز رہا، پھر معتوب ہو کر کابل چلا گیا۔ دوبارہ ہندوستان آیا۔ حضرت سلطان المشائخ کا متولی بنایا گیا، لیکن اس نے اس منصب کو قبول نہ کیا اور اجازت لے کر کابل لوٹ گیا۔

طاقی

نام ملا علی محدث ہے۔ مشہور ہے کہ یہ ملا صادق کا بھائی ہے۔ اس نے عرب میں حدیث کا علم حاصل کیا تھا۔ نہایت متقی اور پرہیزگار آدمی تھا۔ ہندوستان دو مرتبہ آیا تھا۔ 981ھ/1573ء میں وفات پائی۔ ملا عالم کابلی نے تاریخ وفات کہی:

دریغا کہ بگذشت ملا علی را   رہید از میان دستبرد حوادث
پی سال تاریخ و سال دیگر   بگو مردہ ملا علی محدث

شعر کہنے کا سلیقہ تھا، کبھی کبھی اس کی شوخ طبعی اشعار کا جامہ پہن لیتی تھی۔

تن خاکی چنان افسردہ شد از داغ ہجرانم
بدو دیدن چو گرد از جامہ گرد از تن برافشانم

طرفی ساوجی

بذلہ گو، ظریف اور مسخرا تھا۔ اپنی بے حیائی کی وجہ سے دربار میں سارے شاعروں کو تنگ کرتا رہتا تھا۔ آخر دکن کی تفتیش پر بھیجا گیا۔ اور وہیں پیوند خاک ہوا۔

اس کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

عشق بازی را بغیر از جان سپردن پیشہ چیست
مستی کہ از مردن نیندیشم دگر اندیشہ چیست

کسی را جان زدست محنت هجران نمی ماند   اگر این است هجران هیچ کس را جان نمی ماند

درین دیار بخون خوارهٔ که دل بستم
بدام زلف پری چہرهٔ که افتادم

طالب اصفہانی

8 سال سے کشمیر میں مقیم ہے۔ پہلے ایک قلندر نما آدمی تھا، آخر میں ملازمت کر لی اور بادشاہ کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اکبر نے اسے کشمیر سے چھوٹا تبت کے حاکم علی رائے کے پاس سفیر بنا کر بھیجا تھا، وہاں سے لوٹ کر آیا تو وہاں کے حیرت انگیز حالات اور نوادرات کے متعلق ایک رسالہ لکھا اور شیخ ابو الفضل کو دیا۔ اس نے رسالہ کو اکبر نامہ میں شامل کر لیا۔ نہایت دردمند اور غم گسار آدمی ہے۔ شعر و انشا میں بڑا اچھا ملکہ رکھتا ہے۔

رباعی

زهردم بفراق خود پشانی که چه شد
خون ریزی و آستین فشانی که چه شد
ای غافل از آنکه تیغ هجر تو چه کرد
خاکم بفشار تا بدانی که چه شد

طالعی یزدی

خوش خط نستعلیق نویس ہے۔ کچھ پڑھا لکھا بھی ہے۔ آگرہ میں جلد سازی کا کام کرتا تھا۔

ساقیان چند تو ان خورد غم عالم را
بادهٔ پیش از که بیرون کنم از دل را

طفلی

ملا درویش فتح پوری کا لڑکا ہے۔ اس کا چچا ملا صالح اب خانقاہ فتح پور میں مدرس ہے۔ طفلی 13 سال کی عمر میں ہی "شرح شمسیہ" پڑھنے لگا تھا۔ نہایت فیاض طبع آدمی ہے۔ شعر کا ذوق بھی بڑی حد تک مناسب و عمدہ ہے۔ بڑے شاہزادے کی ملازمت میں رہتا ہے یہ تخلص اسی کے دربار سے اسے ملا ہے۔ بڑے شاہزادے کی ملازمت میں جو قصیدہ ان کی تعریف میں کہا ہے اس کے چند شعر یہ ہیں:

ایا شہی کہ جہان را زرہزنان خلل
بدور معدلت فتنہ پاسبان آمد

امید لطف تو ہست آنچنا تک عاصی را
گناہ از آتش دوزخ نگاہبان آمد

تو ئی کہ مرکب عزم ترا بروز دغا
ظفر علم کش و اقبال ہم نمان آمد

رسائند نامۂ اقبال دوش مرغ شرف
کہ صیت شہپرش از اوج لا مکان آمد

نوشتہ کاتب قدرت عبارتی کان را
امید ترجمۂ و شوق ترجمان آمد

اس عمر میں فارسی کہنا اور سمجھنا ہی بڑی بات ہے۔ کہاں شعر گوئی اور وہ بھی اس قدر عمدہ، آثار تو یہ ہیں کہ اپنے زمانہ کے بڑے بوڑھوں کو بھی پیچھے چھوڑ جائے گا۔

ظہوری

دکن میں رہتا تھا۔ نہایت آزاد خیال اور بے قید لیکن دردمند آدمی تھا۔ امیروں کے گھر پر کم ہی آیا جایا کرتا تھا۔ شیخ فیضی اس کی اور ملک قمی کی جو ملک الکلام کے لقب سے مشہور تھا، بہت تعریف کیا کرتا تھا۔ یہ دونوں فیضی کے ساتھ پایتخت لاہور آنا چاہتے تھے لیکن برہان الملک راضی نہ ہوا۔ ان دنوں سننے میں آیا کہ دکن میں غدر ہوا تو وہاں کے لوگوں نے ان دونوں کو قتل کر دیا۔ مولانا ظہوری صاحب طرز اور صاحب دیوان شاعر گزرا ہے۔ یہ شعر اس کی یادگار ہے:

ظہوری شکوہ ات از یا ربی جاست
تو بی طالع قناری جرم او چیست

عالم کابلی

عارف تخلص تھا۔ نہایت دلچسپ، خوش مزاج، خوش اطوار مُلّا تھا۔ بحث کے دوران اور دوسرے مواقع پر ایسی باتیں کہہ جاتا تھا کہ سننے والے ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ اپنی بیاض میں ''شرح مقاصد'' کی بحث پر ایک مضمون لکھ رکھا تھا۔ جگہ جگہ اشعار بھی دیے تھے۔ لکھا تھا کہ یہ عبارت میری کتاب ''قصد'' سے ماخوذ ہے۔ اسی طرح اس نے ''شرح تجرید'' کے جواب میں ''تجرید'' کے نام سے اور ''مطول'' پر بھی ایک دو حاشیے لکھ رکھے تھے کہ عبارت کتاب ''طول'' سے لئے گئے ہیں جو ''مطول'' اور ''اطول'' کے مقابلے کی کتاب ہے۔ اس نے ہندستان کے مشائخین کے حالات میں بھی ایک تذکرہ لکھا تھا۔ اس میں جس مجاور اور فقیر سے بھی کوئی بات سنی درج کر لی اور کچھ تو بس اندازہ پر اضافہ کر دیا۔ اس کا نام رکھا ''وفتح الولایہ'' لوگوں نے کہا: ''بھائی اس واؤ عطف کا معطوف کہاں ہے؟'' اس نے جواب دیا: ''معطوف معطوف علیہ میں چھپا ہوا ہے جس کا نکالنا ممکن نہیں۔ اگر تم ''ولایہ'' کے واؤ کو زبر سے پڑھو تو پتہ چلے گا''۔ ملا ہمیشہ قاضی خان بدخشی پر اس وجہ سے رشک کیا کرتا تھا کہ سجدۂ تعظیمی ایجاد کرنے کا سہرا اس کے سر بندھ گیا تھا۔

ایک دن فتح پور میں مجھے(90) اور نظام الدین احمد کو صبح صبح بڑا اصرار کر کے اپنے گھر لے گیا۔ اشتہا بڑھانے والے معجون اور اپنی کتابوں کا بستہ لے کر بیٹھ گیا۔ ہم صبح سے دوپہر تک بھوکے بیٹھے رہے، کہنے سننے کا کوئی موقع نہیں ملا تھا۔ آخر میرزا سے رہا نہیں گیا اور وہ بول اٹھے: ''کچھ کھانے کے لیے بھی ہے؟'' اس نے جواب دیا: ''میں تو اس خیال میں تھا کہ تم لوگ کھانا کھا کر آئے ہو، میرے پاس ایک بکری کا بچہ ہے اگر فرمائیں تو ابھی ذبح کر دوں''۔ ناچار ہم(91) اٹھ کر اپنے گھر چلے آئے۔ اس کی ان حرکتوں پر آخر اسے کیا سمجھا جائے؟

اس نے جب دیکھا کہ شیخ ابو الفضل اور قاضی خان اور دوسرے اس کے برابر کے لوگ ملاگیری سے امارت کے منصب پر پہنچ گئے ہیں تو وہ بھی ہر وقت بادشاہ سے یہ عرض

کرنے کی فکر میں رہتا تھا کہ اسے بھی فوج میں داخل کر لیا جائے۔ جب اس کی درخواست قبول نہ ہوئی تو ایک دن شام کو چوکی کی سلامی کے موقع پر مانگی ہوئی ایک تلوار کمر سے باندھے فوجی وضع بنائے نہایت مضحکہ خیز حالت میں صف سے باہر نکل کر بادشاہ سلامت کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور خلاف قاعدہ کسی واسطے کے بغیر براہ راست اکبر سے پوچھنے لگا ''ہمیں کس منصب دار کے ساتھ کھڑا ہونا چاہیے اور ہم کس جگہ سے تسلیمات بجا لائیں''؟ بادشاہ اس کا مطلب بھانپ گئے اور کہا: ''تم جس جگہ ہو وہیں سے تسلیمات بجا لاؤ''۔ جب یہ تدبیر بھی بے نتیجہ رہی تو ایک دن اپنی شان دکھانے کے لیے، تا کہ فوجیوں میں داخل ہو جائے۔ عین دوپہر کے وقت گرمی میں روئی کا لبادہ جو میل سے بھرا تھا کسی کا بخشا ہوا یا مانگے کا تھا۔ پہن کر دربار میں آیا۔ مرزا کوکہ نے اس لبادہ پر بڑی پر مذاق باتیں کیں وہ بھی ان کا اسی طرح جواب دیتا رہا۔

اس کی جائے پیدائش کابل کے علاقہ میں گل بہار نامی ایک گاؤں تھا۔ اسی مناسبت سے عرصہ تک اپنا تخلص بہاری رکھے ہوئے تھا۔ جب اسے خیال آیا کہ یہ تخلص کنیزوں کے نام جیسا ہے تو بدل کر ریتی رکھ لیا۔ اپنی مہر کے لیے اسی کا سجع بھی بنوا لیا۔ بہر حال عالم کا بلی موزوں طبع شاعر تھا۔ یہ چند شعر اس کے یادگار ہیں:

می پرد چشمی کہ می گشتم ازو ہر لحظہ شاد
غالباً کاہی ز دیوارش بروخواہم نہاد

چند شعر اس نے ''سلسلۃ الذہب'' کی زمین میں بھی کہے تھے اور اپنے اس مہمل مجموعہ کا نام ''سلسلۃ الجرس'' رکھا تھا۔ اس میں اُس نے اپنی بہت سی ان تصانیف کے نام دیے ہیں جو ابھی اس کے ذہن ہی میں مستور ہیں اور خارج میں نمودار نہیں ہوئے ہیں۔ ان کے نام بھی بڑے عجیب عجیب گنائے ہیں، مثلاً:

دیدہ باشی بہ نسخۂ تجدید   کہ بجود رسید فیض جدید
کاندرو حمد سواقف است نہاد   واز بیانش مقاصد است عیان

اس مسخرے پن سے قطع نظر، ملا عالم بڑا اچھا دوست تھا۔ لائق فاضل، ہمدرد، بے غرض انسان تھا۔ بذلہ گو، مگر دلچسپ اور ہردلعزیز آدمی تھا۔ امید ہے اللہ تعالیٰ اسے اپنے فضل و کرم سے بہشت جاودانی عطا فرمائے گا۔

میر عبدالحی مشہدی

یہ کچھ عرصے تک ہمایوں کے زمانہ میں صدر کے عہدے پر رہے۔ ان کا بھائی میر عبداللہ قانونی خاص مصاحبوں میں سے تھا۔ یہ دونوں بھائی نہایت متقی و پرہیزگار تھے۔ میر عبدالحی خط بابری سے بھی واقف تھے۔ یہ خط بابر بادشاہ نے ایجاد کیا تھا۔ اس خط میں قرآن کا ایک نسخہ لکھ کر مکہ معظمہ بھی بھجوایا تھا، اب اس خط کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔

میر علاء الدولہ نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ میر مذکور بہت سی حیثیتوں کے مالک تھے۔ خط بابری جو نہایت مشکل خط ہے ان کے سوا کسی اور نے اس قدر جلدی اور خوبی کے ساتھ نہیں سیکھا تھا۔ اس کے حاشیہ پر میرزا عزیز کوکہ نے لکھا ہے: "میر کسی علم سے واقف نہیں تھا بس ایک ہنر جانتا تھا بس ایک خط بابری اچھا لکھ لیتا تھا، عجب سادہ لوح ہے کہ ایسی بے سروپا حکایتیں جنہیں کوئی بچہ بھی باور نہیں کرے گا، بے سوچے سمجھے، بے موقع مجلسوں میں بیان کرنے لگتا ہے"۔ چونکہ میرزا اس سے بہت پہلے سے واقف تھا اس لیے اس کی رائے زیادہ صحیح اور حقیقی معلوم ہوتی ہے۔ میر علاء الدولہ کے تذکرہ میں بڑی شترگربگی پائی جاتی ہے۔

میر عبدالحی شعر سے پوری مناسبت رکھتا تھا۔ اس نے اس موضوع پر رباعی کا جواب بھی کہا تھا جسے کسی فاضل شاعر نے میرزا ہندال کے نام مربع کی طرز میں کہا تھا۔ یہ رباعی بہت مشہور ہے۔ بچے بھی پہلی جو چیز یاد کرتے ہیں وہ یہی رباعی ہے۔

رباعی

ای تاج بدرگاہ تو صدر حشم زمال
مداح تو باشند ہمہ اہل کمال

ہند از قدمت مسخر بر تو
القاب تو شد شاہ محمد خندال

میر عبدالحی کے مزاج میں بھی بچگانہ پن تھا۔ اس نے اس کے جواب میں رباعی لکھی۔

ای تاج ورت هزار چو قیصر
مدح تو بود ورد زبان شام و سحر
القاب جہان تمام شد یارب
در حکم شاہ جہان محمد اکبر

عتابی

سید محمد نجفی نام تھا۔ دکن میں نہایت معتبر و معزز تھا۔ ہندستان آیا تو الہ آباد میں بادشاہ کے حضور رسائی ہوئی۔ وہ اکبر کو نہایت ہی لا اُبالی، بے باک اور اکھڑا اکھڑا سا آدمی نظر آیا۔ یہ بھی بات عرض میں پہنچی کہ اس نے دکن میں شاہ فتح اللہ کی ہجو کہی تھی۔ جب بادشاہ نے اس بارے میں دریافت کیا تو اس نے صاف انکار کر دیا اور کہا: "وہاں دکن میں شاہ جیسے لوگوں کو کہاں لائق توجہ سمجھتا تھا"۔ یہ بات اکبر کی بدگمانی کو اور بڑھا گئی اور اس نے اسے قید کروا دیا۔ فتح پور پہنچنے پر حکم دیا گیا کہ اس کے مسودات کی تلاشی لیں اور دیکھیں کہ اس نے اس عرصہ میں کس کس کی ہجو کہی ہے۔ بعض چیزیں برآمد ہوئیں اور وہ 10 سال تک گوالیار کے قلعے میں قید رہا۔ آخر بڑے شاہزادے اور دوسرے مقربوں کی سفارش پر اس کو معافی دی گی اور اسے لاہور بلا لیا گیا۔ رسی جل گئی تھی مگر بل نہیں گیا تھا۔ وہی بدمزاجی اب بھی موجود تھی۔

ایک دن قاضی حسن قزوینی جس کو خان کا خطاب حاصل تھا اس سے ملنے گیا، دربان نے اسے روک دیا، دربان سے لڑ بھڑ کر قاضی کی محفل میں جہاں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا پہنچ گیا اور قاضی حسن سے کہنے لگا کہ: "اچھا تو یہ کھانا ہے جس کی وجہ سے اہل علم کو دروازہ پر روکا جاتا ہے"۔ صاحب خانہ اور حاضرین نے بہت معذرت کی کہ

دربان نے آپ کو پہچانا نہیں لیکن عتابی نے مان کر بھی نہ مانا اور کھانے میں شرکت نہ کی۔ عربی فارسی شعر کہنے میں اچھی مہارت رکھتا ہے۔ ایک دیوان بھی مکمل کیا ہے۔ اس کے کلام کا نمونہ ہے:

در گلخن ھوا دل فرزانہ سوختم
قندیل کعبہ بہر در بت خانہ سوختم

رہائی کے بعد بادشاہ نے اسے ایک ہزار روپیہ نقد دے کر قلیج خان کے حوالے کر دیا کہ اسے سورت سے حجاز روانہ کر دیا جائے، لیکن وہ راستہ سے بھاگ کر دکن چلا گیا اور وہاں کے حکام کے پاس پہلے کی طرح اعزاز و اکرام سے رہنے لگا۔

عبیدی

نو رسیدہ جوان ہے، اس کا شعر ہے:

متاع دل کہ بہ پرسیدنم نمی ارزد
کرشمہ کہ بپرسیدنش نمی ارزم

اس کے اس شعر نے لاہور میں ہلچل مچا دی اور اسی لیے حکیم ابو الفتح نے بڑی تعریف کر کے اسے بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ نے جب اس سے شعر سنانے کی فرمائش کی تو اس نے اس شعر کے بجائے ایک اور شعر جس میں زمانہ کی شکایت بیان کی تھی پڑھا، جو بادشاہ کو پسند نہ آیا۔ اس کے بعد وہ اپنے شعر کے اثر کی طرح ہمیشہ کے لیے غائب ہو گیا۔

عشقی خان

یہ ترک پیرزادوں میں سے ہے۔ "علم سیاق" سے واقف ہے۔ کچھ عرصے تک سرکار اعلیٰ میں میر بخشی بھی رہا۔ قصیدوں اور غزلوں کا ایک دیوان جمع کیا ہے۔ ایک دن اس نے بادشاہ سے عرض کی کہ میں حضور میں کلیات پیش کرنا چاہتا ہوں اور اس وقت ایک نیا قصیدہ اور غزل سنانے لگ گیا۔ اس کے مضحکہ انگیز شعر جیسے بھی ہوتے تھے سب کو معلوم تھا۔ اس

نے بادشاہ نے اسے روک دیا اور کہا ابھی رہنے دو جس وقت تم اپنی کلیات پیش کرتے اس شعر کو بھی اس میں شامل کر لینا ہم سب کچھ ایک ہی بار سن لیں گے۔ تیمور بیگ کی مثنوی کی طرح طویل مثنوی بھی کہی ہے:

خواہی اعتبار در چشم من
چہ بلا مردک با چشم من

تقی

اس کا لقب میر محمد تقی ہے۔ وہ نجف آباد کے سیدوں میں سے ہے۔ خان زمان کا حصہ امیر رہا ہے۔ ایک وقت ہمایوں اس کے ماتحت تھا۔ صاحب علم و فضل اور نہایت خوش طبع آدمی تھا۔ ہمایوں کے اکابرین میں سے تھا۔ خان ہائی ایک شخص نے جس کا تخلص زاہد تھا، وحشی مثنوی کا ایک شعر جو بسم اللہ کی تعریف میں تھا اس کے سامنے پڑھا:

نقطۂ یسین چو خالص شدہ
نقطۂ او لذتی دہان شدہ

میر کا شعر ہے:

اگر دل بہ آں سگ کو خواب نمود
تو نالہ و فریاد و فغان کر تو وہی

میر محمد حافظ

قزوین کے سیفی سیدوں میں سے ہے۔ فن سیاق اور منشی گری میں بہت ماہر تھا۔ دوسرے علوم سے بھی واقف تھا۔ کچھ عرصہ تک شاہی دیوان بھی رہا۔ جب ہندوستان میں کروڑیوں کا تقرر ہوا تو وہ ۵ کروڑ کی تحصیل پر سنبھل میں مقرر کیا گیا تھا اور اس صوبے کا نظم و نسق اور مالیات کا انتظام کرتا رہا۔ آخر دنوں میں بادشاہی دفتر کے محاسبہ کی زد میں آ گیا جو کچھ پونجی جمع کی تھی وہ سب سرکاری خزانہ میں جمع کرانی پڑی اور اسی مصیبت میں فوت ہو گیا۔ اس

کی غزلیات کا ایک دیوان ہے، ایک نظم "شہر آشوب" اور ایک "منظوم نامہ" اور ایک "گل و نل" کے نام سے رسالہ ہے۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

سبزہ خط رستہ زلعلش بس با آب و تاب
زانکہ دایم می خورد از چشمۂ خورشید آب

چنین کا فتادہ در راہ غم و محنت چو خاشاکم
نسیم ولطف واحسانت مگر بر دارد از خاکم

میرزا عزیز کوکہ

اعظم خان کے لقب سے مشہور ہے۔ نہایت با اخلاق، نیک، صاحب علم و فضل ہے۔ امرائے شاہی میں اس جیسا سمجھ دار اور مدبر کوئی اور نہیں ہے۔ وہ پہلے بھی شعر و شاعری میں بھی طبع آزمائی کرتا تھا۔ ان صفحات کو ہم اس کے کلام سے خالی نہیں رکھنا چاہتے۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

چون نشد حاصل مرا کام دل از ناموس و ننگ
بعد ازین خواہم زدن بر شیشۂ ناموس سنگ

ای زلف چلیپائی تو زنجیر دل من
دی عشق تو آئینہ با آب و گل من

آگرہ میں ایک باغ "جہاں آرا" کے نام سے بنوایا تھا اور اس باغ میں ایک مکان نقش و نگار سے آراستہ کیا۔ کتبہ پر یہ رباعی لکھوائی تھی:

یارب بہ صفائی دل ارباب تمیز ... کان نزد تو ہست خوب تر از ہمہ چیز
چون گشت بتوفیق تو این خانہ تمام ... از راہ کرم فرست مہمان عزیز

اس کے جو کارنامے ہیں وہ رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے ان میں سب سے بڑا تو

اس کا وہ دلیرانہ حج پر جانا ہے لیکن آہ اس کا وہ لوٹ کر آنا۔

مہدی شیرازی

قصیدہ اور غزل ہر صنف میں شعر کہے ہیں۔ گجرات میں میرزا نظام الدین احمد کے ساتھ تھا۔ جب دلی آیا تو قاضی محمد کی معزولی کے بعد جو ایک کٹر شیعہ اور بد معاش آدمی تھا حکیم عین الملک مرحوم نے لاہور میں اس عہدے پر مقرر کرانے کی بڑی کوشش کی مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا بس شیخ چلی کا خواب دیکھ کر رہ گیا اور حکیم کے ساتھ دکن چلا گیا۔ حکیم کے مرنے کے بعد اس کے حالات کا پتہ نہیں چلا کہ کہاں گیا اور اس کا کیا ہوا؟

از خون لب شکوہ ام اگر تر می شد   از روزن دیدۂ دوردل برمی شد
اشکم ہمہ شعلہ ریز آتش می ریخت   آہم ہمہ تاب دادہ اخگری شد

حکیم عین الملک جس وقت لاہور سے، بلکہ کہنا چاہیے کہ اس دنیا سے رخصت ہو رہا تھا حکیم ثنائی کی یہ رباعی محفل میں پڑھی گئی:

می زن نفس کہ ہم نفس نزدیکست   وین مرغ مراد از قفس نزدیکست
تا کی گوئی کہ دورم از دلبر خویش   در خود بنگر کہ یاربس نزدیکست

مہدی کے اشعار ہیں:

آزادیٔ این مرغ قفس نزدیکست   وین شعلہ بکار خاروخس نزدیکست
از من بنہراد بال و پر بگریزد   گر غم داند کہ باچہ کس نزدیکست

عنایت اللہ کاتب

شیراز کا رہنے والا ہے۔ ان دنوں شاہی کتب خانہ میں منتظم ہے۔ نہایت خوش طبع اور ذہین ہے۔ کبھی کبھی شعر کہہ لیتا ہے۔

رباعی

افتادہ چو مرغ بی نوا در قفسم
بی ساز صدا چو دل شکستہ جرسم
با آنکہ حقیر تر ز مور و مگسم
بگرفتہ زنگی دو عالم نفسم

وہ گھوڑے کی تعریف میں کہتا ہے:

گہ پویہ اعضا از بس شتاب
بہم در رود ہمچو اجزای آب

عرفی شیرازی

بلند فطرت، صاحب فہم نوجوان تھا۔ ہر طرح کے شعر بہت اچھے کہے ہیں، لیکن کچھ اتنا متکبر اور مغرور تھا کہ لوگ دور بھاگنے لگے۔ بڑھاپے سے پہلے ہی فوت ہوگیا۔

جب ولایت سے فتح پور آیا تو سب سے پہلے شیخ فیضی سے اس کی دوستی ہوئی۔ شیخ نے بھی اس کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا۔ اس آخری سفر میں اٹک کے قریب فیضی کے مکان پر ہی رہتا تھا اور اس کی ضروریات شیخ کے گھر سے پوری ہوتی تھیں لیکن جیسا کہ فیضی کی عادت تھی وہ ہر شخص کے ساتھ بس ہفتہ دو ہفتہ کی دوستی کرتا تھا پھر طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیتا تھا۔ دونوں میں رنجش پیدا ہوگئی اور عرفی نے حکیم ابو الفتح سے دوستی کرلی اور اس کی سفارش سے خان خاناں کی خدمت میں چلا گیا اور وہاں اپنے فن و ہنر کے جوہر کھلائے۔ روز بروز اس کی شعر گوئی اور مراتب میں ترقی ہونے لگی۔

ایک دن شیخ فیضی کے گھر آیا ہوا تھا، فیضی ایک کتے کے پلے سے کھیل رہا تھا۔ عرفی نے پوچھا "اس صاحبزادہ کا کیا نام ہے"؟ فیضی نے کہا: "عرفی" اس نے برجستہ جواب دیا: "مبارک ہو" اس چوٹ سے فیضی، تلملا اٹھا لیکن کر بھی کیا سکتا تھا، چپ رہا۔ عرفی اور

حسین ثنائی نے شاعری میں بڑا نصیب پایا ہے۔ کوئی گلی کوچہ ایسا نہیں جس میں کتب فروش ان دونوں کے دیوان کو لیے ہوئے کھڑے نظر نہ آئیں۔ ان کے دیوان عراق اور ہندستان میں سب تبرکاً خریدتے ہیں اس کے برعکس شیخ فیضی اپنی کتابوں کو لکھوانے، ان کو سونے چاندی کی نقاشی سے سجانے اور سنوارنے میں بے انتہا پیسہ خرچ کرتے ہیں۔ لیکن کوئی اس کی کتاب کو جھوٹے منہ تک نہیں پوچھتا ہے۔ سوائے اس مسودے کہ جو وہ خود ادھر ادھر بطور ہدیہ روانہ کرتا رہتا ہے:

قبول خاطر و لطف سخن خدا داد است

عرفی کے اشعار کا ایک دیوان ہے "مخزن اسرار" کی بحر میں ایک مثنوی بھی لکھی ہے جو بہت مشہور ہوئی ہے۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

رباعی

فردا کہ معاملان ہر فن طلبند
حسن عمل از شیخ و برہمن طلبند
آنہا کہ درودۂ جوئی نستانند
و آنہا کہ کشتۂ بخرمن طلبند

غزنوی

یہ میر محمد خان کلاں کا تخلص ہے جو بڑا عالی مرتبہ اور مشہور امیر تھا۔ اس کی محفل کبھی اہل علم اور شعرا سے خالی نہ رہتی تھی۔ سرکاری مصروفیات کے باوجود وہ شعر کہنے کا وقت نکال ہی لیتا تھا۔ اس نے ایک بڑا دیوان مرتب کرلیا تھا اور بادشاہ سے کہتا تھا کہ تمہارے عہد کی بڑائی یہی ہے کہ مجھ جیسا آدمی اس عہد میں موجود ہے:

در جوانی حاصل عمرم بنادانی گذشت
آنچه باقی بود آن ہم در پشیمانی گذشت
ای جوان جز تخم نومیدی نکشتی در جہان
موسم بذری رسید و وقت دہقانی گذشت

جس زمانے میں وہ سنبھل کا حاکم تھا اس نے شیخ سعدی کی اس غزل کو طبع آزمائی کے لیے پیش کیا:

دلی کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است
ز عشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است

اور خود اس نے اس پر یہ شعر کہا:

دلی کہ چہرۂ ساقی زیادہ گلرنگ است
بنوش بادہ بر آواز نی کہ دل تنگ است

میر اماکی اور دوسرے شاعروں نے اپنے اپنے قرینے اور سلیقے و ہنر کے مطابق اور اس زمانہ کی زبان کے مطابق جواب دیے۔ جمال خان مرحوم بدایونی، خان موصوف کے مقرب و مصاحب تھے اور بڑے لطیف طبع آدمی تھے۔ انھوں نے جو غزل کہی تھی اس کا مطلع ہے:

ترا رخ از پی عشرت مدام گل رنگ است
مرا بہ فکر و وصالت چو غنچہ دل تنگ است

اس زمانہ میں میں (۹۲) کانت و گولہ میں حسین خان کی خدمت میں تھا کہ رات کے وقت یہ غزل میاں جمال خان کے خط کے ہمراہ موصول ہوئی۔ دوسری صبح کو ہی خبر ملی کہ وہ سنبھل کی عیدگاہ میں عید قربان کے دن بیہوش ہوگیا اور عین جوانی میں محبوب حقیقی سے جا ملا۔ اس کی لاش بدایوں بھیجی گئی۔ اس کی تاریخ وفات "آہ جمال خان بمرد" نکالی گئی:

گردون در آفتاب سلامت کرانشاند
کو را چو صبح روشن اندک بقا نکرد

قہاری

یہ قاسم علی ولد حیدر بقال کا تخلص ہے جو بڑا بد مزاج، مغرور اور متکبر مشہور تھا۔ اپنے آپ کو قریشی جتلاتا تھا لیکن یہ بات طے شدہ تھی کہ جس کا نسب اونچا نہیں ہوتا وہ اپنے آپ کو قریشی سے منسوب کر دیتا ہے۔ اس کی محفل میں اگر اس کا باپ چلا آتا تو اسے بڑی شرم معلوم ہوتی تھی اور بگڑنے لگتا تھا اس کا باپ اس سے کہا کرتا تھا تو چاہے کتنی شیخی کر لے، میں تو اپنے آگرہ والی دکان پر بیٹھتا ہوں پھل اور معجون وغیرہ بیچتا ہوں اور ہر آنے والے سے چاہے وہ پوچھے یا نہ پوچھے میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ قاسم علی خان میرا حقیقی بیٹا ہے۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ تمہارے کتنے لڑکے ہیں؟ کہنے لگے 8 اور ان کی تفصیل یہ ہے:

دو از من است و دو بی بی و دو از ہر دو
دوئی دگر کہ نہ از بی بی است و نی از من

قاسم پہلے بڑا حسین جوان تھا اور مجلس شاہی میں شعر پڑھا کرتا تھا۔ پھر ترقی کر کے بادشاہ کا نائب بن گیا اور خان کا خطاب و منصب پایا۔ وہی مثل ہے کہ ایک نے دوسرے سے کہا تو نے سنا فلاں کو خان بنا دیا گیا ہے۔ اس نے جواب میں کہا اچھا ہوا وہ کمینہ اسی قابل تھا۔

میں[92] اُسے 21 سال سے دیکھ رہا ہوں کہ ہمیشہ "متوسط" کا سبق پڑھتا رہتا ہے اور اپنے استادوں سے زبردستی تسلیمات کراتا ہے۔ اگر کوئی تسلیم نہ کرے تو پھر اس کے ساتھ نباہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی مار ہے کہ اس کا سبق کبھی تک "وضع لمعنی منفرد" کے قاعدہ سے آگے نہیں بڑھا۔ اس کے شاعرانہ ذوق کا اندازہ اس کے اشعار سے کیا جا سکتا ہے:

ما سوای آب مائل وحمام جائی ماست
حمام خانہ ایست کہ خاص از برای ماست

1000ھ/1591ء میں ہزار حسرت اس دنیا سے چل بسا۔ اس کی تاریخ "قاسم خاں ابلہ" سے نکلتی ہے۔ ایک روایت کے مطابق اس کی وفات 1001ھ/1592ء ہے۔ اس کے مطابق بجائے "ابلہ" کے جاہل کا لفظ پورا اترتا ہے۔

غربتی حصاری

صاحب دیوان شاعر ہے، کچھ پڑھا لکھا بھی ہے۔ کہا کرتا تھا کہ "میں ایک دن ماوراالنہر میں سلطان الاولیاء شیخ حسین خوارزمی کی محفل سماع میں حاضر تھا اور قوال یہ رباعی گا رہے تھے۔

عمریست کہ من زپوست پوستان تو ام　　　در دائرہ حلقہ بگوشان تو ام
گر بنوازی من از خروشان تو ام　　　ور ننوازی من از خموشان تو ام

حضرت شیخ آخری بیت پر سردھن رہے تھے۔ اس وقت اچانک ان کی صحبت کی برکت سے مجھ پر بھی ایک کیفیت طاری ہو گئی۔ میں اپنے ہوش میں نہ رہا اور میری زبان سے یہ شعر نکل گیا:

گر بنوازی مرا و گر ننوازی　　　در دائرہ حلقہ بگوشان تو ام

یہ سن کر حضرت شیخ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے ساتھ مجھے بھی وجد میں گھمانے لگے۔ اس وقت جو لذت نصیب ہوئی وہ میرے دل سے جاتی نہیں۔ 966ھ/1558ء میں آگرہ میں شیخ فرید کے مدرسہ کے قریب انتقال ہوا۔ اس کا یہ مطلع مشہور ہے:

دھان یار با من دوش رمزی گفت پنہانی
کہ من سرچشمۂ آب حیاتم ہیچ می دانی

غیرتی شیرازی

عرصہ تک ہندستان میں رہا، پھر شیراز چلا گیا۔

بقتل غیر راضی نیم زیرا کہ می دانم
اجل از زہر ہلاک از خنجر جلاد من بردہ

فارغی شیرازی

یہ شاہ فتح اللہ کا بھائی ہے جس کا ذکر آچکا ہے۔ ایک مرتبہ ہندستان آیا تھا۔ بیرم خان خانان نے اس سے درخواست کی کہ: "فارغی شیخ ابو الواجد خوافی کا تخلص ہے اور مجھے ان سے بڑی عقیدت ہے، اس لیے تم اپنا تخلص فایقی رکھ لو"۔ کچھ عرصہ تک تو اس نے فایقی ہی تخلص رکھا لیکن جب عراق گیا تو اپنا پہلا تخلص اختیار کر لیا۔ دوسری بار ہندستان آیا اور یہیں پیوند خاک ہو گیا۔ اس کا لڑکا میر تقی علم ہیئت اور نجوم میں شاہ فتح اللہ کا قائم مقام تھا۔ میں[92] نے اصطرلاب کے 20 باب اسے پیش کیے تھے۔ نہایت بلند فطرت اور با ہمت آدمی تھا۔ اس کا بھائی میر شریف بھی بڑا عالم و فاضل تھا۔ میر تقی کہا کرتا تھا میرے خاندان میں ہم دو بھائی اور شاہ فتح اللہ سنی مذہب کے پیروکار ہیں۔ باقی سب کٹر شیعہ ہیں۔

یہ شعر میر فارغی کے ہیں:

خوش آن کز وعدہ ات خوش حال در محنت سرای خود
نشینم منتظر ساعت بہ ساعت سوی در بینم

بجای میر ... در عشق آنجز آشنائی ھا — کہ عاشق خویش را بیگانہ باید از جدائی ھا
بر تن خاکی مجنون نبود داغ عیان — گرد پی قافلہ لیلی است بر و ماندہ نشان

فہمی طہرانی

بڑا جہاں نورد سیاح تھا۔ ہندستان آنے کے بعد ولایت چلا گیا۔ موزوں طبع آدمی تھا۔

ز عشق آن شعلہ خواہم در تن غم پرور افتد
کہ تا گریم ز سوزش آب در خاکسترم افتد

دل را با احتمال پیاش و ہم قرار ہر چند این محال میسر نمی شود

نجی سمرقندی

یہ خوش طبع سخن گو شاعر نادری سمرقندی کا بیٹا ہے۔ ہندستان آیا تھا لیکن واپس چلا گیا۔

تا خاصیت ی کن پیر مغان گفت
از تو بہ پشیمان نہ چنانم کہ توان گفت

فکری

انکا اصل نام سید محمد جامہ باف ہے اور میر رباعی کے نام سے مشہور ہے۔ رباعیات میں وہ اپنے زمانہ کا خیام تھا۔ جونپور کے سفر میں 973ھ/1565ء میں فوت ہوا۔ اس کی تاریخ "میر رباعی سفر نمود" سے نکالی گئی ہے:

رباعی

دارد فکری سری کہ سامانش نیست دردیست بدل نہان کہ درمانش نیست
عمریست کہ پا کردہ ز سر حد رہ عشق سرکردہ رہی کہ ہیچ پایانش نیست

فنائی

چغتائی کنیز زادہ ہے۔ بہت زیادہ سفر کیے ہیں۔ حرمین کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے۔ لڑائی میں بہادری کی وجہ سے خان کا خطاب حاصل کیا ہے بعض وجوہ کی بنا پر اس منصب سے معزول کردیا گیا۔ کہتا تھا 3 شین یعنی شمشیر، شعر اور شطرنج کوئی مجھ سے جیت کر نہ جا سکا ہے۔ اس کی بات پر اکبر نے برجستہ کہا: "شیطنت کا شین بھی"۔ کچھ عرصہ تک قید میں رہا۔ رہائی پائی تو دیوانہ ہو گیا اور جنگلوں کی طرف نکل گیا پھر اس کا پتہ نہ چل سکا۔ اس کا ایک دیوان اس کی یادگار ہے۔ اس کے شعر بھی بگڑے ہوئے چغتائی امیرزادوں کے رنگ میں ہیں۔

رسد ہر کس بمقصودی ز یارب یارب شبہا　　　　چرا مقصود من حاصل نشد یارب ز یارب ھا

اس کا ایک مطلع مجھے[93] پچاس سال سے برابر یاد ہے۔ یہ تاریخ نظامی میں بھی لکھا ہوا ہے:

نگویم بہر تشریف قدومت خانہ دارم
غریبم خاکسارم گوشۂ ویرانہ دارم

تا گل روی تو از بادۂ گلفام شگفت　　　　بادہ از عکس گل روئی تو در جام شگفت

فسونی یزدی

سید اور قصہ گو ہے۔ شعر سے مناسبت رکھتا ہے۔ ٹھٹھہ سے آکر شاہی ملازمت میں داخل ہوگیا ہے:

بی جہت از پیش ما جستی گذر کردن چہ بود　　　　گر گذر افتادہ سوئی او نظر کردن چہ بود
در سخن بودی بغیر از دور چون دیدی مرا　　　　گر حجاب از من نہ کروی مختصر کردن چہ بود

فیروزہ کابلی

میرزا محمد حکیم کا خانہ زاد ہے۔ اس کا تعلق سنگا قبیلہ سے ہے، غالباً ہندستان کے جنگلوں میں فوج کے ہاتھ آگیا اور ہمایوں بادشاہ کی ملازمت میں رہا اور میرزا محمد حکیم کے ساتھ پرورش پائی۔ نہ تو پڑھا لکھا ہے اور نہ اس کا خط ہی اچھا ہے، البتہ موسیقی میں دخل رکھتا ہے اور طنبورہ کو ایک خاص انداز میں بجاتا ہے۔ پٹنہ کے سفر سے واپسی کے وقت قاضی خان بدخشی کے ہمراہ جونپور سے آکر شاہی ملازمت اختیار کی۔ علم تو اسے نصیب نہ ہوا لیکن اس کے اشعار اثر وشوخی سے خالی نہیں ہیں۔

غیر منظور نظر ساختۂ یعنی چہ؟　　　　بندہ را از نظر انداختۂ یعنی چہ؟
کس ندیدیم بدور تو باین حسن و جمال　　　　قیمت حسن بر انداختۂ یعنی چہ؟

سنا ہے کہ اب وہ اکثر متقدمین و متاخرین کے دیوان کے جواب کہنے کا دعویٰ کرتا ہے۔

تھی استرآبادی

بڑا مستعد آدمی تھا، دہلی میں فوت ہوا۔

رباعی

ای روی تو در عرق گل آب زدہ — زلف تو درد بنفشۂ تاب زدہ
چشمان تو چون دوست در یک بالین — سر بر سر ہم نہادۂ و خواب زدہ

ملک الشعراء شیخ فیضی

مختلف فنون شعر، معمہ گوئی، عروض و قافیہ، تاریخ، لغت، طب اور انشاء میں، بے مثل شخص گزرا ہے۔ پہلے پہل اس نے اپنا تخلص مشہور رکھا تھا۔ لیکن اس کے چھوٹے بھائی کو علامی کا خطاب ملا تو اس نے بھی اپنی شان بڑھانے کے لیے اسی وزن پر فیاضی تخلص رکھ لیا، لیکن یہ تخلص سازگار نہ ہوا۔ ایک دو ماہ بعد ہی دنیا سے رخصت ہونا پڑا۔ فیضی بڑا جدت پسند ھزل گو، متکبر اور مغرور تھا۔ نفاق، خباثت، ریاکاری، حب جاہ اور رعونت تو کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ مسلمانوں سے تو اسے دلی عناد تھا۔ اصول دین کی اہانت کرتا رہتا تھا۔ صحابہ کرام متقدمین اور متاخرین اہل علم اور مشائخین زندہ یا مرحوم ہر ایک کی مذمت اور بے ادبی کرنے میں اسے پاک نہیں ہوتا تھا۔ تمام علما، صلحا اور فضلا کی رات دن توہین کرتا رہتا تھا۔ اس سے تو یہودی، نصرانی ہندو اور مجوسی لاکھ درجہ بہتر تھے۔ ایسا بدعقیدہ تھا کہ تمام حرام باتوں کو شریعت کی ضد میں حلال اور فرائض کو حرام سمجھتا تھا۔ اس نے جو بے نقط تفسیر لکھی تھی وہ بھی بس اپنی بدنامی پر پردہ ڈالنے کے لیے تھی۔ کم بخت نے تفسیر بھی مستی اور ناپاکی کی حالت ہی میں لکھی۔ اس کے پالے ہوئے کتے بھی اس کے مسودوں کو

ناپاک کرتے رہے۔ اس کا عجب و غرور، ہٹ دھرمی اور بے دینی دھری کی دھری رہ گئی اور اسے اس دنیا سے اس حالت میں رخصت ہونا پڑا کہ خدا نہ کسی کو دکھائے نہ سنوائے۔

جس وقت بادشاہ اس کے آخری دم پر پہنچے تو ان کو دیکھ کر کتوں کی طرح بھونکنے لگا۔ یہ بات خود بادشاہ نے اس کے دیوان پر لکھی ہے۔ مرتے وقت اس کا چہرہ سوج گیا تھا اور لب سیاہ پڑ گئے تھے۔ چنانچہ بادشاہ نے شیخ ابوالفضل سے پوچھا: "اس کے لبوں پر اس قدر سیاہی کیوں ہے؟ کیا شیخ نے اپنے ہونٹوں پر مسی لگائی ہوئی ہے؟" ابوالفضل نے کہا: "نہیں یہ خون جم گیا ہے جو تے میں نکلا تھا"۔ ناپاک، بدبخت اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر طعنے کرنے والے کا ایسا حشر ہونا چاہئے تھا اور یہ بھی کم تھا۔ اس کی مذمت میں لوگوں نے بہت سی تاریخیں کہی ہیں۔

فیضی بی دین چو مرد سال وفاتش گفت سگی از جہان رفتہ بحال قبیح

ایک اور تاریخ ہے:

سال تاریخ فیضی مردار شد مقرر بچار مذہب نار

کسی اور نے کہا:

فیضی نجس دشمن نبوی رفت وبا خویش داغ لعنت برد
سگکی بود و دوزخی زان شد سال فوتش چہ سگ پرستی مرد

پورے 40 سال تک شعر کہتا رہا لیکن اس کے سب شعر بس عجیب ہی ہیں۔ بڑیاں خوب جمع کیں مگر مغز کسی میں نہیں ملتا۔ سارے شعر بے مزہ ہیں، البتہ مہمل باتوں کے بیان کرنے، فخر و شان دکھانے اور کفر بکنے میں سب سے آگے تھا۔ اس کے کلام میں نہ ذوق عشق کا پتہ چلتا ہے، نہ معرفت ملتی ہے اور نہ درد کی لذت، حالانکہ اس کے دیوان اور مثنویوں میں 20 ہزار سے زاید ہی شعر ہوں گے۔ اس کے کسی شعر نے بھی کسی کی افسردہ دلی دور نہیں کی اور یہ بدبختی کہ اس کا کوئی شعر کسی نے خواہش سے پڑھا نہ یاد کیا۔ اس سے معمولی اور ادنیٰ شاعر زیادہ خوش نصیب رہے:

شعری کہ بود زنکتہ سادہ

مانند صحفہ عمر یک سوادہ

لطف یہ کہ اپنی جاگیر کا سارا روپیہ اپنے جھوٹے خیالات کی تشہیر میں صرف کرتا رہتا تھا۔ اشعار اور تحریریں لکھوا لکھوا کر دور و نزدیک کے شناساؤں کو بھیجتا رہتا تھا۔ لیکن کوئی شخص دوبارہ ان کو چھونے کا بھی روادار نہیں ہوتا تھا:

شعر تو مگر از حرمت سر آموخت

کز گوشہ خانہ میل بیرون کند

اس کے خود منتخب کردہ شعر جو بطور یادگار اس نے لکھ کر میرزا نظام الدین وغیرہ کو دیئے تھے ان میں سے چند شعر یہ ہیں:

مژگان مجد چون قدم از دیدہ میکنی　　　مردان رہ برہنہ نہادند پائی را

چہ دست می بری ای تیغ عشق اگر داد است　　　ببر زبان ملامت گر زلیخا را

نظر فیض چو برخاک نشینان فگنیم　　　مور را مغز سلیمان رسد از قسمت ما

مشکل کہ سیل دیدہ بگردش در آورد　　　طوفان نوح می طلبد آسیائی تو

لطفی منجم

بادشاہ کا مصاحب تھا مگر بڑا نیک دل انسان تھا۔ اسے اساتذہ کے شعر بہت یاد تھے۔ کسی بھی موضوع پر وہ رات بھر میں ایک ہزار شعر سنا سکتا تھا۔ کچھ عرصہ تک گجرات میں میرزا نظام الدین احمد کے ساتھ رہا اور ان کی مدد سے زاد راہ حاصل کر کے سفر پر چلا گیا۔

گلگل از تاب شراب آن روی چون گلنار شد

گلفروشان مژدہ تان بادا کہ گل بسیار شد

دلم گر شعلۂ آتش شود افسردگی دارد	گل تخم گر از جنت رود پژمردگی دارد

بر آه که در حسرت بالای تو کردم
نخل چمن آرای پشیمانی من شد

میر مرتضیٰ شریفی شیرازی

یہ میر سید شریف جرجانی کے پوتے ہیں۔ ریاضی، حکمت، منطق، کلام اور دوسرے علوم میں تمام علمائے زمانہ سے لائق و فائق تھے۔ شیراز سے مکہ معظمہ جا کر ابن حجر سے علم حدیث کا درس لیا تھا اور تدریس کی اجازت حاصل کی تھی۔ وہاں سے دکن اور دکن سے آگرہ آئے اور قدیم و جدید بیشتر علماء سے آگے بڑھ گئے۔ پڑھنے میں مشغول رہتے تھے۔ 974ھ/1566ء میں انتقال کیا۔ انھیں امیر خسروؒ کے قریب دفن کیا گیا۔ میر محسن رضوی نے یہ تاریخ لکھی ہے۔

رفت تا میر مرتضیٰ از دہر	علم گویا ز نسل آدم رفت
بہر تاریخ رحلتش محسن	گفت علامۂ زعالم رفت

یہ شعر ان کی یادگار ہے:

خاطر جمع ز اسباب میسر نشد
تخم جمعیت دل تفرقۂ اسباب است

محوی

یہ میر محمود منشی کا تخلص ہے جو تقریباً 25 سال ممالک محروسہ ہندستان کا منشی رہا۔ نقیب خان اس کا داماد ہے۔ موزوں طبع آدمی تھا۔ منشیانہ اشعار کہتا تھا۔ یہ رباعی اسی کی ہے جو بیرم خان کے دیوان کے دیباچہ میں لکھی ہوئی ہے:

از کون و مکان نگشت آثار نمود	کاشیا ہمہ از دو حرف کن شد موجود
آمد چو ہمیں دو حرف مفتاح وجود	شد مطلع دیباچہ دیوان شہود

غشی نے یہ رباعی ہمایوں بادشاہ کے عطا کیے ہوئے گھوڑے کی تعریف میں کہی تھی:

ای خسرو جم سپاہ عالی مقدار — دارم اسپی کہ ہست بس لاغر و زار
بروی چو شوم سوار در ہر دو سہ گام — افتد کہ تو ہم یک دو سہ گامی بردار

اس انتخاب کی تصنیف کے دنوں میں فیضی نے ایک دن میرے[94] ہاتھ میں علاء الدولہ کا تذکرہ دیکھ کر لے لیا اور اس ورق کو جس میں اس کا ذکر تھا لے کر پھاڑ ڈالا تھا۔

میر محسن رضوی

کبھی کبھی شعر کہتا ہے۔ میر محمود غشی کے انداز کا آدمی ہے بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی ہے:

آن مہ کہ بدیدہ جایگاہش نیکوست
منظور نظر رفیع چو ماہش نیکوست
بحسن سر خود نہادہ بر پایش
چون مہر صفت عارض ماہش نیکوست

موجی

یہ قاسم خان بدخشی کا تخلص ہے جو ہمایوں کے نامی گرامی امیروں میں سے تھا۔ اصناف شعر کو بخوبی جانتا تھا اور اچھے شعر کہتا تھا۔ یوسف زلیخا کے طرز میں ایک مثنوی بھی کہی ہے جس میں 6 ہزار اشعار ہیں۔ اس مثنوی میں محبوب کی تعریف یوں کرتا ہے:

مرصع موی بندی بی بہایش — زبی قدری فتادہ در قفایش
گہر و از لعل ناب آویزۂ گوش — کہ بود آویختۂ دلہای مدہوش

آخر عمر میں سپاہ گری کا پیشہ ترک کر کے گوشۂ عزلت اختیار کر لیا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ شاعری سے بھی استعفیٰ دے دیتا۔ اس کی وفات آگرہ میں 979ھ/1571ء میں ہوئی۔

میر زادہ علی خان

محترم بیگ کا لڑکا جو ہمایوں کا مشہور امیر تھا۔ میر زادہ نہایت با اخلاق اور موزوں طبع آدمی

تھا۔ کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتا تھا:

شام چو از چہرہ فگندی نقاب
تاب نیاورد و نشست آفتاب

996ھ/1588ء میں کشمیر میں جب کہ یعقوب ولد یوسف خاں کشمیری نے محمد قاسم خان میر بحر پر رات میں چھپ کر حملہ کیا تو یہ لڑتے ہوئے مارا گیا تھا۔

معزی ہروی

طباطبائی سیدوں میں سے ہے۔ بچپن میں کامران مرزا کا ہم سبق تھا۔ ہندستان میں 50 سال تک رہا 982ھ/1574ء میں اسی جگہ فوت ہوا۔ یہ دو شعر اسی کے ہیں:

چند داری ای فلک چون ذرہ سرگردان مرا
تا کی داری بغربت بی سرو سامان مرا

گفتم بآہ درد دل خود برون کنم
دردم بآہ کم نشود آہ چون کنم

مرادی استرآبادی

استرآباد کے سیدوں میں سے تھا۔ 979ھ/1571ء میں فوت ہوا۔ اس کے اشعار مشہور رہے ہیں۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

بہ نمود رخ ز پردہ کہ ضیح صفاست این — یعنی کمال قدرت صنع خداست این
طالع نشد شبی ز رخت کوکب مراد — بی طالعی و تیرگی بخت ماست این

کفر زلفش کہ بود مایۂ ایمانم ازو
تا مسلمانم اگر روی بگر دانم ازو

مشفقی بخاری

مرو کا رہنے والا ہے۔ بعض تو اسے قصیدہ میں اپنے زمانہ کا سلیمان سمجھتے ہیں لیکن یہ ان کی بڑی غلطی ہے۔ وہ ماوراء النہری رنگ میں شعر کہہ لیتا تھا اس کا کلام سرد اور بے سوز تھا۔ دو مرتبہ ہندستان آکر واپس چلا گیا:

چون نقد ہستی مجنون غم نگاری بود
خدا بہ نقد بیا مرزدش کہ یاری بود

اس کی ہجو نہایت رکیک زبان میں ہے۔ اس کی ہجو ملیح اس قطعہ سے نمایاں ہے جو اس نے آخری بار ہندستان آنے پر کہا تھا۔

کشور ہند شکرستانی است
طوطیانش شکر فردوس ہمہ
ہندوان سیاہ چو مگسان
چہرہ ہندوکچہ پوش ہمہ

فیضی ہروی

نام میرزا قلی تھا۔ صاحب دیوان شاعر گزرا ہے۔ اس کی شعر گوئی کا ملکہ اس درجہ پر تھا کہ اگر وہ اس زمانہ تک زندہ ہوتا تو اس زمانہ کے اکثر خام کار شعر گوئی سے دستبردار ہو جاتے۔ متاخرین میں سے کوئی اس کے ہم پلہ نہ تھا۔ برسوں نورنگ خان کی خدمت میں رہا اور اس کی مدح میں بڑے عمدہ قصیدہ کہے ہیں۔ کہتے ہیں نورنگ خان نے بدگمانی کی وجہ سے اسے زہر دے کر مروا ڈالا تھا۔ اس کی وفات مالوہ میں ہوئی تھی۔

دانستۂ کہ مہر تو با جہان نمیرود
کز خاک کشتگان گذری سرگردان مشو

نہ آشنا و نہ بیگانہ نمی دانم   کہ اختلاط چنین را کسی چہ نام کند

بی قرار است دل اندر بدن کشتۂ عشق
دیگر از یار ندانم چہ تمنا دارد
امتحان نام نہد دل ستمی کز تو کشد
خویش را چند باین حیلہ شکیبا دارد

ملک قمی

اسے ملک الکلام بھی کہتے ہیں۔ درویشانہ وضع قطع تھی۔ دکن میں رہتا تھا۔ نہایت درد مند آدمی تھا۔ ہمیشہ اس کی آنکھیں نم رہتی تھیں۔ اہل دکن نے ایک فساد میں اسے ملک عدم پہنچا دیا تھا:

آب شمشیر شہادت شست گرد اختلاف
گبر و ترسا و مسلمان کشتۂ یک خنجر اند

ساز عہ لخت لخت درون فسردگان   و انگاہ بر جراحت دلہا نمک زنند

تو مرہم دل ریش بخندۂ نمکین
دلی بان مژہ تیغ نشتر جگری
بقدر حوصلہ عشق نیست بادہ عشق
تو شیر بیشۂ مانیستی کہ باخبری

سحاب چشم کہ دادہ است نرگست در آب   کہ از نگاہ تو بوئی ستم نمی آید

مداحی بدخشی

شعر گوئی کا بڑا اچھا سلیقہ تھا۔ میرزا عزیز کوکہ کے یہاں ملازم تھا۔
اس کا شعر ہے:

ولا صد فتنہ بر بازان قد و بالاست می گوئی
ازان بالا بلا بسیار دیدم راست می گوئی

اس زمین میں بہتوں نے طبع آزمائی کی اور ایک دوسرے کے مضمون کو پامال کرتے رہے جس کی وجہ سے یہ زمین بالکل ہی بے جان ہوگئی۔ انہی میں سے یہ شعر بھی ہیں:

بلا و فتنہ در عالم ز قدم خاست می گوئی
بلی می آید از بالا بلا ہا راست می گوئی
بہ شہر از قامتم ہر سو قیامت خاست می گوئی
قیامت قامتی داری سہ من راست می گوئی

ملا مقصود قزوینی

اپنے زمانہ کا نہایت خوش طبع شاعر تھا۔ اس کا ایک دیوان بھی ہے:

در عالم و قامتگ کوئی تو رام ماست
اقبال رام گشتہ و عالم بکام ماست
عشاق را تمام نظر بر جمال تست
ای شاہ حسن روئی تو ماہ تمام ماست

اس نے یہ قصیدہ نقیب خان کے داماد قاضی یحیٰی قزوینی کے نام پر کہا ہے اور خواجہ سلمان مذبلی کے رنگ میں:

دگر ز سردی دی رفت آسمان در تاب ــــ زتاب صاعقہ خورشید مانند زیر نقاب
جنگ بحر زبیم سہام صرصر وی ــــ نہاد بر سر خود خود آھنین ز حباب
دگر ز کثرت برف در شدت سرما ــــ زمین بلرزہ در آمد چو قلزم سیماب
سفید گشت سواد زمین ز لشکر برف ــــ سیاہی از دل آفاق شد چنان نایاب

ملا مقصود نے 977ھ/1569ء میں آگرہ میں وفات پائی۔ اس کا باپ ملا فضل اللہ بھی بڑا نیک اور معزز شخص تھا۔ یہ قطعہ اسی کا ہے:

فضلی چو غنچہ خلعت ہستی بخود مپیچ | بر چہرہ چین می فگن و دامن بخون مکش
چون گل شگفتہ باش و چو سرو از غم جہان | آزاد باش و منت این چرخ دون مکش

محقق حصاری

کچھ پڑھا لکھا تھا دہلی کے مدرسہ میں رہتا تھا، بعد میں حسب الحکم اسے سرہند کی قضاوت پر مقرر کیا گیا تھا۔ اسے شاہی دربار سے محقق کا تخلص عطا ہوا تھا۔ اس نے سرہند میں وفات پائی۔

یافتم در گذری جائی کف پائش را | چون تمام رخ خود یافتہ ام جائش را

بفکر موئی میانت دل کسان گم شد
دل شکستہ ما ہم در ان میان گم شد

موسوی مشہدی

اس کی نسبت اس کے تخلص سے ظاہر ہے۔ سوزوں طبع آدمی تھا:

ترا پنہان نظر سوئی من راز است میدانم
تغافل کردنت از بیم اغیار است میدانم

خواجہ معظم

یہ اکبر کا ماموں اور حضرت شیخ جام کی اولاد میں سے تھا۔ خبطی اور پاگل سا آدمی تھا۔ اپنی بیوی کو بے وجہ قتل کر دیا اور قصاص میں 971ھ/ 56! ء قتل کیا گیا۔

خواجہ اعظم معظم نام | کز ازو بود دہر را زیور

زن خود را بکشت و کشت اورا، از غضب شہ جلال الدین اکبر

موزوں

شیخ پیر آگرہ کا لڑکا ہے۔ سات طریقوں پر خوش نویسی کرتا تھا۔ میں (1) نے اسے سلیم شاہ کے عہد میں پشاور میں دیکھا تھا۔ اس کا لڑکا بھی نوجوان اور قابل تھا۔ معما اور خوش خطی میں ماہر تھا۔ چھوٹی بڑی شطرنج خوب کھیلتا تھا۔ یہ چند شعر اس کی یادگار ہیں:

مرا چہ سود ز گلہای رنگ رنگ بہار چو نیست بی تو دلم را بہ ہیچ رنگ قرار

گواہ درد من محو و شد سرشک سرخ و رخ زرد و دیدۂ بیدار

ای یافتہ ز عارض تو ماہتاب تاب ولی سوختہ ز رشک جمال تو آفتاب

ہر ناوک تو ای مہ ابرو کمان ما

چون مغز جا گرفتہ بہر استخوان ما

ایک ہندستانی سے اس سے زیادہ موزوں طبعی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

محمد یوسف

بڑا حسین نوجوان تھا۔ کابل میں پیدا ہوا اور ہندستان میں نشو و نما پائی۔ خوش خطی میں اشرف خان کا شاگرد تھا۔ عین عالم شباب میں 980ھ/1582ء میں سورت کے قلعہ کے محاصرے میں گجرات میں فوت ہوا۔ اشرف خان نے اس کے لیے مصرع تاریخ کہا اور اس پر میر علاء الدولہ نے قطعہ مکمل کیا:

محمد یوسف آن مصر ملاحت برفت از دہر اشک از دیدہ ریزان

پی تاریخ او گفتا عزیزی کجا شد یوسف مصرای عزیزان

یہ غزل بھی محمد یوسف کی ہے:

خوش وقت آنکہ جای بہ میخانہ ساختہ درپای خم بہ ساغر و پیمانہ ساختہ

آن کس کہ دادہ شیوۂ مستی بچشم یار — ستم ازان دو نرگس مستانہ ساختہ

مشرقی سمرقندی

خوش کلام شاعر تھا۔ آگرہ میں بیرم خاں کی سرکار میں ملازم تھا۔ ایک شاہنامہ لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ چند داستانیں بھی لکھ لی تھیں۔ جن میں ایک قصہ سکندر سور کی داستان سے متعلق تھا اور اس میں محمد حسین خان کی بہادری کا ذکر کیا تھا نیز پلیالی میں اس نے یہ نظم پیش کی۔ حسین خان نے اس سے اس واقعہ کو شروع سے آخر تک بیان کیا۔ اس نے رات بھر بیٹھ کر 304 شعروں کی خاطر خواہ تصحیح و اصلاح کی اور صبح مجلس میں آکر نظم سنائی۔ خان نے بڑا اچھا صلہ دیا۔ اس نظم کا ایک شعر ہے:

ز فر لفیرش فلک گشت کر

ملک شد سراسیمہ زان کر و فر

یہ آخری شعر ہی اس کے اپنے خاص رنگ میں ہے، بقیہ کا مضمون پامال اور کافی سنا ہوا ہے۔

ہمیشہ ما ز فراق تو بی سر و پاییم — ترا کس کہ بخاطر نمی رسد ماییم

خط گرد ماہ عارض آن سیم بر نگر — بر دو نشان فتنۂ دور قمر نگر

بر روی ماہ سلسلۂ عنبرین ببین — جعد بنفشہ بر رخ گلبرگ تر نگر

بین چشم رہزن و مژدہ ناوک افگنش — در رہگذار عشق خطر در خطر نگر

مدامی ہمدانی

ہندوستان میں حیدری کے نام سے مشہور تھا۔ میر محمد خان کلاں کی تعریف میں بڑے اچھے قصیدے لکھے ہیں۔ بد مزاج ایسا تھا کہ ہر ایک سے جھگڑا کر لیتا تھا، ہمیشہ اپنی اسی عادت سے مصیبتوں میں مبتلا رہا:

نمی دانست مجنون عاشقی رسوائی عالم شد

منم رسوائی عشق و عاشقی بر من مسلم شد

مقیمی سبزواری

خان اعظم کے سلسلہ کا شاعر تھا۔ خوش طبع آدمی تھا۔ گجرات کی فتح کے بعد اپنے وطن واپس چلا گیا۔

خوش آنکہ چون شمار سگ خویشتن کند
ہر چند در شمار نیم یاد من کند

اس کا لڑکا قاضی ابو المعالی ایک شکستہ دل، قانع مشرب نوجوان ہے۔ اپنے باپ کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ بواسیر کے عارضہ میں لاہور میں فوت ہو گیا۔ شیخ سعدی کا مطلع ہے:

کافران از بت بی جان چہ تمتع دارد
یاری آن بت پرستید کہ جانی دارد

اس نے اسی زمین میں کہا ہے:

مردہ حسرت برد آن دم کہ بری دست بہ تیغ
کین عطا روزی آنست کہ جانی دارد

محوی

حال ہی میں ہندستان آیا ہے۔ خان خاناں بیرم خاں کی ملازمت میں تھا۔ اب مکہ معظمہ کی زیارت کے لیے چلا گیا ہے رباعی کہنے میں بے مثل تھا:

تا زلف برون ہم چو مہ خواہد بود
تا خط شہ حسن را سپہ خواہد بود
گر خانہ زخشت آفتابم سازد
روز من بی چارہ سیہ خواہد بود

مظہری کشمیری

صاحب دیوان شاعر ہے۔ اپنے وطن میں سرکاری خدمت پر مقرر ہے۔ یہ شعر اس کے

ہو

ذوق شعری کا پتہ دیتا ہے:

اقبال حسن کار ترا پیش می برد
ورنہ صلاح کار ندانستہ کہ چیست

شیخ محمد دہلوی

کیا حسب نسب، کیا علم وفضل ہر لحاظ سے یگانۂ روزگار تھا۔ مدتوں کی شناسائی کے بعد اس سال جبکہ شاہی لشکر چتوڑ کے قلعہ کی فتح کے لیے جا رہا تھا، اتفاقاً باری کے قصبہ کے قریب میری[96] اس سے ملاقات ہوگئی، لیکن وقت اتنا تنگ تھا کہ وہ محفل گھڑی بھر سے زیادہ نہ رہی۔ وہ ایک طرف اور میں[97] دوسری طرف رخصت ہو گئے۔ اس پہلی ملاقات ہی میں اس کے قابل قدر احوال کا اندازہ ہو گیا۔ اس کا ذکر شاعروں کے طور پر کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا ہے۔ لیکن وہ بھی کبھی شعر کہتا تھا اس لیے اس کی یاد میں یہ مطلع نقل کیا جاتا ہے:

اگر بروز محنت صبر اختیار کنم
چو اختیار نماند بگو چہ کار کنم

نویدی ترتبی

صاحب دیوان شاعر ہے۔ بیرم خان کے بخشی کچک بیگ کی ہجو میں اس نے ایک ترجیع بند کہا ہے جو رہتی دنیا تک لوح زمانہ سے مٹ نہیں سکتا۔ یہ چند شعر اسی کے ہیں:

ای بدوران شریف تو مباہی ایام — خان بن خان سرور سرخیل سلاطین بیرام
عاجز از و اونی فہم سند ادراک — قاصر از قصر جلال تو کمند اوہام
نحتی ہست مرا شرح کنم بر نواب — مشکلی ہست مرا عرض کنم بر خدام

اس کی ہجو میں اس کا ایک جملہ بھی مشہور ہے۔ خود اس کا بیان ہے کہ "ایک دن کچک بیگ کچہری میں ایک پرانی مسند پر ٹیک لگائے بیٹھا تھا"۔ مجھ سے کہنے لگا "اے کتے میرے

سامنے تو پاخانہ کھاتا ہے"۔ میں نے اسے جواب دیا: ''کون کتا ہے جو تمہارے سامنے پاخانہ کھا سکے؟''

نویدی کا نانا تھا۔ اصل تذکرہ کے مصنف میر علاء الدولہ نے چشم پوشی سے کام نہیں لیا اور قصہ لکھ دیا ہے۔

نشانی

مولانا علی احمد کا تخلص ہے۔ مولانا حسین نقشی مہرکن کے لڑکے ہیں۔ بڑے عالم، فاضل، ولی مشرب آدمی تھے۔ بڑے شاہزادہ کے استاد تھے۔ باپ بیٹے دونوں نے مہرکنی کے فن کو بڑا فروغ دیا۔ خاص طور سے مولانا مذکور کے نگینہ پر نقش سازی میں ان کے کارنامے بے مثل ہیں۔ عراق، خراسان اور ماوراء النہر تک ان کے نقش وسکے کو تبرکاً لے جاتے ہیں۔

علم وکمال میں بھی ان کا بڑا اونچا مقام ہے لیکن نقش سازی کے فن نے ان کے سارے کمالات پر پردہ ڈال دیا ہے۔ اسی لیے سپاہ گری اور ملازمت میں جیسا کہ چاہیے تھا ترقی نہیں پا سکے، پھر بھی قابل عزت عہدہ پر فائز ہوئے۔ امرائے نامدار سے ان کا مرتبہ کسی طرح کم نہیں رہا۔

علم ہیئت اور طبعیات کے ماہر ہیں۔ علم کے مدارج اعلیٰ تک رسائی ہے، ہر طرز کی خوش نویسی جانتے ہیں۔ املاء اور انشاء میں بے مثل آدمی ہیں۔ اگر وہ صرف شاعر ہوتے تو بلاشبہ ان کے شعر صفحہ یادداشت پر یادگار رہتے۔ شعر بس کبھی کبھی کہتے ہیں تخلص اپنے پیشہ کے مطابق رکھا ہے۔

عین عنفوان شباب سے اس منتخب کے لکھنے کے وقت تک کہ میرے بڑھاپے کا زمانہ ہے، ان کے دوستوں میں رہا ہوں۔ ان کے ساتھ میرے (۲۲) گہرے مراسم رہے ہیں۔

ان کے کلام کا نمونہ ہے:

ترا تا سبزۂ خط بر لب جان بخش پیدا شد
مسیحا بود تنہا خضر ہمراہ مسیحا شد

محتسب دل خم شکست و آب آتشناک ریخت

خاک حسن برباد داد خون حسن بر خاک ریخت

باد از یار خبر بر دل ناشاد آورد

استادی سخنوران بر سخن یاد آورد

جس زمانہ میں گجرات فتح ہوا، انھوں نے بادشاہ کے نام کا سکہ کندہ کر کے پیش کیا اور تاریخ میں یہ شعر پیش کیے:

خسرو اسکہ گجرات بنام تو زدند ملک را سایۂ عدل تو تبارک بادا

ای خوش آن دم کہ چو تاریخ دلی زمن پری گویت سکۂ گجرات مبارک بادا

جس زمانہ میں شاہی لشکر پہلی مرتبہ کشمیر کی طرف گیا تھا میں[۹۹] اجازت لے کر پیاور کو جو میری جائے ولادت ہے، چلا گیا تھا۔ انھوں نے کشمیر سے یہ اشعار لکھ کر میرے پاس بھجوائے تھے۔ خدا کو بہتر معلوم ہے کہ انھوں نے دوسروں کو بھی ایسی شوق و محبت میں اشعار لکھے ہوں گے لیکن ان اشعار سے اپنی نسبت کو خاص سمجھتا ہوں تا کہ دوسرا دعوی نہ کرے۔

مرا دور از تو ای ماہ دل افروز نہ شب خوابست ونی آرام در روز

چکیدہ اشک گلگونم بہ خسار شگفتہ لالہ اندر زعفران زار

جس زمانہ میں میں[۱۰۰] یہ تذکرہ لکھ رہا تھا، ان کے چند شعر میں نے منگوائے تھے۔ جواب میں انھوں نے یہ رقعہ لکھا تھا:

"وقت یہ آن پڑا ہے کہ اپنی متفرق خرافات کو جمع کروں۔ بہر حال آپ کے احسان پر آفریں ہے۔ 2 جزو لکھے ہیں، ایک نثر ہے اور دوسری مثنوی، جو ادھوری رہ گئی ہے۔ انشاء اللہ کل یا پرسوں تک اکٹھا دے دونگا۔ فی الحال مثنوی کے چند شعر" سامریم سامریم سامری" روانہ کر رہا ہوں اصلاح فرمادیں اور جو کچھ لکھنے کے قابل ہوں علیحدہ کر لیں"۔

ایک اور رقعہ میں اوگلون بادشاہ اور اکبر کے بزرگوں کے بیچ صاحب قران تمک لکھ کر میرزے[۱۱۵] پاس بھیجے تھے۔

ناجی

یہ جمال خان ولد میاں منکن بدایونی کا تخلص ہے جس کا ذکر آچکا ہے۔ نہایت قابل، بااخلاق نوجوان تھا۔ اسی کی محبت تھی کہ میں نے بدایوں کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ شعر گوئی کے عمدہ نمونے چھوڑ گیا۔ اگر زندگی نے وفا کی ہوتی تو علم و فضل میں بڑی ترقی کر لیتا۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

بشنو این نکتہ سنجیدہ ز پر وردۂ عشق
کہ بہ از زندۂ بی عشق بود مردۂ عشق

ترک من دلم بہ ہنگام سواری زدۂ
لذتی دارم از زخم عشق کہ کاری زدۂ

ملا نویدی

تازہ تازہ خان خانان کی خدمت میں شامل ہوا تھا:

قضا کہ نامۂ جرم شراب خوارہ نوشت
نوید عفو خداوند بر کنارہ نوشت

نہانی

یہ آگرہ میں ایک بوڑھی شاعرہ تھی۔ غالباً ہرات کی رہنے والی تھی۔ یہ اس کا مطلع ہے:

روز غم شب درد بی آرام پیدا کردہ ام
دردمند بیا درین ایام پیدا کردہ ام

بہت سے شاعروں نے اس کے جواب میں شعر کہے لیکن کوئی اس کے برابر کا نہیں:

چہ مردی بود کز زنی کم بود

اس کا لڑکا جعفر اب کشمیر میں احدی ہے۔ یہ ایک قابل نوجوان ہے اور میر بحر معین کی سرکار میں ملازم ہے۔

نجاتی گیلانی

ہندستان آنے کے بعد فوت ہوگیا۔ شعر و نغمہ خوب کہتا تھا:

ای دلم دور از تو در آتش و دیدہ خون فشان
بی تو ام در آب و آتش آشکارا و نہان

حل نشد از دل تو مشکل ما
از دلت وہ کہ آب شد دل ما

نوعی خبوشانی

اپنے آپ کو شیخ جامی محمد خبوشانی کا پوتا بتاتا تھا۔ لیکن اس کے اعمال ایسے تھے جو اس کے دعویٰ کو جھٹلاتے تھے۔ نہایت شوخ طبع آدمی تھا۔ اب چھوٹے شاہزادہ کی ملازمت میں ہے:

نوعی سبو کش ہیم و بعد مردنم
خورشید وار آبلہ ام جوش می زند

غم نوعی نہ ز بسیاری درد والم است　　غم از آنست کہ در حوصلہ گنجائی نیست

نیازی

بخارا کا رہنے والا ہے۔ نہایت بدمست اور بے حیا آدمی ہے، لیکن صحیح معنوں میں شاعر تھا۔

شعر، عروض، معمہ، تاریخ اور دوسری تمام اصناف میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ ان موضوعات پر اس کی تصانیف ہیں۔

جب ہمایوں کی خدمت میں حاضر ہوا تو مجلس میں اس نے بایاں پیر آگے بڑھا دیا۔ ہمایوں ادب و آداب کا نہایت پابند تھا، اس لیے کہا مُلا یہ بایاں پیر ہے۔ پھر حکم دیا کہ اس کو باہر لے جا کر دوبارہ مجلس میں لاؤ۔ جب اسے بیٹھنے کا حکم ملا تو اس نے بیہودہ باتیں شروع کر دیں۔ بیکسی سے بحث کرنے لگا اور میر عبدالحی صدر سے جو بیکسی کی تائید کر رہا تھا کہا بیکسی کے چہرہ سے ظاہر ہے کہ ہم بھی بے کس بنے ہوئے ہیں۔ اس وقت خواجہ حسین مروی نے جو منفعل مزاج آدمی تھا، میر عبدالحی کی تائید میں کچھ کہا تو اس نے ان سے کہا: "خواجہ تم کیوں پشتی لے کر آ گئے"۔

ہمایوں کو اس کی یہ حرکتیں سخت ناگوار گزریں اور وہ محفل سے اٹھ گیا، اسے سزا ملتی لیکن ہمایوں کی بردباری اور حلم ایسا تھا کہ کچھ نہ کہا۔ ماوراء النہر کو چھوڑنے کا سبب اس کی غزل کا یہ مقطع تھا:

بر فلک نیست شفق بادۂ گلفام من است
رند دردی کشم و طاس فلک جام من است
نا نیازی شدہ در ملک سخن خسرو عہد
نا می جامی شدہ منسوخ کنون نام من است

کہتے ہیں ٹھٹھہ میں ایک دن وہ اپنی یہ غزل سنا رہا تھا۔ مولانا جامی کا دیوان بھی موجود تھا۔ جب اسے کھولا گیا تو اس کے حسب حال یہ شعر نکل آیا:

چرخ را جام نگون دان کز می عشرت تہی است
بادہ از جام نگون جستن نشان ابلہی است

نامی

یہ میر محمد معصوم صفوی ولد میر سید صفائی کا تخلص ہے جو بھکر کے اکابر سادات میں سے ہے۔

میر محمد شاہی امرا میں شامل ہے اور کسی خدمت پر سندھ اور قندھار کے علاقے میں مقرر ہے۔ نہایت درویش مزاج، با اخلاق، دیانت دار، بہادر اور سخی ہے۔ تقویٰ، پرہیز گاری، نماز اور تلاوت کا بڑا پابند ہے۔

کسی نے اس سے کہا اس راستہ میں رہنمائی کے بغیر کام نہیں چلتا، کسی مرشد سے تلقین حاصل کرو۔ اس نے جواب دیا کہ فی الحال دو تین مرشد ہیں اب کسی اور کی کیا حاجت میں جس وقت وطن سے دار الخلافہ میں پہنچا تو ہوا و ہوس کا یہ زور تھا کہ ہزاری دو ہزاری منصب نظروں میں نہیں جچتا تھا لیکن جب دربار میں پہنچ کر چوبداروں اور دربانوں کے ڈنڈے کھائے اور خوب ذلتیں اٹھائیں تو اپنی حیثیت معلوم ہوگئی۔ پھر بڑے انتظار کے بعد بیستی کا عہدہ نصیب ہوا اور جوانی کے وہ سارے دعوے ہوا بن کر اڑ گئے، ناچار راضی برضا تسلیم کی خو پیدا کرلی اور مطمئن ہو کر بیٹھ رہے۔ مثال اس طرح سے ہے کہ: "میں نے کچھ بن جانا چاہا کچھ بھی نہ رہا اپنے آپ کو چھوڑ دیا تو سب کچھ بن گیا"۔

نیم ملول کہ کارم نکو نشد بد شد
شود شود نشود گو مشو چہ خواہد شد

اگر کوئی مرشد بھی ہوتا تو وہ اس سے بڑھ کر کیا تعلیم دیتا۔

ہمارا دوسرا مرشد میر ابو الغیث بخاری ہے۔ جو عہدے اور مرتبے میں ہم سے کئی درجہ بڑا تھا۔ جب تک اس سے شناسائی نہیں ہوئی تھی ہمارا یہ حال تھا کہ اگر کسی دن ہمارے گھوڑوں کو دانہ چارہ نہیں ملتا تھا تو غم وغصہ کے مارے کسی سے بولتے نہیں تھے، لیکن جب میر کی صحبت نصیب ہوئی تو ہم نے ان کا یہ رویہ دیکھا کہ کبھی کبھی دو چار روز اچھے گزر جاتے تھے ورنہ ان کے طویلہ میں گھاس کا ایک تنکا رہتا تھا نہ مطبخ سے دھواں اٹھتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے باوجود بھی وہ خوش اور ہنستے بولتے رہتے تھے کہ کسی پر ان کی تنگ دستی کا حال نہیں کھلتا تھا، نہ وہ اس سلسلے میں کسی سے کچھ بولتے تھے اور نہ سنتے تھے۔

ان کے نزدیک خوشحالی اور بدحالی دونوں بس ایک جیسے ہی تھے:

از حادثات در صف آن صوفیان گریز
کز بود غم کنند وز نا بود شادمان

اس وقت ہم نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ جب ایسے بڑے آدمی پر بھی یہ وقت گزرتے رہتے ہیں اور وہ حالات کی ان تبدیلیوں سے متاثر نہیں ہوتا تو ہمارے لیے تو بے فکر رہنا کہیں زیادہ ضروری ہے کیونکہ ہم اس کے دولت و مرتبہ کا دسواں حصہ بھی نہیں رکھتے۔

ہماری تیسری مرشد ایک کنیز ہے جو بادشاہ سلامت نے عطا فرمائی تھی جس وقت بھی شیطان بہکاتا ہے اور ہوا و ہوس زور کرتے ہیں اور طبیعت نظر بازی اور شہوت پرستی کی طرف جھکنے لگتی ہے تو ہم فوراً جا کر اس کی صحبت میں آسودگی حاصل کر لیتے ہیں اور پاک و صاف ہو کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ مرشد کا کام اس سے بڑھ کر کیا ہے کہ وہ ناشائستہ کاموں سے بچا لے۔

میر طالب علم میں بھی بڑے کوشاں رہے۔ شعر گوئی اور معمہ کہنے میں بڑا اچھا ذوق ملا ہے۔ نہایت بلند فطرت آدمی ہے۔ یوسف زلیخا کی بحر میں ایک مثنوی کہی ہے۔ ایک دیوان بھی ان کا ہے۔

اس کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

چہ خوش است آنکہ از خود روم و تو حال پرسی
تو شرح حالی گویم بزبان بی زبانی

چون گریہ من دید نہان کرد تبسم
پیداست کہ این گریہ من بی اثری نیست
در عشق نشہ ایست کہ مشتاق خستہ را
ذوقی ست در فراق کہ اندر وصال نیست

نظیری نیشاپوری

شعراء کے سلسلہ میں شامل ہے۔

نظیری کا قصیدہ ہے:

زحشر بہ خود نگنجم چو بہ فہم می معانی   بدرد لباس برتن چو بجو شدم معانی

بہ فسانہ ام حزن رہ کہ ز آتش عزیمت — بدماغ و دیدہ خواہم ہمہ شب کند و خانی

نوائی

میر محمد شریف نام تھا۔ میر قدسی کربلائی اس کا بھائی ہے، جس کا یہ شعر مشہور ہے:

گر ذوق خرمی نہ شناسم عجب مدان — قدسی بہ عمر خویش چو خرم نبودہ ام

نوائی ہندستان میں بادشاہ کی خدمت میں رہتا تھا۔ حال ہی میں اس کا انتقال ہوا ہے۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

منم نشستہ بکنجی زبلی و فائی تو — قرار دادہ بخود محنت جدائی تو

بگرم خویت از جانی روم چکنم — کہ اعتماد ندارم بر آشنائی تو

تو در طریقۂ مہر و وفا نہ آن شمعی — کہ نور دیدہ فروزد ز روشنائی تو

بہ ہیچ جا نرسیدم بہ ہیچ رہ نگذشتم

کہ در دلم نگذشتی بہ خاطرم نرسیدی

نویدی نیشاپوری

خاصا پڑھا لکھا تھا۔ شعر گوئی میں صاحب مرتبہ شاعر ہے۔ اس کا انتقال 973ھ/1565ء میں حج کو جاتے ہوئے مالوہ، اجین میں ہوا۔

اس کے کلام کا نمونہ

اثرم ز اشک گلگون شدہ لالہ گون زمینہا

نتوان شدن پریشان گل عاشقیت لہا

نقشی تبریزی

جوہر شناس شاعر تھا۔ طبیعت شعر میں خوب لڑتی تھی۔ ایک دیوان مرتب کر چکا تھا، جو بہت مشہور ہوا۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

شوخی کہ بولب بہ خون آلودہ
اہل نظر نہ ازو جنون آلودہ
بربستہ بسر چہرۂ سرخ است اورا
یا رشتہ جان ماست خون آلودہ

وقوعی نیشاپوری

شہاب الدین احمد خان کا داماد ہے۔ اس کا نام محمد شریف ہے لیکن اعمال ایسے کثیف ہیں کہ اس کے نام کی مٹی پلید ہوگئی۔ بے دینی اور الحاد میں وہ ہر طحد بدنام سے آگے ہیں۔

اعتقاد میں نہ تو سنی خالی تھا نہ صباحی، ملا ۱۰۰۰ دونوں کے بین بین تھا۔ ادوار و تناسخ کا قائل بلکہ اس عقیدہ کا پکا پیرو تھا۔

ایک دن بھمبر میں جو کشمیر کا سرحدی شہر ہے، وہ میرے پاس کشمیر جانے کے لیے کچھ ہمراہیوں کی تلاش میں آیا وہاں پتھر کی بھاری بھاری سلیں پڑی ہوئی تھیں۔ انھیں دیکھ کر بڑی حیرت کے ساتھ کہنے لگا: "آہ یہ بیچارے انسانی قالب میں آنے کا انتظار کر رہے ہیں"۔

اس بد اعتقادی کے باوجود اس نے ائمہ علیہ السلام کی شان میں منقبت بھی کہی ہے شاید اس کے ابتدائی زمانہ کی چیز ہو۔ خوش نویسی اور انشاپردازی میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ علم تو حاصل نہیں کر سکا تھا لیکن عربی تاریخیں پڑھنے کی مہارت از خود پیدا کر لی تھی۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

نالہ تا از تو جدا فاش نسازد رازم
بر نیاید شب غم کاش زضعف آوازم

امام حسینؑ کی منقبت میں کہتا ہے:

گر از طغیانی سوز عشق در گیرم چو شمع ۔۔۔ شعلہ خود را ہر زمان بر من زند پروانہ سان
رز فیض خاطرت گردد طبیعت بہرہ ور ۔۔۔ میتوان پر داختن در یک سخن صد داستان

شاہدان بکر معنی چو شود فکرم بلند　　عرض حسین خود کنند از غرفہای آسمان

گر جور آید از تو دلم تن دران دہد　　شاید ترا خدائی دل مہربان دہد

دارد ہلاک غیرت ایئم کہ عشق تو　　در دی بجان ہر کہ دہد جاودان دہد

شبہا کہ بر فروزم از اندیشۂ تو دل　　سوز دلم چراغ بہ ہفت آسمان دہد

یہ اس قصیدہ کے شعر ہیں جو حضرت خاتون جنت بی بی زہرا کی منقبت میں کہے ہیں، لیکن یہ طرز مجھے بے ادبانہ سی معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے میں[101] نے مدح کے شعر درج نہیں کیے۔

شریف وقوعی نے 1003ھ/1594ء میں انتقال کیا۔ اس کے ترکہ میں نفیس کتابیں تھیں جو شاہی کتب خانہ کے پیٹ میں سما گئیں۔

وداعی ہروی

تھوڑا بہت پڑھا لکھا ہے۔ ہندستان میں آنے کے بعد انتقال ہوا:

سواد ہند کہ پر ظلمت ست چون شب ہجران
کسی کہ آمدہ این جا بہ حسرت ست وندامت
ز ملک ہند و داعی بجو غنیمت و بگذر
غنیمت است اگر جان بروی ز ہند سلامت

اس مطلع کے رنگ میں:

خوش آن زمان کہ برویت نظر کنان روم از خود
زمان زمان بخود آیم زمان زمان روم از خود

اس نے کہا ہے:

نہ از شراب بہ بزم تو ہر زمان روم از خود　　پیالہ لعل تو بوسد ز رشک آن روم از خود

واقعی ہروی

ابن علی نام تھا۔ بادشاہی ملازمت میں تھا:

نہ بر جبین تو از روئی ناز چین پیداست | کہ بحر حسن تو ز موج واین چنین پیداست
ہنوزت از می ناز است نشۂ در سر | ز سرگرانیت ای ترک نازنین پیداست
چو شمع سوز دل خود چہ آورم بہ زبان | کہ سوز را اثر از آہ آتشین پیداست
چہ احتیاج بہ ماہ تو است در شب عید | ترا کہ ماہ تو از چاک آستین پیداست

در لعل او بہم دارند آب زندگانی را
یکی جان درمیان باشد بہم یاران جانی را

وصفی

میر عبداللہ نام ہے۔ بڑا اچھا خوش نویس ہے۔ 7 قلم میں خوش نویسی کرتا ہے، شاہ غیاث او رمولانا راقی کا شاگرد ہے۔ احدیوں کے زمرہ میں داخل ہے۔ اپنی والدہ کی طرف سے میر نظام الدین احمد کا رشتہ دار ہوتا ہے۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتا ہے:

کنون کہ لذت اندوہ عشق دانستم
ہزار رنگ بہر خندہ گریہا دارم

وصلی

بڑا زبان آور، خوش طبع شاعر ہے۔ عراق سے حجاز گیا، پھر وہاں سے بحری سفر کرتا ہوا ہندستان آیا۔ جہاز والے طوفان میں بہہ گئے۔ وہ بھی بہتا بہتا قطب شاہ دکن کے ساحل کے قریب پہنچ گیا اور اس کے دربار میں آگیا۔

ایک موقع پر اس نے ایک پہلوان کو کشتی میں پچھاڑ دیا تھا۔ پہلوان نے حسد کے مارے اس زہر دلوادیا اور وہ 977ھ/1569ء میں فوت ہوگیا۔ یہ اشعار اس کی یادگار ہے:

دل فریبانہ برہ میرود وی ترسم
کہ مبادا بودش دل نگرانی از پی

وثوقی ہروی

میر واعظ کے نام سے مشہور ہے۔ بدخشاں اس کا وطن ہے۔ اس کی وعظ کی مجلس میں بڑی رونق رہتی تھی۔

گر سرم خاک رہت گردد و برباد رود
نیست ممکن کہ خیال رخت از یاد رود

چون سر زلف تو گردید پریشان دل من
یک سر مو نکشادی گرہ از مشکل من

وفائی اصفہانی

کچھ عرصہ تک کشمیر میں رہا پھر لاہور آ کر زین خان کوکہ کے یہاں رہنے لگا۔

در دل نیم شبان کوب کہ چون روز شود
ہمہ در ہا بکشایند و درش بر بندند
قحط و قاست اینکہ نکویان روزگار
خوانی نہند و خون دل میہمان خورند

ہمدمی

یہ میرزا برخوردار خان عالم ولد ہمدم بیگ کا تخلص ہے جو ہمایوں بادشاہ کا مشہور امیر تھا۔ بہادری اور نیکی میں اس کی بہت شہرت رہی ہے۔ یہ اس کے اشعار ہیں:

دل من بین و بہر سو تازہ داغی از جنون دروی
محیط محنت است و ہر طرف گرداب خون دروی

ہجری

یہ شیخ جامی کی اولاد میں سے ہیں۔ نہایت متقی اور فرشتہ خصلت آدمی ہیں۔ ان کا ایک دیوان پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔

رباعی

ای گل کہ نسیم سحر بدامان تو دست
بر نام تو عاشقیم و بر بوئی تو مست
این طرفہ کہ حاضری و غایب زمیان
پنہانی و ظاہر از تو ہر چیز کہ ہست

خوش است موسم ولی خاصہ در بہار شباب
گل نشاط اگر بشگفد ز جام شراب

ہاشم

محمد ہاشم کا ذکر بیرم خان خانان کے تذکرہ میں آچکا ہے۔ یہ مولانا شاہ محمد انسی کا بھتیجا ہے۔ کبھی سنجری اور کبھی داعی تخلص کرتا تھا۔ آخر اسی تخلص پر وفات پائی۔ شعر گوئی کا بڑا اچھا ملکہ تھا:

قمری بباغ بہرچہ فریاد می کنی
گویاز سرو قامت او یادمی کنی
گنجشک وار بستۂ دام تو گشتہ ام
نی میکشی مرا و نہ آزادی کنی

رباعی

ای زلف تو زنجیر دل شیدایم
شیدائی آن دو زلف عنبر سایم

گفتی کہ بلاکش شو بسودائی غم

عمریست کہ من بلاک این سودائیم

ہم[102] بیان کر آئے ہیں کہ اس کی ایک غزل خان خانان بیرم خاں نے ایک لاکھ تنکہ میں خریدی تھی۔ اس غزل کا مطلع ہے:

من گیستم عنان دل از دست دادۂ

وز دست دل براہ غم از پا فتادۂ

اس کا انتقال لاہور میں 972ھ/1564ء میں ہوا۔

خاتمہ

یہ ان چند شاعروں کا تذکرہ تھا جن میں سے اکثر مؤلف کے ہم عصر ہیں اور ان کے اشعار و دیوان مشہور اور زبان زد عام ہیں۔

جن شاعروں کا ذکر اس انتخاب میں نہیں آیا ان کے تذکرہ کی ذمہ داری بعد میں آنے والوں پر ہے۔ کیونکہ یہ سلسلہ بہت طویل ہے اور کسی ایک زمانہ میں اس کا احاطہ کر لینا محال ہے:

در پیشتم جگر کرد روزی کباب   کہ می گفت گویندۂ بار باب
بسا تیر ودی ماہ و اردی بہشت   بیاید کہ ما خاک باشیم و خشت
کسا نیکہ از ما غیب اندر اند   بیایند و بر خاک ما بگذرند

میرے [103] اس سودائی قلم نے دیوانہ وار ہر آشنا اور بیگانے کے دامن کو تھامنے کی کوشش کی ہے اور اپنے جنون کے ہر قطرہ کو صفحۂ قرطاس پر ثبت کر دیا۔ نہ معلوم میرے ساتھ بھی لوگ وہی سلوک کریں گے جو میں نے دوسروں کے ساتھ کیا۔

مرا تو عہد شکن خواندۂ و می ترسم
کہ با تو روز قیامت ہمین عتاب رود

لیکن مجھے [104] توقع ہے کہ نکتہ شناس اس بات کو نظر انداز نہیں کرینگے کہ میری یہ ساری آفرین اور نفرین شرح مبین کی حمایت اور دین متین کی طرفداری میں ہے۔ میرا حال اس شخص کے بالکل مشابہ ہے کہ ایک گنوار آدمی ایک محفل میں پہنچا وہاں دسترخوان بچھا ہوا

دیکھا تو بے ساختہ ٹوٹ پڑا اور رکھانے لگا۔ سارے تھال اپنے سامنے سمیٹ کر رکھ لیے۔ کسی نے پوچھا: ''بابا تم کون ہو اور اس زیادتی کا کیا مطلب؟'' کہنے لگا: ''میں ترک ہوں اور داروغہ کا نوکر اور بھوکا ہوں'' اگر دوسروں کو بھی دینی خدمت کا درد اسی طرح دامن گیر ہو جائے اور وہ میرا احتساب کرنا چاہیں تو بسم اللہ۔ میں تو ان لوگوں پر فدا ہو جاؤں جو مجھے میرے عیوب سے آگاہ کردیں ورنہ وہ شرم سے اپنے گریبان میں اپنا منہ چھپالیں۔

اصل میں دیکھا جائے تو میرا یہ بلند پرواز تیز منقار قلم تو قیامت کے ''دابۃ الارض'' کی طرح ہے جو اس آخری زمانہ کے لوگوں کی پیشانی پر یہ مسلم وہ کافر کا نشان لگاتا گیا اور کسی کو رحمت سے کسی کو لعنت سے سرفراز کرتا رہا۔ حضور اکرم ﷺ نے بھی عرب کے مشرکوں اور قریش کے سرداروں پر لعنت بھیجی ہے۔ صاحب ''مرصا العباد'' نے 400 سال پہلے ہی بڑے درد سے کہا تھا:

شاہان جہان بجملگی بشتابید
تابوکہ بقیۂ ز دین در یابید
اسلام ز دست رفت بس بی خبرید
بگرفت جہان کفر وشما در خوابید

ارباب تصنیف و تالیف کی بدقسمتی ہے کہ وہ اپنی اچھی بری کاوشوں کو قلم بند کر کے اہل زمانہ پر بڑا احسان جتاتے ہیں اور کسی نہ کسی کے نام اپنی تصنیف کو منسوب کر کے اپنے اغراض و منافع کی راہ نکال لیتے ہیں۔ میں اس روایت کے خلاف کسی لالچ کے بغیر اپنے پیچھے آنے والوں کے لیے ایک تحفہ چھوڑ نا چاہتا ہوں تاکہ وہ لوگ جو ہمارے زمانہ کے حالات و حقائق کے طالب ہوں اس سے استفادہ کر سکیں:

اگر شراب خوری جرعۂ فشان بر خاک
ازان گناہ کہ نفعی رسد بغیر چہ باک

اس انتخاب کی ترتیب کا اصلی سبب بھی یہی ہے کہ اس زمانے میں احکام دین میں

جس طرح تغیر و تبدل کیا جا رہا ہے اس کی ان ہزار سالوں میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ چنانچہ ہر وہ املا و انشاء کرنے والا جو دو کلمے جوڑ لینے کی استطاعت رکھتا ہے۔ صاحبان اقتدار کی خوشامد یا دین سے ناواقفیت یا اصل حالات سے لاعلمی کے باعث باطل کو حق بنا کر پیش کرنے اور کفریات اور حشویات کو خیرات و حسنات جتلانے میں باک نہیں رکھتا۔

یقین ہے کہ مستقبل کے لوگ اگر ان باطل خرافات اور حشویات کو دیکھیں گے تو بڑے تذبذب اور تردد میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس لیے میں ان معاملات سے بخوبی واقف بلکہ اس گورکھ دھندے میں مبتلا رہا ہوں، یہ ضروری سمجھا کہ اپنے مشاہدات اور روایات کو جو آنکھوں دیکھے حقائق ہیں ظن و تخمین کا نتیجہ نہیں، قلمبند کردوں:

شنیدہ کی بود مانند دیدہ

تا کہ میری سابقہ بیہودہ نگاری کا کفارہ ہو جائے اور اہل اسلام پر میری اس خدمت کا حق ثابت ہو جائے:

مگر صاحب دلی روزی برحمت
کند درکار این مسکین دعائی

مجھے اس کا بخوبی احساس ہے کہ یہ مسودہ ایک بیاض کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں چند معلومات درج کردی گئی ہیں۔ اس لیے اس پر تصنیف یا تالیف جیسے بھاری نام کو تھوپا نہیں جا سکتا۔ لاف و گزاف شرفا کی سیرت کے معارض ہے، مجھے تو اپنی نگارش پر شرم آرہی ہے۔ فخر و مباہات کا کیا موقع اور اگر میں بلند پروازی سے بھی کام لیتا تو کیا ہوتا؟ یہ کھوٹی اور بے قیمت متاع میرے دعوے کے جھٹلانے کے لیے کافی ہے:

روبہی گفت با شتر کہ عمو — از کجا میرسی تو راست بگو
میر سم گفت اینکہ از حمام — شستہ ام ز آب گرم و سرد اندام
گفت آری کہ شاید اینت — بس بود دست و پای چہ کنیت

مناجات

اب بس دعا اور مناجات کا موقع ہے اور بس:

ہرچہ بخشی بہ بندہ دینی بخشی
با رضای خویش قرینی بخشی

سراپا ز عصیان مرا پیش بین مبین جرم مارحمت خویش بین

نگہدار از من بہ روزگار زہر بہ کہ باشد مرا درد وار

خدای جہان را ہزاران سپاس
کہ گوہر سپردم بگوہر شناس

میرے(105) پیش نظر تھا کہ اس شیرازہ میں کشمیر کی تاریخ، سلاطین گجرات، بنگال اور سندھ کے حالات اور ہندستان کے عجائب وغرائب کا ذکر بھی شامل کر دیتا لیکن کہاں وہ تذکرے اور کہاں یہ مجموعہ؟ دونوں میں کوئی نسبت نہیں جیسے "قالین میں ٹاٹ کا پیوند" ریشم میں ریشم ہی کا بخیہ بھلا معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے بروز جمعہ 23 ماہ جمادی الثانی 1004ھ/1595ء کو اپنے رہوار قلم کی باگیں کھینچ لیں اور جتنا کچھ لکھ گیا اس پر اکتفا کرلیا۔ بطور تعمیہ یہ قطعۂ تاریخ کہا گیا ہے:

شکر اللہ کہ یا تمام رسید
منتخب از کرم ربانی
سال تاریخ ز دل جستم، گفت
انتخابی کہ ندارد ثانی

ترجمہ اردو:

خدا کا شکر ہے کہ یہ کام اپنے اختتام کو پہنچا۔ خدا کے کرم سے یہ انتخاب (منتخب) ہوا۔ جب میں نے اپنے دل سے اس کی سال تاریخ ڈھونڈی تو دل نے یہ کہا۔ یہ وہ انتخاب ہے کہ جس کی کوئی دوسری مثال نہیں۔

حواشی

1۔ میں، سے مراد یہاں صاحب تصنیف منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔
2۔ میں، ہم، میں، سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔
3۔ ہم سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی اور میر علی سلدوزی ہیں۔
4۔ میں، سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔
5۔ مجھ، سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی ہیں
6۔ میں، یہ سب الفاظ ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔
7۔ مجھ، ملا عبدالقادر کے لیے آیا ہے۔
8۔ میں سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔
9۔ میں، سے مراد مؤلف تصنیف ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔
10۔ میں سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔
11۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔
12۔ میں، مجھے، میری، میں، ہم، مجھ، الفاظ ملا عبدالقادر بدایونی خود اپنے لیے استعمال کیے ہیں۔
13۔ کاکری کا موجودہ نام کاکوری ہے۔
14۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔
15۔ ولایتی سے مراد ایران و عرب کے طالب علم ہیں۔

16۔ ان کا ذکر "نجات الرشید" میں آیا ہے۔

17۔ میں، ملا عبد القادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

18۔ میں، ملا عبد القادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

19۔ والد مرحوم، یعنی ملا عبد القادر بدایونی کے والد۔

20۔ میں، سے مراد ملا عبد القادر بدایونی۔

21۔ میں، میرا اور مجھے، سے مراد عبد القادر بدایونی ہے۔

22۔ میں، ملا عبد القادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

23۔ میں دراصل اس یحییٰ آدمی کے لیے آیا ہے جس سے ملا عبد القادر بدایونی نے گرتا خریدا تھا۔

24۔ میں، ملا عبد القادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

25۔ میں، سے مراد عبد القادر بدایونی ہیں۔

26۔ میری، ملا عبد القادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

27۔ میں، سے مراد ملا عبد القادر بدایونی ہیں۔

28۔ میں، سے مراد ملا عبد القادر بدایونی ہیں۔

29۔ میں، ملا عبد القادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

30۔ ہم سے مراد یہاں ملا عبد القادر بدایونی اور مولانا عبد اللہ قندھاری ہیں۔

31۔ میں، یعنی مؤلف منتخب التواریخ۔

32۔ میں یعنی ملا عبد القادر بدایونی۔

33۔ میں، سے مراد ملا عبد القادر بدایونی ہیں۔

34۔ میں، سے مراد ملا عبد القادر بدایونی ہیں۔

35۔ میں، سے مراد ملا عبد القادر بدایونی ہیں۔

36۔ ہمیں میں ملا عبد القادر بدایونی کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔

37۔ میں، ملا عبد القادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

38۔ میں، سے مراد ملا عبد القادر بدایونی ہیں۔

39۔ میں، سے مراد ملا عبد القادر بدایونی

40۔ میرا سے مراد ملا عبد القادر بدایونی صاحب تصنیف منتخب التواریخ ہیں۔

41۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

42۔ دریائے گوری متن میں آیا ہے اصلی نام دریائے گومتی ہے۔

43۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

44۔ میرے ساتھی سے مراد عبدالرحمن ہے۔

45۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

46۔ میری، سے مراد عبدالقادر بدایونی ہیں۔

47۔ میں اور میری، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

48۔ محاضرات یعنی یادداشت، سخن موافق حال، تذکرہ سلف، حکایات، تاریخ اور معلومات وغیرہ۔

49۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

50۔ مجھے، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

51۔ میں اور مجھے، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

52۔ میں، سے مراد یہاں مخدوم الملک عبداللہ سلطانپوری ہے۔

53۔ میرا، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

54۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

۵۵۔ میرا، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

56۔ میرے والد سے مفہوم ملا عبدالقادر بدایونی کے والد ہیں۔

57۔ ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

58۔ مجھ، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

59۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

60۔ میرا، سے مفہوم ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

61۔ مجھ، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

62۔ مجھ، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

63۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

64۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

65۔ مجھ، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

67۔ ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

68۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

69۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

70۔ یہاں میں وہی مکار شخص ہے جس نے قاضی صدرالدین سے کہا تھا کہ ہمیشہ خضر میرے ساتھ رہتے ہیں۔

71۔ میرا یعنی ملا عبدالقادر بدایونی کا نام۔

72۔ مجھے یعنی ملا عبدالقادر بدایونی کو۔

73۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

74۔ مجھ، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

75۔ مجھے یعنی ملا عبدالقادر بدایونی۔

77۔ میں، عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

78۔ مجھے، عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

79۔ میرا وطن، یعنی ملا عبدالقادر بدایونی کا وطن۔

80۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

81۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

82۔ میرا یعنی ملا عبدالقادر بدایونی۔

83۔ ہم یعنی ملا عبدالقادر بدایونی۔

84۔ مجھے یعنی ملا عبدالقادر بدایونی۔

85۔ مجھے، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

86۔ میری، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

87۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

88۔ ہمارا، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

89۔ میں اور میری سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

90۔ بغرا: ایک طرح کی غذا ہے جس کو ہندوستان میں بغرا خان نے ایجاد کیا تھا۔ آئین اکبری میں ملتا ہے کہ یہ ایک قسم کا پلاؤ ہے جو چنے کے میدے، سرکہ، چاول اور گوشت سے تیار کیا جاتا ہے۔

91۔ سراندیپ: موجودہ سری لنکا ہے۔

92۔ سیلون: پہلے یہ سراندیپ اور سیلون سری لنکا کے دو حصے تھے۔ بعد میں سری لنکا کو سیلون کے نام سے پکارا جانے لگا یعنی موجودہ نام سے قبل یہ ملک اس نام سے جانا جاتا تھا۔

93۔ ہم: صاحب تصنیف ملا عبدالقادر بدایونی کے کہنے کا مفہوم ہے کہ منتخب کے گزرے ابواب میں ان کا ذکر ہو چکا ہے۔

94۔ مجھے، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

95۔ ہم، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

96۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

97۔ مجھے، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

98 میرے، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

99۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

100۔ میری، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

101۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

القادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

القادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

''منتخب التواریخ'' ملا عبدالقادر بدایونی کی شاہکار تصنیف ہے۔ یہ اصلاً فارسی میں ہے اور عہدِ اکبری کی تصنیف ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی گو کہ ایک ماہر مترجم تھے اور مہابھارت کا فارسی ترجمہ ''رزم نامہ'' اس کی مثال ہے۔ لیکن مختلف علوم و فنون پر بھی ان کی گہری نظر تھی اور عہدِ اکبری کے نابغہ اشخاص میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ تاریخ گوئی میں ان کا سکہ چلتا تھا۔ ''منتخب التواریخ'' میں عبدالقادر بدایونی نے اکبر کی ساٹھ سالہ زندگی کے نشیب و فراز کو قلمبند کیا ہے۔ اس کا اصل ماخذ مرزا نظام الدین احمد کی تاریخ ہے لیکن آخر کے دو برسوں کے حالات انھوں نے خود قلمبند کیے ہیں۔

قومی کونسل کی فہرستِ کتب میں ''تاریخ'' پر 80 سے زاید کتابیں ہیں ''منتخب التواریخ'' ان میں سے ایک ہے جسے دہلی یونیورسٹی میں فارسی کے استاذ علیم اشرف خاں نے نہایت خوبی کے ساتھ اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ جلد اول 410 صفحات پر مشتمل ہے جبکہ جلد دوم و سوم کی ضخامت بھی 620 صفحات پر محیط ہے۔ نہایت فصیح زبان میں ترجمہ شدہ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ 2008 میں اس کی اولین اشاعت کے بعد اسے کونسل تیسری بار شائع کرنے جا رہی ہے۔ اصل متن میں بغیر کسی اضافے کے بھی اسے قارئین کی ہر نسل پسند کر رہی ہے اور اس سے اخذ و استفادہ کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

ISBN: 978-81-7587-759-7

NCPUL
New Delhi

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025